فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون

○

اِمدادُ الاحکام

امداد الفتاویٰ کا تکملہ جو سنہ ۱۳۳۰ھ کے بعد کے تقریباً سوا دو ہزار
فتاویٰ پر مشتمل ہے،

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ و حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب گمتھلویؒ

زیر نگرانی و رہنمائی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ناشر

زکریا بکڈپو دیوبند ضلع سہارنپور

نام کتاب :- امداد الاحکام جلد سوم

تالیف :- حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تبویب :- مولانا محمود اشرف عثمانی مولانا رفیع اللہ عثمانی

ترتیب و مقدمہ :- مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب صدر دار العلوم کراچی

زیر ہدایت :- ذوالفقار علی

ناشر :- زکریا بکڈپو دیوبند، سہارنپور

فون نمبر :- ۰۱۳۳۶ - ۲۳۲۲۳

فیکس :- ۰۱۳۳۶ - ۲۲۹۲۲

طباعت :- اشرفی آفسیٹ پریس دیوبند

فہرست مضامین "امداد الاحکام" جلد سوم

کتاب الزکوٰۃ

فصل فی المحرمات

فصل فی الانکحۃ الفاسدۃ

فصل فی الاولیاء والاکفاء

باب الوکالۃ بالنکاح !

فصل فی الجهاز والمهر

فصل فی القسم عند تعدد الازواج

مسائل متفرقہ متعلقہ نکاح

کتاب الطلاق

باب ایقاع الطلاق

فصل فی الطلاق الصریح

امدادُ الاحکام جلد سوم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

کتابُ الزکوٰۃ

پیشگی زکوٰۃ اگر زائد ادا کردیجائے تو اس کا حکم

سوال (۱) اگر پیشگی زکوٰۃ غلطی سے زائد ادا کردی جائے تو اسے آئندہ سالوں میں محسوب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مثلاً دس ہزار کی مالیت کا اندازہ کرکے سال حال اور ایک سال آئندہ کی زکوٰۃ ادا کردی۔ اور بعد میں حساب کے جانچ کرنے سے معلوم ہوا کہ اصل مالیت آٹھ ہی ہزار کی ہے، تو یہ جو دو ہزار سال حال اور دو ہزار سال آئندہ کی جملہ چار ہزار کی زکوٰۃ غلطی سے پیشگی ادا ہوگئی ہے یہ اس کے بعد کے سال میں وضع کی جاسکتی ہے؟

الجواب: وضع کی جاسکتی ہے، قال فی العالمگیریۃ: رجل له اربع مائة درهم فظن ان عنده خمسمائة فادی زکوٰة خمسمائة ثم علم فله ان یحسب الزیادة للسنة الثانیة اھ (ص ۱۱۳ ج ۱)

۲۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ۔

وکیلِ زکوٰۃ کا زکوٰۃ کی رقم میں خیانت کرنا

سوال (۲) ایک شخص کو وکیل بنایا کہ وہ رقمِ زکوٰۃ اپنی ماں کو لے جاکر دیدے، اس نے درمیان میں خیانت کی، کہ کچھ رقم خود صرف کرڈالی، اور کچھ اپنی ماں کو دیدی وہ شخص خود بھی مصرفِ زکوٰۃ ہے، مگر اس کو وکیل بنایا گیا تھا مالک نہیں بنایا گیا تھا اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا بقدر خیانت پھر ادا کرنا پڑے گی؟

الجواب: اگر وکیل خود بھی فقیر ہے جب بھی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، البتہ جس قدر اس نے اپنی ماں کو دیدیا ہے اس قدر زکوٰۃ ادا ہوگئی، باقی کا ضمان وکیل سے لے سکتے ہیں، قال فی الدر: ولو خلط زکوٰة موکلیه ضمن وللوکیل ان یدفع لولده الفقیر وزوجته (الفقیرة) لالنفسه الا اذا قال ربها ضعها حیث شئت اھ قال فی الشامیة: وهذا حیث لو یأمره بالدفع، اذ لو خالف ففیه قولان اھ (ص ۱۷ ج ۲)

۲۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ۔

کسی مسافر کو زادِ راہ کے واسطے کچھ رقم بطور زکوٰۃ دی، اگر وہ مسافر رقم واپس کردے تو کیا زکوٰۃ ادا ہوجائے گی

سوال (۳) ایک مسافر کہ جس نے بطور قرض زادِ راہ مانگا مگر میں نے یہ کہہ دیا کہ یہ قرض نہیں ہے تم واپس کرنا اور بہ نیت زکوٰۃ اُسے دیدیا اور وہ بحالتِ قیام بھی مصرفِ زکوٰۃ ہے، اب وہ روپیہ واپس کرنا چاہتا ہے، اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہوگئی یا نہیں؟

الجواب، ادا ہوگئی۔

(بقیہ سوال) اگر ادا ہوگئی تو اس کا واپس کیا ہوا روپیہ کیا کیا جائے؟

الجواب: بہتر یہ ہے کہ وہ روپیہ واپس نہ لیا جائے، اور اگر لے لیا ہے تو افضل یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے، اور اگر خود بھی رکھ لیں تو جائز ہے۔

دلیل الجواب: ما ذکرہ فی الدر بقوله وتسقط الزکوٰة عن موهوب له فی نصاب مرجوع فیه مطلقا سواء رجع بقضاء او غیرہ بعد الحول لورود الاستحقاق علی عین الموهوب ولذا الرجوع بعد هلاکه قید به زای بقوله عن موهوب له) لانه لا زکوٰة علی الواهب اتفاقا لعدم الملك اھ قال الشامی (قوله اتفاقا لعدم الملك) لان ملك الواهب انقطع بالهبة واشار بقوله "اتفاقا" الی ان فی سقوطها عن الموهوب له خلافا لان زفر یقول بعدمه ان رجع الواهب بلا قضاء لانه لما ابطل ملکه باختیارہ صار ذلك کهبة جدیدة وکمستهلك، قلنا بل هو غیر مختار لانه لو امتنع عن الرد اجبر بالقضاء فصار کانه هلك، شرح درر البحار اھ، ص ۵۹ ج ۲، قلت واما فی الصورة المسئولة فلا شك فی کون رد الموهوب له هبة جدیدة لانه لا جبر علیه من الواهب فیسقط الزکوٰة عن الواهب قطعا الا انه ینبغی للواهب ان لا یقبل هذا الرد لما ورد فی الصحیح عن عمر رضی الله عنه انه حمل رجلا علی فرس فی سبیل الله ثم راہ یباع فی السوق فاراد شراءه فنهاه النبی صلی الله علیه وسلم عن ذلك وقال لا تعد فی صدقتك اھ، والله اعلم۔

۲۰ رمضان ۱۳۴۱ھ

مدیون بدین مہر پر وجوب زکوٰۃ کا حکم

سوال (۴) اگر کسی کے ذمہ اب تک دَینِ مہر باقی ہے تو اس پر احکام نصاب عائد ہوتے ہیں یا نہیں، دراں حالیکہ علاقے دَینِ مہر سے زیادہ مالیت کے موجود ہوں؟

الجواب: احکامِ نصاب دو قسم کے ہیں، ایک وجوبِ زکوٰۃ، دوسری جواز اخذ مالِ زکوٰۃ، وجوبِ زکوٰۃ تو محض علاقہ کے موجود ہونے سے نہیں ہوتا، جب تک چاندی یا سونا بقدرِ نصاب موجود نہ ہو، اور اُس پر حولانِ حول نہ ہو، یا مالِ تجارت نہ ہو، ہاں علاقے کی پیداوار پر عشر ہوگا اگر یہ خود کاشت کرتا ہے، پس اگر اس شخص کے پاس چاندی یا سونا یا مالِ تجارت بقدرِ نصاب فاضل از حوائج اصلیہ ضروریہ موجود ہو، اور اس پر سال بھی گذر جائے، تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور دَینِ مہر وجوب زکوٰۃ سے اس وقت مانع ہے جبکہ اس رقم کو دَینِ مہر میں ادا کرنے کی نیت ہو، اور اگر مہر میں ادا کرنے کی نیت نہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور صورتِ اوّل میں بھی قدرِ مالیتِ مہر سے زائد رقم میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر وہ نصاب کو پہونچ جاوے، اور زکوٰۃ لینے کا جواز اس وقت ہے جبکہ زمین کی آمدنی اس کے اہل وعیال کے نفقہ قوت کو سال بھر کے لئے کافی نہ ہوتی ہو، مگر سوال کرنا جائز نہیں، کوئی خود دیدے تو لینا جائز ہوگا، اور اگر آمدنی نفقہ سالانہ کے لئے کافی ہے تو زکوٰۃ کا روپیہ لینا اس شخص کو جائز نہیں، اسی طرح صدقہ فطر وچرم قربانی کا حکم ہے، قال فی العالمگیریۃ ولو کان لہ ضیعۃ تساوی ثلثۃ الاف ولا تخرج ما یکفی لہ ولعیالہ اختلفوا فیہ قال محمد بن مقاتل: یجوز لہ اخذ الزکوٰۃ اھ (ص ۱۲۲ ج ۱) وفیہ ذکر البزدوی فی شرح الجامع الکبیر قال مشائخنا رحمہم اللہ فی رجل علیہ مہر مؤجل لامرأتہ وھو لایرید اداءہ لایجعل مانعا من الزکوٰۃ لعدم المطالبۃ بہ عادۃ وانہ حسن ایضا ھکذا فی جواھر الفتاوی اھ (ص ۱۱۱ ج ۱) ۔ ۲۵ رشعبان ۱۳۴۲ھ۔

مال مخلوط بالحرام پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم

سوال (۵) ایک شخص ہے جسکو دس ہزار روپے سالانہ آمدنی تو جائز مثلاً زمین کے اناج وغیرہ سے ہے اور پانچہزار سالانہ مشکوک ذرائع سے، مثلاً لاٹری وجوا وگھوڑدوڑ کے انعام ورشوت سے آتا ہے، توکیا یہ شخص اگر اپنے نوکروں کو تنخواہ دے گا، تو ملازم لوگوں کی آمدنی جائز ہے یا کہ نہیں، اور زکوٰۃ اس کو دس ہزار روپے پر دینا چاہئے یا کہ پندرہ ہزار پر، جس میں کہ پانچہزار مشکوک رقم ہے؟

الجواب: گھوڑدوڑ کے انعام میں جو رقم اس کو ملتی ہے اس کو تو مطلقاً حرام نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس کی بعض صورتیں حلال بھی ہیں، البتہ جوا اور سود ورشوت سے جو رقم آتی ہے وہ حرام ہے، اور اس کو اگر جائز آمدنی سے مخلوط نہیں کرتا تو اس پر زکوٰۃ

نہیں بلکہ اصلی مالکوں کو واپس کرنا لازم ہے، اور اگر حلال آمدنی سے اُس کو مخلوط کر دیا ہے اور دونوں میں تمیز نہیں ہو سکتی تو زکوٰۃ مجموعہ پر فرض ہوگی، اور اصل مالکوں کو مال کا واپس کرنا بھی لازم ہے، اور ملازموں کو اس حرام آمدنی سے عدم خلط کی حالت میں تو تنخواہ لینا جائز نہیں اور حلال آمدنی کے ساتھ خلط کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے۔

قال فی الدر: ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ فتجب فیہ الزکوٰۃ ویورث عنہ لان الخلط استہلاک اذا لم یمکن تمییزہ الخ قال الشامی قولہ بمالہ متعلق بخلط واما لو خلطہ بمغصوب اخر فلا زکوٰۃ فیہ کما یذکرہ فی قولہ کما لو کان الکل خبیثا اھ (ص ۳۹ ج ۲) قلت ظھر بذلک انہ لا یملک شیئا بخلط مال القمار والربٰوا مالم یخلط بمالہ و قال فی قاضی خان ان کان غالب مال المھدی من الحلال لا بأس بان یقبل الھدیۃ ویاکل مالم یتبیّن عندہ انہ حرام لانّ اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فیعتبر الغالب کما مرّ فی ص ۱۸۲ من ھذا الجزو الملقب بالقال المضبوط (تتمۃ الکلام علی الجواب) فی حکم المال المخلوط، قال فی الدر وجاز اخذ دَین علی کافر من ثمن خمر لصحۃ بیعہ بخلاف دَین علی المسلم لبطلانہ الّا اذا وکل ذمیا ببیعہ فیجوز عندہ خلافا لھما وعلٰی ھذا لومات مسلم وترک ثمن خمر باعہ مسلم لایحلّ لورثتہ کما بسطہ الزیلعی، وفی الاشباہ: الحرمۃ تنتقل مع العلم الّا للوارث الّا اذا علم ربّہ قلت و مرّ فی البیع الفاسد لکن فی المجتبیٰ مات وکسبہ حرام فالمیراث حلال ثم رمز وقال لانأخذ بھذہ الرّوایۃ اھ قال الشامی تحت قولہ کما بسطہ الزّیلعی الخ حیث قال لانّہ کالمغصوب وقال فی النہایۃ قال بعض مشائخنا کسب المغنیّۃ کالمغصوب لم یحل اخذہ وعلٰی ھذا قالوا لومات الرّجل وکسبہ من بیع الباذق او الظلم او اخذہ الرّشوۃ یتورع الورثۃ ولا یأخذون منہ شیئا وھو اولٰی بھم ویردّونھا علٰی اربابھا ان عرفوھم والّا تصدّقوا بھا لانّ سبیل الکسب الخبیث التصدّق اذا تعذّر الرّدّ علی صاحبہ اھ وتحت قولہ فی الاشباہ الخ قال الشیخ عبد الوھاب الشعرانی فی کتاب المنن

وممّا نقل عن بعض الحنفیّة من انّ الحرام لایتعدی الی ذمّتین سالت عنه
الشہاب بن الشلبیؒ (الحنفی) فقال ہو محمول علی ما اذا لم یعلم بذلک امّا
من رأی المکاس یأخذ من احد شیئا من المکس ثم یعطیه اٰخر ثم یأخذه
من ذلک الاٰخر فہو حرام اہ وفی الذخیرة سئل ابو جعفر عمن اکتسب ماله
من امر السلطان والغرامات المحرمة وغیر ذلک هل یحل لمن عرف ذلک
ان یأکل من طعامه قال احب الیّ فی دینه ان لا یأکل ویسعه حکمًا ان لم یکن
غصبا او رشوة اہ وفی الخانیة: امرأة زوجها فی ارض الجور اذا اکلت من طعامه
ذلک ولم یکن عینه غصبًا او اشتری طعامًا او کسوة من مال اصله لیس بطیب
فہی فی سعة من ذلک والاثم علی الزوج اہ حمویؒ تحت قوله وہو حرام مطلقا
علی الورثة الخ ای سواء علموا اربابه اولا فان علموا اربابه ردوه علیہم والا تصدقوا به کما قدّمناه
اٰنفا عن الزیلعی اقول ولا یشکل ذلک بما قدّمناه اٰنفا عن الذخیرة والخانیة
لانّ الطعام او الکسوة لیس عین المال الحرام فانه اذا اشتری به شیئا یحل
اکله علی تفصیل تقدم فی کتاب الغصب بخلاف ما ترکه میراثًا فانه عین
المال الحرام وان ملکه بالقبض والخلط عند الامام فانه لا یحل له التصرف
فیه قبل اداء ضمانه وکذا الوارثه فی الدیانة لا الحکم فلا یجوز لوصی لقاصر
التصدق به ویضمنه القاصر اذا بلغ تأمل اہ (ص ۳۸۰ ج ۵) وفی الدر
فی باب الغصب فان غصب وغیّر المغصوب فزال اسمه واعظم منافعه
ای اکثر مقاصده او اختلط المغصوب بملک الغاصب بحیث یمتنع
امتیازه کاختلاط برّه ببرّه او یمکن بحرج کبرّه بشعیره ضمنه وملکه بلا حل
انتفاع قبل اداء ضمانه ای رضا مالکه باداء او ابراء او تضمین قاض و
القیاس حله وہو روایة فلو غصب طعامًا فمضغه حتی صار مستہلکًا
یبتلعه حلالًا فی روایة وحرامًا علی المعتمد حسمًا لمادة الفساد اہ قال الشامی

عه قلت ہذا مبنی علی قولہما لا علی قوله کما یظہر ۱۲ عه قلت نعم یفتی بالحرمة فی حق الغاصب
وہو کاف لحسم مادة الفساد واما فی حق غیره فالافتاء بالحل ارفق لدفع الحرج کما سیأتی ۱۲

تحت قوله وہو روایة الخ جعلہا فی الخلاصة وغیرہا قول الامام والاستحسان
قولہما وفی البزازیة وکان الامام نجم الدین النسفیؒ ینکر ان یکون ہذا قول
الامام ولیقول اجمع المحققون من اصحابنا انه لا یملکه الا باحدی الامور
الثلاثة عه وقالوا جمیعًا الفتوی علی قولہما اہ قلت نما قاله المحققون مخالف
لعامة المتون کما مرّ فتدبّر، ثم رأیت بعضہم نقل انّ العلامة قاسم
تعقبه اہ (ص ۱۸۷ ج ۵) قلت وقد ذکر الشامیؒ قبل ذلک فی (ص ۱۸۶ ج ۵)
وما افاده کلامه ای کلام المصنّف من ان الملک فی المغصوب ثابت قبل
اداء الضمان وانّما المتوقف علی اداء الضمان الحل ہو ما فی عامة المتون اہ
ثم ردّ علی صاحب النوازل فی توقیفه الملک ایضًا علیه وفی الدر فی باب
البیع الفاسد الحرام ینتقل فلو دخل بامان واخذ مال حربی بلا رضاه و
اخرجه الینا ملکه وصحّ بیعه لکن لا یطیب له ولا للمشتری منه بخلاف
البیع الفاسد فانّه لا یطیب له لفساد عقده ویطیب للمشتری منه لصحة
عقده وفی حظر الاشباه الحرمة تتعدی مع العلم بہا الا فی حق الوارث
وقیده فی الظہیریة بان لا یعلم ارباب الاموال وسنحققه ثمّه اہ
قال الشامی وفی منیة المفتی مات رجل ویعلم وارثه ان اباه کان یکسب
من حیث لا یحلّ ولکن لا یعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الارث
والافضل ان یتورع ویتصدّق بنیّة خصماء ابیه اہ وکذا لا یحل اذا علم
عین الغصب مثلا وان لم یعلم مالکه لما فی البزازیة: اخذ مورثه
رشوة او ظلمًا ان علم ذلک بعینه لا یحلّ له اخذه والا فله اخذه حکمًا
امّا فی الدیانة فیتصدّق به بنیة ارضاء الخصماء اہ والحاصل انّه
ان علم ارباب الاموال وجب ردّه علیہم والا فان علم عین الحرام
لا یحلّ له ویتصدّق به بنیّة صاحبه وان کان مالًا مختلطًا مجتمعًا من
الحرام ولا یعلم اربابه ولا شیئًا منه بعینه حل له حکمًا والاحسن دیانة

عه ای بالاداء او الابراء او تضمین قاض قلت ومقتضاه ان لا یجب علی الخالط
الزکوٰة بعد الخلط وقد صرح اصحاب المتون بخلافه کما ذکرناه ۱۲ منه

التنزہ عنہ اھ (ص ۲۰۱ ج ۴) قلت ومفادہ ان الحرمۃ انما تتعدی الی الغیر اذا علم شیئاً بعینہ حراماً وعلم ربہ والا فیحل لہ اخذہ والتورع التنزہ عنہ وھذا ھو الذی قلتہ فی المختلط ویؤیدہ ما فی قاضی خان: ان کان غالب مال المھدی حلالاً لا بأس بان یقبل الھدیۃ ویأکل ما لم یتبین عندہ انہ حرام لان اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فیعتبر الغالب اھ قیل لیس فیہ تصریح بالخلط قلتُ قولہ لان اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام یشعر بالخلط والا لقال لان احداً لا یخلو عن کسب حرام وایضاً فالحکم یدور مع العلۃ وھی فی المسئلۃ المذکورۃ دفع الحرج ولا یخفی کثرۃ اختلاط اموال الناس بقلیل حرام وفی الافتاء بحرمۃ اخذھا حرج عظیم فیعتبر الغالب مطلقاً سواء کان قلیل الحرام مخلوطاً او غیر مخلوط وفی الدر ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ فتجب الزکوٰۃ فیہ ویورث عنہ لان الخلط استھلاک اذا لم یمکن تمییزہ عند ابی حنیفۃؒ وقولہ ارفق اذ قل ما یخلو مال عن غصب اھ (ص ۲۹ ج ۲) قلت وفی قولہ دلالۃ علی انتقال الحرمۃ عن الاخذ اذا اخذ المال المختلط بالحرام بحیث لا یمکن تمییزہ والا فلا رفق بالناس مع بقاء الحرمۃ وفی الھندیۃ: ولا یجوز قبول ھدیۃ امراء الجور لان الغالب فی مالھم الحرمۃ الا اذا علم ان اکثر مالہ حلال بان کان صاحب زرع او تجارۃ فلا بأس بہ لان اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وکذا اکل طعامھم کذا فی الاختیار (ص ۲۲۸ ج ۶) وحملہ علی غیر المخلوط بعید وکیف یقال ان مقتضاہ ان اموال الناس الغیر المخلوطۃ لا تخلو عن قلیل حرام ای والمخلوطۃ تخلو عنہ کلا فان التفسیر بھذا المعنی لا یقبلہ احد، وفیہ ایضاً قال الفقیہ ابو اللیث: اختلف الناس فی اخذ الجائزۃ من السلطان قال بعضھم یجوز ما لم یعلم انہ یعطیہ من حرام قال محمدؒ: وبہ نأخذ ما لم یعرف شیئاً حراماً بعینہ وھو قول ابی حنیفۃؒ واصحابہ کذا فی الظھیریۃ وفیہ ایضاً ولا ینبغی للناس ان یأکلوا من اطعمۃ الظلمۃ لتقبیح الامر علیھم وزجرھم عما یرتکبون وان کان یحل کذا فی الغرائب اھ وفیہ ایضاً لو ان فقیراً یأخذ جائزۃ السلطان

مع علمہ ان السلطان یأخذھا غصباً ایحل لہ قال ان خلط ذلک بدراھم اخری فانہ لا بأس بہ وان دفع عین المغصوب من غیر خلط لم یجز قال الفقیہ وھذا الجواب خرج علی قیاس قول ابی حنیفۃ لان من اصلہ ان الدراھم المغصوبۃ من اناس متی خلط البعض بالبعض فقد ملکھا الغاصب ووجب علیہ مثل ما غصب وقالا لا یملک تلک الدراھم وھی علی ملک صاحبھا فلا یحل لہ الاخذ کذا فی الحاوی اھ (ص ۲۲۸ ج ۶)۔

وحاصل الکلام ان خلط دراھم الغیر بمالہ بحیث لا یمکن التمییز بینھما سبب الملک عند الامام فیملک الغاصب ولا یحل لہ الانتفاع بھا قبل الضمان بالامور الثلثۃ فی روایۃ ویحل قبلہ فی روایۃ والمعتمد فی حق الغاصب الافتاء بالروایۃ الاولیٰ ای لا یجوز لہ الانتفاع بھا قبل الاداء واما فی حق الغیر فینبغی الافتاء لہ بالحل والجواز فی قبول الھدیۃ واکل الطعام والبیع والشراء معہ اذا کان غالب مالہ حلالاً ولم یعرف شیئاً بعینہ حراماً لان اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وفی الافتاء بخلاف ذلک حرج عظیم علی الامۃ والحرج مدفوع والمتورع ماجور واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ۸ ج ۲ سنہ ۴۵ھ

احقر اشرف علی جو ان روایات کے مجموعے سے سمجھا ہے جس سے سب روایات عملاً جمع ہو جاتی ہیں یہ ہے کہ حرام غیر مخلوط تو یقیناً حرام ہے، اور اس میں جہاں حل کا حکم کیا گیا ہے، مراد اس سے حرمتِ خاصہ کی نفی ہے، یعنی جو حرمت بملکِ غیر ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے، اور نفیِ خاص سے نفیِ عام لازم نہیں، اور مخلوط میں یہ تفصیل ہے کہ جہاں خلط یقینی نہ ہو، محض بناء بر عادۃ عامہ مظنون ہو وہاں غالب کا اعتبار ہے، اور جہاں خلط یقینی ہو وہاں خالط کے لئے تو مطلقاً حرام ہے، گو حرام قلیل ہو، اور غیر خالط کے لئے اگر وہ غیر مضطر ہے یعنی بچ سکتا ہے بدون حرج، غلبۂ حلال کے وقت قضاءً حلال اور دیانۃً حرام ہے، اور مضطر کے لئے جو بچنے سے حرج میں داخل ہو جائے غلبۂ حلال کے وقت گنجائش ہے دیانۃً بھی۔

۹ ج ۲ سنہ ۴۵ھ

حکم ادائے زکوٰۃ بصورت سپردگی وکیل

سوال (۶) کیا زکوٰۃ دینے والا جب زکوٰۃ کا روپیہ کسی شخص کو تقسیم کرنے کے واسطے دیدے یا بذریعہ منی آرڈر وغیرہ کے بھیجدے، پھر بھی وہ اس بات کا ذمہ دار رہتا ہے کہ جس شخص کو روپیہ تقسیم کرنے کو دیا ہے وہ اس کو مستحق لوگوں کو دے گا، اور جائز مصرف میں صرف کرے گا؟

الجواب: قاعدہ یہ ہے کہ محض وکیل کو دیدینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، جب تک کہ وکیل اس کو مستحقین میں صَرف نہ کردے، پس اگر وکیل ثقہ، معتبر، دیندار ہے جس پر اطمینان ہے کہ وہ مستحقین ہی میں صرف کرے گا، غیر مستحقین کو نہ دے گا، اس وکیل کو رقم دیکر مؤکل اپنے کو فرض زکوٰۃ سے سبکدوش سمجھ سکتا ہے، ہاں اگر بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وکیل نے مستحقین کو نہیں دیا بلکہ غیر مستحقین کو دیا ہے، اور وکیل بھی دیتے وقت اُن کو غیر مستحق جانتا تھا، تو اس صورت میں مؤکل کو زکوٰۃ دوبارہ دینا پڑے گی، لیکن جب وکیل معتبر دیندار ثقہ ہے تو مؤکل کے ذمہ یہ تحقیق واجب نہیں، ہاں اگر بعد میں خود معلوم ہو جائے کہ وکیل نے بے موقعہ صَرف کیا، تو اب آئندہ اس وکیل کو ثقہ نہ سمجھے اور گذشتہ زکوٰۃ جو اس نے بے موقع صَرف کی ہے دوبارہ ادا کرے، واللہ اعلم۔　۲ر رجب ۴۵ھ

ادائے زکوٰۃ بلفظ قرض اور اس میں رجوع کی ایک صورت کا حکم

سوال (۷) زید نے عمرو سے کہا کہ ہمیں دس روپے قرض دو ہم چند روز میں ادا کر دیں گے، عمرو نے خیال کیا بیچارہ زید غریب ہے، اور مستحق زکوٰۃ ہے مگر غیرت مانع ہو رہی ہے، اس نے دس روپے زکوٰۃ کے دیدیئے، زکوٰۃ کی نیت سے اور بری الذمہ ہو گیا، مگر سوال یہ ہے کہ زید بعد میں اگر دس روپے لاکر عمرو کو دے کہ لو بھائی آپ کے دس روپے، تو عمرو کو لینے جائز ہیں، یا نہیں؟ (جبکہ یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر نہ لوں گا تو زید بگڑے گا، اور کہے گا کہ کیا تم نے ہمیں ایسا گمان کیا تھا، اور کوئی سبیل بھی زید کے سمجھانے کی نہ ہو) اور اگر جائز ہے تو پھر اس دس روپے کو اور کسی غریب مستحق زکوٰۃ کو دینے ضروری ہوں گے یا کہ عمرو کو اپنے کام میں لانے جائز ہیں؟

الجواب: اگر زید نے عمرو کو روپے دیتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ روپیہ قرض مت سمجھنا، بلکہ تمہاری ملک ہیں تم کو ویسے ہی ہبۃً بلا قرض دیتا ہوں (گو یہ نہ کہا ہو کہ زکوٰۃ دیتا ہوں) تب تو زید پر سے زکوٰۃ ساقط ہو گئی، اور اس صورت میں عمرو اگر اس کو دس روپے دے گا تو یہ ہبہ مستانفہ ہوگا، اس کا لینا جائز ہے، مگر خلاف اَولیٰ ہے،

اور لے لینے کے بعد صدقہ کر دینا بہتر ہے احترازاً عن صورۃ العود فی الصدقۃ، اور اگر زید نے عمرو سے اس کے سوالِ قرض کے بعد یہ نہیں کہا کہ یہ روپیہ قرض نہیں بلکہ ہبہ ہیں تو زکوٰۃ بوجہ نیتِ زکوٰۃ کے اس صورت میں بھی ادا ہو گئی، لیکن اس رقم کو عمرو سے واپس لینا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ بالکل عود فی الصدقہ ہے، عمرو اس رقم کو اپنے اوپر قرض سمجھکر واپس کر رہا ہے، اور زید کی نیت قرض دینے کی نہ تھی، تو اب زید کو اس کی واپسی کا کچھ حق نہیں بخلاف صورتِ اُولیٰ کے کہ وہاں عمرو کو بوقتِ عطا، یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ رقم قرض نہیں، پس صورتِ ثانیہ میں اگر زید نے اس رقم کو واپس لے لیا تو لازم ہے کہ اس کو پھر کسی حیلہ سے عمرو ہی کو واپس کر دے، ورنہ ادائے زکوٰۃ میں شبہ رہ گا، قال فی الشامیۃ تحت قول الدر: وشرط صحۃ ادائہا نیۃ مقارنۃ لہ ای للاداء ما نصہ اشار الی انہ لا اعتبار للتسمیۃ فلو سماہا ہبۃً او قرضًا تجزیہ علی الاصح اھ (ص ۱۶ ج ۲)، قلت ای وراعی مع تسمیتہ قرضًا حقیقۃ معنی التصدق بالنیۃ ولم یرجع علی الفقیر اما لو رجع علیہ بما ادی فالحکم عدم جواز الرجوع لاخذہ ملک الغیر وشبہۃ عدم سقوط الزکوٰۃ عنہ لو رجع علی الفقیر، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قال الشامی فی مسئلۃ تصادق الدائن والمدیون علی ان لا دین علیہ یستردہ الدافع ولیس للمدیون ان یأخذہ زیلعی اھ ثم قال ناقلاً عن النہر: ان اطلاق مسئلۃ التصادق محمول علی ما اذا کان الوفاء بغیر امر المدیون اما لو کان بامرہ فینبغی ان یرجع علی المدیون الخ قال وہو ملخص من کلام الفتح لکن قولہ فینبغی ان یرجع علی المدیون لیس فی عبارۃ الفتح وہو سبق قلم لان ہذا اذا لم ینو بالدفع الزکوٰۃ کما قدمناہ والکلام الآن فیما اذا نواہا و حینئذ لا رجوع لہ ای للدافع علی احد لوقوعہ زکوٰۃ اھ (ص ۱۰۰ ج ۲)۔

زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اس مال سے کوئی تجارت نہیں کی ویسا ہی پڑا رہا تو دوسرے سال اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی یا نہیں؟

سوال (۸) زکوٰۃ جس مال کی دیدی گئی ہے اور اس مال سے کوئی تجارت وغیرہ نہیں کی وہ بدستور موجود ہے، تو اب دوسرے سال یا آئندہ اس مال پر کیا پھر زکوٰۃ دی جاوے گی یا نہیں؟

الجواب: جب تک یہ رقم مقدارِ نصاب یا اس سے زائد رہے گی اس وقت تک

ہر سال اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ہاں جب زکوٰۃ ادا کرتے کرتے مقدارِ نصاب سے کم رہ جائے پھر سال پورا ہونے سے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مگر یہ کہ سال پورا ہونے سے پہلے کچھ اور رقم اس میں مل کر نصاب کامل ہو جاوے، تو پھر زکوٰۃ واجب ہوگی، وعلیٰ ہذا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ر ذی الحجہ ۴۴ھ

بذریعہ نوٹ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم

سوال (۹) بدون سیم و زرِ خالص کے نوٹ اور رگلٹ کی اکنی دونی چونی اور تانبہ کے پیسہ سے زکوٰۃ ادا ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ نوٹ مال نہیں ہے بلکہ سندِ مال کی اور محض حوالہ ہے، یعنی سرکار کے جو ذمہ جو قرضہ ہے اس کے وصول کرنیکا، اور زکوٰۃ مال کی تملیک سے ادا ہوتی ہے، بدونِ تملیکِ مال ادا نہیں ہوتی، اور فقط وصولِ قرض کا وکیل بنانے سے وکیل مالک نہیں ہو جاتا، بلکہ جب وصول کرلے اور قبضہ کرلے اس وقت مالک ہوتا ہے، اس لئے نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، لیکن جسکو زکوٰۃ میں نوٹ دیئے گئے ہیں اگر وہ اُن کے بدلے میں کسی سے روپیہ وغیرہ لے لے تو ادا ہو جائے گی، اور اگر اس نے یعنی جس کو زکوٰۃ میں نوٹ دیئے گئے تھے کسی کو قرض یا ادائیگیِ قرض میں نوٹ ہی دیدیئے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، فی تنویر الابصار متن الدر المختار ھی تملیک جزء مال عینہ الشارع الخ اور بعد توکیل بالقبض قبضِ دین سے ادائِ زکوٰۃ کی روایت صفحہ آئندہ میں درج ہے، باقی اکنی دونی وغیرہ سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، کیونکہ زکوٰۃ خلافِ جنس سے ادا کرنا جائز ہے جس چیز پر زکوٰۃ واجب ہے اس کی قیمت کا چالیسواں حصہ ان سکوں سے دیدیا جاوے، کما فی الشامی ص۲ ج۲، تحت قول الدر (والمعتبر وزنہما اداءً ووجوبًا) واجمعوا علی انہ لو ادی من خلاف جنسہ اعتبرت القیمۃ، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۶ر شوال ۴۳ھ

الجواب صحیح، - ظفر احمد عفا عنہ ۱۶ر شوال ۴۳ھ

کیا منی آرڈر کے ذریعہ زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

سوال (۱۰) ڈاکخانہ کے ذریعہ زکوٰۃ کا روپیہ کسی مستحق کے پاس بھیجنے کی صورت میں جو روپیہ ڈاک خانہ میں داخل کیا جاتا ہے، وہ روپیہ مستحق کو نہیں ملتا بلکہ اس کے عوض میں دوسرا روپیہ ملتا ہے تو اس طرح پر زکوٰۃ ادا ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: فی الدر المختار (تملیک الدین ممن لیس علیہ الدین بالملک الا) فی ثلاث حوالۃ ووصیۃ و(اذا سلطہ) ای سلط المملک غیر المدیون (علی قبضہ) ای الدین (فیصح حینئذ ومنہ ما لو وھبت من ابنہا ما علی ابیہ فالمعتمد الصحۃ للتسلیط، وقال الشامی تحت (قولہ علی قبضہ) و حینئذ یصیر وکیلا فی القبض عن الآمر ثم اصیلا فی القبض لنفسہ ومقتضاہ صحۃ عزلہ عن التسلیط قبل القبض واذا قبض بدل الدراھم دنانیر صح لانہ صار الحق للموھوب لہ فملک الاستبدال واذا نوی فی ذلک التصدق بالزکوٰۃ اجزأہ کما فی الاشباہ (شامی ج۲ ص۷۹۵)۔

اس میں تصریح ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کہہ دیا جاوے تو وہ شخص وکیل بالقبض ہو جاتا ہے، اور جب وہ وصول کرے گا تو مؤکل کی طرف سے وکیل اور اپنی طرف سے اصیل ہو کر وصول کرے گا، اور اگر وہ درہم کی جگہ دینار وصول کرلے تب بھی صحیح ہے، پس جب ڈاک خانہ داخل شدہ روپے کو بعینہٖ نہیں پہونچاتا تو وہ اس کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے، اور مرسل الیہ وکیل عن الآمر اور اصیل عن نفسہٖ ہونیکی حیثیت سے اس کو وصول کرتا ہے، تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اور زکوٰۃ کی نیت روانگیِ منی آرڈر کے وقت کرچکا تھا، اس لئے زکوٰۃ ادا ہوگئی، دوبارہ یعنی وقت قبض نیت ادائیگیِ زکوٰۃ کی ضرورت نہیں ہے، (کما ہو مصرح فی قولہ واذا نوی من ذلک التصدق بالزکوٰۃ اجزأہ) واللہ اعلم، البتہ اگر ڈاک خانہ سے مرسل الیہ کو نوٹ وصول ہوئے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، بلکہ ان کے بدلہ میں روپیہ وغیرہ جب کسی سے لے گا تب ادا ہوگی، کما مر فی الجواب عن السوال الاول، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۶ر شوال ۴۳ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۶ر شوال ۴۳ھ

ایک شخص پر کئی سالوں کی زکوٰۃ واجب تھی بعد میں مال ضائع ہو کر وہ مقروض ہو گیا، تو سنینِ گذشتہ کی زکوٰۃ اس پر واجب رہیگی یا نہیں۔

سوال (۱۱) ایک شخص کے ذمہ پر کئی سال کی زکوٰۃ ادا کرنی واجب تھی، اس شخص نے اپنے مال کو جس کی زکوٰۃ واجب تھی تجارت میں لگایا، تجارت میں نقصان ہوا یعنی خسارہ آیا، اور تجارت کے باعث وہ مقروض ہو گیا، تو اس صورت میں اس شخص کے ذمہ سے زکوٰۃ معاف ہوگئی یا واجب رہی؟ بہشتی زیور کے تیسرے حصہ میں زکوٰۃ کے بیان میں اس طرح لکھا ہے، کسی کے مال پر پورا سال گذر گیا، لیکن ابھی زکوٰۃ نہیں نکالی تھی کہ سارا مال چوری ہو گیا، یا اور کسی طرح جاتا رہا، تو زکوٰۃ بھی معاف ہوگئی،

زکوٰۃ کے بیان کے ختم کے دو مسئلوں سے بیشتر یہ مسئلہ ہے۔

الجواب: فی الدر المختار والتوی بعد القرض والاعارۃ واستبدال مال التجارۃ بمال التجارۃ ھلاک ویعتبر مال التجارۃ والسائمۃ بالسائمۃ استھلاک وفی الشامی تحت قولہ (ویعتبر مال التجارۃ الخ) تتمہ وحکم النقود مثل مال التجارۃ ففی الفتح رجل لہ الف حال حولھا فاشتری بھا عبدًا للتجارۃ فمات اوعروضًا للتجارۃ فھلک بطلت عنہ زکوٰۃ الالف ولو کان العبد للخدمۃ لم تسقط بموتہ وتمامہ فیہ (ص ۳۳ ج ۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں (یعنی جبکہ ایسے مال کو تجارت میں لگایا جس میں زکوٰۃ واجب تھی، اور اس تجارت میں خسارہ ہوا تو) زکوٰۃ ساقط ہوگئی، البتہ اگر تجارت میں بیع وشراء غبن فاحش کے ساتھ کی ہو تو غبن کی مقدار ساقط نہ ہوگی، کما فی الشامی (صفحہ مذکورہ) عن البدائع وان حابی بما لایتغابن فیہ ضمن قدر زکوٰۃ المحاباۃ الخ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، ۲۶ رجب ۴۴ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۹ رجب ۴۴ھ

ایک شخص اللہ واسطے محتاج کو ماہانہ رقم دیتا ہے شعبان اور رمضان کے مہینہ میں، اگر زکوٰۃ کی نیت سے رقم دیدے تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں

سوال (۱۲) ایک محتاج شخص کو عمرو پانچ روپیہ ماہوار بلا کسی محنت واحسان کے للہ دیا کرتا ہے، عمرو پر دس روپیہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ماہِ شعبان ورمضان شریف میں پانچ روپے دیتے وقت ادائیگی زکوٰۃ کی نیت کرلیتا ہے، کیا اس صورت سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؟

الجواب: ہاں زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، زکوٰۃ دینے کے لئے یہ زبان سے کہنا ضروری نہیں، کہ یہ رقم زکوٰۃ کی ہے، واللہ اعلم، ۱۱ شعبان ۴۵ھ۔

نوٹ سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم

سوال (۱۳) ۱ زکوٰۃ یا عشر ادا کرنے کے لئے نوٹ اگر فقیر کو دیا جائے تو زکوٰۃ یا عشر ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

۲، اگر نوٹ زکوٰۃ میں دینا جائز نہیں تو جولاعلمی کی وجہ سے زکوٰۃ میں نوٹ دئیے جاچکے ہیں جن کی تعداد بھی معلوم اور یاد نہیں اس کا کیا حکم ہے؟ وہ زکوٰۃ یا عشر ادا ہوا یا نہیں؟

الجواب: اصل یہ ہے کہ نوٹ خود مال نہیں ہے، بلکہ سند مال ہے، اس لئے اس کے دینے سے زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک فقیر اس کو بھنا کر اس کی رقم پر

قبضہ نہ کرے یا اس سے کوئی شے خرید کر اس شے پر قبضہ نہ کرلے، اگر اس نوٹ کو بھنا کر روپیہ پر قبضہ نہ کیا اور نہ اس سے کوئی شے خرید کر قبضہ میں کی بلکہ بعینہٖ وہی نوٹ کسی کو اپنے قرضہ میں دیدیا یا نوٹ اس کے پاس سے گم ہوگیا، یا وہ اس نے کسی کو ہبہ کردیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی کیونکہ فقیر کے قبضہ میں مال نہیں پہنچا۔

۲۔ گزشتہ کے متعلق دو صورتیں ہیں، ایک تو تحقیق: کہ جس قدر بدون تعب شدید کے تحقیق ہوسکے، دریافت کرکے معلوم کیا جائے کہ جن لوگوں کو زکوٰۃ میں نوٹ دیا گیا تھا انھوں نے اس کو کس طرح صرف کیا، دوسرے تحری کہ جس مقدار کے متعلق تحقیق دشوار ہو اس کے متعلق یہ سوچا جائے کہ عادۃً اتنے آدمیوں میں جن کو ہم نے نوٹ دیئے ہیں ایسے آدمی کتنے ہوں گے جنھوں نے نوٹ کو ہم سے لیتے ہی اپنے قرضہ میں دیدیا ہوگا، یا ضائع کردیا ہوگا، یا کسی کو ہبہ کردیا ہوگا، اس کو سوچا جائے، اندازہ سے اگر کوئی مقدار ذہن میں آئے تو جو مقدار راجح اور غالب ہو اس کے موافق زکوٰۃ کا اعادہ کردیا جائے، اور اس اندازہ میں دو چار احباب سے امداد لینے کا مضائقہ نہیں، واللہ اعلم، ۱۲ رمضان شریف ۴۵ھ

حکم زکوٰۃ بر منافع کارخانہ

سوال (۱۴) میرے یہاں جو کارخانہ ہے اس میں ہڈی کی پسائی ہوتی ہے، اور چکی سے آٹا پیسا جاتا ہے، ہڈی کی فروختگی پر اور چکی کی پسائی پر زکوٰۃ پوری قیمت ہڈی اور پوری قیمت چکی کی پسائی پر ہوگی یا قیمتِ خرید ہڈی اور خرچ تیل اور تنخواہ ملازمان غرضکہ کل اخراجات مجریٰ ہوکر منافع پر ہوگی؟ جواب سے مطلع فرمایا جائے، خاکسار حسین علی خان

الجواب: ہڈی کی فروختگی پر زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ ختم سال سے پہلے واجب نہیں ہوتی، حولانِ حول (سال تمام) ہونے پر واجب ہوتی ہے، پس سال تمام ہونے کے بعد دیکھا جائے کہ اس وقت کتنا مال موجود ہے، اور کتنی رقم موجود اور کتنے لوگوں کے ذمہ چڑھی ہوئی ہے، پس ختم سال پر جتنی ہڈی موجود ہو اور جتنی رقم باقی ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اس کا چالیسواں حصہ نکال دیا جاوے، اور درمیان سال میں جتنی رقم تنخواہِ ملازمان اور صرفہ تیل وغیرہ میں خرچ ہوچکی یا جو اپنی ذاتی ضروریات میں صرف ہوئی یا قرضہ میں دی گئی اس پر زکوٰۃ نہیں، زکوٰۃ صرف اس سرمایہ پر ہے جو اس دن موجود ہو جس دن سال ختم ہوا، اور اس کے ساتھ وہ رقم بھی ملائی جائے گی جو کارخانہ کے منافع سے جمع ہوا یا خریداروں کے ذمہ قرض ہو، اور پسائی آٹا میں چونکہ اناج وغلہ

دوسروں کا ہوتا ہے، اپنا سرمایہ نہیں ہوتا، اس میں زکوٰۃ کی صورت یہ ہے کہ ختم سال پر پسائی آٹا کی جو رقم موجود ہو یا پسوانے والوں کے ذمہ ہو اُس کا چالیسواں حصہ نکال دیا جائے اور جو رقم خرچ ہو گئی اس پر زکوٰۃ نہیں۔

یہ جواب حضرت مولانا کا فرمودہ ہے، والسّلام۔ ۱۷ ر رجب سنہ ۴۶ھ

امانتِ زکوٰۃ بطور قرض دینے کا حکم

سوال (۱۵) زید کے پاس بکر کے زکوٰۃ کے روپے ہیں، اور اس کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا وکیل بنایا ہے، چنانچہ حسبِ موقع و محل اُس زکوٰۃ کی امانت کو فقراء و مساکین پر تقسیم کرتا ہے، اور کبھی کوئی حاجت مند اگر قرض مانگتا ہے تو قرض کی نیت سے اس کو دیدیتا ہے، اور واپسی پر پھر اس روپیہ کو زکوٰۃ کے مد میں رکھ دیتا ہے، اور اس قرض کے ثواب کو بھی بکر کو بخش دیتا ہے، چونکہ زید کو معلوم ہے کہ بکر میرے اس تصرف کو بخوشی اجازت دیدے گا، اس لئے ایسا کرتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ تصرفِ اقراض زکوٰۃ کے روپے میں جائز ہے یا نہیں، یا صریحی اجازت کی ضرورت ہوگی؟ ایسے تصرّف کے بعد تدارک کی کیا صورت ہوگی، آیا بکر کو اطلاع دینا کافی ہوگا؟

الجواب: زکوٰۃ کی رقم کو بمدِ قرض استعمال کرنا چونکہ غرض معطی کے خلاف ہے اس لئے اس کا ایک ثمرہ تو یہ ہوگا کہ درصورتِ ضیاعِ رقم کے وکیل قرض دینے کی صورت میں اس رقم کا ضامن ہوگا، اور اگر وہ قرض نہ دیتا بلکہ اس رقم کو بجنسہٖ محفوظ رکھتا تو ضامن نہ ہوتا، دوسرے اس میں احتیاط کے بھی خلاف ہے، کہ بدون صریح اجازت مؤکّل کے اس کے خلاف تصرّف کیا جائے، پس لازم ہے کہ وکیل ماضی و مستقبل دونوں کے متعلق مؤکّل کو اطلاع کرے، اور اجازت حاصل کرے، اور جب بکر کو معلوم ہے کہ زید اُس کے اس تصرّف کو بخوشی قبول کرے گا تو اطلاع کرنے میں کیا حرج ہے، واللہ اعلم، ۱۲ر شعبان سنہ ۴۶ھ

ختم سال پر جتنی رقم ہو سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی

سوال (۱۶) بندہ صاحبِ نصاب تمام سال رہا، اور بندہ زکوٰۃ کا حساب ہر سال ۲۸ر شعبان کو کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ بندہ نے اپنی زمین اجارہ پر ۸ر ذیقعدہ میں بعوض مبلغ ۵۰۰ پانچسو روپے دی اور یہ وعدہ جانبین سے ہوا کہ فصل کٹنے کے بعد یعنی آئندہ ذیقعدہ میں مبلغ ۵۰۰ روپے دوں گا، کیونکہ ہمارے یہاں اسی طرح اجارہ پر دیتے ہیں، اس مدت سے قبل نہ میں مانگ سکتا ہوں نہ وہ دیتا ہے اب جبکہ بندہ ۲۸ر شعبان کو زکوٰۃ کا حساب کرے گا، تو جس قدر روپیہ زیور ہوں گے اس کے

ساتھ اجارہ کی اجرت کے روپے پانچ سو کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: ختم سال پر زکوٰۃ اسی رقم کی واجب ہوتی ہے جو ختمِ سال پر اُس شخص کے پاس ہو، اور دین قوی پر زکوٰۃ واجب ہے، مگر بعد وصول کم از کم چالیس درہم کے ادا واجب ہوتی ہے، اور دین مؤجل جس کی اجل ختمِ سال سے متجاوز ہو اس کے مطالبہ کا قبل از اجل حق نہیں، نہ اُس پر قبضہ ہے، اس لئے وہ اس رقم کے ساتھ شمار کرنا واجب نہیں، جس کی زکوٰۃ ختمِ سال پر واجب الاداء ہے، لیکن اس رقم کی زکوٰۃ بھی قبل از وصول دیدی جاوے تو ادا ہو جائے گی، اور اسی میں سہولت ہے، ورنہ بعد وصول کے ادا کرنا واجب ہے۔

۲۰ ر رمضان المبارک سنہ ۲۶ھ

دَینِ محیط مانعِ وجوب زکوٰۃ ہے

سوال (۱۷) میری جائداد تقریباً ڈیڑھ ہزار کی ہے، اس پر بارہ سو روپے قرضہ ہے، اور جائداد میں اپنی دخلی رہن کر چکا ہوں، اس کا منافع مجھے کچھ نہیں ملتا، اور سود بھی دینا نہیں پڑتا، میرے پاس تقریباً چار سو ساڑھے چار سو روپیہ کا زیور طلائی و نقرئی ہے، ایسی صورت میں مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں قرض کی وجہ سے زیور پر زکوٰۃ واجب نہیں، قال فی الدر مع الشامیۃ یصرف الدین اولا الی مال الزکوٰۃ لا الی غیرہ ولو من جنس الدین خلافاً لزفرؒ اھ واللہ اعلم، ۲۵ر شوال سنہ ۴۶ھ

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال (۱۸) زید محکمۂ تعلیم میں ملازم ہے، اس کے ایک نابالغ لڑکی ہے، جس کی ماں مر چکی ہے، زید نے مرتے وقت لڑکی کی ماں سے مہر معاف نہ کرایا تھا، بعد میں حساب کر کے جملہ حقداروں کو مہر دیا گیا، چونکہ لڑکی کے حصہ کا مہر زیادہ تھا اور زید کی طاقت سے باہر تھا، کہ ایک دم سے ادا کر سکے، لہٰذا اس نے ایک ماہوار رقم کے ذریعہ سے ادا کرنے کا ارادہ کیا، پھر یہ خیال کر کے کہ روپے کی کافی حفاظت نہ ہو سکے گی اس نے اپنی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کٹوانا شروع کر دیا، یعنی وہ ماہوار رقم جو سرکار ہر ماہ میں تنخواہ سے کاٹ لیتی ہے، اور اس پر سود دیتی ہے، اور سرکار میں لکھ دیا کہ اگر زید کی موت واقع ہو جائے تو یہ کل رقم جو جمع ہو زید کی لڑکی کو دی جائے، اور اگر لڑکی اُس وقت بھی نابالغ ہو تو ولی کے ذریعہ سے دی جاوے، چنانچہ اب وہ رقم ماہ بماہ جمع ہوتے ہوتے ایک خاصی تعداد میں ہو چکی ہے، مگر ابھی بہت دنوں تک اسی طرح

جمع ہونا چاہئے، تین سال سے یہ رقم جمع ہو رہی ہے، اور سود اور اصل دونوں مل کر اس میں ماہ بماہ اضافہ ہو رہا ہے، اب تک کچھ خیال نہ کیا گیا، مگر اب یکایک خیال آیا کہ زکوٰۃ نہیں دی گئی، لہٰذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہے یا نہیں، اور یہ کہ اصل ہی پر زکوٰۃ ہوگی یا سود اور اصل دونوں پر، اگر زکوٰۃ واجب ہو تو اس کا طریقہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ آئندہ جو رقم ماہوار جمع ہوئی ہے اس میں سے زکوٰۃ بھرے کا روپیہ نکال کر زکوٰۃ ادا کر دی جائے اور بقیہ جمع کر دیا جائے، کیونکہ جو روپیہ جمع ہو چکا ہے اس میں سے واپس ملنا فی الحال بہت مشکل ہے، یا اگر کوئی اور طریقہ ادائیگی کا ہو تو اس سے مطلع کیا جائے، زید یہ بھی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اصل روپیہ جمع ہو رہا ہے اُتنا ہی مہر کے قرضہ سے وضع ہو رہا ہے، باقی جو سود ملتا ہے وہ نابالغہ کے مال پر ہے، اور مہر کے قرضہ میں وضع نہیں ہو سکتا، کیا زید کا یہ خیال صحیح ہے، جواب باصواب سے مطلع فرمایا جاوے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں یہ رقم ابھی زید کی ملک میں نہیں آئی، اس لئے ابھی ادائے زکوٰۃ واجب نہیں، ہاں یہ رقم چونکہ گورنمنٹ کے ذمّہ دَین ہے، اور یہ دَین ضعیف ہے اس لئے ادائے زکوٰۃ بعد قبضِ مال و حولانِ حَول کے واجب ہوگا، ہاں اگر مال پر زید نے اپنی زندگی ہی میں قبضہ کر لیا اور وقت قبضہ کے اس کے پاس پہلے سے نصاب موجود ہو تو اس کے ساتھ ملا کر سب کی زکوٰۃ دیدے، یعنی جس وقت نصاب سابق کا سال پورا ہو اسی وقت اس رقم کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اور اگر زندگی میں قبضہ نہ ہوا تو زید کے ذمہ اس کے متعلق وصیت کرنا لازم نہیں اور نہ وارث کے ذمہ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ہے،

قال الشامی مقتضی ما مرّ من ان الدین القوی والمتوسط لا یجب اداء زکوٰته الّا بعد القبض انّ المورث لو مات بعد سنین قبل قبضه لا یلزمه الایصاء باخراج الزکوٰة عند قبضه لانه لم یجب علیه الاداء فی حیاته (ای فکان کما اذا مات قبل الحول ۱۲) ولا علی المورث ایضا لانّه لا یملکه الّا بعد موت مورثه فابتداء حوله من وقت الموت وفیه ایضًا عن المحیط ان اجرة دار التجارة او عبد التجارة علی الرّوایة الاولیٰ من الدّین الضعیف (لانّ المنفعة لیست بمال حقیقة فصار کالمهر) وعلیٰ ظاهر الرّوایة من المتوسط (لانّ المنافع مال حقیقة لکنها لیست بمحل لوجوب الزکوٰة لانّها لا تصلح

نصابًا اذ لا تبقی سنة) ووقع فی البحر عن الفتح انه کالقوی فی صحیح الروایة ثم رأیت فی الوالوالجیة التصریح بان فیه ثلاث روایات اھ (ص ۵، ج ۲، ۲۳)۔

قلت: وهذا انّما هو فی اجرة دار التّجارة وعبد التجارة واما اجرة الحرّ فینبغی ان تکون کالمهر بلا خلاف لانّ منافع الحرّ لیست بمالٍ حقیقة وعلیٰ هذا فهی من الضعیف لا تجب فیه الاداء الا بعد القبض وحولان الحول ....

واللّٰہ اعلم۔

تتمّہ: اور اس رقم میں جو بطور فنڈ کے وضع کرائی گئی ہے بعد وصول کے صرف اصل تنخواہ پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سود کی رقم کو بتمامہ صدقہ کر دیا جاوے، اور یہ تصدق زید پر واجب ہے، لڑکی پر واجب نہیں، جبکہ اس کے قرض میں اصل اور سود کو ملا کر دیا جائے، فقط۔ ۴ ر ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

نابالغ کے نکاح میں والدین نے زوجہ کو زیور چڑھایا، بلوغ کے دس بارہ سال بعد والدین نے کہا کہ زیور ہم تمھیں ہبہ کر چکے ہیں تو اس پر زکوٰۃ کب سے واجب ہوگی، زمانۂ بلوغ سے یا علم بالہبہ سے

سوال (۱۹) زید نابالغ کا نکاح ہوا، اس کے والدین نے بیوی کو زیور چڑھایا، بعدہٗ زید بالغ ہوا اور بلوغت سے دس بارہ سال کے بعد والدین سے یہ کہا کہ میں علیحدہ ہوتا ہوں، اور یہ زیور جو تم نے میری زوجہ کو دیا تھا واپس لیلو، والدین نے کہا کہ یہ زیور تو ہم تمہیں ہبہ کر چکے ہیں، چڑھانے کے ہی وقت سے، مگر زید کو اس ہبہ کا علم نہ تھا، صورتِ ہٰذا میں زید پر زکوٰۃ اس وقت سے ہے کہ جب سے اُسے ہبہ کا علم ہوا ہے، یا اُس وقت سے جبکہ والدین نے زیور چڑھایا ہے، اور بے علمی کے زمانے کی قربانی کی قضا ہے یا نہیں، زید کے والدین اپنے مال سے کبھی کبھی زید کی طرف سے قربانی کرتے تھے، اگر زید پر قربانی واجب ہوئی ہو تو یہ قربانی جو والدین زید کی طرف سے کرتے تھے زید کی قضا، قربانی میں مجری ہو سکتی ہے یا نہیں، اگر قربانی واجب ہوئی تو ہر سال کتنے دام نکلنے چاہئیں؟

الجواب: زید پر اس زیور کی زکوٰۃ وقت بلوغ سے ہے، زمانۂ قبل بلوغ کی زکوٰۃ واجب نہیں، اور وہ بھی اس شرط پر واجب ہے کہ زید والدین کے قول کو سچا سمجھتا ہو اور اگر گمان غالب یہ ہو کہ اس وقت انھوں نے مجھے شرما کر یا اور کسی وجہ سے یہ بات کہدی ہے تو زید پر اس زیور کی زکوٰۃ اُس وقت سے واجب ہے جس وقت سے اس کو ہبہ کا علم ہوا،

خدا سے معاملہ ہے، اس لئے زید بلا وجہ والدین پر بدگمانی نہ کرے، ہاں اگر واقعی کسی وجہ سے گمان غالب ان کے قول کے خلاف ہو جاوے تو گمان غالب پر عمل کرنا جائز ہے، اور یہی حکم تفصیل کے ساتھ قربانی کا ہے، اور قربانی کی قضا متوسط بکری کی قیمت صدقہ کرنے سے ہوتی ہے، ہمارے یہاں تو پانچ چھ روپے متوسط بکری کی قیمت ہے، زید اپنے یہاں کا نرخ بھی دیکھ لے، اگر اس کے یہاں اس سے کم یا زائد ہو تو اسی جگہ کا نرخ معتبر ہے، پس ہر سال کی طرف سے ایک متوسط بکری کی قیمت مساکین وغربا کو صدقہ کردی جائے، اور صدقہ میں اپنے خاندان کے غربا کو مقدم کرنا چاہئے، نانا، نانی، دادا دادی، باپ، ماں، اولاد، میاں بیوی کے سوا اور سب قرابت داروں کو زکوٰۃ وغیرہ دینا جائز ہے، واللہ اعلم، ۶ر رمضان ۴۷ھ

موٹر اگر تجارت کے لئے نہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں، البتہ اس سے حاصل شدہ کرایہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی

سوال (۲۰) زید کے پاس تعدادی چار ہزار روپیہ نقد ہے، جس میں سے اس نے دو ہزار دے کر مبلغ چار ہزار روپے کا موٹر کرایہ پر چلانے کے واسطے خرید کیا، اور کمپنی کا دو ہزار روپیہ اس پر قرض رہا، خریدنے کے بعد پانچ مہینہ موٹر چلا اور بذریعہ کرایہ مبلغ پانچ سو روپیہ وصول ہوا، اب زید کا زکوٰۃ نکالنے کا سال پورا ہو گیا، اور حال یہ ہے کہ زید دو ہزار روپے موٹر کی قیمت میں دے چکا ہے اور دو ہزار نقد پاس موجود ہیں، مگر دو ہی ہزار کا کمپنی کا قرضدار ہے، اور مبلغ پانچسو روپے منافع موٹر کا موجود ہے، تو اب کمپنی کے قرض کو جدا کر کے صرف پانچسو روپیہ جو منافع موٹر کے ہیں اُن کی زکوٰۃ ادا کرے، یا دو ہزار جو گھر میں ہیں اُن کو بھی ملا کر زکوٰۃ دے، یا اُس منافع اور اُن دو ہزار کو جو گھر میں ہیں اور ان دو ہزار کو جو قیمت موٹر میں دے چکا کُل ساڑھے چار ہزار کی زکوٰۃ نکالے، ہر سہ صورت میں کون صورت اختیار کرے، اور یہ موٹر مالِ تجارت مانا جائے گا یا آلہ تجارت؟ بینوا توجروا، فقط

الجواب: زید کے ذمہ صرف پانچسو روپے کی زکوٰۃ واجب ہے، جو منافع میں وصول ہوئے، موٹر پر، اور دو ہزار جمع پر زکوٰۃ واجب نہیں، یہ موٹر مالِ تجارت نہیں بلکہ مثل مکان کرایہ کے ہے، ولا زکوٰۃ فیہ الا فی المنافع، اور دو ہزار جمع فاضل عن الدین نہیں، فلا زکوٰۃ فیہ ایضاً، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۳ر رمضان ۴۷ھ

بیوی صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ وقربانی اسی پر واجب ہوگی، شوہر پر واجب نہیں اور یہ کہ بیوی کو شوہر کی خدمت کا معاوضہ لینا جائز نہیں

سوال (۲۱) کسی عورت کو مہر کے عوض سو تولے

چاندی یا سونے کے زیورات ملے، اس کے سوا اور کچھ مال اس کے پاس نہیں، اب اس پر زکوٰۃ وقربانی واجب ہے تو کیونکر ادا کرے، کیا زیورات بیچ کر دے گی یا اس کے شوہر کو اپنی بیوی کی طرف سے ادا کرنا لازم ہوگا، کیونکہ عورت مرد کے لئے ایک نوکرنی کا کام بھی انجام دیتی ہے، لیکن اجرت کے لئے کوئی عقد نہیں، یوں ہی شوہر کی رضا جوئی کے لئے اپنی غیر متعلق کام تک کو بھی انجام دیتی ہے، اس صورت میں اگر شوہر اپنی بیوی کی طرف سے زکوٰۃ یا قربانی نہ دے تو مواخذہ عورت پر ہوگا یا مرد پر؟

الجواب: زکوٰۃ وقربانی عورت پر واجب ہے، اس کی طرف سے مرد پر ادا کرنا واجب نہیں، اور عورت کو شوہر سے اپنی خدمت کا معاوضہ لینا بھی جائز نہیں، کیونکہ خدمتِ زوج طاعت ہے اور طاعت کی اجرت لینا حرام ہے، الا ما استثناہ الفقہاء للضرورۃ البتہ عورت اپنے مہر کا زوج سے مطالبہ کرسکتی ہے، اگر مرد مہر بھی نہ دے تو عورت زیور بیچ کر زکوٰۃ وقربانی ادا کرے، فقط۔ ۲۹ ربیع الآخر ۴۸ھ

زکوٰۃ یکمشت کے بجائے سال بھر میں تھوڑی تھوڑی ادا کرنا

سوال (۲۲) زید صاحبِ نصاب ہے، اور بجائے سال تمام پر حساب کر کے کُل رقم زکوٰۃ یکمشت ادا کرنے کے دورانِ سال میں اپنی سہولت کے لئے وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی رقم علی الحساب شروع سال سے ادا کرتا رہتا ہے، ختم سال پر حساب سے اگر کمی رہتی ہے تو اس کو پورا کر دیتا ہے، اور اگر زیادتی ہو جاتی ہے تو اس کو آئندہ سال کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں درج کر لیتا ہے، اور ختم سال پر حساب کے وقت اس پچھلی زیادتی کو اس سال کی ادائیگی میں شمار کر لیتا ہے، اسی طرح آئندہ بھی، دریافت طلب یہ ہے کہ یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں اور زکوٰۃ ادا ہوتی یا نہیں؟

الجواب: یہ صورت بھی جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ سال تمام پر اس سال کی کُل زائد زکوٰۃ ادا کر دی جائے، کیونکہ موت وحیات کا اعتبار نہیں، اگر مرضِ موت میں مبتلا ہو گیا تو وہ رقم جو زکوٰۃ کے لئے الگ رکھی ہے ورثہ کی مِلک ہو جائے گی، پھر وہ کیا خبر دیں یا نہ دیں۔ ۲۰ر جمادی الاول ۴۸ھ

بذریعہ منی آرڈر زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں

سوال (۲۳) زکوٰۃ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے، کہ ڈاک خانہ اس کا پابند نہیں ہے کہ وہاں روپیہ ہی ادا کرے بلکہ اکثر نوٹ ہی ادا کئے جاتے ہیں، اور نوٹ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اگر قواعد فقہیہ سے

قطع نظر کر کے منشاء شارع پر نظر کی جائے تو نوٹ سے زکوٰۃ علیٰ وجہ الکمال ادا ہونا چاہئے، ایک تو اس لئے کہ نوٹ میں بھی اغناءِ مساکین حاصل ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے یہ روپیہ سے بھی انفع ہے، روپیہ میں تو کھرا کھوٹا بھی ہے، اور پھر کھرے میں آواز بے آواز اور آواز دار میں گھسا اور بے گھسا بھی دیکھا جاتا ہے، اور نوٹ پھٹا چٹا میلا کچیلا ہر طرح کا آسانی سے چل جاتا ہے، پھر جس شخص نے نوٹ ہی پائے ہوں، یا حولانِ حول کے وقت اُس کے پاس نوٹ ہی ہوں تو وہ اور بھی زیادہ اس کا مستحق ہے کہ نوٹوں میں سے نوٹ ہی زکوٰۃ میں دیدے۔

الجواب من حضرت حکیم الامت مد فیوضہم: نص کے ہوتے ہوئے ہم لوگوں کا قیاس کافی نہیں، اور پھر قیاس بھی حقیقی قیاس نہیں، جس میں علتِ جامعہ سے حکم متعدی ہوتا ہے، یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حکمت ہے، اور حکمت سے حکم کا تعدیہ نہیں ہوتا، وجہ یہ کہ حکمت حکم پر مرتب ہوتی ہے، اور علت پر حکم مرتب ہوتا ہے، سو اوّل حکم کا تحقق ہونا چاہئے، اس میں حکمتیں نکالی جاسکتی ہیں، اور حکم ہے زکوٰۃ کا، اور زکوٰۃ کا محل مال ہے اور نوٹ مال نہیں سندِ مال ہے، اور منی آرڈر سے ادا ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ کسی اور شخص کے پاس بھیجدے کہ وہ اُس کے روپے بھُنا کر مسکین کو دیدے، فقط۔

اس کے بعد اُن کا دوسرا خط آیا جس کا جواب جامع امداد الاحکام نے تحریر فرمایا جو مع جواب کے ذیل میں مذکور ہے:۔

خط

دراصل ابتلائے عام کی وجہ سے حیلہ کی ضرورت ہے، بذریعہ منی آرڈر دوسرے کے نام سے بھیجنے میں اوّل تو مسکین کی دل شکنی اور اس دوسرے شخص کی بددیانتی کا احتمال ہے، سوائے اس کے کہ روپے کا پارسل کیا جائے، دوسرے اگر زکوٰۃ اس طرح ادا ہوسکتی ہے کہ زید نے ایک رقعہ عمر کو لکھدیا کہ حامل ہذا کو اتنا روپیہ ہمارے حساب میں دیدیا جاوے، اور اسے یہ ہدایت کی کہ تم ہمارے جس ایجنٹ یا وکیل یا نمائندہ کو چاہو یہ رقعہ دکھلا کے اتنے روپے لے لینا اور زید نے اپنی جگہ پر یہ نیت کرلی کہ جو کچھ دلا رہا ہوں یہ زکوٰۃ ہے، اگر اس طرح زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے تو پھر نوٹ بھی اسی طرح کی سندِ حوالہ ہے، اب اسی نوٹ سے وہ مسکین جو روپیہ وصول کرے وہ زکوٰۃ ہے یا جو دوسری اشیاء حاصل کریں وہ بھی زکوٰۃ ہیں، یہ نوٹ خود زکوٰۃ نہیں؟

الجواب من جامع امداد الاحکام: آپ نے جو صورت بیان کی ہے اس میں بھی محض رقعہ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، جب تک وہ شخص کسی ایجنٹ سے روپیہ وصول نہ کرے، اور اگر ایجنٹ نے اس کو روپے نہ دیئے، بلکہ کاغذ ہی دیدیا کہ فلاں سے لے لو جب بھی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، جب تک وہ روپیہ وصول نہ کرے، اور اگر فقیر نے تاجر کا رقعہ کسی کو اپنے قرض میں دیدیا کہ تم فلاں ایجنٹ سے اپنا قرض یہ رقعہ دکھلا کر وصول کرلو تو زکوٰۃ بالکل ادا نہ ہوگی، پس یہ صورت مسئلہ نوٹ کے خلاف حکم نہیں رکھتی، بلکہ جو احکام اس کے ہیں وہی اس کے ہیں، اور نوٹ سے زکوٰۃ کا ادا نہ ہونا صرف اس صورت میں ہے جبکہ فقیر بعینہ اس نوٹ کو اپنے قرض میں دیدے یا ہبہ کردے، یا اس سے چوری ہوجائے یا چھوڑ کر مرجائے، اور اگر اس کے روپے وصول کرکے اپنے قبضہ میں لائے یا اس سے سودا خرید کر اپنی ملک میں لے آئے، تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، پس دشواری کچھ نہیں، صرف اتنی ضرورت ہے کہ مرسل الیہ کو کوپن میں تنبیہ کردی جائے کہ پوسٹ مین سے نوٹ نہ لے، اور اگر لے تو نوٹ کو بعینہ اپنے قرض وغیرہ میں نہ دے، بلکہ روپیہ حاصل کرکے قرض ادا کرے، یا جمع رکھے۔

سوال (۲۴) یہ امر دریافت طلب ہے کہ دورانِ سال میں وقتاً فوقتاً زکوٰۃ تقسیم کی جاتی ہے، اور سال تمام پر حساب پورا کردیا جاتا ہے، اگر زکوٰۃ امسال مقدارِ فرض سے زائد تقسیم ہوجائے تو اس زائد رقم تقسیم شدہ کو آئندہ سال کی زکوٰۃ میں مجریٰ و محسوب کردیا جائے یا نہیں؟

> مقدار فرض سے زائد زکوٰۃ ادا کی تو وہ آئندہ سال زکوٰۃ میں محسوب ہوسکتی ہے یا نہیں

الجواب: مقدار واجب سے زائد جو رقم زکوٰۃ میں دی گئی ہے وہ آئندہ سال کی زکوٰۃ میں محسوب ہوسکتی ہے، کما فی الشامی ص ۴۲ ج ۲: وفی الولوالجیۃ: لو کان عندہ اربعمائۃ درھم فادّی زکوٰۃ خمسمائۃ ظاناً انھا کذلک کان لہ ان یحسب الزیادۃ للسنۃ الثانیۃ لانہ امکن ان تجعل الزیادۃ تعجیلاً۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۴ / صفر ۱۳۴۵ھ۔ الجواب صحیح ظفر احمد ۲۵ / صفر ۱۳۴۵ھ۔

سوال (۲۵) صاحب زکوٰۃ فریضہ کس کو کہتے ہیں، اور اس پر کب زکوٰۃ کا حکم دیا جائے گا، کہتے ہیں کہ اگر اس کے پاس دو سو درہم ہوں تو اس کو

> نصاب زکوٰۃ کی تحقیق

نصاب کہتے ہیں اور اس پر پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے، لیکن یہ یقینی نہیں معلوم ہوا کہ درہم کی کیا قیمت ہے، پھر بعض علماء سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۹ یا ۴۰ یا ۵۰ یا ۵۲ ہو یا اس قدر کی چاندی ہو تو صاحبِ نصاب ہے، اور پھر ایک روپیہ چار آنہ زکوٰۃ واجب ہے، سکہ مروجہ سے ایک روپیہ[عہ] چار آنہ ہے، اور درہموں سے پانچ درہم، نہ معلوم درہم سکہ مروجہ انگریزی سے کتنے بھر ہوتا ہے، اور اختلاف مابین علمائے کرام میں کیوں ہے، صحیح قول بالآخر مفتٰی بہ کون ہے، حساب سے الگ الگ کر کے صورت بتلائی جائے، جو کہ ذہن نشین علی الفور ہو، ایسا ہی سونے کے بارے میں جب دریافت کیا جاتا ہے، کہ سونے پر کس قدر زکوٰۃ واجب ہے؟ تو جواب دیا جاتا ہے کہ بیس مثقال سونے پر نصف مثقال، پھر عدم فہم پر فرماتے ہیں کہ سات مثقال دس درہم کا ہوتا ہے، بلکہ دوسری جگہ ہے کہ فی کل اربعۃ مثاقیل قیراطان، لہٰذا دونوں شقوں کو لکھ دیا جائے کہ پہلی صورت سے کیا مراد ہے؟ اور ثانی سے کیا، وجہ اختلاف کیا ہے؟ حساب کی صورت میں ملا کر تحریر فرمائیے کہ بیس مثقال انگریزی تول کے حساب سے کس قدر ہوگا اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بیس مثقال ساڑھے سات تولہ کا وزن ہوتا ہے، اور اس میں ۲ ماشہ[عہ] اڑھائی رتی زکوٰۃ نکلتا ہے یہ کس حساب کی بناء پر ہے، خلاصۂ حساب صحیح صحیح تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرمایا جائے، نیز یہ بھی تحریر کیجئے کہ جتنا وزن زکوٰۃ کا سونا نکلے بعینہ وہی سونا مخرجہ زکوٰۃ دیا جائے یا اس کی قیمت دی جائے؟ مدلل اور مصرح جواب تحریر فرمایا جائے؟ بینوا بالدلیل وتوجروا عند اللہ الاجر الجزیل من جناب رب الجلیل۔

الجواب: حساب مذکورۂ بالا کی رُو سے صاحبِ مظاہر حق وغیرہ علمائے کرام کے نزدیک چاندی کا نصاب باون تولہ چھ ماشہ ہے، ہمارے اکابر اسی پر فتویٰ دیتے ہیں، دوسرے اقوال کی بناء وہی اختلاف فی الوزن ہے۔

نوٹ (۱):۔ سونے چاندی میں وزن کا اعتبار ہے، قیمت معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہے، البتہ وزن کے اعتبار سے حساب کر کے پھر اس کی قیمت وقتیہ ادا کردے تو یہ جائز ہے۔

نوٹ (۲):۔ قولِ فقہاء (فی کل اربعۃ مثاقیل قیراطان) محض تمثیل کے طور پر ہے،

عہ صحیح حساب سے ایک روپیہ پانچ آنہ ہوتے ہیں ۱۲ مجیب۔ عہ صحیح یہ ہے کہ ۲ ماشہ ۲ رتی زکوٰۃ نکلتی ہے ۱۲ مجیب۔

یا بیس مثقال سے زائد کا حساب ہے، اس سے یہ مقصود نہیں کہ فقط چار مثقال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ کتبہ الاحقر عبد الکریم، ۱۳ جمادی الاولیٰ ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۴۸ھ۔

مسئلہ وجوبِ زکوٰۃ

سوال (۲۶) فرض کیا زید کے پاس سو روپے ہیں، اس نے سال کے آخر میں جب یہ دیکھا کہ یہ سو روپے اس کے خرچ سے بچ رہا ہے، تو اس نے ڈھائی روپے زکوٰۃ دیدی، لیکن یہی ساڑھے ستانوے روپے جو اسی سو روپے میں ڈھائی روپے زکوٰۃ دینے کے بعد بچا ہے پھر سال تمام کے اخراجات کے بعد بچ گیا تو کیا اس ساڑھے ستانوے روپے کی بھی زکوٰۃ دی جاوے یا وہی اڑھائی روپے جو سو روپے کی زکوٰۃ تھا، اس رقم کے لئے کافی تھا، غرض یہ ہے کہ وہی سو روپیہ کی رقم رکھی ہے، نہ اس میں شامل کوئی رقم کی گئی، نہ اس میں سے کوئی رقم لی، اس کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: دو روپیہ آٹھ آنہ تو ایک سال کی زکوٰۃ ہے، دوسرے سال اگر یہ روپیہ رہ گیا تو اس کی زکوٰۃ دوبارہ دینی پڑے گی، اسی طرح آئندہ بھی ہر سال موجودہ رقم کا چالیسواں حصہ دینا چاہیے جب تک کہ مقدارِ نصاب رہے، اور جب مقدارِ نصاب نہ رہے تب واجب نہ رہے گی۔ احقر عبد الکریم عفی عنہ، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۴۸ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ، ۱۸ جمادی الاولیٰ ۴۸ھ۔

پراویڈنٹ فنڈ پر وجوبِ زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال (۲۷) زید سرکاری ملازم ہے، اس کی تنخواہ سے بیس روپے ماہوار سرکار کاٹ لیا کرتی ہے، وہ رقم اس کی جو بیس روپے ماہوار سرکار میں جمع ہو رہی ہے بعد پنشن یکمشت سرکار ادا کردے گی، تو ایسی رقم پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ اس وقت واجب نہیں، بلکہ یہ رقم جب اس کے قبضہ میں آجائے اور حولانِ حول ہو جائے تو ــــ زکوٰۃ واجب[عہ] ہوگی، قال قاضی خان: اذا اجر داره او عبده بمائتی درهم لا تجب الزکوٰۃ مالم یحل الحول بعد

عہ اور اگر اس پر اس رقم کے آنے سے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہے تو اس رقم کے وصول ہونے کے بعد جب پہلے مال کا سال تمام ہوا اسی وقت اُس سب رقم کی زکوٰۃ بھی اس کے ساتھ دی جائے ۱۲

القبض وفی قول ابی حنیفۃؒ فان کانت الدار والعبد للتجارۃ وقبض اربعین درھما بعد الحول کان علیہ درھم بحکم الحول الماضی قبل القبض الخ (ص ۲۱ ج ۲) قلت واذا لم یکن علیہ زکوٰۃ فی اجرۃ الدار والعبد الا اذا کانا للتجارۃ فاجرۃ نفسہ اولی فان الحر لیس بمال۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۷ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۸ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ۔

بنک کا دیوالہ نکل جائے تو اس میں جمع کردہ روپے پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں

سوال (۲۸) زید نے کچھ روپیہ بنک میں جمع کیا، بنک کا دیوالہ نکل گیا، بنک سے روپیہ ملنے کی امید بھی ہے، اور اسی قدر ناامیدی بھی کیونکہ پتہ نہیں کہ روپیہ ملے بھی کہ نہ ملے، یا کچھ ملے اور کچھ نہ ملے، ایسی صورت میں کیا جمع کنندہ پر زکوٰۃ واجب ہے؟

الجواب: اس روپے کی زکوٰۃ واجب رہے گی، مگر سردست ادا کرنا لازم نہیں، بلکہ جب دس روپے آٹھ آنہ کی وصولی کے بعد وصول شدہ رقم کی سب گذشتہ برسوں کے متعلق زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۷ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۸ جمادی الاولی ۱۳۴۸ھ۔

مسئلہ وجوب زکوٰۃ

سوال (۲۹) زید کے پاس دس ہزار روپے کی مالیت کی زمین ہے، اور اس زمین کا کچھ حصہ بعوض پانچ ہزار رہن ہے، اور شخص مذکور کے پاس پانچسو روپے کی مالیت کا زیور ہے، آیا اس زیور پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: اس زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔ عبدالکریم عفا عنہ ۲ ج ۲ ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۴۸ھ۔

مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں

سوال (۳۰) زید کے پاس پانچسو روپے کا زیور ہے، اور ایک ہزار روپیہ اس کی زوجہ کا مہر اس کے ذمہ واجب الادا ہے، آیا اس زیور پر مرد کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر باوجود مہر مؤجل ہونے کے یہ شخص فی الحال ادا کرنے کی فکر میں ہے تب تو اس زیور پر زکوٰۃ واجب نہیں، ورنہ واجب ہے، کما فی العالمگیریۃ وذکر البزدوی فی شرح الجامع الصغیر قال مشائخنا فی رجل علیہ دین مؤجل لامرأتہ وھو لا یرید اداءہ (ای فی الحال) لا یجعل مانعا من الزکوٰۃ لعدم المطالبۃ فی

العادۃ انہ حسن ایضا ھکذا فی جواھر الفتاوی فقط۔ عبدالکریم عفا عنہ ۲ ج ۲ ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۷ جمادی الثانیۃ ۱۳۴۸ھ۔

قرض پر وجوب زکوٰۃ کی ایک صورت کا حکم

سوال (۳۱) کسی کے پاس کچھ روپیہ تھا جس پر وہ زکوٰۃ نکالا کرتا تھا اب وہ روپیہ دوسرے شخص کو قرض دیدیا، اب وہ مقروض کہتا ہے کہ مجھ سے نقد روپیہ نہیں ادا ہو سکتا، بلکہ اس کے عوض کچھ جائداد مجھ سے لکھا لو اور اس کو بجز ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اس صورت میں مدیون منکر تو نہیں ہے بلکہ قرض کا مقر ہے، اور جائداد رقم قرض کے عوض دینے کو تیار ہے، اس لئے قرض دینے والے کے ذمہ سے سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ساقط نہیں، ہاں جب جائداد لے لے گا تو آئندہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

واستبدال مال التجارۃ بمال التجارۃ ھلاک وبغیر مال التجارۃ استھلاک۔ قال الشامی تشمل ما لو استبدل بعوض ما لیس بمال اصلا او بعوض ھو مال لکنہ لیس بمال الزکوٰۃ بان باعہ بعبد الخدمۃ او ثیاب البذلۃ فیضمن الزکوٰۃ فی ذلک کلہ لانہ استھلاک اھ (شامی ص ۳۲ ج ۲)۔

مثل سوال مذکور

سوال (۳۲) کسی شخص کے ذمہ کچھ روپیہ باقی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ ایک دم روپیہ نہیں ادا ہو سکتا ہے، بلکہ دفعہ دفعہ ادا کریں گے، اور دفعہ دفعہ کرنے سے روپیہ اس قدر نہیں ہوتا ہے کہ جس کی زکوٰۃ فرض ہے، بلکہ کل روپیہ جو اس کے ذمہ ہے یکمشت ادا کرنے سے زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے، تو ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟

الجواب: جب اس قرض میں سے گیارہ روپے چار آنہ وصول ہوں خواہ یکمشت یا تدریجاً تو اس گیارہ روپے چار آنہ کی زکوٰۃ یعنی چالیسواں حصہ دینا واجب ہوگا، اور جتنے برسوں کے بعد وصول ہوا ہو سب کی طرف سے اس گیارہ روپے چار آنہ کی زکوٰۃ واجب ہے، اس کے بعد پھر جب کبھی گیارہ روپے چار آنہ وصول ہوں تو اس کا بھی یہی حکم ہے، جب تک پورے گیارہ روپے چار آنے پر قبضہ نہ ہو اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں، قال الشامی فاذا قبض ذلک کلہ او اربعین درھما منہ بانقطاع ذلک من اجرۃ الدار تجب زکوتہ لما مضی من السنین والناس عنہ غافلون (ص ۵۶ ج ۲) کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۵ رجب ۱۳۴۸ھ۔ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۵ شعبان ۱۳۴۸ھ۔

زکوٰۃ کی رقم اور دیگر سامان دینے کی نیت سے علیحدہ رکھا تھا، مگر اپنے مال کے ساتھ زکوٰۃ کا مال بھی چوری ہوگیا تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں

سوال (۳۳) زید نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی، اور اس زکوٰۃ کے پیسے سے کچھ تو مستحقین زکوٰۃ پر خرچ کیا، اور کچھ کپڑے مستحقین کے واسطے خرید کر رکھ لئے، اور کچھ بھی کچھ نقد باقی رہ گئے تھے کہ اس کے ہاں چوری ہوئی، چوری میں زکوٰۃ کے پیسے اور کپڑے اور اس کا اپنا مال بھی چوری ہوگیا، سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ سے سبکدوش ہوا یا نہیں، اگر نہیں تو کس طریقہ سے ادا کرے، بینوا بالصواب توجروا بالثواب؟

الجواب: اگر فقط وہ مال چوری ہوتا جو کہ زکوٰۃ کی نیت سے الگ رکھا ہوا تھا تب تو زکوٰۃ سے سبکدوشی نہ ہوتی، لیکن جب دوسرا مال بھی چوری ہوگیا ہے تو اس مال مسروقہ کی زکوٰۃ معاف ہوگئی ہے، البتہ اگر کچھ مال صاحبِ واقعہ کے پاس باقی رہ گیا ہو تو اس باقی کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے، کما فی الدر المختار ولا یخرج عن العھدۃ بالعزل بل بالاداء للفقراء وقال الشامی فلو ضاعت لا تسقط عنہ الزکوٰۃ الخ (ص ۱۸ ج ۲) ولا فی ھالک بعد وجوبھا ومنع الساعی فی الاصح لتعلقھا بالعین لا بالذمۃ وان ھلک سقط حظہ فقط واللہ اعلم، ۱۴ رجب سنہ ۵۰ھ۔

حکم وجوب زکوٰۃ در زیورات

سوال (۳۴) کسی عورت کے پاس دو سو تولہ کے زیورات ہیں، اس کے ہاتھ پیر کان اور گلے میں مدام باون تولہ سے زائد رہتا ہے، اور یہ اس کی ضروریات میں سے ہے، اس کو پورے زیورات کی زکوٰۃ دینی ہوگی، یا مابقیہ زیور کی دینی ہوگی کتاب کا حوالہ زینت فرمایئے؟ آپ کی اصلاح تحریر ادلہ ہوگا۔

الجواب: اس عورت کے تمام زیورات پر زکوٰۃ واجب ہے، ان پر بھی جو رکھے رہتے ہیں اور ان پر بھی جو استعمال میں رہتے ہیں، صرح بہ فی الدر وغیرہ من المتون و الشروح، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ، ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۸ھ۔

مسئلۂ زکوٰۃ

سوال (۳۵) گورنمنٹ نے بعض فوجی پنشنر اشخاص کو مربعہ جات (اراضی جو نہر کے پانی سے سیراب ہو) بطور عطیہ کے عطا کئے ہیں، جن پر مطالبہ مالِ آبیانہ ششماہی لگتا رہتا ہے، علاوہ ازیں یہ شرط ٹھہرائی گئی کہ عرصہ پانچ سال تک بیع معاملہ کچھ رقم بطور مالکانہ ادا کرنی پڑے گی، اس وقتِ معینہ کے بعد مبلغ گیارہ صد روپیہ قیمت فی مربعہ ادا کرکے ہر شخص مالکِ مربعہ بن سکتا ہے، اور وہ مالکانہ بند ہوجائیگا اور ساتھ یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ مالک نہیں بننا چاہتا تو مالکانہ بدستور ادا کرتا رہے، جبراً قیمت نہیں لی جائیگی، اب جس شخص کے پاس قیمت مربعہ قبل از عطیہ موجود ہے اور اس نے اس نیت سے رکھی ہوئی ہے کہ قیمت مربعہ ادا کرکے مالکِ مربعہ بنوں گا اس پر بعد گذرنے سال کے زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ وہ قرض سے فارغ ہے، گورنمنٹ کی رقم اس پر قرض نہیں، جبکہ یہ خود مختار ہے کہ اس رقبہ کا مالک بنے یا نہ بنے اور اس زمین کو خریدے یا نہ خریدے، تو عقد کا تحقق نہ ہوا، اور نہ ثمن اس کے ذمہ لازم ہوا، واللہ اعلم۔

۱۰ ذیقعدہ سنہ ۴۸ھ

قرض ہر حال میں مانعِ وجوبِ زکوٰۃ ہے

سوال (۳۶) ایک شخص نے چار ہزار روپے میں ایک زمین خریدی، جس کی ادا دس قسطوں میں قرار پائی ہے، ایک قسط وہ ادا کرچکا اور زمین پر قابض ہوگیا، دوسری قسط کے لئے مالغہ ۲۵ روپیہ اس کے پاس رکھا ہے، جس پر حولانِ حول ہوچکا ہے، تو اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں، اور زمین کا قرض مانع وجوبِ زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، قرض بہرحال مانع وجوب زکوٰۃ ہے، خواہ زمین کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، اور خواہ اس کی ادا بالاقساط مشروط ہو یا بلا اقساط، واللہ اعلم، ۱۳ ذی الحجہ سنہ ۴۸ھ۔

مسودۂ زکوٰۃ بل کے بارے میں ایک استفتاء۔

سوال (۳۷) حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کی خدمت میں ایک سوال اس مضمون کا آیا تھا کہ تنظیم زکوٰۃ کے لئے مرکزی اسمبلی میں زکوٰۃ بل پیش کرنے کا ارادہ ہے جس کا مسودہ ارسالِ خدمت ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس مسودے کے متعلق جو رائے ہو اس سے مطلع فرمایا جائے، اس کا جواب حضرت کے ایماء سے یہ دیا گیا:۔

الجواب: مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مسودۂ زکوٰۃ بل دیکھا گیا، آپ کی نیت کے نیک ہونے اور خیرخواہی پر مبنی ہونے میں شبہ نہیں، مگر ہم اس بل کی تائید سے بوجوہِ چند معذور ہیں:۔

الف: کافر گورنمنٹ کے ذریعہ سے شرائعِ اسلام کی ترقی جب طلب کی جاتی ہے بجائے ترقی کے تنزل ہی ہوتا ہے، وقف بل، اور خلع بل کی نظائر سامنے ہیں، کہ ان دونوں سے بجائے فائدہ کے شرعی حیثیت سے نقصان ہی ہوا۔

ب ؛ چونکہ قانون کا پاس کرنا صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اکثریت کے ہاتھ میں ہے، اس لئے جس صورت سے بل پیش کیا جاتا ہے اس سے بدتر صورت میں پاس ہوتا ہے، چنانچہ خلع بل جس صورت سے پاس ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے کہ حاکم مسلم کی شرط جو اس بل کی جان تھی حذف کر دی گئی، اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ خود مسلمان ہی بوجہ جہل کے مخالف ہو جاتے ہیں، اور احکام شرع میں رائے زنی کرتے ہیں، کہ اس قید کی کیا ضرورت ہے؟

ج ؛ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ میں خلیفۃ المسلمین و امیر المؤمنین کو بھی جبر کا حق نہیں، یہ بل ان میں بھی جبر کا حق دیتا ہے۔

د ؛ اموالِ ظاہرہ میں خلیفہ و امام کو حقِ جبر ضرور حاصل ہے، مگر اس کو عشر یا ربع عُشر سے زیادہ مسلمانوں سے وصول کرنے کا حق نہیں، یہاں کافر حکومت پہلے ہی سے زمینوں پر لگان اور تجارتوں پر ٹیکس وصول کر رہی ہے، اور اب کانگریسی حکومت رات دن مسلمانوں کو پیسنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے، اگر اس کو عُشر اور رُبع عُشر کے وصول کا حق بھی دیدیا گیا اور اس کی تشخیص بھی اس کے ہی ہاتھ میں رکھی گئی، جیسا کہ بل میں ظاہر کیا گیا ہے تو مسلم مزارعین اور مسلم تجار پر وہ جتنا بار ڈالیں گے ظاہر ہے۔

ہ ؛ زکوٰۃ کی رقوم میں سے ۵ فی صد گورنمنٹ کے عاملین کے لئے رکھا گیا ہے، جس میں کچھ تصریح نہیں کہ وہ عاملین مسلمان ہی ہوں گے، یا مسلم و غیر مسلم دونوں ہو سکتے ہیں، شقِ ثانی میں یہ حصہ زکوٰۃ کا غیر مصرف میں جائے گا۔

و ؛ زکوٰۃ کا ۲۰ فی صد دیگر اغراض کے لئے رکھا گیا ہے اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی، کہ کن مصارف میں صَرف ہوگا، صَرف کرنے والے مسلمان بھی ہوں گے تو مسائل سے ناواقف ہوں گے نہ معلوم کہاں کہاں صرف کریں اور مسلمانوں کی زکوٰۃ برباد ہو، اس طرح ۱۰ فی صد بطور سرمایہ محفوظ رکھا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ زکوٰۃ دینے والوں کی پوری زکوٰۃ ہر سال ادا نہ ہوگی، بلکہ اس کا کچھ ادا سے رہ جائے گا۔

ز ؛ افسر مشخص کا مسلم ہونا تو بل میں مصرح ہے، مگر اس کے فیصلہ کی اپیل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے یہاں رکھی گئی ہے، جس کا مسلم ہونا شرط نہیں کیا گیا، اگر وہ غیر مسلم ہوا تو اس کے فیصلہ سے زکوٰۃ کا جو حشر ہوگا ظاہر ہے۔

ح ؛ انجمنوں کے اور ر ۔ ۔ کے بیت المال کے معائنہ کے لئے جو انسپکٹر اور ان انسپکٹروں کے

تقرر کا اختیار گورنمنٹ کو دیا گیا ہے، اس میں بھی یہ تصریح نہیں کہ وہ انسپکٹر مسلم ہوں گے یا غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں، شقِ ثانی میں اُن کی تنخواہ جو زکوٰۃ کی مد سے دی جائے گی، وہ محض برباد ہوگی، اور کافروں کو مسلمانوں کی زکوٰۃ اور بیت المال پر جو حق تصرف ہوگا وہ جدا رہا، اس سے آئندہ جو کچھ خرابیاں پیدا ہوں گی وہ احکامِ وقت کے حالات سے باخبر طبقہ پر مخفی نہیں۔

ط ؛ وزیرِ اوقاف اور افسر مشخص اگر نام کا مسلمان ہوا اور عقیدۃً قادیانی یا اور کسی فرقہ کا ہوا (جو عامۂ مسلمین کے نزدیک مسلمان نہیں بلکہ مرتد ہے) اور پورے مسائل سے سب ہی ناواقف ہوں گے، تو اس کے برائے نام اسلام سے بجائے نفع کے ضرر کا اندیشہ ہے، اس خطرہ سے حفاظت کی کیا سبیل ہے؟

ی ؛ خلیفۂ اسلام جو عاملین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کرتا ہے، چونکہ خلیفہ تمام مسلمانوں کا نائب ہے جن میں فقراء بھی داخل ہیں تو خلیفہ یا اس کے عاملین کے ہاتھ میں زکوٰۃ پہونچتے ہی ارباب اموال کے ذمہ سے ادا ہو جاتی ہے، گویا فقراء کے ہاتھ میں پہنچ گئی مگر حاکم غیر مسلم یعنی غیر مسلم گورنمنٹ کا شرعًا یہ حکم نہیں اس کے یا اس کے عاملین کے قبضہ میں زکوٰۃ پہونچنے سے فوراً ادا ہونا شرعًا باطل ہے، پس اگر کوئی شخص زکوٰۃ ادا کر کے مر گیا، اور اس کی زکوٰۃ ابھی تک مصرف میں صرف نہ ہوئی تھی تو وہ رقم ورثہ کی طرف منتقل ہو کر ترکہ میں داخل ہوگی، اور اس کو مصارفِ زکوٰۃ میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، اس کا کوئی حل اس بل میں نہیں۔

الغرض جب تک باقاعدہ اسلامی حکومت نہ ہو زکوٰۃ کا انتظام غیر مسلم حکومت کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا، اس کی واحد صورت یہی ہے کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو اجازت دے کہ وہ اپنا ایک حاکم مسلم مقرر کر لیں جس پر گورنمنٹ کا ویسا ہی اقتدار ہو جیسا والیانِ ریاست پر ہوتا ہے، اندرونی نظم و نسق میں وہ بالکل آزاد ہو، پھر حاکم مسلم زکوٰۃ کو قاعدۂ شرعیہ کے موافق وصول کرے تو یہ صورت جائز ہے۔

آپ نے اس بل کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوؤں کے کھاتہ پن کا تذکرہ کیا ہے، مگر ہندوؤں کا کھاتہ پن گورنمنٹ کے قانون کی طاقت سے نہیں چل رہا بلکہ خود ہندوؤں کی قومی طاقت سے چل رہا ہے، اگر مسلمان بھی اپنے یہاں کوئی خیراتی فنڈ ایسا قائم

کریں جو قومی طاقت سے چلے تو یہ ایک مفید صورت ہوگی، اور ہم خوشی کے ساتھ اس کی تائید کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں اس وقت دس فی صد زکوٰۃ دینے والے ہوں گے مگر غالباً یہی اوسط نماز پڑھنے والوں کا ہے، تو کیا کل کو نماز کے لئے بھی کوئی قانون بنوایا جائے گا، اور غالباً حج کرنے والے تو اس سے بھی بہت کم ہوں گے، تو کیا حج کیواسطے قانون بنوایا جائے گا؟ اگر نہیں تو زکوٰۃ ہی کے لئے قانون بنوانے کی کیا ضرورت ہے؟

دراصل ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کو احکامِ دین سے واقف کیا جائے، مذہبی تعلیم کو عام طور سے رواج دیا جائے، تبلیغ کی طرف پوری توجہ کی جائے، مسلمانوں کو نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج اور تمام احکام کی ضرورت سے مطلع کیا جائے، ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جن کا فریضہ تبلیغ احکام ہو، جن کا کام مسلمانوں میں مذہبی روح پیدا کرنا ہو، جس دن قوم میں مذہبی بیداری پیدا ہوجائے گی وہ ہندوؤں کے کھاتہ پُن سے بہتر نظام قائم کرے گی، اور اگر مذہب اور احکامِ مذہب سے یہی غفلت رہی جو اس وقت ہے تو زکوٰۃ بل بھی کچھ مفید نہ ہوگا، بلکہ بجائے مصارفِ خیر کے گورنمنٹ کا عملہ اور افسر مشخص یا وزیر اوقاف کا خاندان اس بیت المال کو لقمۂ تر سمجھ کر ہضم کرجائے گا، اور مسلمان دیکھتے کے دیکھتے رہجائینگے، جس چیز کی ضرورت ہو کہ مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بنایا جائے، اور اس کی سہل صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کا اونچا طبقہ جو علمی اور مالی اعتبار سے بڑا ہے وہ دین کی طرف توجہ کرتا، خود دیندار بنتا اور دوسروں کے لئے نمونہ ہوتا، جس سے اعلیٰ درجہ کی تنظیم ہوجاتی، اس سے تو سب دُور بھاگتے ہیں اور بجائے اس کے اپنی عبادات تک گورنمنٹ کے ہاتھ میں دیتے جارہے ہیں جس کا انجام نہایت ہی خراب ہے، ظفر احمد والسلام۔

بابُ زکوٰۃ مال التجارۃ

کتبِ تجارت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال (۱) میں نے دو سو بچپن روپے خرچ کرکے ۱۵۵۵ کتاب چھپوائیں اور فروخت کے لئے دُکان دار کے پاس رکھدیں (ابھی میرے ہاتھ میں روپیہ پیسہ کچھ بھی نہیں) ختم سال پر مجھ کو ۴۵۵ روپے ملیں گے، پھر وہی ۴۵۵ روپے بھی دوسری بار کتاب چھاپنے میں خرچ کیا جائے گا، میرا کچھ اور مال و متاع نہیں ہے، پس مجھ پر زکوٰۃ واجب

ہے یا نہیں؟

الجوابُ: آپ پر زکوٰۃ واجب ہے، اور مالِ تجارت کی زکوٰۃ کے لئے روپیہ پیسہ ہاتھ میں ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ مالِ تجارت کا موجود ہونا اور اس پر سال گذرنا شرط ہے، پس جب وہ ۱۰۰۰ کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں، اور اُن پر سال گذر گیا تو ابھی ایک ہزار میں سے ۲۵ عدد کتابیں زکوٰۃ میں نکال دی جائیں، یا ۲۵ کتابوں کی قیمت دیدی جائے، جو آسان ہو اور انفع للفقراء ہو، واللہ اعلم، ۱۲ر رمضان ۴۵ھ۔

بابُ صدقۃ السوائم

بکریوں کی زکوٰۃ کا حکم ونیز سرکاری اور زمیندار کی زمین میں اُن کے چرانے کا حکم

سوال (۱) ایک شخص رئیس کے پاس کچھ بکریاں بھی ہیں، اور اس کی زمین میں اس کے نوکر چراتے ہیں، ان میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: بکریاں اگر چالیس یا اس سے زیادہ ہوں تو سال گذر جانے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر بکریاں محض کھانے کے واسطے نہیں پالتا بلکہ اصل مقصود مال کا بڑھانا ہے، گو طبعاً کبھی کھا بھی لیتا ہو جس کا مفصل بیان کتبِ فقہ میں موجود ہے، خواہ وہ اپنی زمین میں چراتا ہو یا سرکاری زمین میں یا زمیندار کی زمین میں، سب صورتیں برابر ہیں، البتہ اگر چالیس سے کم ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں۔

سوال ۲ ایک شخص کے پاس بکریاں ہیں، دو سو، مگر زمین نہیں ایک اُنگل، سرکاری زمین میں یا زمینداروں کی زمین میں چرا کر لاتا ہے، بازار میں دودھ بیچکر گذر کرتا ہے، اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجوابُ: سرکاری اور زمیندار کی زمین میں چرانا درست ہے، بشرطیکہ کھیتوں اور درختوں کا نقصان نہ کرے، خود رو گھاس یا پتے چرائے، اور جس شخص کے پاس دو سو بکریاں ہیں اور وہ دودھ بیچکر گذارا کرتا ہے اس کا مقصود بکریوں کے پالنے سے کیا ہے، آیا صرف دودھ بیچنے ہی کے واسطے بکریاں پالتا ہے، یا مقصود مال کا بڑھانا ہے، اور بکریوں سے بچے لینا اور تبعاً دودھ سے بھی نفع حاصل کرلیتا ہے، ان دونوں باتوں میں سے جو مقصود ہو اس کو واضح لکھا جائے تو جواب دیا جائے گا۔

سوال ۳: چند زمیندار آپس میں ایک دوسرے کی زمین میں ڈنگر بکریاں چرا لیتے ہیں آپس کی رضامندی سے عام رواج سے یہ کیسا ہے؟

الجواب: جائز ہے، بشرطیکہ کھیتوں اور درختوں کا نقصان نہ کرے، ۱۸ رمضان ۱۳۴۲ھ

علوفہ اور تجارتی مواشی پر وجوب زکوٰۃ کا حکم

سوال (۲) زید کے پاس ایک سو علوفہ بھینسیں ہیں، جن کا دودھ فروخت کرتا رہتا ہے، اور جب کبھی ان بھینسوں میں سے کسی بھینس کا دودھ کم ہوجاتا ہے تو معاً بھینس کا خسارہ برداشت کرتے ہوئے اگرچہ چار سو کی بھی ہو تب بھی ایک سو یا کچھ کم وبیش سے قصابوں کو فروخت کردی جاتی ہے، اور فوراً اس کی جگہ پر دوسری بھینس خرید کرکے ایک سو کی تعداد پوری کرلی جاتی ہے، چھ یا سات ماہ کے بعد ہر ایک بھینس کا دودھ کم ہوجانا لابدی امر ہے، اور دودھ کم ہونے پر اسے فروخت کردینا اور اس کے قائم مقام دوسری رکھ چھوڑنا بھی ضروری ہے، غرض کہ کامل سال کسی بھینس پر بھی نہیں گزرتا، بلکہ مرقومہ بالا صورت سے فروخت ہوتی رہتی ہیں اور نئی آتی رہتی ہیں۔

زید روزانہ اپنا حساب اس طور سے کرتا رہتا ہے کہ روزانہ جس قدر آمدنی ہوتی ہے اس میں سے خرچ شدہ رقم کے علاوہ ہر ایک بھینس کے عوض میں ایک روپیہ کاٹتا رہتا ہے، اور اسی ایک روپے کے عوض میں بھینس کو روزانہ ایک روپیہ کم قیمت کی سمجھتا رہتا ہے، مثلاً ایک روز دودھ مالعہ روپیہ کا فروخت ہوا تو ان میں سے سنو خرچ کے نکال دیئے اور ایک سو روپے ہر ایک بھینس کی قیمت میں سے ایک ایک کاٹا ہوا الگ خرچ میں لیا گیا تو گویا کل مالر روپے خرچ ہوکر ۲۵ روپے سالم بچے، ان کو اس روز کا نفع تصور کرتے ہوئے حساب میں لاتا ہے، اور بھینس کی قیمت میں سے کم کرنے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً تین سو روپے کی ایک بھینس دودھ فروخت کرنے کے لئے آج خرید کی، تو آج ہی سے اس کی قیمت میں سے ایک روپیہ کم کرتے ہوئے وہ بھینس ۲۹۹ کی تصور کی گئی، علیٰ ہذا القیاس ایک روپیہ روزانہ اس کی قیمت میں سے کم سمجھتا رہا، حتیٰ کہ دو سو دنوں کے بعد دو سو روپے کم تصور کرتے ہوئے بھینس صرف ۱۰۰ کی تصور کی گئی، اور دودھ کم ہونے پر ۱۵۰ روپے میں قصاب کو فروخت کیگئی اور اپنے دل کو طفل تسلی کے طور پر یوں سمجھا لیا کہ ڈھائی سو کی بھینس گویا ڈھائی سو ہی میں فروخت کی گئی، اب جو اس کی جگہ پر نئی بھینس خریدی جائے گی اس کے لئے پچاس روپے تو یہ بھینس کی قیمت کے وصول شدہ موجود ہیں، اور دو سو ایک ایک روپیہ روزانہ قیمت میں

کم کئے ہوئے اور آمد میں سے کاٹ کر خرچ میں لئے ہوئے موجود ہیں، تو اس صورت سے کاٹنے سے کیا علوفہ بھینس تجارت کی بن جاتی ہے؟ بینوا، توجروا۔

ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ دودھ فروخت کرنے کی وجہ سے یہ کُل علوفہ بھینسیں مالِ تجارت بن چکیں، فلہذا اُن پر زکوٰۃ واجب ہے، حالانکہ متون میں سے کسی کتاب سے بھی علوفہ پر زکوٰۃ ثابت نہیں ہے، بلکہ تمام میں نفی موجود ہے، صاحب درمختار وجوبِ زکوٰۃ کے لئے نیتِ تجارت کو شرط قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، ولا فی العوامل والعلوفۃ مالم تکن العلوفۃ للتجارۃ، جلد دوم۔

صاحب ہدایہ علوفہ پر عدمِ وجوبِ زکوٰۃ کی علت بایں طور تحریر فرماتے ہیں کہ لان فی العلوفۃ تراکم المؤنۃ، صورتِ مسئولہ میں تو ہجومِ مؤنت ونفقات کا یہ عالم ہے کہ طویلہ کا کرایہ الگ دیا جاتا ہے اور بھینسوں کی خدمت کے لئے جو نوکر رکھے جاتے ہیں ان کو تنخواہیں الگ دی جاتی ہیں، اور دونوں وقت صبح وشام بھینسوں کو چارہ بانٹا الگ دیا جاتا ہے، فقہاء نے چوپاؤں میں علتِ وجوبِ زکوٰۃ نمو کو قرار دی ہے، کہ نما خواہ حقیقۃً ہو خواہ حکماً، لیکن زید کی نیت اپنی موجودہ بھینسوں کے متعلق بھی اور آئندہ جو خرید کرے گا اُن کے بارے میں بھی یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی کسی بھینس کا دودھ کم ہوجائے گا تو خسارہ برداشت کرتے ہوئے چار سو کی بھینس بھی سو یا سوا سو تک قصابوں کو فروخت کر ڈالوں گا، تو اس صورت میں بایں طور نیت کرنے سے نما نہ تو حقیقی پایا گیا، اور نہ حکمی، پھر کیا یہ نیت وجوبِ زکوٰۃ کے لئے مؤثر ثابت ہوگی یا لغو جائے گی؟

حضرت مولانا مولوی مفتی محمد حسین صاحب صدر المدرس مدرسہ راندیر تحریر فرماتے ہیں کہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ واجب نہیں، درمختار کی یہ عبارت اس کے لئے شاہد ہے کہ ولو نوی التجارۃ بعد العقد او اشتری شیئًا للقنیۃ ناویًا انہ ان وجد ربحًا باعہ لا زکوٰۃ علیہ، جلد دوم قبیل باب السائمۃ۔

لیکن مولوی صاحب موصوف اسے تسلیم نہیں کرتے، براہِ کرم ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواب مع حوالۂ کتب محقق ومدلل تحریر فرماتے ہوئے عند اللہ ماجور ہوں۔

سوال ۱: جوہرہ نیرہ مطبوعہ خیریہ جلد اوّل صفحہ ۱۲۰ میں سائمہ کے متعلق قولہ والسائمۃ الخ کے تحت میں درج ہے کہ لان اصحاب التوائم قد لا یجدون بدامن

ان یعلفوا سوائمہم فی بعض الاوقات فیجعل الاقل تابعاً للاکثر ثم ھذا الذی ذکرہ من الاسامۃ فی حق ایجاب زکوٰۃ السوائم انما یصح ان لو کانت الاسامۃ للدر والنسل اما اذا کانت للتجارۃ او للحمل والرکوب فلا تجب فیہا الزکوٰۃ اصلاً، یہ عبارت کسی اور کتاب میں نہیں ہے، فلہذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ عبارت صحیح ہے یا غلط؟ بینوا توجروا۔

الجواب وھو الموفق للصواب: یہ بات تو ظاہر ہے کہ جب وہ بھینسیں علوفہ ہیں تو اُن پر زکوٰۃ سوائم واجب نہیں، اور درمختار کی عبارت ولا فی العوامل والعلوفہ میں زکوٰۃ سوائم ہی کی نفی ہے، ونیز جوہرہ نیرہ کی عبارت مرقومہ بالا یعنی اما اذا کانت للتجارۃ او للحمل والرکوب فلا تجب فیہا الزکوٰۃ اصلاً میں زکوٰۃ سوائم ہی کی نفی ہے، اور درمختار کی عبارت مذکورہ ولو نوی التجارۃ بعد العقد الخ سے معلوم ہوا کہ اگر فروخت کرنے کا حکمی قصد نہیں ہے تو علوفہ میں زکوٰۃِ تجارت بھی واجب نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ زید کی نیت مذکورہ فی السوال حکمی نیت ہی یا نہیں اور دودھ فروخت کرنا بھی تجارتِ مواشی ہے یا نہیں، سو بظاہر یہ نیت بیع مواشی کی حکمی نہیں اور نہ تجارتِ لبن کو تجارتِ مواشی کہہ سکتے ہیں، لہٰذا زکوٰۃِ تجارت ان بھینسوں پر نہ ہوگی، واللہ اعلم۔

عبدالکریم عفی عنہ۔
۱۹؍ذی الحجہ ۴۳ھ

بابُ العُشرِ والخراج

| مسجد کی زمین پر عشر کا حکم |

سوال (۱) کیا وقف زمین متعلق مسجد پر عشر ہے؟

الجواب: زمین وقف متعلق مسجد پر بھی عشر ہے، قال فی العالمگیریۃ وکذا الملک الارض لیس بشرط للوجوب لوجوبہ فی الاراضی الموقوفۃ اھ (ص ۱۹۱ ج ۱)۔

۲۶ ربیع الثانی سنہ ۴۲ھ

| زمین عشری اور خراجی کی تعریف اور بعض زمینوں کے عشری یا خراجی ہونے کی تحقیق |

سوال (۲) ۱: زمین عشری کی تعریف کیا ہے اور زمین خراجی کس کو کہتے ہیں، اور دوسرے سوال میں جو جزئیات مرقوم ہیں وہ عُشری ہیں یا خراجی؟

۲: لاخراج بازیافتی اس زمین کو کہتے ہیں جو نصاریٰ کے تسلط کے قبل لاخراج تھی، اور اس میں خزانہ وغیرہ دینا نہیں پڑتا تھا، جب اُن کا غلبہ ہوا اور مالکِ زمین لاخراج ہونیکا کوئی ثبوت نہ دے سکا تو سرکار نے کچھ خزانہ وٹیکس مقرر کر کے مالک زمین کو وہ زمین واپس کردی ہے۔

۳: نیا باد اس زمین کو کہتے ہیں جس کو رعایا نے گورنمنٹ سے میعادی اجازت لیکر آباد کیا، اور جو خزانہ سرکار نے اس پر مقرر کیا وہ ادا کرتا ہے، اور جب میعادِ اجازت ختم ہوجاتی ہے گورنمنٹ خزانہ وغیرہ بڑھا دیتی ہے، اگر وہ لوگ زیادتی کو قبول کریں تو زمین ان کے پاس بحالہ رہتی ہے، ورنہ جو اس پر راضی ہو اس کو دیدیتے ہیں۔

۴: طرف دوسری قسم کی زمین والوں سے سرکار نے بوجہ ضرورت کے ایک روپیہ خزانہ کے مقابلہ میں دس روپے لیکر انھیں قائمی بندوبستی دیا، اور اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُس زمین کو تم لوگوں سے لے کر دوسروں کو نہ دوں گا۔

۵: دررعایتی اس زمین کو کہتے ہیں جس کو زمینداروں نے سرکار سے خزانہ پر بندوبستی کر کے رعایا کو میعادی بندوبستی دیا بعض سے کچھ نذر وغیرہ لے کر بعض کو یوں ہی مثلاً ۹ سال کے لئے بندوبستی دیا اور ان سے وعدہ کیا میں یہ زمین تم لوگوں سے واپس نہ کروں گا، لیکن زمیندار اگر ان سے واپس کرنا چاہیں رعایا کو رکھنے کی کچھ قدرت نہیں۔

۶: زمین خراجی میں جو غلہ ایک سال کی خورد پوش سے زائد پیدا ہوتا ہو اس کی زکوٰۃ دینا واجب ہے یا نہیں، بر تقدیر اول اس کا حکم مالِ تجارت کی طرح ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) الارض العشریۃ ما فتحہا المسلمون عنوۃ وقسموھا بین الغانمین او اسلم اھلہا برضاھم واقروا علیہا ولم یملکہا کافر منذ فتحوھا الی الاٰن، والخراجیۃ ما فتحوھا صلحا واقر اھلہا علیہا او کانت عشریۃ فملکہا کافر فی وقت۔

(۲) یہ زمین عشری ہے، (۳) یہ زمین خراجی ہے (۴) یہ بھی خراجی ہے، (۵) اگر وہ زمین پہلے سے مسلمانوں ہی کے قبضہ میں تھی تو عشری اور اگر کسی وقت بعد قبضہ اہلِ اسلام کے کسی کافر کی ملک میں آچکی ہے تو خراجی ہے، اور اگر مسلمانوں کے قبضہ میں اس وقت ہے اور پہلے کسی کافر کے قبضہ میں آنا معلوم نہیں تب بھی عشری ہے، (۶) زمین خراجی یا عشری کی پیداوار زائد میں زکوٰۃ نہیں البتہ پیداوار کو فروخت کرکے جو رقم جمع کی جاوے، اگر وہ ضروراتِ اصلیہ سے فاضل ہو تو بعد حولانِ حول کے اس میں زکوٰۃ ہوگی۔

۸ رجب ۴۱ھ

انگریزی حکومت کو مالگذاری دینے سے عُشر ادا نہ ہوگا

سوال (۳) زمینداری میں یہ ہے کہ چالیسواں حصہ غلہ سے زکوٰۃ دیا جاتا ہے، عشر نہیں دیا جاتا ہے، صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے کہ جب کہ اس زمین کی مالگذاری (جیسا کہ اس زمانہ میں ہے) اگر نہ دی جاوے اُس وقت عشر ہوگا اس وقت زمین کی ہم گورنمنٹ کو مالگذاری دیتے ہیں، تو اس وقت میں عشر یا چالیسواں حصہ ساقط ہو جانا چاہئے، کچھ زکوٰۃ نہ آنا چاہئے؟

الجواب: انگریزوں کو مالگذاری دینے سے عشر ادا نہ ہوگا، اگر زمین عشری ہے تو عشر کا ادا کرنا لازم ہے، زمین کی پیداوار میں زکوٰۃ نہیں بلکہ عُشر ہی واجب ہے، ۸ ر رجب ۴۱ھ۔

ارضِ حربی میں عُشر و خراج کا واجب نہ ہونا

سوال (۴) ایک شخص کے پاس ہزار بیگہ زمین ہے، اور چھ آنہ بیگہ سرکار میں بھرتا ہے، باقی پھر کچھ کاشت کرتا ہے، کچھ دوسرے لوگوں کو عہ بیگہ مال لے کر دیتا ہے، وہ اس میں کھیتی کرتے ہیں، کچھ تہائی چوتھائی حصہ بٹائی پر دیتا ہے، وہ لوگ کاشت کرتے ہیں، اگر نہر کا پانی دیتے ہیں تو اس کا الگ مال دیتے ہیں، کنوئیں کا دیتے ہیں تو خود دیتے ہیں، بعض بارش کے پانی سے کھیتی کرتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جس کی زمین ہے وہ کیا زکوٰۃ نکالے یا نہیں، اور نکالے تو کس قدر نکالے، دسواں یا بیسواں یا چالیسواں، روپیہ سے یا جنس سے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگریزی میں جو زمیندار ہیں اُن پر زکوٰۃ فرض نہیں، یہ مسئلہ کیسے ہے اور جو لوگ دوسرے زمیندار کی زمین لے کر کھیتی بیچتے ہیں، بتفصیل مذکور الصدر تو ان پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس قدر اور روپیہ سے یا جنس سے؟

الجواب: قال فی ردّ المحتار تحت قول الدر فی تعریف الرکاز وجدہ مسلم او ذمی فی ارض خراجیۃ او عشریۃ ما نصّہ قال فی فتح القدیر قید بالخراجیۃ والعشریۃ لیخرج الدار فانہ لا شیٔ فیہا لکن ورد علیہ الارض التی لا وظیفۃ فیہا کالمفازۃ اذ یقتضی انہ لا شیٔ فی الماخوذ منہا ولیس کذلک فالصواب ان لا یجعل ذلک لقصد الاحتراز واقول یمکن الجواب بانّ المراد بالعشریۃ والخراجیۃ ما تکون وظیفتہما العشر والخراج سواء کانت بید احد، ولا فتشمل المفازۃ وغیرہا بدلیل ما قدمناہ عن الخانیۃ من ارض الجبل عشریۃ فیکون المراد الاحتراز بہا عن دار الحرب ویدلّ علیہ انّہ فی متن درر البحار عبر بمعدن غیر الحرب فعلم انّ المراد معدن ارضنا ولہذا قال القہستانی بعد قولہ فی ارض خراج او عشر

الاخص فی ارضنا سواء کانت جبلاً او سہلاً مواتاً او ملکاً واحترز بہ عن دارہ وارضہ وارض الحرب اھ ثم رأیت عین ما قلتہ فی شرح الشیخ اسمٰعیل حیث قال ویحتمل ان یکون احترازاً عما وجد فی دار الحرب فانّ ارضہا لیست ارض خراج او عشر اھ (ص ۷۲، ج ۲) وفی العالمگیریۃ ثم ہذہ الدار ای دار الاسلام ۱۲) اذا صارت دار الحرب لو فتحہا الامام ثم جاء اہلہا قبل القسمۃ اخذوہا بغیر شیٔ وبعد القسمۃ بالقیمۃ ولو افتتحہا الامام عادت الی الحکم الاوّل الخراجی یصیر خراجیاً والعشری یصیر عشریاً اھ (ص ۱۴۶، ج ۳) قلت فیہ دلالۃ علی ان ارض الاسلام اذا صارت دار الحرب لا تبقی خراجیۃ ولا عشریۃ دلّ علیہ قولہ عادت الی الحکم الاوّل فافہم۔

ان عبارات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی زمین نہ خراجی ہے نہ عشری پس نہ زمیندار پر زمین کی پیداوار میں کچھ واجب ہے، نہ کاشتکار پر ویؤیدہ ایضاً ما فی رد المحتار (ص ۳۸۴ ج ۳) تحت قول الدر کما یمنع لو وضع علیہ ای علی الحربی المستامن) الخراج بان الزم بہ واخذ منہ عند حلول وقتہ لانّ خراج الارض کخراج الراس اھ ونصہ ای فی انہ اذا التزمہ صار ملتزماً المقام فی دارنا، بحر اھ، دلّ علی اختصاص الخراج بدارنا کالجزیۃ، قال الشامی ناقلاً عن السرخسی ولا یترک ان یخرج الی دارہ لانّ خراج الارض لا یجب الا علی من ہو من اہل دار الاسلام اھ (ص ۳۸۷ ج ۳) ۱۸ ر رمضان ۴۲ھ۔

ہندوستان کی زمینوں پر عُشر واجب ہے یا کیا

سوال (۵) اس ملک کی پیداوار پر عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: روایاتِ فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں عُشر واجب نہیں، لیکن اس ملک کے دار الحرب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ عُشر دیا جاوے، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفا اللہ عنہ ۸ ر ۲ ر ۴۴ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۸ ر ربیع الثانی ۴۴ھ۔

وجوبِ عشر و خراج کی ایک صورت کا حکم

سوال (۶) بندہ کے یہاں ۲۰ ر شعبان کو دس بیس من روئی پک کر آئی اور نصف سے زائد ابھی کھیت میں کچی ہے، وہ ۲۰ ر رمضان تک تمام آجاوے گی، تو ۲۸ ر شعبان کو اگر زکوٰۃ کا حساب لگائے تو اس رُوئی پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، یا

اس کی قیمت کا اندازہ کرکے دینا واجب ہے یا نہیں، اور اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو جس قدر مکان میں آگئی اسی قدر پر واجب ہوگی یا جو بچی ہے اس پر بھی دینا ہوگا؟

الجواب: یہ روئی تجارتی ہے، یا تجارتی نہیں، اگر اپنی زمین کی پیداوار ہے تو اس پر حولانِ حول واجب نہیں، بلکہ جب پیداوار حاصل ہوجائے اُسی وقت عُشر یا خراج واجب ہے، اگر زمین عشری ہے یا خراجی، اور اگر تجارتی ہے تو سوال واضح لکھا جائے، ۲۰ر رمضان ۱۳۴۶ھ۔

حکومت کے لگان سے عُشر ادا نہیں ہوتا

سوال (۷) ہمارے علاقہ کی زمین صرف بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہے کوئی نہر وغیرہ نہیں، لہذا گورنمنٹ کی طرف سے آبیانہ وغیرہ کچھ نہیں لگتا صرف مطالبۂ مال یعنی زرِ لگان بحساب مقررہ گورنمنٹ ہر ششماہی لگ جاتا ہے، کیا یہ زرِ لگان عُشر میں سے منہا کرلیا جاسکتا ہے، یا عشر پورا الگ دیا جائے اور گورنمنٹ کو مطالبہ الگ؟

الجواب: گورنمنٹ کے زرِ لگان سے عُشر نہیں ادا ہوسکتا، ۱۰ر ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ۔

کچی فصل کی کٹائی میں عُشر ہے یا نہیں

سوال (۸) ہمارے یہاں بہت فصل کچی کاٹ لی جاتی ہے، مثلاً جوار، نخود وغیرہ اور دانہ اُن سے نہیں حاصل ہوتا، ایسی سبز کاٹی ہوئی فصل پر عشر ہے یا نہیں؟

الجواب: امام صاحبؒ کے نزدیک اس پر بھی عُشر ہے، جتنا کاٹا جائے اس کا دسواں حصہ نکال دیا جائے، ۱۰ر ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ۔

بابُ صَدَقَۃِ الفِطر

صدقۂ فطر کی ادائیگی میں دوسرے شہر کے بھاؤ کا اعتبار نہیں

سوال (۱) جہاں گیہوں نہ ملے اور آٹا نہایت گراں قیمت ہو تو اگر دوسرا کسی اور شہر کے گیہوں کے بھاؤ سے صدقہ فطر ادا کرے تو جائز ہوگا یا نہ؟

الجواب: دوسرے شہر کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا، اگر گیہوں نہ ملے تو ایک صاع جَو کی قیمت ادا کردے، اور اگر کچھ نہ ملے تو تجار سے پوچھے کہ اگر یہاں گیہوں اس وقت ہوتا تو اس کا کیا بھاؤ ہوتا، اس کے حساب سے قیمت ادا کرے، واللہ اعلم، ۲۲ر رمضان ۱۳۴۰ھ۔

صدقۂ فطر غیر منصوص چیزوں میں قیمت کا اعتبار ہے مقدار کا نہیں

سوال (۲) چاول فطرہ میں گیہوں جَو کی قیمت کے حساب سے دیا جائے گا یا ہر ایک کی مقدار مشروع کے حساب سے دیا جائے

چاول کا اصل کہیں ہے یا نہیں؟ فقط۔

الجواب: فطرہ میں چاول دینا جائز ہے، مگر وزن اس کا مقرر نہیں، بلکہ نصف صاع گندم کی جو قیمت ہو اتنی قیمت کے چاول دیوے یا قیمت ہی دیدے، کما فی الدر المختار ص ۱۲۲ ج ۲ وما لم ینص علیہ کذرۃ وخبز یعتبر فیہ القیمۃ فقط۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ر شوال ۱۳۴۳ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۰ر شوال ۱۳۴۳ھ۔

چاول اور دھان سے صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم

سوال (۳) ہمارے ملک بنگالہ میں گیہوں نہیں ہے، دھان ہے، اور چاول ہے، اگر کسی نے روزہ کا فطرہ چاول سے یا دھان سے ادا کرنا چاہا تو ادا کرسکتا ہے یا نہیں، اور اگر ادا کرسکتا ہے تو کس طور پر حساب لگانا پڑے گا، گیہوں چار آنہ سیر اور چاول پونے تین آنہ سیر اور دھان دو آنہ سیر ہے، امید قوی ہے کہ ابد الآباد کے لئے ایک خلاصہ حکم فرماکر اطمینان فرمادیں؟

الجواب: نصف صاع گندم وغیرہ یا ایک صاع جو وغیرہ کی جو قیمت ہو اس قیمت کے جتنے چاول یا دھان آتے ہوں اتنے دیئے جاویں، فی الدر المختار مع الشامی ج ۲ ص ۱۲۲: وما لم ینص علیہ کذرۃ وخبز یعتبر فیہ القیمۃ اھ احقر عبد الکریم عفی عنہ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۱ر شوال ۱۳۴۳ھ۔

صدقۂ فطر میں موضع مال کی قیمت کا اعتبار ہوگا یا صدقہ ادا کرنے کی جگہ کا

سوال (۴) ایک آدمی تھانہ بھون میں رہتا ہے، اور یہاں کے گیہوں سیر چھ آنہ کرکے خرید کرتا ہے، اور شہر مراد آباد میں تاجر لوگ گیہوں چار آنہ کرکے خرید کرتا ہے، اس تقدیر پر جو آدمی تھانہ بھون کا رہنے والا ہے وہ اگر مراد آباد کے بھاؤ سے فطرہ ادا کرے تو ادا ہوگا یا نہیں، یا تھانہ بھون کے بھاؤ سے دینا ہوگا؟

الجواب: قیمت صدقۂ فطر میں قیاس علی الزکوٰۃ کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ موضع مال کی قیمت کا اعتبار ہو قال فی الدر ویقوم فی البلد الذی فیہ المال ولو فی مفازۃ ففی اقرب المواضع الیہ اھ (ص ۳۵ ج ۲) وفیہ ایضاً صدقۃ الفطر کالزکوٰۃ فی المصارف وفی کل حال الا فی جواز الدفع الی الذمی وعدم سقوطھا بھلاک المال وقد مر اھ (ص ۱۲۷ ج ۲) اور اس فرق پر نظر کی جائے کہ زکوٰۃ کا سببِ وجوب مال ہے، اس لئے موضع مال معتبر ہوا) اور صدقۂ فطر کا سببِ وجوب راس ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ صدقۂ فطر

میں اُس جگہ کی قیمت کا اعتبار کیا جاوے جہاں متصدق وقت ادائے صدقۂ فطر کے موجود ہے، والثانی راجح عندی نظراً الی العلۃ ولم ارہ صریحا فلیراجع، واللہ اعلم، ۲۴ رجب ۴۵ھ۔

ایک شخص ایک مسکین کو صدقہ فطر دے یا کئی مسکینوں کو دینا بھی جائز ہے

سوال (۵) فتاویٰ امدادیہ میں ہے: وجاز دفع کل شخص فطرتہ الی مسکین علی المذھب کما جاز دفع صدقۃ جماعۃ الی مسکین واحد بلا خلاف، اور عالمگیریہ جلد اوّل کتاب الزکوٰۃ میں ہے کہ ویجب دفع صدقۃ فطر کل شخص الی مسکین واحد حتی لو فرقہ علی مسکینین او اکثر لم یجز ویجوز دفع ما یجب علی الجماعۃ الی مسکین واحد کذا فی التبیین ص ۱۲۴ ج ۱، پس ان دونوں قول میں کس کا قول مرجح ہے، اور کس پر عمل کرے، ادلۂ شرعیہ سے ارشاد فرماویں؟

الجواب: قال فی الدر وجاز دفع کل شخص فطرتہ الی مسکین او مساکین علی ما علیہ الاکثر وبہ جزم فی الولوالجیۃ والخانیۃ والبدائع والمحیط وتبعھم الزیلعی فی الظھار من غیر ذکر خلاف وصححہ فی البرھان فکان ھو المذھب کتفریق الزکوٰۃ والامر فی حدیث اغنوھم للندب فیفید الاولویۃ کما دفع صدقۃ جماعۃ الی مسکین واحد بلا خلاف یعتد بہ اھ ص ۱۰۲ ج ۲۔

اس سے معلوم ہوا کہ فتاویٰ امدادیہ میں جو لکھا ہے وہی صحیح ہے، اور عالمگیریہ میں جو ایک شخص کا صدقۂ فطر ایک ہی مسکین کو دینا واجب اور تفریق کو غیر جائز لکھا ہے وہ قول ضعیف پر مبنی ہے، ہاں عمل میں اَولیٰ وہی ہے جو عالمگیریہ میں ہے، گو اس کے خلاف بھی جائز ہے، واللہ اعلم۔

۲۲ جمادی الثانیہ ۴۶ھ۔

جس جگہ گندم اور دوسری منصوص اشیاء موجود نہ ہوں وہاں صدقۂ فطر ادا کرنے کا طریقہ

سوال (۶) دریں دیار بر بہار زراعت گندم نیست، اگر بعوض گندم قیمتش دادہ شود، پس قیمتِ گندم وغیرہ منصوص علیہ کدام جا کردہ صدقۂ فطر دادہ شود، از روئے مہربانی رفع اشتباہ فرمایند؟

الجواب: والمعتبر فی الزکوٰۃ مکان المال وفی الوصیۃ مکان الموصی وفی الفطرۃ مکان المؤدی عند محمد وھو الاصح در، بل صرح فی النھایۃ والعنایۃ بانہ ظاھر الروایۃ وھو المذھب کما فی البحر، شامی (ص ۱۱۲ ج ۲) وفی الدر ایضا ولو فی مفازۃ ففی اقرب الامصار الیہ، فتح (ص ۳۵ ج ۲)۔

جس شہر میں گندم نہ ہو اگر وہاں جَو (شعیر) موجود ہو یا اور کوئی منصوص تو صدقۂ فطر ایک صاع جو کی یا دوسرے منصوص کی قیمت سے ادا کیا جائے، اگر گندم اور جَو وغیرہ منصوص نہ ہوں تو اس شہر سے قریب تر شہر جو ایسا ہو جس میں گندم وجو موجود ہوں تو اس قریب تر شہر میں نصف صاع گندم یا ایک صاع جو کی قیمت جو کچھ ہو اس سے صدقۂ فطر ادا کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ ذیقعدہ ۴۷ھ

وزنِ صاع کی تحقیق

سوال (۷) صدقہ فطر جو کہ ہر شخص کے ذمہ نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو وغیرہ واجب بتلایا جاتا ہے، مگر یہ یقینی نہیں بتلایا جاتا کہ نصف صاع یا ایک صاع انگریزی تول کے حساب سے جو کہ اسّی تولہ کا ہوتا ہے، کیا ہونا چاہئے؟ بعض کہتے ہیں کہ احناف کے نزدیک ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ رطل کتنے وزن کا ہوتا ہے، اور کیا قیمت رکھتا ہے؟ بعض کا قول ہے کہ صاع انگریزی تول کے حساب سے ساڑھے تین سیر یا تین سیر دس چھٹانک کا ہوتا ہے، اور نصف صاع ایک سیر تیرہ چھٹانک یا ساڑھے بارہ چھٹانک یا ساڑھے نو چھٹانک یا دو سیر پختہ بتاتے ہیں، اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ صاع اور نصف صاع کو حساب کی شکل میں لا کر بالتفصیل تحریر فرمایا جاوے تاکہ یقینی طور پر صاع اور نصف صاع کی بابت معلوم ہو جاوے کہ وہ اسّی تولہ کے حساب سے کتنے کا ہوتا ہے، بیّنوا؟

الجواب: درمختار میں صاع کا وزن ایک ہزار چالیس درہم لکھا ہے، اور درہم کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن شرح وقایہ میں دس درہم کو سات مثقال کے برابر لکھا ہے اور مثقال کا صحیح وزن بقول غیاث اللغات ۴ ۱/۲ ماشہ ہے، پس درہم ۳ ماشہ ۱/۵ ۱ رتی کا ہوا، (مظاہر حق میں بھی درہم کا یہی وزن لیا ہے) اور صاع دو سو بہتر تولہ کا ہوا، جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنی بیاض میں درج کر دیا ہے، اب اُن کے سیر ہر شخص اپنے علاقہ کے مطابق کر سکتا ہے، اسّی کے حساب سے نصف صاع پونے دو سیر کا ہوتا ہے، اور ہمارے علمائے کرام کا یہی قول ہے، مگر احتیاطاً پورے دو سیر ادا کرنے کے لئے فرما دیا کرتے ہیں، اسی پر عمل کرنا چاہئے، اور دوسرے اقوال جو صاع کے متعلق ہیں ان کی بناء درہم کے وزن

ع۵ خلاصہ اس وجہ سے کہ مذکور وزن ماش یا مسور کا ہے یعنی جس برتن میں دو سو بہتر تولہ مسور سماتی ہو اس میں گیہوں بھر کر دینا چاہئے اور ظاہر ہے کہ گیہوں کا وزن اور ماش و مسور کا وزن متفاوت ہے، ۳۔

۵ و نیز گیہوں خود ہلکی و بھاری ہوتی ہے، پس احتیاط دو سیر میں ہے تاکہ یقیناً صدقۂ فطر ادا ہو جاوے ۱۲ منہ

میں اور خود صاع کے وزن میں (کہ وہ کتنے درہم کا ہے) اختلاف ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

فائدۂ عظیمہ: حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک مُد تھا جس کی سند حضرت زید بن ثابتؓ تک مسلسل ہے کہ حضرت زیدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُد سے ناپ کر وہ مُد بنایا تھا، اس مُد کو حضرت مولانا تھانوی مدظلہم العالی نے دو مرتبہ بھر کر وزن کیا تو اسّی کے سیر سے پونے دو سیر ہوا تھا، جو حساب مذکورہ بالا کے مطابق ہے، والحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیراً کثیراً۔

نوٹ: نصف صاع ۶ ماشہ، ۱۳۶ تولہ کا ہوا، اور چونکہ روپیہ ۱۱ ماشہ کا ہوتا ہے، اس واسطے ۲ رتی ۸ ماشہ تولہ کا اضافہ کرکے روپیوں کے حساب سے نصف صاع ۲ رتی ۲ ماشہ ۱۴۲ روپیہ بھر ہوتا ہے، کتبہ الاحقر عبدالکریم، ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۴۸ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۴۸ھ۔

فطرہ اور چرم قربانی کی قیمت میں تملیک شرط ہے

سوال (۸) میرے محلہ والے لوگ اکثر قرضدار ہیں اور بعضے توانگر نہیں ہیں، اس لئے چاہتا ہوں کہ اپنے محلہ کی قربانیوں کے چمڑے اور روزوں کے فطرے ایک جگہ جمع کرکے ایک تحویل بنا کے اس کے روپے سے محلہ والوں کو نفع پہونچاؤں، خواہ نسیئۃً بیع کے طریقہ پر خواہ قرض حسنہ کی روش پر تاکہ محلہ والے لوگ سودی قرض سے بچیں، شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ صورت جائز نہیں ہے، کیونکہ چرم قربانی کی قیمت اور صدقۂ فطر کا بطور تملیک دینا ضروری ہے، اور صورت مذکورہ فی السوال میں تملیک مفقود ہے، کما لایخفی، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفا عنہ، ۱۵ر رمضان ۴۸ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔

تحقیق مقدار صدقۂ فطر

سوال (۹) مقدار صدقۂ فطر بحساب بنگالہ کہ از دوازدہ ماشہ تولہ واز پنج تولہ چھٹانک واز شانزدہ چھٹانک یا ہشتاد تولہ سیر باشد چیست؟

الجواب: تقدیرش موقوف بر تحقیق صاع است، لما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادوا صدقا تکم الخ، و دراں اختلاف کثیر است، لیکن بقول فقہائے محققین وزن صاع ۱۰۴۰ درم است، (کذا فی الدر المختار وغیرہ)، و دہ درم از انہا وزن ہفت مثقال (کذا فی الدر وشرح الوقایہ وغیرہما)، و مثقال بقول صحیح چہار و نیم ماشہ (کذا فی الغیاث)،

پس از ۱۰۴۰ درم مبلغ ۳۲۷۶ ماشہ و بحساب مسئول از یک صاع ۲۷۳ تولہ باشد، (چنانچہ در بیاض یعقوبی و مظاہر حق ہمیں حساب موجود است) و صدقۂ فطر نصف صاع از گندم یک سیر و یازدہ چھٹانک یک تولہ شش ماشہ گردید (بو قتیکہ تولہ بوزن بارہ ماشہ گرفتہ شود) (چنانچہ در بیاض یعقوبی و مظاہر حق ہمیں حساب موجود است) لیکن علمائے کرام یک سیر دوازدہ چھٹانک بلکہ برائے مزید احتیاط دو سیر ہم فرمودہ اند، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، احقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۵ر شوال المکرم ۴۸ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ۔

غیر منصوص اشیاء سے صدقۂ فطر ادا کرنے میں قیمت کا اعتبار ہے مقدار کا نہیں

سوال (۱۰) آفتاب دولت سراج ملت جناب حکیم الامت دام ظلہ۔ السلام علیکم، بعد تمنائے قدمبوسی عرض خدمت اقدس یہ ہے کہ فدوی کو بوجہ کم علمی ذیل کے مسئلوں میں نہایت شک پیدا ہوا، لہٰذا امید واثق ہے کہ جواب بالمراد عطا فرما کر فلاح دارین بخشیں گے۔

۱، صدقۂ فطر گیہوں اور جو وغیرہ وغیرہ کے علاوہ چاول جو ہمارے ملک میں خاص غلہ ہے سال بسال انگریزی تول سے ڈھائی سیر بمقابل نصف صاع دینے سے ادا ہوگا یا نہ، یا ہندوستان سے گیہوں کا بھاؤ سال بسال دریافت کرکے اس کی قیمت کے مقابل جتنے سیر چاول آوے دینا ہوگا، یہاں کے بعض عالم یہ بتلاتے ہیں کہ جس ملک میں جس غلہ کا زیادہ تر رواج ہے، اور اسی سے اوقات بسری ہوتی ہے، مذکورہ بالا مقدار پر دینے سے ادا ہوگا، اگر ہو یہ ہمارے مذہب میں ہے یا نہ، مگر یہاں کی اصلی خوراک صرف چاول ہے۔

الجواب: قال فی الدر: وفی الفطرۃ مکان المؤدی عند محمد وھو الاصح اھ وفیہ ایضاً وما لم ینص علیہ کذرۃ وخبز یعتبر فیہ القیمۃ اھ (ص ۱۲۲ ج ۲) جس ملک میں چاول کا رواج زیادہ ہو وہاں چاول کا نصف صاع ادا کرنے سے صدقۂ فطر ادا نہ ہوگا، بلکہ نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو یا ایک صاع چھوارہ کی قیمت ادا کرنے سے صدقۂ فطر ادا ہوگا، اور گیہوں کی ہندوستانی قیمت سال بسال معلوم کرنا معتبر نہیں، بلکہ بنگال ہی میں نصف صاع گیہوں کی جو قیمت ہو اس کا لحاظ لازم ہوگا پس یا تو نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو یا ایک صاع چھوارہ ادا کیا جائے، یا ان میں سے کسی ایک کی قیمت نقد یا اس قیمت کے برابر چاول ادا کئے جائیں۔

سوال ۲، کتاب صدقۂ فطر میں جو ایک صاع مذکور ہے چاول اس کے مقابل

میں دوچند دینے سے انگریزی تول سے اس کی مقدار کتنی ہوگی؟

الجواب: اس سوال کی حاجت کیا ہے، نصف صاع کا وزن پونے دو سیر ہے، انشی کے سیر سے اس کا دوچند خود معلوم کرلیا جائے، لیکن اگر ایک صاع چاول بھی نصف صاع گیہوں کی یا ایک صاع جَو و چھوارہ کی قیمت کو نہ پہونچے تو صدقۂ فطر ادا نہ ہوگا، ۱۰ ذیقعدہ ۴۸ھ

صدقۂ فطر وصول کرنے کی غرض سے کمیٹیاں قائم کرنا

سوال (۱۱) بعض لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ جابجا کمیٹیاں قائم کرکے لوگوں سے صدقۃ الفطر وصول کریں، اور اس کی تقسیم کا انتظام کمیٹیاں کریں، آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں، ؟

الجواب: آجکل کمیٹیوں کی جو حالت ہے اس سے یہ امید نہیں کہ صدقۃ الفطر کو صحیح طور پر مصارف میں صرف کیا جائے گا، نیز یہ بھی اندیشہ ہے کہ کمیٹی والے مسلمانوں سے صدقۃ الفطر جبراً وصول کریں گے، حالانکہ اس میں جبر کا کسی کو حق نہیں، اس لئے یہ صورت درست نہیں، ہر شخص جہاں چاہے اور جسکو چاہے اپنا صدقہ دے، یہی بہتر ہے، واللہ اعلم بالصواب

ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ رج ۲ ۵۸ھ، الجواب عین الصواب، اشرف علی عفی عنہ ۲۹ رج ۲ ۵۸ھ

بابُ المصارف

تنو بیگھہ زمین کے مالک کو عیال دار ہونے کی صورت میں زکوٰۃ لینے کا حکم

سوال (۱) زید غریب ہو مسکین ہے، مگر اس کی دختر مرحومہ کا زر مہر مثلاً ہزار دو ہزار روپے زید کے داماد کے ذمہ واجب ہے، جو کہ نالش کرنے پر ممکن ہے وصول ہو جائیں اور ممکن ہے وصول نہ ہوسکیں مگر زید کا عزم نالش کرکے وصول کرنے کا ہے معاف کرنے کا نہیں ہے۔

اور ایسے ہی بکر مفلس خستہ حال عیال دار ہے مگر اس کے نام ایک موضع ویران شدہ میں آراضی زرعی ہزار بیگھہ ہے، جو کہ موضع ویران ہو جانے سے محض بیکار پڑی ہے، کچھ آمد نہیں، البتہ فروخت کرنے تو کئی ہزار مل سکتے ہیں، تو ایسے دونوں شخصوں کو زکوٰۃ کا مال شرعاً جائز ہے یا نہیں، جواب باصواب معہ دستخط مرحمت فرمادیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان دونوں شخصوں کو زکوٰۃ لینا جائز ہے، مگر جس کے پاس افتادہ زمین ہے اس کو لازم ہے کہ اس کو فروخت کرنے کی کوشش کرے، اور جب تک خریدار نہ پیدا ہو زکوٰۃ کا مال لے سکتا ہے، قال فی الدر و تحفہ مالو کان مالہ مؤجلاً او

علی غائب او معسر او جاحد ولو لہ بینۃ فی الاصح اھ قال الشامی وفی الفتح دفع الی فقیرۃ لہا دین مہر علی زوجہا یبلغ نصابا وھو موسر بحیث لو طلبت اعطاھا لا یجوز وان کان لا یعطی لو طلبت جاز اھ ص ۹۹ ج ۲ و ذکر فی الفتاوی فی من لہ حوانیت ودور للغلۃ لکن غلتہا لا تکفیہ ولعیالہ انہ فقیر ویحل لہ اخذ الصدقۃ عند محمد وعند ابی یوسف لا یحل اھ ص ۱۰۳ ج ۲ شامی و لو کان لہ ضیعۃ تساوی ثلثۃ الاف ولا تخرج ما یکفی لہ ولعیالہ اختلفوا فیہ قال محمد بن مقاتل یجوز لہ اخذ الزکوٰۃ عالمگیریہ ص ۱۲۲ ج ۱، ۲۳ ر ۱ ۴۳ھ

تراویح سنانے والے کو اجرت میں رقم دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

سوال (۲) میرے ملکوں میں بعض حافظ بعض مسجدوں میں باجرت تراویح میں قرآن سناتے ہیں، اور بعض کو بعد ختم کے للہ وغیرہ کہہ کر دیتے ہیں، ایسے ملک میں جو حافظ اجرت و شبہ اجرت کو ناجائز بتلاتے ہیں اگر اس کو مصلیوں نے صدقۂ فطر و زکوٰۃ کہہ کر کچھ روپیہ پیسہ دیں، لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو حافظ اجرت پر قرآن سناتے ہیں اُن کو زکوٰۃ و فطرہ دینے سے واجب ذمہ سے ساقط نہ ہوگا، کیونکہ مال زکوٰۃ و فطرہ کا تصدق و تملیک مجاناً ضروری ہے، اور یہاں اجرت میں دیا گیا، البتہ جو حفاظ باجرت نہیں سناتے، بلکہ اجرت و شبہ اجرت کو ناجائز سمجھتے ہیں اگر وہ فقیر ہوں صاحب نصاب نہ ہوں ان کو زکوٰۃ و فطرہ کا روپیہ دینا جائز ہے، مگر یہ تصریح کردینی چاہئے کہ یہ تم کو اجرت میں نہیں دیا گیا نہ تمہارا کچھ حق تھا، محض غریب سمجھ کر دیا گیا ہے، نیز جب ان حفاظ کے پاس قدر نصاب رقم جمع ہو جاوے اس کے بعد ان کو زکوٰۃ و فطرہ نہ دیا جاوے، ورنہ واجب ادا نہ ہوگا، الا ان یکون مدیونا بقدر ما یحیط بمالہ فیصح فافہم، ۳ر شعبان ۴۳ھ

بیوی، شوہر، باپ، بیٹے کو صدقہ و نذر دینا جائز نہیں

سوال (۳) معروض اینکہ حضور فیض گنجور در یں دیار در مسئلہ مذکور اختلاف افتاد، ولہذا بخدمتِ حضور عرض کنم تا کہ از ہمگنان تنازع بخیزد و حق ظہور شود تا اقتدا ہمگناں برائے حضور زند، جناب از روئے مہربانی مسئلہ مرقومۃ الذیل را بیان فرمودہ فیصلہ کنند کہ اگر زوج محتاج باشد زوجہ صدقۂ نذر بخود زوج دادن جائز است یا نہ، یا بالعکس اگر پدر محتاج باشد پسر پدر خود را صدقہ، نذر دادن جائز است یا نہ یا بالعکس مسئلہ نذر فتاوی عزیزی از مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ جلد دوم صفحہ ۱۰۶

مرقوم است ومجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص ۲۹۹ وجلد سوم ص ۳ ۱۲ از مولانا عبدالحیٔ صاحب مرقوم است وبہشتی زیور حصہ سوم ص ۶۳ مرقوم است لیکن ہمگناں را ازیں کتب مسئلہ مذکور بتصحیح درفہم نمی آید لاجرم بخدمت حضور عرض نمائیم، زیادہ والسلام۔

الجواب: فی العالمگیریۃ (ص ۲۱ اج ۱) ولا یدفع الی اصلہ وان علا وفرعہ وان سفل کذا فی الکافی ولا یدفع الی امرأتہ للاشتراک فی المنافع عادۃ ولا تدفع المرأۃ الی زوجہا عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کذا فی الہدایۃ وھکذا فی الدر وقال الشامی تحت قول الدر مصرف الزکوٰۃ الخ وھو مصرف لصدقۃ الفطر والکفارۃ والنذر وغیر ذلک من الصدقات الواجبۃ کما فی القہستانی، پس زوج وزوجہ وپدر وپسر را صدقہ نذر دادن جائز نیست، فقط

کتبہ عبدالکریم عفی عنہ ۸ جمادی الاول ۴۴؁ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔

زکوٰۃ کے روپیہ سے ضیافت کرکے فقیروں کو کھلانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

سوال (۴) زکوٰۃ کے روپے سے اگر ضیافت کرکے فقیروں کو کھلادیوے تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب: فقیروں کو کھانا کھلانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، البتہ اگر ان کو کھانا بطور ملک دیدیا جاوے تو ادا[عہ] ہوجاوے گی، کما فی الشامی (ص ۳ ج ۲) فلو اطعم یتیما ناویا للزکوٰۃ لا یجزیہ الا اذا دفع الیہ المطعوم، کتبہ الاحقر عبدالکریم ۸ جمادی الاولیٰ ۴۴؁ھ۔

کافر کو زکوٰۃ ودیگر صدقات واجبہ دینے کے متعلق "بہشتی زیور" کے مسئلہ پر شبہ کا جواب

سوال (۵) بہشتی زیور مدلل ومکمل جلد سوم صفحہ ۴۴ مسئلہ نمبر ۸ میں بحوالہ درمختار ص۷۶ ج۲ مرقوم ہے کہ زکوٰۃ کا پیسہ کسی کافر کو دینا درست نہیں، مسلمان ہی کو دیوے، اور زکوٰۃ اور عشر اور صدقہ فطر اور نذر اور کفارہ کے سوا اور خیر خیرات کافر کو بھی دینا درست ہے، درمختار میں دیکھا گیا تو یہ عبارت ملتی ہے۔

وجاز دفع غیرھا وغیر العشر والخراج الیہ ای الذمی ولو واجبا کنذر وکفارۃ وفطرۃ خلافا للثانی وبقولہ یفتی حاوی القدسی، اور شامی میں خلافا للثانی کے تحت مرقوم ہے، حیث قال ان دفع سائر الصدقات الواجبۃ الیہ

[عہ] بقدر اس کھانے کے قیمت کے خواہ اس کی تیاری میں لاگت کم لگی ہو یا زیادہ ۱۲ از حضرت مولانا مدظلہم العالی۔

لا یجوز اعتبارا بالزکوٰۃ وصرح فی الہدایۃ وغیرہا بان ہذہ روایۃ عن الثانی وظاہرہ ان قولہ المشہور کقولہما اور بقولہ یفتی کے تحت میں ہے الذی فی حاشیۃ الرملی عن الحاوی وبقولہ ناخذ قلت ولکن کلام الہدایۃ وغیرہا یفید ترجیح قولہما وعلیہ المتون، ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے صرف ایک روایت ہے، کہ نذر وکفارہ ودیگر صدقات واجبہ کافر کو دینا جائز نہیں ہے، مگر طرفین کے نزدیک اور خود امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جیسا کہ ظہور روایۃ عنہ سے ظاہر ہے، زکوٰۃ کے علاوہ باقی تمام صدقات واجبہ اور نافلہ کا دینا جائز ہے۔

اور بہشتی زیور کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ کے سوا کا دینا جائز ہے، اور صدقات واجبہ نہیں دے سکتا، اب شبہ یہ ہو رہا ہے کہ متون اور طرفین رحمہما اللہ کے خلاف بہشتی زیور میں کیوں درج ہوا، کیا کوئی دوسری دلیل ان سب دلائل پر فوقیت رکھنے والی موجود ہے، اگر موجود تھی تو کیوں نہیں درج فرمائی گئی، اور اگر نہیں موجود ہے تو یہ دلائل کیوں نظر انداز کردیئے گئے، امید کہ شافی جواب سے تشفی بخشی جاوے؟

الجواب: چونکہ امام ابو یوسفؒ کی وہ روایت مفتیٰ بہ ہے جس میں نذر وکفارہ کو زکوٰۃ کے حکم میں داخل کیا ہے، (چنانچہ سوال میں بقولہ یفتی وبقولہ ناخذ خود نقل کیا ہے) پس اس بناء پر بہشتی زیور میں نذر وکفارہ کو زکوٰۃ کے ساتھ درج کیا ہے، باقی رہی یہ بات کہ متون کے خلاف کیوں لکھا، اس کا جواب یہ ہے کہ متون کے خلاف اگر فتویٰ کی تصریح موجود ہو تو فتوے پر عمل کیا جاوے گا، کما فی الشامی (ص ۴، ج ۱) اما لو ذکرت مسئلۃ فی المتون ولم یصرحوا بتصحیحہا بل صرحوا بتصحیح مقابلہا فقد افاد العلامۃ قاسم ترجیح الثانی لانہ تصحیح صریح وما فی المتون تصحیح التزامی والتصحیح الصریح مقدم علی التصحیح الالتزامی، اور ہم کو فقہاء کی تصریح کے بعد وجہ تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن ان کی تصریح بالفتویٰ کے بعد اس کے کہنے کی جرأت ہوسکتی ہے، کہ امام ابو یوسفؒ کی روایت میں احتیاط ہی، اس لئے وہی مفتیٰ بہ ہے، کافر کو نذر وغیرہ دے کر ادا ہونا محتمل ہے، کما ہو الظاہر، بلکہ ہندوستان میں تو طرفینؒ کے قول کو لے کر بھی نذر وغیرہ صدقات واجبہ نہ دینا چاہئے، کیونکہ طرفین کے نزدیک بھی ہر کافر کو دینا جائز نہیں، بلکہ ذمی کی قید ہے، جیسا کہ سوال کی عبارت میں موجود ہے، دیز درمختار ہی میں عبارت مذکورہ فی السؤال کے بعد ہے: واما

واما الحربی ولو مستامنا فجمیع الصدقات لا تجوز له اتفاقا بحر عن الغایہ (شامی ص ۱۰۸ ج ۲) اور ہندوستان کے کفار کا ذمی ہونا مختلف فیہ ہے، ہذا ما سنح لی واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبد الکریم ۶ رمضان المبارک سنہ ۴۴ھ۔

زکوٰۃ اپنے لڑکے کو دینے سے ادا نہیں ہوتی

سوال (۶) خالد اپنے مال کی زکوٰۃ خود نکالتا ہے اس زکوٰۃ کا پیسہ سے اپنے لڑکے کے لئے کتابیں خرید دیتا ہے، آیا یہ زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں، اور یہ لڑکا حقیقی اور شامل حال ہو، شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: اس صورت میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، کیونکہ اولاد والدین وزوجین زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں، واللہ اعلم، ۲۱ شعبان سنہ ۴۵ھ۔

جس شخص پر قربانی واجب ہو مگر زکوٰۃ واجب نہ ہو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے یا نہیں

سوال (۷) بندہ کے اسباب مکان کی رو سے قربانی تو واجب ہے اور بوجہ نہ جمع ہونے روپیہ کے زکوٰۃ واجب نہیں، اب میرے پاس جاڑے کا لحاف نہیں ہے، جو کچھ روپیہ حساب کا ہے وہ اگر لحاف میں خرچ کیا جاوے تو ضروری خرچ میں تنگی ہوگی، اب مدرسہ میں جو لحاف بمد زکوٰۃ آئے ہیں بندہ کو لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جو شخص صاحب نصاب زکوٰۃ نہ ہو مگر صاحب نصاب صدقۃ الفطر و قربانی ہو اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہیں، قال فی الدر فی بیان نصاب صدقۃ الفطر وبہ ای بھذا النصاب تحرم الصدقۃ کما مر وتجب الاضحیۃ اھ (ص ۱۱، ج ۲) قال الشامی قولہ تحرم الصدقۃ ای الواجبۃ اما النافلۃ فانما یحرم علیہ سؤالہا واذا کان النصاب المذکور مستغرقا بحاجتہ فلا تحرم علیہ الصدقۃ ولا یجب بہ ما بعدہا اھ قلت ولکن السؤال یفید فراغ النصاب عن الحاجۃ لقول السائل انہ ممن تجب علیہ الاضحیۃ وھی لا تجب الا علی الذی عندہ نصاب غیر نام فارغ عن الحاجۃ الاصلیۃ فلا یجوز للسائل ان یاخذ مال الزکوٰۃ، واللہ اعلم، ۱۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۶ھ۔

ایضاً ایضاً ایضاً

سوال (۸) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گذارش ہے کہ بندہ پر بوجہ اسباب مکان کے اضحیہ اور صدقۃ الفطر تو واجب ہے، لیکن بوجہ نہ ہونے نصاب نامی کے زکوٰۃ واجب نہیں، اور اس وقت مسافری کی حالت میں دفعیہ جاڑے کے واسطے

لحاف کی ضرورت ہے، اور اگر اپنے پاس سے خرچ دے کر تیار کرا لیا جاوے تو آئندہ ضروری خرچوں میں تنگی کا احتمال ہے، پس اس صورت میں مدرسہ میں جو لحاف بمد زکوٰۃ آئے ہیں، بندہ کو لینا جائز ہوگا، والسلام،

الجواب: ہاں اس صورت میں بوجہ ابن السبیل ہونے کے آپ کو زکوٰۃ کی چیز لینا جائز ہے، لیکن سوال کرنا جائز نہیں، بدون سوال کے مل جائے تو جائز ہے، اور اگر مال زکوٰۃ تقسیم کرنے والا یہ کہے کہ جسکو حاجت ہو وہ درخواست پیش کرے خواہ آپ سے کہے یا عام طور پر خانقاہ والوں سے کیا جائے تو اس صورت میں حاجت کی اطلاع کرنا سوال میں داخل نہیں، پس اطلاع کر دینا جائز ہے، واللہ اعلم، ۱۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۶ھ۔

الاحتیاط اللازم فی التصدق علی بنی ہاشم زمان دیگر، والقول الحاسم فی حرمۃ الزکوٰۃ علی بنی ہاشم

السوال (۹) ما قولکم دام ظلکم فی رجل اعطی زکوٰۃ مالہ سنین عدیدۃ لبنی ہاشم عارفا ایاھم وھو یظن انھم من مصارف الزکوٰۃ فھل یجب علیہ ان یعید ما دفعہ الیھم بعد ما علم انہ لا یجوز لھم دفع الزکوٰۃ ام کیف الامر وھل ترون دفع الزکوٰۃ الی بنی ہاشم فی زماننا ھذا بناء علی روایۃ ابی عصمۃ رحمہ اللہ؟ فانہ لا تخفی علی سیادتکم الحالۃ البائسۃ التی نزلت بالمسلمین عامۃ و ببنی ہاشم خاصۃ بالدیار الہندیۃ والناس لا یکادون ان یتوجھوا الیھم بما یسد فاقتھم بید ان البعض ممن یخاف اللہ سبحانہ تکاد نفسہ ان تسمح بدفع بعض الصدقات الواجبۃ ھذا وللہ الفضل والمنۃ ولرسولہ ثم لکم۔

الجواب عن مسئلۃ الصدقۃ علی بنی ہاشم

اقول لا یخفی علی فضیلتکم ان مذہب ائمتنا الثلاثۃ تحریم الصدقۃ علی بنی ہاشم مطلقا فریضتہا ونافلتہا الا ما کانت بطریق الہدیۃ والھبۃ کما ذکرہ الطحاویؒ فی شرح الآثار وقواہ بالدلائل النقلیۃ والنظریۃ ثم قال فلما حرم علی بنی ہاشم اخذ الصدقات المفروضات حرم علیہم اخذ الصدقات غیر المفروضات ھذا ھو النظر فی ھذا الباب وھو قول ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمد رحمہم اللہ (ص ۳۰۱ ج ۱) قال المحقق ابن الہمام فی الفتح

وهو رأی تحریم الصدقة علیهم مطلقاً (۱۲ منہ) الموافق للعمومات فوجب اعتباره فلا یدفع الیهم النافلة الاعلی وجه الهبة مع الادب وخفض الجناح تکرمة لاهل بیت رسول الله صلی الله علیه وسلم (ص ۲۱۲ ج ۲) ولکن المشائخ توسعوا فی ذلک وقالوا لجواز النافلة لهم واجابوا عن العمومات بانها وان کانت عامة لفظاً کقوله صلی الله علیه وسلم انا آل محمد لا ناکل الصدقة وفی روایة انا اهل بیت قد نهینا ان ناکل الصدقة وفی لفظ ان آل محمد لا یحل لهم الصدقة ولکنها مخصوصة معنی بدلیل ما اخرجه مسلم من روایة عبد المطلب بن ربیعة مرفوعاً ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد الحدیث ففیه ما یشعر بعلة حرمة الصدقة علیهم وهی کونها من اوساخ الناس والمال لیس بنجس وانما یتدنس خلافاً للقیاس باسقاط الفرض ضرورة انه صار مطهراً بالنص وهو قوله تعالی خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزکیهم بها لا یقال ان الصدقة النافلة مطهرة ایضاً لانا نقول لا دلیل علی کونها مطهرة بل یجوز ان تکون محسنة مزینة مجلیة والتحسین والتزیین والجلاء محله بعد التطهیر فلا یلزم منه تدنس ما یحصل به ذلک فیبقی ما وراءه علی ما یقتضیه القیاس من الطهارة الاصلیة فان الثابت خلاف القیاس یقتصر علی مورده والنص هو قوله من اوساخ الناس ورد فی المکتوبة خاصة کما هو ظاهر حدیث عبد المطلب بن ربیعة فیجوز ما سوی الزکوٰة ونحوها من الواجبات لبنی هاشم وهذه التوسعة التی وسع بها المشائخ علی بنی هاشم هی غایة ما یصار الیه ولا یتصور عندنا الزیادة

عہ ویرد علیه ان حرمة الصدقة علی بنی هاشم کحرمتها علی النبی صلی الله علیه وسلم سواء بسواء کما هو ظاهر النصوص ولیس فیها ما یعین الفرق ولا یخفی انها کانت محرمة علی النبی صلی الله علیه وسلم مطلقاً یدل علیه حدیث سلمان انه اتی النبی صلی الله علیه وسلم بصدقة حین قدم المدینة فردها علیه وقال انا لا ناکل الصدقة وکان سلمان عبداً ممن لا یجب علیه الزکوٰة وقد صح انه صلی الله علیه وسلم اذا علم بشیء انه صدقة امسك عنه مطلقاً ولم یسئل انه صدقة من زکوٰة او غیر ذلك فتأمل ۱۲ ظ

علیه واما ما رواه ابو عصمة عن الامام واشار الیه الطحاوی ایضاً انه یجوز دفع سائر الصدقات الیهم فی زمانه لان عوضها وهو خمس الخمس لم یصل الیهم الخ کما فی رد المحتار (ص ۱۰۶ ج ۲) فهو ضعیف روایة ودرایة لا یجوز الاخذ به اصلاً اما ضعفه روایة فلان ابا عصمة ضعیف رواه ابن المبارك وغیره بالکذب والوضع واما ضعفه درایةً فلان مبناه علی کون خمس الخمس لبنی هاشم عوضاً عن تحریم الصدقة علیهم فان کان قاله الامام بالرأی قلنا هذا تعلیل بمعارض النص فان حدیث عبد المطلب بن ربیعه عند مسلم دال علی ان علة التحریم کون الصدقات من اوساخ الناس وان قاله بالنص فلابد له من نص یدل علی کون ذلك عوض عن هذه ولم یرد نص صحیح بذلك اصلاً فیما علمناه واما اللفظ الذی رواه صاحب الهدایة انه صلی الله علیه وسلم قال یا بنی هاشم ان الله تعالی حرم علیکم غسالة الناس واوساخهم وعوضکم منها بخمس الخمس فغریب جداً کما صرح به الزیلعی وانما الصحیح ما اخرجه مسلم بلفظ ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد ولیس فیه ما زاده فی الهدایة من قوله وعوضکم منها بخمس الخمس نعم قد رواه الطبرانی بطریق حنش عن عکرمة عن ابن عباس وفی آخره فقال لهما صلی الله علیه وسلم انه لا یحل لکم اهل البیت من الصدقات شیء وان لکم فی خمس الخمس ما یغنیکم انتهی کما فی نصب الرایة (ص ۴۱۸ ج ۱) ولکن لیس فیه دلالة علی کون خمس الخمس لبنی هاشم عوضاً عن تحریم الصدقات علیهم بل یحتمل ان یکون قوله ان لکم فی خمس الخمس ما یغنیکم تسلیة لهما ومعناه انه لا حاجة لکم الی الصدقات الآن لان لکم فی خمس الخمس ما یغنیکم ولا یجب عموم التسلیة ولا ابقاؤها علی حالها دائماً بل یجوز ان یسلی واحد بشیء واخر بشیء وان یکون التسلیة فی زمان بشیء وفی زمان اخر بشیء اخر وذلك لان التسلیة لا تکون علة للحکم بل المقصود منها حض المخاطب علی الامتثال وتقویة قلبه لذلك کما لا یخفی۔

وان سلمنا کونه دالاً علی معنی التعویض فنقول لفظ الطبرانی هذا لم یصح سنده لان حنشا متروك ولا یروی عن عکرمة مولی ابن عباس احد غیره

ممن يلقب بحلش كما لا يخفى على من مارس الاسانيد) واسمه حسين بن قيس ابو
على الرحبى (تقريب) وروى ابن ابى شيبة فى مصنفه حدثنا وكيع ثنا شريك عن
خصيف عن مجاهد قال كان آل محمد صلى الله عليه وسلم لا تحل لهم الصدقة
فجعل لهم خمس الخمس ورواه الطبرى فى تفسيره ثنا ابن وكيع به (سنداً ومتناً)
كما فى نصب الراية وفيه تائيد للفظ الهداية فانه مشعر بكون خمس الخمس
عوضاً عن تحريم الصدقة عليهم ولكنه موقوف على مجاهد وفى سنده خصيف و
هو صدوق شئ الحفظ خلط باخره ولقائل ان يقول ان حديث مثله حسن فى الدرجة
الثانية وهو صالح للاحتجاج به والاعتذار عن وقفه ممكن بان معناه مما لا يدرك
بالرأى واذا روى التابعى ما لا يدرك بالرأى كان فى حكم المرسل المرفوع وهو حجة
عند الحنفية. تامل، ويرد عليه ان الاحتجاج بقول مجاهد يقتضى ان يكون سهم
ذوى القربى وهو خمس الخمس باقياً، ويجب على الامام ان يصرف خمس الخمس
من الغنيمة على بنى هاشم وهذا انما هو قول الشافعى دون ابى حنيفة فعندنا يقسم
الخمس على ثلثة اسهم سهم لليتامى وسهم للمساكين وسهم لابن السبيل يدخل
فقراء ذوى القربى فيهم ولا يدفع الى اغنيائهم كما صرح به فى الهداية (ص ۵۵۶ ج)
وليس لهم خمس الخمس عندنا متعيناً ولو كان ذلك عوضاً عن تحريم الصدقات
عليهم لوجب صرفه اليهم وذلك يقتضى تخميس القسمة لا تثليثه وهذا خلاف
المشهور من مذهب ابى حنيفة وصاحبيه كما لا يخفى على من مارس الفقه واذا
كان كذلك فالقول باباحة صرف الصدقات الى بنى هاشم لعدم وصول خمس
الخمس اليهم انما يصح لمن قال بتعين حقهم فى خمس الخمس فى حياة النبى
صلى الله عليه وسلم وبعد وفاته كما قال ابن عباس واخذ به الشافعى واما
من قال ان خمس الخمس لم يكن لبنى هاشم لا فى حياة النبى صلى الله عليه وسلم
ولا بعد مماته وانما ذكر الله ذوى القربى فى الآية مع اليتامى والمساكين،
بحال فقرهم وحاجتهم فادخلهم مع الفقراء والمساكين وقدم فقراءهم
ومساكينهم على فقراء غيرهم فلا يخرج لهم سهم من الغنيمة على حدة بل
سهم الفقراء والمساكين يكفيهم ويقدمون على غيرهم من الفقراء كما هو مذهب ابى حنيفة رح

واصحابه فلا يجوز له القول باباحة صرف الصدقات الى بنى هاشم الآن
لعدم وصول خمس الخمس اليهم ولا يصح منه القول بذلك ابداً الا انه لا يقول
بحقهم فى خمس الخمس فافهم والله تعالى اعلم هذا ما عندنا ولا يخفى ان الاول
فى المذهب هو الصحيح رواية ودراية ولا يجوز الافتاء بالضعيف مع العلم بضعفه
وبعد ذلك فاللازم على الرجل المسئول عنه اعادة زكوة هذه السنين التى انفق
زكوتها على بنى هاشم عارفاً اياهم، وظنه انهم من مصارف الزكوة باطل، فعليه
ان يعيد زكوتها وان لم يستطع ذلك لعدم المال فليعدها بحيلة الاسترداد
من الفقير والاستيهاب منه وهى لا تخفى على مثلكم، واما ما ذكرتم من الحالة
البائسة التى نزلت بالمسلمين فهى لا تختص ببنى هاشم منهم بل تعمهم وغيرهم
ولو ابحنا لهم الحرام لاجل ذلك فلنبح الربوا والرشوة لغيرهم ايضاً لاجل هذه
الحالة البائسة ولا يجترى على ذلك احد، والسلام۔

فان قيل قال فى البحر عن الحاوى القدسى وعن ابى يوسف: ان الخمس
يصرف لذوى القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل وبه ناخذ اھ فهذا
يقتضى ان الفتوى على الصرف الى الاقرباء الاغنياء فليحفظ اھ (ص ۹۱ ج ۵)
وهذا ايد رواية ابى عصمة ويدفع الايراد الذى اورد قبل على الاستدلال
باثر مجاهد بانه يقتضى تخميس الخمس لا تثليثه وهذا خلاف مذهب
ابى حنيفة واصحابه وانما هو مذهب الشافعى الخ فان ما رواه الحاوى القدسى
عن ابى يوسف رح يدل على بقاء التخميس فى مذهب الحنفية ايضاً ولو كان ذلك
خلاف المشهور فليؤخذ به للضرورة -

- -

قلت هذا لا يجدى - - - - - - - - - -

- -

شيئاً فان ما رواه الحاوى يفيد كون خمس الخمس حقاً لبنى هاشم كلهم غنيهم
وفقيرهم فلو كان تحريم الصدقة عوضاً عنه كما يفيده اثر مجاهد للزم جواز
الصدقة على اغنياءهم ايضاً اذا لم يصل اليهم خمس الخمس ولم يقل به احد
ولو امعنت النظر لعرفت ان رواية ابى يوسف رح هذه تفيد تحريم الصدقة

علی بنی ہاشم مطلقا لکونہا دالۃ علی ان حقہم فی خمس الخمس باق واثر مجاہد قد افاد ان علۃ التشریع فی تحریم الصدقۃ علی بنی ہاشم کونہم قد عوضوا منہا بخمس الخمس فما دام ہذا التشریع باقیا کان الحکم باقیا ولا ینعدم الا بانعدام التشریع واما بظلم الولاۃ ومنعہم بنی ہاشم عن حقہم فلا ینعدم الحکم بہ اصلا فان مدار الاحکام انما ہو علی التشریع وعلتہ لا علی افعال الولاۃ والامراء فاذا کان الشارع قد شرع تحریم الصدقۃ علی ذوی القربیٰ بعلۃ تفویضہ خمس الخمس لہم عنہ ووضعہ حقہم فیہ وجب ان یبقی حکم التحریم ببقاء حکم ہذا التعویض لہم وہذا ظاہر جدا۔ ومبنی ہذا الجواب علی تسلیم ان اثر مجاہد یدل علی ان کون خمس الخمس لبنی ہاشم علۃ لتحریم الصدقۃ علیہم ولقائل ان یقول ان اثر مجاہد فیہ بیان حکمۃ ہذا التشریع لا علتہ والعلۃ انما ہی کون الصدقۃ من اوساخ الناس وہی المنصوصۃ فی کلام الشارع والحکم انما یدور مع العلل دون الحکم واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۲ صفر ۱۳۴۷ھ

سوال (۱۰) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام	رسالہ رفع التشکیک فی دفع الزکوٰۃ بالتملیک مذاکرہ در مصارف زکوٰۃ

علیٰ رسولہ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، امابعد واضح ہو کہ دینی ضروریات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، اور ان میں سے اکثر کے لئے آمدنیوں کی قلت ہوتی ہے، اور شرعاً آجکل زکوٰۃ کے سوا کوئی ایسی مد نظر نہیں آتی جس کے ترک پر وعید شدید شرعی سنائی جائے، اور اس زکوٰۃ میں حضرات فقہائے کرام نے تملیک کی شرط لگائی ہے، جس کی وجہ سے مساجد، مدارس دینی، تبلیغ واشاعت اسلام اور تصنیف وتالیف کتب دینیہ کے بہتیرے کام رک جاتے ہیں یا جیسے چلنے کی ضرورت ہو ویسے چلنے نہیں پاتے، کیونکہ اُن پر مال زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی خرچ نہیں کئے جاسکتے، اس لئے کہ امور مذکورہ میں تملیک نہیں ہوسکتی، اور ان امور مذکورہ میں تملیک جاری کرنا ہو تو حیلہ کی تلاش کرنا پڑتی ہے، جس کا ثبوت آیات واحادیث اور اقوالِ سلف سے نہیں ملتا ہے، پس امور مذکورہ کا اجراء یا تو صدقاتِ غیر واجبہ سے کیا جاوے، جن کے نہ دینے سے مسلمان وعید کے مستحق نہیں ہوسکتے، یا آیات واحادیث کے عموم ہی سے کیوں نہ ہو، ان امور مذکورہ کو مصارف زکوٰۃ میں داخل کیا جائے۔

مسئلہ بالا کے متعلق ایک عرصہ دراز سے بلکہ زمانہ طالب علمی سے خلجان رہا، اور حضرات شیوخ کرامؒ کے افادات سے کچھ کچھ منزل مقصود کا نشان نظر آرہا تھا، بالآخر دو چار سال کے عرصہ میں بعض معزز ومحترم خیر خواہ حضرات اس مسئلہ کو چھیڑتے رہے، جس پر فاضل محقق عالی جناب مولانا محمد عبد الوہاب صدر مدرس جامعہ دار السلام عمر آباد نے آیت "فی سبیل اللہ" کی تعمیم اور چند احادیث سے استدلال فرما کر امور مذکورہ کو مصارفِ زکوٰۃ میں شامل فرمایا، مولانا ممدوح کی تحریر سے خاکسار کے خیالات میں امید وجرأت پیدا ہوئی، جس کے بعد خاکسار بغرض استفادہ اپنے ناچیز منتشر خیالات کو حضرات رہنمایانِ دین کی خدمات میں پیش کرتا ہے، جن کے متعلق امید کہ آنحضرات اپنے اپنے تنقیدانہ وتحقیقانہ افادات سے ممنون فرمائیں گے، اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ۔

جمیع حضرات علمائے کرام پر یہ امر بخوبی روشن ہے کہ امت محمدیہ کے پاس مصارفِ زکوٰۃ کی دلیل آیت عظیمہ ذیل ہے:۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَۃِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ط فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ہ

"صدقے صرف فقیروں کے لئے ہیں اور محتاجوں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے جو صدقات پر کام کرتے ہیں اور اُن لوگوں کے لئے جن کی تالیف قبول کی جاوے، اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کی مدد میں خرچ کئے جاویں، خداوند پاک کی جانب سے یہ حکم ہے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے"

(۱) للفقراء کا لام جمیع سلف صالحین کے پاس تملیک کے لئے ہے یا نہ؟ تفاسیر وشروحِ حدیث کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف بھی ائمہ کرام کی ایک جماعت گئی ہے کہ لام اس آیت میں تملیک کے لئے نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں یہ رقم فرمایا ہے کہ:۔

ان اللام فی قولہ تم للفقراء لبیان المصرف لا للتملیک اھ	"لام "فقراء" کے شروع میں مصرف بیان کے لئے ہے تملیک کے لئے نہیں"

اور علامہ سیوطیؒ نے اتقان کی کتاب الادوات میں لام کے متعدد معنی جو پندرہ سے زیادہ ہوں گے بیان کئے ہیں، اُن میں سے صرف لام تعلیل کے متعلق حقیقی یا مجازی معنی ہونے کا اختلاف اہلِ لسان سے ذکر کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ باقی معانی حقیقی ہیں۔

اصولِ فقہ کی کتاب "حصول المامول من علم الاصول" مطبوعہ مصر میں لام کے بائیس معنی ذکر کئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی مثال قرآن پاک سے دی گئی ہے۔

اور کتبِ نحو میں عموماً اور شرح جامی میں خصوصاً یوں مرقوم ہے:۔

اللام للاختصاص بملكية او بغير ملكية۔	"لام اختصاص کے لئے آتا ہے خواہ ملکیت کے طور پر ہو یا بلا ملکیت کے"۔

امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں پہلے چار مصرفوں میں لام کے آنے اور بعد کے چار مصرفوں میں فی کے آنے کا فرق یوں بیان فرمایا ہے کہ پہلے چار مصرف والوں کو اپنے حاصل کردہ مال زکوٰۃ میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہے اور پچھلے چار مصرف والوں کو اپنے حسبِ منشا تصرف کا اختیار نہیں، پس لام سے تملیک کی شرط اجتہادی محتمل چیز ہوئی نہ کہ قطعی اور منصوص۔

(۲) فی سبیل اللہ کے معنی میں تعیین اور اس تعیین پر اجماع ہوا ہے یا نہ؟ اگر تعیین اور اس پر اجماع ہو چکا ہے تو کتبِ فقہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شافعیہ کے پاس اغنیاء مجاہدین کو مالِ زکوٰۃ سے دے سکتے ہیں، اور یہ امام حنیفہؒ کے پاس ناجائز ہے، اور امام ابو یوسفؒ نادار مجاہدین کو ہی مال کی زکوٰۃ دینے کی اجازت دیتے ہیں، اور امام محمدؒ نادار حاجیوں کو بھی مالِ زکوٰۃ سے دیگر حج کرانے کی اجازت اس لفظ فی سبیل اللہ سے نکالتے ہیں۔

اتنے مختلف اقوال کے بعد اگر کوئی یہ کہے کہ ان اقوال و مذاہب کے سوا نیا قول گویا اجماع کے مرکب کا خرق ہے، اس لئے وہ نیا قول ناجائز قرار دیا جائے، تو یہ عرض ہے کہ جن لوگوں نے اس مقام میں اجماع کا ذکر فرمایا ہے وہ اصولی اصطلاحی اجماع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اجماعِ امت کا لفظ اس مقام میں کسی نے ذکر کیا ہو، دیکھنے میں نہیں آیا، بلکہ اجماع الجمہور لکھا ہے، اجماع اور جمہور کی اضافت خود اصولی اصطلاحی اجماع ہونے سے انکار کرتی ہے۔

علاوہ بریں امام قفال نے بعض ائمہ سے عام مصارفِ خیر جیسے کہ امور مذکورہ اوقاف وغیرہ کو فی سبیل اللہ کے معنی میں نقل فرمایا ہے جسکو امام رازیؒ، علامہ بیضاویؒ اور صاحبِ خازن نے اپنی اپنی تفسیروں میں بیان فرمایا ہے اور سب کے الفاظ قریب قریب حسب ذیل ہیں:۔

وقال بعضهم ان اللفظ عام فلا يجوز قصره على الغزاة فقط ولهذا اجاز بعض الفقهاء صرف سهم سبيل الله الى جميع وجوه الخير من تكفين الموتى وبناء الجسور والحصون وعمارة المساجد وغير ذلك وقال لان قوله تعالى وفي سبيل الله عام في الكل فلا يختص بصنف دون غيره، اه	"اور کہا بعض علماء نے کہ لفظ عام ہے، اس کو صرف مجاہدین پر قصر کرنا جائز نہیں، اسی لئے بعض فقہائے کرام نے "سبیل اللہ" کا حصہ سب نیک کام مثلاً تکفینِ موتیٰ، پلوں اور قلعوں اور مساجد وغیرہ کے بنانے میں خرچ کرنے کو جائز رکھا، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "فی سبیل اللہ" سب نیک کاموں کو شامل ہے، صرف ایک جماعت کے ساتھ خاص کرنا نہیں چاہیے"،

اور شرح وقایہ کے حاشیہ عمدۃ الرعایہ میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے مصارفِ زکوٰۃ کے مقام میں فقہ کی کتاب بدائع سے نقل فرمایا ہے کہ:۔

وذكر في البدائع انه يشمل جميع القرب،	"فی سبیل اللہ کا لفظ جمیع نیک مصرفوں کو شامل ہے"۔

(۳) امام بخاریؒ اپنی جامع صحیح بخاریؒ کے "باب العرض فی الزکوٰۃ" میں ابوہریرہؓ سے ابن جمیلؓ، خالد بن ولیدؓ اور حضرت عباسؓ کے منع زکوٰۃ کی توجیہ والی حدیث نقل فرماتے ہیں اور اسی روایت کو "باب والغارمین وفی سبیل اللہ" میں مکرر لائے ہیں، امام بخاریؒ کا مدعا امام ابن حجرؒ نے فتح الباری میں یوں ذکر فرمایا ہے:۔

واستدل البخاري بقصة خالد على مشروعية تحبيس الحيوان والسلاح وان الوقف يجوز بقاؤه تحت يد محتبسه وعلى جواز اخراج العروض في الزكوٰة،	"امام بخاریؒ نے حضرت خالدؓ کے قصہ سے جانوروں اور ہتھیاروں کے وقف کرنے اور وقف کی ہوئی چیزوں کا واقف کی نگرانی میں رہنے اور زکوٰۃ میں نقد کے عوض متاع کے دینے پر دلیل پکڑی ہے (یہ بطور مالِ زکوٰۃ وقف میں دیا گیا)"،

پس شروح بخاریؒ سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے خالدؓ کے واقعۂ وقف کو زکوٰۃ میں شمار فرمایا، اور آیت "فی سبیل اللہ" میں تملیک کو غیر ضروری سمجھا جو حضرات احناف کرام

کے خلاف ہیں، اور وقف منقول کو بھی جائز سمجھا، اور یہ اکثر فقہائے کوفہ کے مخالف ہے، اور زکوٰۃ میں نقد کے عوض متاع دینا ثابت کیا، جو فقہائے حنفیہ کے موافق ہے، جس کو مولانا حافظ احمد علی صاحب حنفی محدث سہارنپوریؒ محشی صحیح بخاری نے اپنے حاشیہ بخاری میں یوں رقم فرمایا ہے:۔

قال العینی احتج اصحابنا فی جواز دفع القیم فی الزکوٰۃ ولھذا قال ابن رشید وافق البخاری فی ھذا المسئلۃ الحنفیۃ مع کثرۃ مخالفتہ لھم، قال الکرمانی: وفیہ دلیل علیٰ صحۃ وقف المنقول وبہ قالت الامۃ باسرھا الا بعض الکوفیین،	"علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ ہمارے حضرات نے زکوٰۃ میں قیمتوں یعنی متاع کو دینا جائز کہا، اور اس پر اس حدیث سے دلیل پکڑی، اور اسی لئے ابن رشید نے کہا کہ بخاریؒ نے اس مسئلہ میں حنفیہ کی موافقت کی، حالانکہ وہ اُن کے اکثر مسائل میں مخالفت کرتے ہیں، علامہ کرمانیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث میں منقولات کے وقف کی اجازت

ثابت ہوتی ہے جس کی قائل بعض اہل کوفہ کے سوا ساری اُمّت ہے"،

الحاصل امام بخاریؒ کے استدلال کے جواب میں کوئی آیت یا حدیث صریح حضرات مانعین پیش فرما سکتے ہیں؟ رہی مانعین کے احتمالات وہ مجوزین کے پاس ناشی عن الدلیل نہ ہوں، اور مجوزین کی تجویز اُن کے احتمالات کی بہ نسبت واضح ترین اور اقرب الی الدلیل ہو تو امام بخاریؒ کے استدلالات کا قطعی اور تشفی بخش جواب کیا ہوگا؟

مذکورہ بالا معروضات پیش کرنے کے بعد مجوزین کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آیت مصارف میں سے سات حصے خاص خاص افراد یا جماعتوں پر خرچ کئے جائیں، اور ایک حصہ عام مصارفِ خیر کے لئے رکھدیا جاوے تاکہ آٹھویں مصرف میں سہولت کے ساتھ امور مذکورہ ادا کئے جائیں، ورنہ تبرعات اور تطوعات اختیاری امور ہیں جن پر جبر واکراہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ کرنے والوں پر وعید بھی نہیں ہوتی، اور بناءِ مساجد و مدارس دینی اور مصارفِ تبلیغ وغیرہ خدانخواستہ بالکل متروک کئے جائیں گے۔

چونکہ زمانہ موجودہ میں یہ مسئلہ مہمات مسائل میں سے ہے، لہٰذا بغرض استفادہ یہ امر بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بوقت شدتِ حاجت حضرات فقہائے کرام نے بھی

اپنے امام کے خلاف دوسرے امام کے فتوے پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ اجرت تعلیم قرآن کی بابت صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ اجرت علیٰ تعلیم القرآن جائز نہیں، مگر متاخرین نے بوجہ ضرورت اجازت دی ہے، تاکہ تعلیم قرآن معدوم نہ ہو، اور اسی طرح مفقود الزوج کے نکاح کا مسئلہ معروف بین العلماء ہے۔

انہی امور کو مدنظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں گویا امام بخاریؒ کا مسلک اختیار فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے:۔

وعن ابی الاسؓ حملنا النبی صلعم علیٰ ابل الصدقۃ للحج وفی الصحیح واما خالد فانکم تظلمون خالداً وقد احتبس ادرعہ واعتدہ فی سبیل اللہ وفیہ شیئان جواز ان یعطی مکان شئ شیئاً اذا کان انفع للفقراء وان الحبس مجزئ عن الصدقۃ قلت وعلیٰ ھذا فالحصر فی قولہ تعالیٰ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ اضافی بالنسبۃ الی ما طلبہ المنافقون فی صرفھا فیما یشتھون علیٰ یقتضیہ سیاق الآیۃ والسر فی ذلک ان الحاجات غیر محصورۃ ولیس فی بیت المال فی البلاد الخالصۃ للمسلمین غیر الزکوٰۃ کثیر مال فلابد من توسعۃ لتکفی نوائب المدینۃ واللہ اعلم۔	"ابو الاسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو صدقہ (زکوٰۃ) کے اونٹوں پر حج کے لئے سوار کرایا، اور صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم خالد پر ظلم کرتے ہو، جو اس سے زکوٰۃ طلب کرتے ہو، حالانکہ اس نے بکتر اور ہتھیار اللہ کی راہ میں وقف کئے ہیں اس حدیث سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں! ایک تو ایک چیز کے عوض دوسری چیز زکوٰۃ میں دے سکتے ہیں، جبکہ دوسری چیز فقراء کے لئے زیادہ نافع ہو اور یہ کہ وقف صدقہ زکوٰۃ کے بدلے کافی ہے، میں کہتا ہوں (یعنی حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں) کہ اس صورت میں حصر فرمانِ خداوندی اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ کے جملہ میں اضافی ہے، منافقوں کے مطلب کے مقابلہ میں کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی خواہشوں کے مطابق زکوٰۃ

کی رقم بیجا خرچ کی جاوے، جیسا کہ آیت کی روانی کا مقتضا ہے، اور زکوٰۃ کے مصرف میں وقف کو داخل کرنے میں راز یہ ہے کہ ضروریات بے شمار ہیں، اور مسلمانوں کے خالص شہروں

میں زکوٰۃ کے سوا کوئی معتد بہ مد نہیں ہوتی، لہٰذا ضرور ہوا کہ مصرفِ زکوٰۃ میں وسعت ہو، جو کافی حاجات ہو جیسا کہ آیت کے نزول کے موقع پر مدینہ مسلمانوں کا خالص شہر تھا واللہ اعلم۔

الجواب: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، لاسیما علی سیدنا النبی محمد الذی قد افلح من بہ اقتفی، وبسنتہ وسنۃ خلفائہ المھدیین المجتھدین اقتدی وبھا اکتفی، ومن احدث فی امرہ وشرعہ ما لیس منہ واتبع ھواہ فقد خاب وخسر وظلم نفسہ وجفا، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ رؤس اھل الوفاء وافضل الخلق بعد الانبیاء وسادات اھل الصفاء،

اما بعد، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے میں اُن دلائل کو ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جن کی بناء پر ائمہ مجتہدین نے زکوٰۃ کی تعریف میں تملیکِ فقیر کی قید بڑھائی، اور بدون اس کے عدم ادا زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے۔

مبحث اوّل در دلائل رکنیتِ تملیک برائے زکوٰۃ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز کے حکم کے ساتھ جہاں بھی زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے وہاں لفظ ایتاء اختیار فرمایا ہے، اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ الی قولہ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وقولہ رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وغیرھا من الآیات اور لغۃً ایتاء کے معنی اعطاء یعنی تملیک کے ہیں، صاحب بدائع فرماتے ہیں: وقد امر اللہ تعالیٰ الملاک بایتاء الزکوٰۃ لقولہ عزوجل وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ والایتاء ھو التملیک اھ (ص ۳۹ ج ۲)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے مالکانِ (اموال) کو ایتاء زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے، اور ایتاء کے معنی مالک بنا دینا ہے، (وفی الحدیث المشھور بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ الحدیث اخرجہ الشیخان والجماعۃ۔

(۲) مصارفِ زکوٰۃ کے متعلق جو آیتِ عظیمہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقات سے تعبیر فرمایا ہے، اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ الآیۃ اور صدقہ اور تصدق بھی تملیک کو چاہتا ہے، صاحب بدائع فرماتے ہیں: ولذا سمی اللہ تعالیٰ الزکوٰۃ صدقۃ بقولہ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والتصدق تملیک اھ (ص ۳۹ ج ۲) اور شرح سیر کبیر للامام محمد بن الحسن میں ہے لان ھذا جعل ثلث مالہ فی سبیل اللہ علی وجہ الصدقۃ والصدقۃ تملیک من اھل الحاجۃ قال اللہ تعالیٰ انما الصدقات للفقراء الخ (ص ۲۴۴ ج ۴)

اور محمد بن حسن رحمہ اللہ امام عربیت ہیں، اُن کا قول لغت میں حجت ہے، اسی شرح سیر کبیر میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول وقف منقول کے بارہ میں جو ذکر کیا ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کے معنی تملیک ہیں، فاما ابو حنیفۃ رحمہ اللہ فانہ کان لا یجوز الوقف والحبس فی حالۃ الحیوٰۃ فلا یجوز عندہ اذا اوصی بعد موتہ الا ما کان لہ اصل فی الشریعۃ والوصیۃ بالغلۃ لھا اصل فی الشریعۃ فانہ لو اوصی بان یصرف غلۃ بستانہ علی الفقیر فذلک جائز لما یقع فیہ من التملیک فکذلک حبس الاراضی والعبد والدار لیکون غلتھا فی سبیل اللہ یجوز لان فیہ معنی التملیک لان الغلۃ یتصدق بھا علی اھل الحاجۃ ممن یغزو فتصیر ملکا لمن یاخذھا یصنع بھا ما شاء فاما ما لیس فیہ معنی التملیک ولکن فیہ انتفاع بالعین نحو سکنی الدار ورکوب الفرس وقرأۃ المصحف ولبس السلاح وخدمۃ العبید لا اصل فی جوازہ فی الشرع اذا وقع لاقوام مجھولین والمعنی فی ذلک انہ اذا لم یکن فیہ تملیک العین لم یکن صدقۃ اھ (ص ۲۶۳ ج ۴)۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ شریعت میں صدقہ بدون تملیک عین کے کوئی اصل نہیں، نیز اس سے پہلے امام ابو یوسفؒ کا قول وقف منقول میں اس طرح مذکور ہے:

وکان (ابو یوسفؒ) یقول القیاس ان لا یجوز وقف الاراضی لما فیہ من تعطیل الملک ولا تملیک من احد الا ان الشرع عطل ملکنا عن المساجد لقربۃ تعلقت بھا عائد نفعھا الینا من حیث الثواب فجوزنا فی مثلہ فی وقف الاراضی لانھا من جنس المساجد فانھا تبقی وعائد نفعھا کالمساجد، فاما الاموال المنقولۃ ما وجدنا فیھا قربۃ اوجبھا اللہ تعالیٰ الا قربۃ تقع بتملیک الفقیر فکذلک لا یجوز ایجاب القربۃ من العبد الا علی وجہ التملیک اذ ایجاب العبد معتبر بایجاب اللہ تعالیٰ، اس میں صاف تصریح ہے کہ کوئی قربۃ

مالیہ واجبہ منقولات میں بدون تملیک فقیر کے شریعت میں نہیں، اور امام ابو یوسفؒ کے اس دعویٰ میں کوئی کلام نہیں کر سکتا، نہ کسی کو کلام ہے، اور جو لوگ وقفِ منقول کو جائز کرتے ہیں وہ اس کے جواب میں صرف یوں کہیں گے کہ قربتِ نافلہ تو شریعت میں بدونِ تملیک کے واقع ہے، پس ایجاب قربت من العبد کے لئے قربتِ نافلہ کی نظیر کافی ہے، قربت واجبہ کے مثل ہونا لازم نہیں، بہرحال امام ابو یوسفؒ کا یہ ارشاد کہ کوئی قربت مالیہ واجبہ منقولات میں شرعاً بدونِ تملیکِ فقیر نہیں ہے، اس بات کو بتلا رہا ہے کہ صدقہ کے معنی تملیک کے ہیں۔

اور کشاف اصطلاحات الفنون میں ہے الصدقۃ بفتحتین من الصدق سمی بہا عطیۃ یراد بہا المثوبۃ لا التکرمۃ (لان بہا یظہر صدقہ فی العبودیۃ) کما فی جامع الرموز اھ (ص ۸۵۱) اس میں صدقہ کی تفسیر عطیہ سے کی ہے، اور عطیہ میں تملیک ظاہر ہے، کیونکہ عطیہ وہبہ لغۃً متحد ہیں، اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے، الصدقۃ کالہبۃ فلا تجوز الا مقبوضۃ، کذا فی الدر۔

(۳) حدیث مشہور قصہ بعث معاذ الی الیمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ فان ہم اطاعوا لک بذلک فاخبرہم ان اللہ قد فرض علیہم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءہم فترد علی فقراءہم، الحدیث رواہ الشیخان وغیرہما۔

(ترجمہ) ”اگر وہ لوگ اس بارہ میں (یعنی نماز کی فرضیت کے بارہ میں) تمہاری اطاعت کر لیں تو اس کے بعد اُن کو خبر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے، جو اُن کے اغنیاء سے لیا جائے گا، پھر اُن کے فقراء پر واپس کیا جائے گا۔“ یہ حدیث بھی اس بات کو بتلاتی ہے کہ زکوٰۃ تملیکِ فقیر ہی کے لئے موضوع ہے۔

اور اسی کے مثل حدیث ضمام بن ثعلبہ میں وارد ہے:۔ قال انشدک اللہ آللہ امرک ان تأخذ ہذہ الصدقۃ من اغنیاءنا فتقسمہا فی فقراءنا فقال اللہم نعم، الحدیث رواہ الشیخان وغیرہما وہو مشہور ایضاً،

(ترجمہ) ”ضمام بن ثعلبہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی عرض کیا کہ میں آپؐ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ امر فرمایا ہے کہ آپؐ یہ صدقہ ہمارے اغنیاء سے لیں، پھر اس کو ہمارے فقراء میں تقسیم فرما دیں؟ حضورؐ نے فرمایا بخدا ہاں (اللہ تعالیٰ ہی نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے) یہ حدیث بھی بتلا رہی ہے کہ زکوٰۃ فقراء

میں تقسیم کرنے کے موضوع ہے، اور یہ تقسیم بطور تملیک ہی کے ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

(۴) تعریف زکوٰۃ میں شرعاً تملیک فقیر بالاتفاق معتبر ہے، قال الحافظ فی الفتح قال ابن العربی وتعریفہا فی الشرع اعطاء جزء من النصاب الحولی الی فقیر ونحوہ غیر ہاشمی ولا مطلبی ثم لہا رکن وہو الاخلاص وشرط ہو السبب وہو ملک النصاب الحولی وشرط من تجب علیہ وہو العقل والبلوغ والحریۃ الخ قال الحافظ وہو جید لکن فی شرط من تجب علیہ اختلاف اھ (ص ۲۰۰ ج ۳)،

قلت: فدل علی ان ما سواہ متفق علیہ عند الکل، یہ عبارت صاف بتلا رہی ہے کہ زکوٰۃ کی تعریف میں تملیک فقیر اتفاقاً معتبر ہے۔

کشاف اصطلاحات الفنون (ص ۶۲۳) میں ہے: انہا فی اللغۃ النمو الحاصل من برکۃ اللہ تعالیٰ وفی الشریعۃ قدر معین من النصاب الحولی یخرجہ الحر المسلم المکلف للہ تعالیٰ الی الفقیر المسلم الغیر الہاشمی ولا لمولاہ مع قطع المنفعۃ عنہ من کل وجہ، وفی جامع الرموز ان الزکوٰۃ فی الشریعۃ القدر الذی یخرجہ الی الفقیر وفی الکرمانی انہا فی القدر مجاز شرعاً فانہا ایتاء ذلک القدر وعلیہ المحققون کما فی المضمرات انتہی ویؤیدہ انہا توصف بالوجوب وہو من صفات الافعال ویؤید الاول قولہ تعالیٰ واتوا الزکوٰۃ اذ ایتاء الایتاء محال والاظہر ان الزکوٰۃ فی الشرع یجیٔ بکلا المعنیین کذا فی البرجندی اھ، اس میں زکوٰۃ کے شرعاً دو معنی بیان کئے ہیں، اور دونوں میں تملیک فقیر معتبر ہے، جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔

(۵) مال زکوٰۃ کو ایسے مواقع میں صرف کرنا جن میں تملیک نہ ہو، باتفاق ائمہ مذاہب و باجماعِ جملہ مجتہدین جائز نہیں، رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ میں تصریح ہے:۔

واتفقوا علی منع الاخراج لبناء مسجد او تکفین میت اھ (ص ۴۵)

(ترجمہ) ”اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زکوٰۃ بناءِ مسجد اور کفنِ میت میں صرف کرنا ممنوع ہے۔“ اور یہ اتفاق صرف ائمہ اربعہ ہی کا نہیں، بلکہ جملہ ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے، مثل اوزاعیؒ و مکحولؒ و سفیان ثوریؒ و حسن بصریؒ وغیرہم، کیونکہ صاحب رحمۃ الامۃ نے مقدمہ کتاب میں اس کی تصریح کی ہے کہ جس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو اور

کسی دوسرے کا اختلاف ہو تو میں مخالف کا قول بھی نقل کروں گا، تاکہ مسئلہ کا اختلافی ہونا معلوم ہو جائے، اور یہاں کسی کا اختلاف نقل نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق ہے، وھذا نصہ اذا کان فی المسئلۃ خلاف لاحد من الائمۃ الاربعۃ اکتفیت بذلک ولا اذکر من خالف فیہا من غیرھم فان لم یکن احد منھم خالف فی تلک المسئلۃ وکان فیہا خلاف لغیرھم احتجت الی ذکر المخالف لیظھر ان فی المسئلۃ خلافاً اھ (ص ۲ ج ۳)۔

مبحثِ دوم؛ سائل کے جواب سے پہلے میں اس کو بھی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ آیت اِنما الصدقات للفقراء میں حصر حقیقی مقصود ہے کہ زکوٰۃ مفروضہ کے مصارف بھی مصارفِ ثمانیہ ہیں ان کے سوا مصرفِ زکوٰۃ کوئی نہیں۔

دلائل ملاحظہ ہوں:۔

(۱) عن زیاد بن الحرث الصدائیؓ قال اتیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فبایعتہ فاتی رجل فقال اعطنی من الصدقۃ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصدقات حتی حکم فیہا ھو فجزأھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلک الاجزاء لاعطیتک، رواہ ابوداؤد وسکت عنہ وسندہ حسنؓ،

زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے بیعت ہوا، پھر ایک شخص آیا اور کہا یا رسول اللہ مجھ کو صدقہ (کے مال) میں سے دیجئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صدقات کے بارے میں رسول کے فیصلہ پر راضی ہوئے نہ کسی اور کے، یہاں تک کہ اس کا فیصلہ خود ہی فرمایا ہے، اور صدقہ کو آٹھ حصوں پر تقسیم کیا، پس اگر تو ان آٹھ حصوں میں (کسی حصہ میں داخل) ہو تو میں تجھ کو دوں گا

(اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند حسن ہے)۔

یہ حدیث صاف تصریح کر رہی ہے کہ صرف اموالِ زکوٰۃ انہی مصارفِ ثمانیہ میں منحصر ہے، ان کے سوا دوسرے کسی مصرف میں صرف نہیں کی جا سکتی، اور اس کے بعد کسی دلیل کے

ع فیہ عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم الافریقی وثقہ غیر واحد وتکلم فیہ بعضھم ومثلہ حسن الحدیث وقد حسن لہ الترمذی ۱۲ منہ

بیان کی حاجت نہیں، مگر تائیداً اور دلائل بھی ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۲) امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں المسئلۃ الاولیٰ، قولہ انما الصدقات للفقراء الآیۃ تدل علی انہ لاحق فی الصدقات لاحد الا لھذہ الاصناف الثمانیۃ و ذلک مجمع علیہ وایضا فلفظۃ انما تفید الحصر ویدل علیہ وجوہ ثم ذکرھا واطال (ص ۴۵۹ ج ۴)۔

تفسیر کبیر ہی میں ص ۴۶۴ ج ۴ میں ہے اتفقوا علی ان مال الزکوٰۃ لا یخرج عن ھذہ الثمانیۃ واختلفوا انہ ھل یجوز وضعہ فی بعض الاصناف فقط وقد سبق ذکر الدلائل المسئلتین اھ، اس میں صاف تصریح ہے کہ مال زکوٰۃ کا ان مصارف ثمانیہ میں منحصر ہونا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے۔

(۳) صاحب کشافؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں انما الصدقات للفقراء قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودۃ وانھا مختصۃ بھا لا تتجاوزھا الی غیرھا کانہ قیل انما ھی لھم لا لغیرھم ونحوہ قولک انما الخلافۃ لقریش ترید لا تتعداھم ولا تکون لغیرھم اھ (ص ۲۳۸ ج ۲) اس میں بھی صاف تصریح ہے کہ آیت کا مقصود و مطلب یہ ہے کہ جنس صدقات اصنافِ ثمانیہ پر مقتصر اور انہی میں منحصر ہے، ان کے سوا دوسروں کو صدقہ، زکوٰۃ نہیں دیا جا سکتا، اور صاحب کشاف امام عربیت ہیں، ان کی تفسیر معانیِ عربیت میں حجت ہے۔

مبحث سوم فی سبیل اللّٰہ کے معنی میں؛ چونکہ سائل نے فی سبیل اللہ کے معنی میں تعمیم کی کوشش کی ہے، اس لئے اس پر بھی گفتگو لازم ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لغۃً لفظ فی سبیل اللہ ہر طاعت کو عام ہے، مگر اصطلاحِ قرآن وحدیث میں غزات ومجاہدین کے ساتھ مخصوص ہے، مفسرین کا اس پر اتفاق ہے:۔

(۱) امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:۔ الصنف السابع قولہ تعالیٰ وفی سبیل اللّٰہ، قال المفسرون یعنی الغزاۃ اھ (ص ۴۶۳ ج ۴) المفسرون جمع معرف باللام ہے جو عموم کے لئے موضوع ہے، مطلب یہ ہے کہ تمام مفسرین نے فی سبیل اللہ کی تفسیر غزاۃ سے کی ہے۔

(۲) امام حافظ انام علامہ طبریؒ نے بھی فی سبیل اللہ کی تفسیر یہی کی ہے اور فرمایا کہ

کہ اہلِ تفسیر کا یہی قول ہے۔

وھذا نصہ واما قولہ فی سبیل اللہ فانہ یعنی وفی النفقۃ فی نصرۃ دین اللہ وطریقتہ وشریعتہ التی شرعھا لعبادہ بقتال اعداءہ وھو غزو الکفار وبالذی قلنا فی ذلک قال اھل التاویل ذکر من قال ذلک حدثنی یونس انا ابن وھب قال قال ابن زید فی قولہ وفی سبیل اللہ قال الغازی فی سبیل اللہ اھ (ص ۱۱۴ ج ۱۰) ثم سرد احادیث عدیدۃ۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ امام ابن جریر طبریؒ اپنی تفسیر میں ہر آیت کے تحت میں علماء قرآن وائمۂ تفسیر کے مختلف اقوال بکثرت بیان کرتے ہیں، اور اختلاف نقل کرنے کے بعد کسی ایک معنی کو ترجیح دیا کرتے ہیں، لیکن فی سبیل اللہ کی تفسیر میں انھوں نے بجز غزو کفار کے کچھ نہیں بیان کیا، اور حصر کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے وبالذی قلنا فی ذلک قال اھل التاویل فان تقدیم ما حقہ التاخیر یفید الحصر فتقدیم الجار والمجرور فی قولہ وبالذی قلنا افاد انھم لم یقولوا بغیر ذلک اصلاً، کہ جو تفسیر ہم نے کی ہے ائمۂ تفسیر نے بھی صرف یہی تفسیر کی ہے، اس سے یہ بات روشن ہے کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے، اور اگر کسی کا اختلاف منقول ہے تو وہ ائمہ تفسیر میں سے نہیں ہے، بلکہ علماء حدیث وفقہ میں سے ہوگا۔

اور درمنثور میں جو ابن ابی شیبہ وابن المنذر کے حوالہ سے ابن عباسؓ کا (جو ائمۂ تفسیر میں سے ہیں) یہ قول مذکور ہے: انہ کان لایری بأساً ان یعطی الرجل من زکوتہ فی الحج اھ (ص ۱۵۲ ج ۳) اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابن عباسؓ نے فی سبیل اللہ کی تفسیر بمعنی عام کی اور حج میں زکوٰۃ دینا اس لئے جائز سمجھا ہے کہ ان کے نزدیک حج بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے بلکہ ممکن ہے کہ انھوں نے حاج کو ابن السبیل میں داخل کر کے زکوٰۃ سے اس کی امداد کو جائز سمجھا ہو جیسا کہ مدونہ میں مالکؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے حاج منقطع کو ابن السبیل میں داخل کر کے مستحقِ زکوٰۃ قرار دیا، وھذا نصہ قال مالک یعطی من الزکوٰۃ ابن السبیل وان کان غنیاً فی بلدہ قلت فالحاج المنقطع بہ فقال قال مالکؒ ھو ابن السبیل یعطی من الزکوٰۃ اھ (ص ۲۵۰ ج ۱)۔

اس توجیہ سے میرا مقصود یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ مراد غازی ہے، مفسرین سے اس کا خلاف منقول نہیں، بلکہ سب اس پر متفق ہیں کہ ابن عباسؓ

سے جو منقول ہے وہ اس کے خلاف میں نص نہیں۔

(۳) علامہ امام ابوبکر بن العربی نے احکام القرآن میں امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ مجھے اس میں کسی اختلاف کا علم نہیں ہے کہ فی سبیل اللہ سے آیت صدقات میں صرف غزو وجہاد مراد ہے، اس کے بعد امام ابن العربیؒ نے احمدؒ واسحٰقؒ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک سبیل اللہ صرف حج ہے، پھر یہ کہا کہ ان کا صحیح قول یہ ہے کہ حج بھی غزو کے ساتھ سبیل اللہ میں داخل ہے اس پر امام ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول قانون شریعت کو توڑتا اور قیاس کی لڑی کو بکھیرتا اور مضبوط گرہ کو کھولتا ہے، اور ہرگز کسی اثر میں یہ وارد نہیں ہوا کہ زکوٰۃ حج میں دی جائے، وھذا نصہ قولہ فی سبیل اللہ قال مالکؒ سُبُل اللہ کثیرۃ ولکنی لا اعلم خلافاً فی ان المراد بسبیل اللہ ھھنا الغزو ومن جملۃ سبیل اللہ الا ما یؤثر عن احمدؒ واسحٰقؒ فانھما قالا انہ الحج والذی یصح عندی من قولھما ان الحج من جملۃ السبیل مع الغزو ولانہ طریق بر فاعطی منہ باسم السبیل وھذا یحل عقد الباب ویخرم قانون الشریعۃ وینثر سلک النظر وما جاء قط باعطاء الزکوٰۃ فی الحج اثر اھ (ص ۳۹۶ ج ۱)۔

امام مالکؒ کا لا اعلم خلافاً فرمانا اس امر کی دلیل ہے کہ سلف صالح اور مشائخ ومعاصرین مالکؒ کا طبقہ اس پر متفق تھا کہ فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ ہیں، اور اصولی قاعدہ ہے کہ اجماع لاحق خلافِ سابق کو رفع کر دیتا ہے، اور خلافِ لاحق اجماعِ سابق کو منقوض نہیں کر سکتا، پس اگر صحابہؓ میں سے کسی نے (مثل عبداللہ بن عمرؓ) حج کو فی سبیل اللہ میں داخل کیا ہو تو[ع]

ع جملہ شرطیہ کے ساتھ اس کو اس لئے تعبیر کیا گیا کہ عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے جو فی سبیل اللہ میں ادخالِ حج منقول ہے وہ آیت زکوٰۃ کی تفسیر میں نہیں بلکہ وصیت کے باب میں ہے، کہ ایک شخص نے اپنے مال کے متعلق وصیت کی کہ اس کو سبیل اللہ میں صرف کیا جائے تو عبداللہ بن عمرؓ نے حج میں اس کے صرف کو جائز کہا اور فرمایا کہ یہ بھی سبیل اللہ میں سے ہے، کمافی شرح السیر، ص ۲۴۵ ج ۴، اور وصیت کا مبنیٰ عرف عام پر ہے، ممکن ہے عرفِ عام میں سبیل اللہ حج کو عام ہو، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عرفِ شرع میں بھی سبیل اللہ حج کو عام ہے، اور آیتِ قرآن کی تفسیر عرفِ شرع کیساتھ لازم ہے، عرفِ عام کیساتھ صحیح نہیں، پس عبداللہ ابن عمرؓ وغیرہ کے اس قول سے آیتِ مصارف میں فی سبیل اللہ کی تفسیر میں حج کو داخل کرنا صحیح نہیں، اس لئے امام ابن عربیؒ نے احمدؒ واسحٰقؒ کے قول کو خارمِ قانونِ شریعت کہا، اور درمختار میں محمدؒ کے قول کو قیل سے تعبیر کیا ہے جو

؎ ضعف پر دال ہے ۱۲ منہ

اجماع مابعد سے یہ اختلاف مرتفع ہوجائے گا، اور اس اجماع کو اختلاف لاحق منقوض نہیں کرسکتا۔

(۴) احمد و اسحٰق اور اسی طرح امام محمد بن حسنؒ نے جو فی سبیل اللہ کی تفسیر میں حج کو داخل کیا ہے ہر چند کہ یہ قول ضعیف ہے، اور بقول امام ابن العربی خارم قانونِ شریعت ہے مگر اُن کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حج میں زکوٰۃ کا مال بدون تملیک کے دیدیا جائے، کیونکہ باتفاق ائمہ مجتہدین ادائے زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے کما مر، بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ حاج منقطع کو بطور تملیک کے مالِ زکوٰۃ دینا جائز ہے، کیونکہ وہ بھی فی سبیل اللہ کا فرد ہے، شرح سیر کبیر میں امام محمدؒ کا قول مذکور ہے وان اعطاھا حاجا منقطعا علی وجہ الصدقۃ علیہ جاز اھ، اس میں لفظ اعطاء اور علی وجہ الصدقۃ معنی تملیک میں صریح ہے، مگر اسی کے ساتھ امام محمدؒ کو یہ بھی تسلیم ہے کہ فی سبیل اللہ کا اطلاق اصل میں معنی جہاد و غزو ہی کے لئے ہے، چنانچہ شرح سیر ہی میں ہے لان کل خیر طاعۃ وان کان فی سبیل اللہ ولکن مطلقہ یستعمل فی الغزو والجہاد قال اللہ تعالیٰ قاتلوا فی سبیل اللہ والمراد منہ الجہاد اھ (ص ۲۲۴ ج ۴) اگر کوئی شخص اپنے ثلث مال کے متعلق وصیت کرے کہ اس کو سبیل اللہ میں صرف کیا جائے تو محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کو محتاج غازی پر صرف کیا جائے یہی افضل ہے، گو حاج منقطع پر بھی صرف کرنا اُن کے نزدیک جائز ہے، شرح سیر میں ہے:

ولکن الافضل ان یعطی المحتاج الذی یخرج فی سبیل اللہ لما بینا ان سبیل اللہ اذا اطلق یراد بہ الغزو والجہاد دون غیرہ فکان صرفہ الیہ اولی الیہ اھ (ص ۲۴۵ ج ۴) جب وصیت کے باب میں محمدؒ کا یہ قول ہے حالانکہ اس کا مبنیٰ عرفِ عام پر ہے نہ عرفِ شرع پر تو زکوٰۃ کے بارہ میں آیت مصارف کے جملہ فی سبیل اللہ کی تفسیر تو غازی کے ساتھ یقیناً لازم ہے، کیونکہ عرفِ شرع میں فی سبیل اللہ کا اطلاق جہاد و غزو ہی کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ مفسرین کے اتفاق اور امام مالکؒ کے قول لا اعلم فی ذلک خلافاً سے ظاہر ہے، یہ گفتگو بطور تتمیم کلام کے تھی، اصل مقصود اس مقام پر یہ ہے کہ جن ائمہ مجتہدین نے فی سبیل اللہ میں حج کو داخل کیا ہے، اُن کی مراد یہ ہے کہ حاج منقطع کو مالِ زکوٰۃ بطور تملیک کے دیا جائے، بہرحال اس تعمیم کا اثر شرط تملیک پر اصلاً عائد نہیں۔

(۵) اسی طرح صاحب بدائع نے جو فی سبیل اللہ میں تمام قرب کو داخل کیا ہے اُن کی

مراد بھی یہی ہے کہ بطور تملیک کے ہر مشغول قربت کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، یہ مراد نہیں کہ بغیر تملیک کے بھی صرف زکوٰۃ جائز ہے، چنانچہ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ واما قولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ عبارۃ عن جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعۃ اللہ و سبیل الخیرات اذا کان محتاجا اھ (ص ۴۵ ج ۲) اس میں قول کل من سعی فی طاعۃ اللہ صاف بتلا رہا ہے کہ صاحب بدائع کی مراد سبیل اللہ کے عموم جمیع قرب سے یہ ہے کہ اس میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو مشغولِ طاعت اور محتاج ہوں، اور یقیناً اُن پر جو کچھ صرف ہوگا تملیکاً ہوگا، پس اس سے یہ سمجھنا کہ صاحب بدائع فی سبیل اللہ میں تکفینِ موتیٰ و بناءِ مساجد وغیرہ کو بھی داخل کرتے ہیں، بالکل غلط ہے، کیونکہ صاحب بدائع نے اس سے پہلے تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی تصریح کی ہے، اور اس پر یہ حکم متفرع کیا ہے کہ بناء مساجد و رباطات و سقایات و اصلاحِ قناطر و تکفین موتیٰ وغیرہ میں صرف زکوٰۃ بوجہ عدم تملیک کے جائز نہیں وھذا نصہ فرکن الزکوٰۃ ھو اخراج جزء من النصاب الی اللہ تعالیٰ وتسلیم ذلک الیہ بقطع المالک یدہ عنہ بتملیکہ من الفقیر وتسلیمہ الیہ او الی ید من ھو نائب عنہ وھو المصدق الی ان قال وعلی ھذا یخرج صرف الزکوٰۃ الی وجوہ البر من بناء المسجد والرباطات والسقایات واصلاح القناطر وتکفین الموتیٰ ودفنھم انہ لا یجوز لانہ لم یوجد التملیک اصلا اھ (ص ۳۹ ج ۲)

ان ابحاثِ ثلاثہ سے فراغت کے بعد میں سائل کے دلائل پر توجہ کرتا ہوں:

(۱) سائل نے سب سے پہلے للفقراء کے لام میں بحث کی ہے، کہ یہ لام ملک کے لئے ہے یا نہ؟ پھر حافظ ابن حجرؒ[عـہ] کا قول فتح الباری سے نقل کیا ہے ان اللام فی قولہ تعالیٰ للفقراء لبیان المصرف لا للتملیک اھ، اس بحث کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک کی شرط اسی پر موقوف ہے کہ لام للفقراء میں ملک کے لئے ہے، اور اس میں اختلاف ہے، لہٰذا زکوٰۃ میں قید تملیک بھی مختلف فیہ ہوگی، مگر اس سے ہر شخص کو جو فقہ

عـہ اس مقام پر یہ بات قابلِ تنبیہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے یہ قول اپنی طرف سے بیان نہیں کیا، بلکہ امام حسن بصریؒ کے قول کی توجیہ میں بیان فرمایا ہے، پوری عبارت یہ ہے وفیہ مصیر منہ الی ان اللام فی قولہ للفقراء لبیان المصرف لا للتملیک فلو صرف الزکوٰۃ فی صنف واحد کفی اھ، پس نقل میں سائل نے مسامحت کی ہے جس سے اہل علم کو احتراز لازم ہے ۱۲ منہ

سے مناسبت رکھتا ہو، سائل کے قصور نظر پر تعجب ہوگا کیا سائل کو معلوم نہیں کہ ائمہ حنفیہ زکوٰۃ میں تملیک کو رکن کہتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی وہ لام للفقراء کو ملک کے لئے نہیں مانتے اور حافظ ابن حجرؒ کا قول حنفیہ کے عین موافق ہے، ہدایہ میں ہے فہذہ جہات الزکوٰۃ فللمالک ان یدفع الی کل واحد منہم ولہ ان یقتصر علی صنف واحد وقال الشافعی لایجوز الا ان یصرف الی ثلاثۃ من کل صنف لان الاضافۃ بحرف اللام للاستحقاق ولنا ان الاضافۃ لبیان انہم مصارف لا لاثبات الاستحقاق الی ان قال ولا یبنی بہا مسجد ولا یکفن بہا میت لانعدام التملیک وھو الرکن اھ، اس میں صاف تصریح ہے کہ لام للفقراء حنفیہ کے نزدیک بیان مصارف کے لئے ہے، استحقاق و ملک کے لئے نہیں، مگر پھر بھی وہ تملیک کو زکوٰۃ میں رکن قرار دیتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوا کہ شرطِ تملیک کی دلیل لام للفقراء نہیں بلکہ اس کے علاوہ ہے، جس کا مفصل بیان مبحثِ اوّل میں گذر چکا، پس سائل کا لام میں گفتگو کرنا محض فضول ولاطائل ہے۔

(۲) اس کے بعد سائل نے فی سبیل اللہ کے معنی میں بحث کی ہے، کہ اس کے معنی میں تعیین اور اس تعیین پر اجماع ہوا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب مبحثِ سوم سے بخوبی واضح ہو چکا ہے، کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے، اور امام مالکؒ کے زمانہ تک اس میں اختلاف نہ تھا، کہ فی سبیل اللہ سے مراد غازی ہیں، اختلاف ان کے بعد حادث ہوا، اور علماءِ امت نے اس قول کو کہ فی سبیل اللہ میں حج بھی داخل ہے خارم قانون شریعت اور ضعیف کہہ کر رد کر دیا ہے اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ فی سبیل اللہ میں حج اور جمیع قرب داخل ہیں تو ائمہ مجتہدین میں سے کسی کا یہ قول ہرگز نہیں کہ حج یا جمیع قرب میں بدونِ تملیک کے زکوٰۃ کا دینا جائز ہے، بلکہ جو لوگ حج کو اس میں داخل کرتے ہیں یا جمیع قرب کو عام کہتے ہیں وہ تملیک کی شرط کو ضروری کہتے ہیں، ائمہ اربعہ اور جمیع مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ تملیک رکنِ زکوٰۃ ہے، محمدؒ نے جو حج کو فی سبیل اللہ میں داخل کرتے ہیں اس کی تصریح کی ہے کہ حاج منقطع کو تملیک کے طور پر صدقہ دیا جائے، صاحبِ بدائع نے جمیع قرب کو فی سبیل اللہ میں شامل کیا ہے، مگر تملیک کی شرط کو بار بار ذکر کرتے ہیں، پس یہ بحث بھی سائل کو کچھ مفید نہیں، کیونکہ فی سبیل اللہ کا عموم شرطِ تملیک کی نفی نہیں کرتا، ہاں سائل نے تفسیر کبیر و بیضاوی اور خازن کے حوالہ سے بعض فقہاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سہم سبیل اللہ کو تمام وجوہِ خیر مثل تکفینِ موتٰی و بناءِ جسور و عمارت مساجد وغیرہ میں صرف کرنا جائز ہے،

کیونکہ لفظ فی سبیل اللہ سب کو عام ہے اھ یہ قول البتہ بظاہر شرط تملیک کی نفی کر رہا ہے اگر سبیل اللہ سے مراد سہم زکوٰۃ ہے مگر یہ قول لغو و باطل ہے، کیونکہ عرفِ شرع میں فی سبیل اللہ جہاد و غزو کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ اوپر گذر چکا، اور امام ابو بکر ابن العربی نے جب احمد و اسحٰق کے اس قول کو کہ حج فی سبیل اللہ میں داخل ہے خارمِ قانونِ شریعت اور ناشرِ سلکِ نظر کہہ دیا، حالانکہ حج کو جہاد سے شرعاً مناسبت بھی ہے، کیونکہ حدیث میں عورتوں کے لئے وارد ہے جہادکن الحج کہ تمہارا جہاد حج ہے، تو یہ قول خارمِ قانونِ شریعت کیونکر نہ ہوگا، جس میں حج کے سوا جمیع وجوہِ خیر کو سبیل اللہ میں داخل کیا گیا ہے، پھر یہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ بعض فقہاء کون ہیں؟ مقلدین یا مجتہد یا اہلِ ظاہر[عہ] میں سے ہیں؟ اور جب تک قائل معلوم نہ ہو اُس وقت تک کوئی قول مسموع نہیں ہو سکتا، ان هذا الامر دین فانظر واعمن تاخذون دینکم ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء، مبحث اوّل میں شرط تملیک کی دلیل میں نصِ قرآنی و احادیث مشہورہ و اجماعِ مجتہدین مذکور ہوا ہے، اس کے مقابلہ میں قول مجہول کیونکر مسموع ہو سکتا ہے؟! فقہ میں محض قال بعض الفقہاء یا قال بعضہم سے کام نہیں چل سکتا، جب تک قائل معلوم نہ ہو جیسا حدیث میں روایت مجہول معتبر نہیں اس سے زیادہ فقہ میں مجہول کا قول قابل اعتبار نہیں، فافہم۔

علاوہ ازیں یہ کہ سائل نے تفاسیر کو غور سے دیکھا ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہوا ہے، کہ اس سے صرف زکوٰۃ واجبہ مراد ہے یا اس میں صدقات نافلہ بھی داخل ہیں، بعض فقہاء کا قول یہ ہے کہ اس میں صدقاتِ نافلہ بھی داخل ہیں، تو ممکن ہے کہ یہ بعض فقہاء جو فی سبیل اللہ میں جمیع وجوہِ خیر کو داخل کرتے ہیں وہی ہوں، جو انما الصدقات میں صدقات نافلہ کو بھی داخل کرتے ہیں اور چونکہ بالاتفاق صدقات نافلہ کا صرف کرنا جمیع وجوہِ خیر میں جائز ہے، مثل تکفینِ موتٰی و بناءِ مساجد و بناءِ حصون وغیرہ کے، اس لئے وہ اس طرف مضطر ہوئے کہ فی سبیل اللہ کو عام کہیں، مگر اس تعمیم کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ صدقاتِ نافلہ کا جمیع وجوہِ خیر میں صرف کرنا جائز ہے، نہ یہ کہ زکوٰۃ واجبہ بھی بدونِ تملیک کے تمام وجوہِ خیر میں صرف ہو سکتی ہے، تفسیر کبیر ملاحظہ ہو: اتفقوا علی ان قولہ تعالیٰ انما الصدقات دخل فیہ الزکوٰۃ الواجبۃ لان الزکوٰۃ الواجبۃ مسماۃ بالصدقۃ قال

[عہ] اور ظاہر ہے کہ مقلد و اہل ظاہر کا خلاف کسی درجہ میں معتبر نہیں ۱۲ منہ

تعالیٰ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وقال علیہ السلام لیس فیما دون خمسة اوسق صدقة واختلفوا فی انه هل تدخل فیه الصدقة النافلة فمنهم من قال تدخل فیها لان لفظ الصدقة مختص بالنافلة فاذا دخلنا فیه الزکوٰة الواجبة فلا اقل من ان تدخل فیها الصدقة المندوبة وتکون الفائدة ان مصارف جمیع الصدقات لیس الا ھٰؤلاء اھ (ص ۴۶۴ ج ۴)

(۳) اس کے بعد سائل نے امام بخاریؒ کے ایک ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے کہ امام بخاریؒ زکوٰۃ میں تملیک کو واجب نہیں سمجھتے، اور مانعین سے امام بخاریؒ کے استدلال کے جواب میں آیت یا حدیثِ صریح کا مطالبہ کیا ہے اور قطعی و تشفی بخش جواب مانگا ہے،

مگر میں کہتا ہوں کہ پہلے سائل امام بخاریؒ کا صریح قول تو دکھلائے اس کے بعد ہی اس کے جواب کے لئے آیت یا حدیث صریح و قطعی و تشفی بخش جواب کا مطالبہ کرے، امام بخاریؒ نے صراحۃً کہیں یہ نہیں کہا کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط نہیں، انھوں نے تو صرف ایک ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، باب العروض فی الزکوٰۃ، جس کے معنی ہیں کہ زکوٰۃ میں متاع و اسباب کا دینا بھی (بجائے نقود کے) جائز ہے یا نہیں، پھر اس باب کے تحت میں چند احادیث لائے ہیں، اب اس ترجمہ کو اور اُن احادیث کو ملا کر جو کچھ مطلب نکالا جائے گا وہ صراحۃً امام بخاریؒ کا قول نہ ہوگا، بلکہ شارحین کا قول ہوگا، کیونکہ یہ بات اہلِ علم پر ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ کے تراجمِ ابواب کی مطابقت احادیث باب سے بہت دقیق ہوتی ہے! اور بہت جگہ مطابقت ظاہر میں کچھ نہیں معلوم ہوتی، امام بخاریؒ کے تراجم ابواب چیستان سے کم نہیں، جن کی تطبیق احادیث پر جا بجا نہایت دشوار اور دقیق ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ترجمۃ الباب اور احادیث باب میں تطبیق دیتے ہوئے جو وجوہ مختلفہ شارحین بیان کرتے ہیں اُن سے امام بخاریؒ کا مذہب کیونکر متعین ہو سکتا ہے، اور اس کو جزماً امام بخاریؒ کا قول کیونکر کہا جا سکتا ہے۔

اب سنئے، اس مقام پر ترجمۃ الباب یہ قائم کیا گیا ہے، باب العروض فی الزکوٰۃ، اور اس کے تحت میں حضرت خالدؓ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے واما خالد فقد احتبس ادراعه واعتده فی سبیل الله (کہ جب حضرت خالدؓ سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا گیا اور انھوں نے زکوٰۃ نہ دی اور حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ) خالد نے تو اپنی زرہیں اور سامان سب کا سب اللہ کے راستہ میں وقف کر دیا ہے"،
شارحین نے ترجمہ کے ساتھ اس حدیث کی مطابقت میں مختلف وجوہ اور متعدد تاویلیں ذکر کی ہیں، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: مطابقة للترجمة من حیث ان ادراع خالدؓ و اعتده من العرض ولولا انه وقفهما لاعطاهما فی وجه الزکوٰة، او لما صح منه صرفهما فی سبیل الله دخلا فی احد مصارف الزکوٰة الثمانیة المذکورة فی قوله تعالیٰ انما الصدقات للفقراء فلم یبق علیه شئ اھ (ص ۳۴۹ ج ۴)

(ترجمہ) حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے اس طرح ہے کہ حضرت خالدؓ کی زرہیں اور سامان عروض کی قسم سے تھا، اور اگر وہ اُن کو وقف نہ کر چکتے تو زکوٰۃ میں انہی کو دیتے، (معلوم ہوا کہ زکوٰۃ میں عروض کا دینا جائز ہے) یا یہ کہ جب حضرت خالدؓ کا زرہ اور سامان کو سبیل اللہ میں صرف کرنا صحیح ہو گیا، تو یہ سامان مصارفِ زکوٰۃ کے ایک مصرف میں داخل ہو گیا، جو آیتِ صدقات میں مذکور ہیں تو اب اُن کے ذمہ کچھ نہیں رہا، اھ۔

اس میں توجیہ اوّل تو حنفیہ اور جمہور امت کے موافق ہے، اس سے شرط تملیک کا ابطال لازم نہیں آتا، ہاں توجیہ ثانی سے شبہ ہو سکتا ہے کہ وقف ہی سے بدون تملیک کے زکوٰۃ ادا ہو گئی، مگر علامہ عینی کا یہ مطلب ہرگز نہیں، بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ زرہ اور سامانِ حرب کو سبیل اللہ میں وقف کر دینے سے زکوٰۃ ساقط ہو گئی، کیونکہ مال موقوف محلِ زکوٰۃ نہیں، جیسا کہ صفحہ ۳۹۶ ج ۴ میں تصریح کے ساتھ علامہ عینیؒ نے حدیث خالد ہی کی شرح میں فرمایا ہے وفیه اسقاط الزکوٰة عن الاموال اھ، کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال موقوفہ سے زکوٰۃ ساقط کر دی جاتی ہے، اور یہ[1] بات حنفیہ کے موافق ہے کہ

[1] اس مقام پر یہ بات قابلِ تنبیہ ہے کہ سائل نے سوال میں یہ ظاہر کیا ہے کہ قصۂ خالدؓ سے بخاری نے زکوٰۃ میں نقد کے عوض متاع دینا ثابت کیا جو فقہائے حنفیہ کے موافق ہے، اس کے بعد سائل نے مولانا احمد علی صاحبؒ محشی بخاری کی عبارت نقل کی ہے، جس سے دیکھنے والوں کو یہ دھوکہ ہوگا کہ حنفیہ نے بھی حدیث خالد سے وہی سمجھا ہے جو بزعمِ سائل امام بخاریؒ نے سمجھا کہ حضرت خالدؓ نے زرہ بکتر کو زکوٰۃ میں نکالا اور ان کو بدون تملیک کے وقف کر دیا، حالانکہ حنفیہ نے ادا بعرض و ادا قیمت فی الزکوٰۃ کا مسئلہ صرف حدیثِ خالدؓ سے مستنبط نہیں کیا، بلکہ دراصل حدیث معاذ و انسؓ سے مستنبط کیا ہے، اور جو عبارت دفع قیم فی الزکوٰۃ کے متعلق سائل نے حاشیۂ بخاری سے نقل کی ہے وہ حاشیہ مولانا احمد علی صاحبؒ نے حدیث معاذؓ ہی پر تحریر کیا ہے نہ حدیث خالدؓ پر، اور علامہ عینیؒ نے بھی اس مسئلہ کو اولاً (ص ۳۴۸ ج ۴) میں حدیثِ معاذ و حدیثِ انسؓ ہی کے تحت میں بیان کیا ہے، سائل کو ایسی صریح مسامحت سے احتراز کلی لازم تھا، ۱۲ منہ

مال وقف منقول میں زکوٰۃ واجب نہیں، جبکہ حولانِ حول سے پہلے وقف کر دیا گیا ہو اور حضرت خالدؓ نے حولانِ حول سے پہلے ہی اپنا سامان وقف کر دیا تھا، کیونکہ جب انھوں نے مصدق سے انکار کر دیا (جو حولانِ حول پر زکوٰۃ وصول کیا کرتا ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ ماضی کے ساتھ فرمایا کہ خالدؓ تو اپنا سامانِ حرب وقف کر چکے ہیں، تم مطالبۂ زکوٰۃ پر اُن پر ظلم کرتے ہو (اور وقف قبل حولانِ حول کی بحث عنقریب مفصل آئے گی)۔

اور ایک توجیہ حافظ ابن حجرؒ نے کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے قصۂ خالدؓ سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ زکوٰۃ کے مال کو ہتھیار و آلاتِ حرب کی خرید میں لگانا اور جہاد میں اُن سے مدد کرنا جائز ہے، اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو اس امر کی اجازت دی کہ وہ اپنے اس حبس کو زکوٰۃ واجبہ کے حساب میں لگا لیں اھ (۲۶۴/۳)۔

یہ توجیہ البتہ ظاہر میں شرطِ تملیک کے غیر ضروری ہونے پر مبنی ہے، گو تاویل کے ساتھ اس کو بھی علامہ عینیؒ کی تاویلِ ثانی کی طرف راجع کیا جا سکتا ہے۔

اور ایک توجیہ جمہور نے کی ہے انه لو کان نوی باخراجها عن ملكه الزكوٰة عن ماله لان احد الاصناف سبيل الله وهم المجاهدون وهذا يقوله من يجيز اخراج القيم فی الزكوٰة كالحنفية ومن يجيز التعجيل كالشافعية ذكره الحافظ فی الفتح (ص ۲۶۴ ج ۳) کہ حضرت خالدؓ نے ان زرہوں وغیرہ کو اپنی مِلک سے نکالتے ہوئے اپنے مال کی زکوٰۃ کی نیت کی تھی، کیونکہ سبیل اللہ یعنی مجاہدین بھی زکوٰۃ کا ایک مصرف ہے، اور یہ توجیہ وہ لوگ کرتے ہیں جو زکوٰۃ میں قیمت کا ادا کرنا جائز سمجھتے ہیں، جیسے حنفیہ اور زکوٰۃ پیشگی ادا کرنا جائز سمجھتے ہیں، جیسے شافعیہ اھ، اس توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالدؓ نے زکوٰۃ میں زِرہیں وغیرہ نکالی اور اُن کو جہاد کے واسطے رکھ چھوڑا کہ ضرورت کے وقت مجاہدین کو دیدی جائیں گی، اس توجیہ میں اخراج عن الملک سے مراد عزل ہے، اور حبس سے مراد حبسِ لغوی ہے، وقف مراد نہیں، کیونکہ حنفیہ و شافعیہ کے مذہب پر یہی صورت منطبق ہو سکتی ہے، اور حافظ نے اس کو حنفیہ و شافعیہ کی طرف منسوب کیا ہے، پس ان کے مذہب پر انطباق لازم ہے، علامہ عینیؒ کی عبارت حافظ کی عبارت سے زیادہ واضح ہے، انھوں نے اس میں اتنا اور زیادہ کیا ہے فصرفها فی الحال كصرفها فی المآل اھ کہ زکوٰۃ کا اس وقت صرف کرنا اور بعد میں صرف کرنا برابر ہے، اس کا وہی مطلب ہے کہ حضرت خالدؓ نے ان

اشیاء کو زکوٰۃ کی نیت سے الگ کر کے آئندہ مجاہدین پر صرف کرنے کے لئے روک لیا تھا۔

ایک توجیہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے شرح تراجم بخاری میں بیان فرمائی ہے۔ واستدلال المؤلف بقول النبی صلی الله علیه وسلم واما خالد الخ استدلال ببعض محتملاته بان يقال معناه انه اشترى بمال الزكوٰة الادراع والاعبد فوقفها فی سبيل الله فقد سقطت زكوٰته واما لو حمل الكلام على معان أخر فلا يدل على الترجمة اھ (ص ۱۱۰)۔

مؤلف کا قصۂ خالدؓ سے استدلال بعض معانیِ محتملہ سے استدلال ہے، کہ یوں کہا جائے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت خالدؓ نے مالِ زکوٰۃ سے زرہیں اور غلام خرید کر کے ان کو سبیل اللہ میں وقف کر دیا ہے، اس لئے اُن پر سے زکوٰۃ ساقط ہو گئی، اور اگر کلام کو دوسرے معنی پر محمول کیا گیا تو ترجمہ پر دلالت نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں اس کا حاصل وہی ہے جو علامہ عینیؒ کی توجیہ ثانی کا حاصل ہے، کہ خالدؓ نے حولانِ حول سے پہلے زکوٰۃ کے مال سے آلاتِ حرب خرید کر کے وقف کر دیئے ہیں اس لئے زکوٰۃ ساقط ہو گئی، اور اس کو حنفیہ تسلیم کرتے ہیں، جبکہ تمام حول پر نصاب کامل باقی نہ رہے۔

ایک توجیہ ہمارے بعض مشائخ حدیث نے یہ کی ہے کہ امام بخاریؒ نے زکوٰۃ کو وقف پر قیاس کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جب عروض کا وقف جائز ہے (جو کہ صدقہ کی ایک قسم ہے) تو زکوٰۃ میں بھی عروض کا دینا جائز ہے، کیونکہ زکوٰۃ بھی صدقہ ہی ہے، جب صدقہ ہونے میں دونوں مساوی ہیں تو عروض کے ساتھ جواز تعلق میں بھی دونوں مساوی ہونگے، اور یہ توجیہ ہمارے نزدیک تمام توجیہات سے اقرب ہے، کیونکہ بقیہ توجیہات کی بنا محض احتمالی امور پر ہے، مثلاً یہ کہ حضرت خالدؓ نے سلاح واعتاد وغیرہ کو زکوٰۃ میں محسوب کر کے وقف کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس حساب کو جائز رکھا۔

یا حضرت خالدؓ نے مالِ زکوٰۃ سے ان اشیاء کو خرید کر وقف کیا تھا، اور ظاہر ہے کہ الفاظِ حدیث میں ان احتمالات پر کوئی دلیل و قرینہ قائم نہیں، نہ حضرت خالدؓ کے حساب لگانے پر، نہ حضورؐ کی اجازتِ حساب پر، نہ حضرت خالدؓ کے شراء و بیع پر، حدیث کا مدلول تو صرف اس قدر ہے کہ مصدق نے حضرت خالدؓ سے زکوٰۃ مانگی انھوں نے دینے سے انکار کیا، مصدق نے حضورؐ سے شکایت کی، حضورؐ نے حضرت خالدؓ کی طرف سے یہ عذر بیان کیا

کہ وہ تو اپنا سامانِ حرب زرہ و غلام و سامان وغیرہ سبیل اللہ میں وقف کر چکے ہیں، تم اُن پر مطالبۂ زکوٰۃ سے ظلم کرتے ہو، اس مدلول سے ظاہر صرف اس قدر ہے کہ مصدق نے حضرت خالد رضؓ کے سامانِ حرب کو بمقدار کثیر دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ تجارتی مال ہے (کیونکہ استعمالی اسباب اتنا زیادہ نہیں ہوتا، اور اس کثرت کی دلیل حدیث میں صیغۂ جمع ادراع واعتُد اعبد ہے) اس لئے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا، حضور ﷺ نے بتلادیا کہ وہ تو اس کو وقف کر چکے ہیں، اس سے امام بخاری رحؒ نے یہ استدلال کیا کہ جب عروض کا وقف جائز ہے تو زکوٰۃ میں بھی عروض کا دینا جائز ہے۔

امام شوکانیؒ نیل الاوطار میں فرماتے ہیں: ومعنی ذلک انہم طلبوا من خالد رضؓ زکوٰۃ اعتادہ ظنًّا منہم انہا للتجارۃ (ای لکثرتہا ۱۲) وان الزکوٰۃ فیہا واجبۃ فقال لہم لا زکوٰۃ فیہا علیّ فقالوا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان خالدًا منع الزکوٰۃ فقال انکم تظلمونہ لانہ حبسہا ووقفہا فی سبیل اللہ تعالیٰ قبل الحول علیہا فلا زکوٰۃ فیہا اھ (ص ۳۷ ج ۴)۔

اب اتنی توجیہات کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ امام بخاریؒ کی مراد وہی توجیہ ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے بیان کی ہے دعویٰ بلا دلیل ہے، اور اس پر یہ تفریع کرنا کہ امام بخاریؒ کا اس قصۂ خالد رضؓ کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ ادائے زکوٰۃ میں تملیک شرط نہیں بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔

اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ امام بخاریؒ کا یہ مقصود ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا مذہب بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط نہیں، کیونکہ محدثین اپنی کتابوں میں مختلف احادیث مختلف تراجم کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور ان کا مذہب ان میں سے ایک ہوتا ہے، جیسا کہ ترمذی و نسائیؒ نے باب القرآۃ خلف الامام، والرخصۃ فی ترک القرآۃ خلف الامام منعقد کیا ہے، اور دونوں ان کا مذہب نہیں، اسی طرح ممکن ہے کہ امام بخاریؒ نے اس ترجمہ و حدیث سے اس بات پر تنبیہ کی ہو، کہ حدیث خالد رضؓ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ زکوٰۃ وقف سے بھی ادا ہو سکتی ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام بخاریؒ کا مذہب یہی ہے۔

اب رہا یہ کہ حدیثِ خالد رضؓ سے یہ مطلب قطعی طور پر حاصل ہوتا ہے یا بطور احتمال کے، تو اس کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے واضح کر دیا کہ یہ استدلال بعض محتملات سے

استدلال ہے، اور اصولی قاعدہ ہے اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، کہ احتمال کے ساتھ استدلال باطل ہے، پھر یہ احتمال اُن دلائلِ صریحہ کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھ سکتا ہے جو مبحث اوّل میں تملیک کی ضرورت پر نصوص قرآنیہ و احادیث مشہورہ و اجماعِ مجتہدین سے بیان کئے گئے ہیں؟

تیسرے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعد تسلیم اگر مان لیا جائے کہ امام بخاری کا مذہب وہی ہے جو سائل نے سمجھا ہے تو اس کے بعد وہ یہ ثابت کرے کہ امام بخاری مقلد ہیں، یا مجتہد، اگر مقلد ہیں تو مجتہدین کے اقوال کو چھوڑ کر مقلد کا قول لینا کب جائز ہے؟ خصوصًا جبکہ اُن کا استدلال بھی بوجہ استدلال بالمحتمل ہونے کے باطل ہو، اور اگر مجتہد ہیں تو اُن کا قول ائمۂ مجتہدین سابقین کے خلاف ہے، اور اجماعِ سابق کو خلافِ لاحق منقوض نہیں کر سکتا، بلکہ خلافِ لاحق خود باطل ہے۔

اور کوئی یہ کہے کہ گو حافظ ابن حجرؒ کی توجیہ سے امام بخاریؒ کا مذہب متعین نہیں ہو سکتا مگر خود حافظؒ کے نزدیک تو اس توجیہ کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حافظ کا مذہب وہی ہے جو اس توجیہ میں مذکور ہے، کیونکہ شارح کا کام صرف یہ ہے کہ مؤلف کتاب کے قول کی شرح کردے خواہ وہ شرح شارح کے موافق ہو یا مخالف، اور جب اس سے حافظ کا مذہب متعین نہ ہوا تو اس کا اخذ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جس قول کے خلاف خود قائل کا مذہب ہو وہ قول قائل ہی کے نزدیک باطل ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ امام شافعیؒ کے مقلد ہیں، اس لئے یہ توجیہ حافظ کا مذہب ہرگز نہیں، بلکہ اُن کے مذہب کے خلاف اور ان کے نزدیک باطل ہے، نیز اس میں وہ جوابات بھی جاری ہیں جو امام بخاریؒ کے مقلد و مجتہد ہونے کی صورت میں اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

اس کے بعد سائل نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت حجۃ اللہ البالغہ[ف] سے

ف اس مقام پر یہ امر قابلِ تنبیہ ہے کہ سائل نے عبارت حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمہ میں غلطی کی ہے، کیونکہ ترجمہ میں یہ جملہ "جیسا کہ آیت کے نزول کے موقع پر مدینہ مسلمانوں کا خالص شہر تھا" نہ معلوم کس جملہ کا ترجمہ ہے، اور اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ مترجم نے لتکفئ نوائب المدینۃ میں المدینہ سے شہر مدینہ مراد لیا ہے، اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے، یہاں نوائب المدینہ سے حوادث البلد مراد ہے، جو ہر بلد کو عام ہے ۱۲ منہ

نقل کی ہے، جس میں شاہ صاحبؒ کا یہ قول ہے کہ حدیثِ خالدؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف زکوٰۃ کی جانب سے کافی ہے، اور یہ کہ آیت صدقات میں حصر اضافی ہے،[عہ] اور یہ کہ مصارف زکوٰۃ میں توسیع کی ضرورت ہے الخ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے خود شرح تراجم وابواب میں تصریح کر دی ہے کہ حدیثِ خالدؓ میں مختلف احتمالات ہیں، اور امام بخاریؒ کا استدلال حدیثِ خالدؓ سے بطور احتمال کے ماخوذ ہے اھ، اور محتمل سے استدلال باطل ہے، اس لئے شاہ صاحبؒ کا یہ استدلال ساقط ہے، اگر ان کی مراد وہی ہے جو سائل نے اس سے سمجھی ہے، نیز آیت میں حصر کو اضافی کہنا بھی حدیث واجماع کے خلاف ہے، جس کا مبحثِ دوم میں ذکر ہو چکا۔

دوسرے شاہ صاحبؒ نے شرح تراجم میں جو توجیہ بیان کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ کے وقف کرنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے، اور حجۃ اللہ البالغہ میں یہ کہا ہے کہ وقف زکوٰۃ کی طرف سے کافی ہے، دونوں میں اختلاف ہے، اور ایک شخص کے مختلف اقوال میں جمع یا ترجیح لازم ہے، پس اول یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ان دونوں میں سے مقدم ومؤخر کونسا ہے، اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو جمع نہ ہو سکنے کی صورت میں دونوں ساقط ہیں، اور اس کے قول سے احتجاج واستدلال نہیں ہو سکتا، خصوصاً جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ خود مقلد ہیں، اور اُن کا رتبہ امام بخاریؒ اور حافظ ابن حجر سے بھی پیچھے ہے، تو اُن کا قول ائمہ مجتہدین کے خلاف مسموع نہیں ہو سکتا۔

نیز حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صدقات کی تقسیم اوّلاً اس طرح کی ہے: والبلاد الخاصة بالمسلمين عمدة ما يختص فيها من المال نوعان بازاء نوعين من المصرف، نوع هو المال الذى زالت عنه يد مالكه كتركت الميت لا وارث له وضوال من البهائم لا مالك لها واللقطة

[عہ] سائل نے شاہ صاحبؒ کی عبارت کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے وعن ابی الآس حملنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ابل الصدقة للحج اھ اس سے معلوم نہیں سائل کو کیا ثابت کرنا مقصود ہے، اگر یہ مقصود ہے کہ فی سبیل اللہ غزاۃ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ حج بھی اس میں داخل ہے، تو اس کو یہ ثابت کرنا لازم ہے کہ یہ اونٹ جن پر حجاج کو سوار کیا گیا سہم سبیل اللہ کے تھے، سہم ابن السبیل کے نہ تھے، اور اگر یہ مقصود ہے کہ یہ اونٹ زکوٰۃ کے بدون تملیک کے بطور وقف کے استعمال کئے گئے تو اس کو نفیِ تملیک پر دلیل قائم کرنا چاہئے، کیونکہ لفظ حملنا تملیک سے آبی نہیں بلکہ تملیک کے ساتھ بھی اطلاق ہوتا ہے ۱۲ منہ

اخذها اعوان بيت المال وعرفت فلم يعرف لمن هى ومن حقه ان يصرف الى المنافع المشتركة التى مما ليس فيها تمليك لاحد ككرى الانهار وبناء القناطر والمساجد وحفر الآبار والعيون وامثال ذلك ونوع هو صدقات المسلمين جمعت فى بيت المال ومن حقه ان يصرف الى ما فيه تمليك لاحد وفى ذلك قوله تعالى انما الصدقات للفقراء الآية (ص ۳۳ و ۲۳۴ ج ۲)۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے بلادِ خاصہ میں دو قسم کے اموال دو قسم کے مصرف کے مقابلہ میں ہیں، ایک قسم کا مال تو وہ ہے جس پر سے مالک کا قبضہ زائل ہو گیا، جیسے لاوارثی ترکہ، گم شدہ جانور اور لقطہ وغیرہ، اس کا مصرف تو منافع مشترکہ ہیں جن میں تملیک کسی کی نہیں ہوتی، جیسے بناء مساجد وقناطر اور نہریں اور کنواں اور چشمہ کھودنا وغیرہ۔

اور ایک نوع اموال کی وہ ہے جو مسلمانوں کے صدقات سے بیت المال میں جمع ہوتی ہے، اس کا حق یہ ہے کہ ایسے مصرف میں صرف ہو جس میں کسی کی تملیک ہو، اور آیت انما الصدقات للفقراء اسی قسم کے اموال کے متعلق ہے، اھ

اس عبارت کے سیاق سے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں قانونِ شرعی کی ترجمانی کی گئی ہے، کیونکہ اس سے پہلے یہ جملہ ہے فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکل من هذين سنة وجعل الجباية بحسب المصارف اھ اور اخیر میں فرمایا ہے کہ اموال کی نوع ثانی کا حق یہ ہے کہ ایسے مصرف میں صرف ہو جس میں کسی کی تملیک ہو، پھر فرمایا کہ آیت انما الصدقات اسی قسم کے اموال کے متعلق ہے، اس سے صاف عیاں ہے کہ اس مقام پر شاہ صاحبؒ نے اموال ومصارف کی جو تقسیم کی ہے وہ ان کے نزدیک شرعی تقسیم ہے، محض اجتہادی نہیں، کیونکہ خدا ورسولؐ کی طرف شاہ صاحبؒ نے اس کو منسوب کیا ہے، پس جب حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اموال کی نوع ثانی کے لئے شرعاً تملیک کا ضروری ہونا متحقق ہے تو اب اُن کے آئندہ کلام کو جو محض استدلالی کلام ہے ایسے معنی پر محمول کرنا جس سے تملیک کا ابطال ہوتا ہو اُن کے کلام کو مختل کرنا اور آخر کلام بنقض اوّلہ کا مصداق بنانا ہے، پس لازم ہے کہ آخر کلام کی ایسی توجیہ کی جائے جس سے پہلے کلام کا ابطال نہ ہو، اور وہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصود آخر کلام سے یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ کا وقف قبل حولانِ حول جائز[عہ] ہونا چاہئے،

[عہ] اور چونکہ اس میں بظاہر ابطال زکوٰۃ اور فرار عن الزکوٰۃ ہے، جس کو بعض فقہاء نے جائز نہیں سمجھا، اس لئے شاہ صاحبؒ نے اس میں گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی ۱۲ منہ

اور اس سے زکوٰۃ ساقط ہوجانا چاہیے، تاکہ زکوٰۃ کے اموال میں وسعت ہوجائے، اور اس صورت میں حصر کو اضافی ان صدقات کے لحاظ سے کہا گیا جو باعتبار اصل کے اموالِ زکوٰۃ تھے، اور باعتبار انتہاء کے اموالِ زکوٰۃ نہیں رہے، ولاکلام فیہ، اس صورت میں کلام میں تعارض نہ رہے گا، اور حاصل یہ ہوگا کہ مالِ زکوٰۃ کو قبل حولانِ حول دوسری نوع کی طرف منتقل کردینا جائز ہے، اور ہم حضرت خالدؓ کے واقعہ کی تاویل میں علامہ شوکانیؒ سے بعینہٖ یہی نقل کرچکے ہیں کہ انھوں نے قبل حولانِ حول اپنی ادراع و اعتاد کو وقف کردیا تھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کا حجۃ اللہ البالغہ میں الحبس یجزی عن الصدقۃ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ وقف قبل حول سے زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے، اس صورت میں شرح تراجم کی عبارت اور حجۃ اللہ البالغہ کی اول و آخر عبارت میں تعارض نہ رہے گا، اور اجزأعنہ کا بمعنی سقوط مستعمل ہونا اہل علم پر مخفی نہیں، محاورات فقہاء میں اس کے نظائر ملیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہرحال شاہ صاحبؒ کے مرتبۂ عالیہ پر نظر کرکے اُن کے کلام کی یہ توجیہ کردی گئی ورنہ ان کا کلام واضح بھی ہوتا جب بھی ائمہ کے مقابلہ میں کسی درجہ میں حجت نہ تھا، اور متعارض کلام تو کسی کے مقابلہ میں بھی کافی نہیں۔

وهذا وقت ایفاء ما وعدناه سابقا من البحث فی کون الوقف قبل الحول مسقطاً للزکاۃ ودلیله ما فی الدر ولا زکوٰۃ فی هالك بعد وجوبها بخلاف المستهلك بعد الحول لوجود التعدی منه اھ قال الشامی اما قبله لو استهلکه قبل تمام الحول فلا زکوٰۃ علیه لعدم الشرط واذا فعل حیلة لدفع الوجوب قال ابو یوسفؒ لا یکره لانه امتناع عن الوجوب لا ابطال حق الغیر وفی المحیط انه الاصح وقال محمدؒ یکره واختاره الشیخ حمید الدین الضریرؒ لان فیه اضرارا بالفقراء وابطال حقهم مآلا اھ (ص ۳۲ ج ۲)۔

قلت ووقف مال الزکوٰۃ استهلاك فیسقط الزکوٰۃ ان کان قبل الحول ولا یسقطها بعده فافهم۔

تتمہ (۱) سائل نے شروع سوال میں یہ ظاہر کیا ہے کہ مالِ زکوٰۃ، فطرہ، اور چرمِ قربانی (یعنی اس کی قیمت) کو بہت سے مصارف میں بدونِ تملیک کے صرف کرنے کی آجکل ضرورت ہے، اور تملیک جاری کرنا ہو تو حیلہ تلاش کرنا پڑتا ہے جس کا

ثبوت آیات و احادیث و اقوال سلف سے نہیں ملتا ہے الخ اس قول میں سائل نے فقہاء حنفیہ پر درپردہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے حیلۂ تملیک ایسا بیان کیا ہے جو شریعت میں کچھ اصل نہیں رکھتا، افسوس سائل کو پہلے کسی فقہی کتاب میں دلیل تلاش کرنے کی مشقت تو برداشت کرنا چاہیے تھی، اس کے بعد ہی یہ بات قلم سے نکالنا زیبا تھی، اس حیلہ کی دلیل تو سائل کو امام بخاریؒ ہی سے معلوم ہوجاتی، جن کے قول مبہم و متشابہ کی تقلید کا اس کو بہت شوق ہو رہا ہے، امام بخاریؒ نے حدیث بریرۃؓ کو تقریباً چالیس مقام سے زیادہ میں اعادہ کیا ہے، اور اس سے مسائل کثیرہ مستنبط کئے ہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ اگر فقیر کو صدقہ دیا جائے، پھر فقیر وہ صدقہ غنی کو دیدے تو غنی کے لئے جائز ہے، لقوله صلی اللہ علیه وسلم وهو لها صدقة ولنا منها هدية (ملاحظہ ہو بخاری، ص ۲۰۲ ج ۱) باب اذا تحولت الصدقة) یہی اصل اُس حیلہ کی ہے جو حنفیہ نے تملیکِ زکوٰۃ میں بیان کیا ہے۔

نیز ابوداؤد و ابن ماجہ اور حاکم نے ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: لا تحل الصدقة لغنی الا لخمسة لعامل علیها او لغاز[عہ] فی سبیل اللہ او غنی اشتراها بماله او فقیر تصدق علیه فاهدی لغنی او غارم وقال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین کذا فی العمدة للعینی (ص ۳۹۲ ج ۴)۔

اس میں او فقیر تصدق علیه فاهدی لغنی، اس حیلہ کی دلیل ہے جو تملیکِ زکوٰۃ میں فقہاء نے بیان کیا ہے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ زکوٰۃ فقیر کو دی جاتی ہے پھر وہ اپنی طرف سے غنی کو یا مدرسہ و مسجد میں دیدیتا ہے۔

(۲) اشکل علی البعض عدول تعالیٰ عن اللام الی فی قوله وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل وعسی ان یتوهم منه لبعض القاصرین

عہ یہ حدیث بھی اس کی دلیل ہے کہ آیت صدقات میں فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ ہیں، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سبیل اللہ کو غازی کے ساتھ مقید نہ فرماتے، اس قید ہی کی وجہ سے شراحِ حدیث نے اُن روایات کی جن میں فی سبیل اللہ مطلق ہے، غازی کے ساتھ تفسیر کی ہے، ملاحظہ ہو نیل الاوطار باب فی سبیل اللہ وابن السبیل ۱۲ منہ

ان ظاهره يقتضى ان هؤلاء الاربعة لايملكون ما يعطون من الصدقات كالاوائل وان لايكون سهم سبيل الله كله مقصوراً على الغزاة بل ينفق منه فيهم شئ والباقى فى مصرف آخر فنقول قال صاحب الكشاف انه تعالى انما عدل عن اللام الى فى الاربعة الاخيرة للايذان بانهم ارسخ فى استحقاق التصدق عليهم ممن سبق ذكره لان فى للوعاء فنبته على انهم احقاء بان توضع فيهم الصدقات ويجعلوا مظنة لها ومصبا الخ۔

مبلّغین کی تنخواہ میں زکوٰۃ صرف کرنا ضمیمہ سوال مذکور

سوال (۱۱) مبلّغین کی تنخواہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مصارفِ ثمانیہ میں وفی سبیل اللہ جو ایک مصرف ہے اس میں طلبۂ علم اور مبلغینِ احکامِ اسلام اور واعظینِ مسلمانان اور فتنۂ ارتداد سے روکنے والے اور حفاظتِ اسلام کرنے والے سب داخل ہیں، ان سب کو زکوٰۃ کا روپیہ دینا خواہ متفرق غیر معین طریق پر دیں یا ماہانہ مقرر کر کے دیں درست ہے، اور زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی، بشرطیکہ وہ نصاب کے مالک نہ ہوں، کما فتاویٰ شامی جلد ۲ صفحہ ۶۳ (مصری) میں وقد قال فى البدائع فى سبيل الله جميع القرب فيدخل فيه كل من سعى فى طاعة الله وسبيل الخيرات اذا كان محتاجاً الخ

اور کما تفسیر مظہری ص ۱۵ سورۂ توبہ میں قلت ولما كان الفقر ماخوذاً من جميع الاصناف فالاولى ان لا يخص سبيل الله بالحج ولا بالغزو بل يترك اعم منهما ومن سائر ابواب الخير فمن انفق ماله فى طلبة العلم صدق انه انفق فى سبيل الله الخ البتہ جو مصارف دیگر تبلیغِ اسلام کے ہیں، مثلاً ڈاک، تار، طباعت و کاغذات وغیرہ، ان میں زکوٰۃ کا روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا، کہ کسی کی مِلک میں نہیں آتا، البتہ کسی غریب یا غیر مالکِ نصاب زکوٰۃ کی مِلک پہلے کر دیں، اور اس سے ان کاموں میں خرچ کرا دیں تو یہ صورت ہو سکتی ہے، کیونکہ زکوٰۃ میں مالک بنا دینا شرط ہے، بعض اشخاص مہتممینِ مدارس کے پاس زکوٰۃ کا روپیہ بھیجدیتے ہیں، اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مہتمم صاحب محتاجین کو تقسیم کر کے اس کا مالک بنا دیں، اور جو مہتمم کسی مدرسہ کا یا کسی نیک کام کا منتظم زکوٰۃ کے روپے مرسلہ کو طلبہ یا غیر طلبہ غیر مالکِ نصاب کی

مِلک میں اس روپے کو نہیں کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

الجواب من الخانقاه الامدادية تهانه بهون: یہ جواب مذکورہ بالا جس میں زکوٰۃ کی رقم کو معاوضۂ تبلیغ وغیرہ میں دینا بھی جائز کیا ہے، صحیح نہیں، اور جس عبارت سے استدلال کیا ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام قرب و طاعات داخل ہیں، رہا یہ کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے محل صرف کا قربت و طاعت ہونا کافی ہے، اس کے سوا کچھ شرط نہیں، یہ اس عبارت سے مفہوم نہیں ہوتا، بدائع میں تملیک (بلاعوض) کی قید خود مصرح ہے، اور اس کو رکنِ ادا، زکوٰۃ قرار دیا ہے، اور یہی مطلب تفسیر مظہری کا ہے، کہ طلبۃ العلم پر انفاق کرنا انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے، یعنی جبکہ یہ انفاق بطریق تملیک بلاعوض کے ہو، ومن اراد البسط فى الدلائل فليراجع رسالة "التنازع التشكيك فى دفع الزكوٰة بالتمليك"

قال فى البدائع ركن الزكوٰة هو اخراج جزء من النصاب الى الله تعالى وتسليم ذلك اليه بقطع المالك يده عنه بتمليك الفقير وتسليمه اليه او الى يد من هو نائب عنه والملك للفقير يثبت من الله تعالى وصاحب المال نائب عن الله تعالى فى التمليك والتسليم الى الفقير بدليل قوله تعالى الم يعلموا ان الله هو يقبل التوبة عن عباده ويأخذ الصدقات وقول النبى صلى الله عليه وسلم الصدقة تقع فى يد الرحمٰن وقد امر الله تعالى بايتاء الزكوٰة والايتاء هو التمليك ولذا سمى الله تعالى الزكوٰة صدقة بقوله انما الصدقات للفقراء والتصدق تمليك ولان الزكوٰة عبادة والعبادة اخلاص العمل بكليته لله تعالى ويكون معنى القربة فى الاخراج الى الله تعالى بابطال ملكه عنه لا فى التمليك من الفقير بل التمليك من الله تعالى حقيقة وصاحب المال نائب عن الله تعالى اه ص ۳۹، ج ۲، قلت و الاخراج الى الله تعالى يقتضى ان يكون التمليك فى الزكوٰة بلاعوض وان كان بعوض لم يكن اخراجاً الى الله ولم تكن صدقة ولا عبادة كما لا يخفى فان الصدقة انما هى تمليك العين من الفقير مجاناً قال فى الدر والصدقة كالهبة بجامع التبرع لان المقصود فيها الثواب لا العوض اه ص ۴۹۶، ج ۲۔

(۲) قال فی البدائع واما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم الامام لجبایۃ الصدقات واختلف فیما یعطون قال اصحابنا یعطیہم الامام کفایتہم منہا وقال الشافعیؒ یعطیہم الثمن لنا ان ما یستحقہ العامل انما یستحقہ بطریق العمالۃ لا بطریق الزکوٰۃ بدلیل انہ یعطی وان کان غنیًا بالاجماع ولو کان صدقۃ لما حلت للغنی دل انہ انما یستحقہ بعملہ لکن علی سبیل الکفایۃ لا علی سبیل الاجرۃ، لان الاجرۃ مجہولۃ لان قدر الکفایۃ لہ ولاعوانہ مجہول غیر معلوم وجہالۃ احد البدلین یمنع جواز الاجارۃ فدل ان الاستحقاق لیس علی سبیل الاجرۃ بل علی طریق الکفایۃ لہ اھ (ص ۴۴ ج ۲)۔

اس عبارت سے امور ذیل مستفاد ہوئے:۔ (۱) عاملین زکوٰۃ کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ اجرت نہیں بلکہ نفقہ ہے، جیسے زوجہ کا نفقہ زوج پر بوجہ حبس کے لازم ہوتا ہے یا مضارب کا نفقہ مالِ مضاربت میں ہوتا ہے۔

(۲) امام شافعیؒ اس کو زکوٰۃ ہی قرار دیتے ہیں۔

(۳) عاملین وہ ہیں جن کو امام نے زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کے لئے مقرر کیا ہو، اس کے بعد ظاہر ہے کہ مبلغ یا چندہ وصول کرنے والوں کو عاملین میں داخل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ امام کے مقرر کردہ نہیں، اور اُن کو زکوٰۃ وصدقات میں سے نہ تنخواہ دی جا سکتی ہے نہ نفقہ، کیونکہ یہ لوگ نہ عاملین میں داخل ہیں نہ اُن پر اُن کو قیاس کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خود عاملین کو زکوٰۃ سے حقِ عمالت دینا خلافِ قیاس نص سے ثابت ہوا ہے، اور خلافِ قیاس کا تعدیہ نہیں ہو سکتا، رہا یہ کہ اُن لوگوں کو یہ تنخواہ زکوٰۃ سے بوجہ سبیل اللہ کے مصداق ہونے کے ہے، اس کا جواب اوپر گزر چکا، کہ جو لوگ فی سبیل اللہ کے مصداق ہیں اُن کو زکوٰۃ تملیک بلاعوض کے طور پر دی جائے گی، معاوضہ کی صورت سے نہیں دی جا سکتی۔

قال فی الدر ولو دفعہ المعلم لخلیفتہ ان کان بحیث یعمل لہ لو لم یعطہ صح والا لا، ص ۱۱۳ ج ۲ ومثل ذلک فی کتب الفقہ کثیر، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ رشوال ۴۸ھ

بیشک مبلغ وغیرہ کی تنخواہ میں زکوٰۃ کی رقم وغیرہ خرچ کرنا جائز نہیں، اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اور خرچ کرنے والے پر ضمان آتا ہے، زکوٰۃ کا مصرف زکوٰۃ کو مفت بلا کسی

معاوضہ کے دینا ایسا امر ہے کہ ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں، نہ آئندہ کسی کے خلاف کی توقع، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۲ رشوال ۴۸ھ۔

وقال الامام ناصر الدین المالکی وثم سر آخر ہو اظہر واقرب وذلک ان الاصناف الاربعۃ الاوائل ملاک لما عساہ یدفع الیہم وانما یاخذونہ ملکا فکان دخول اللام لائقًا بہم واما الاربعۃ الاواخر فلا یملکون ما یصرف نحوہم بل ولا یصرف الیہم ولکن فی مصالح تتعلق بہم فالمال الذی یصرف فی الرقاب انما یتناولہ السادۃ المکاتبون وکذلک الغارمون انما یصرف نصیبہم لارباب دیونہم تخلیصا لذممہم لا لہم واما سبیل اللہ فواضح فیہ ذلک واما ابن السبیل فکانہ کان مندرجًا فی سبیل اللہ وانما افرد بالذکر تنبیہًا علی خصوصیتہ اھ ای فانہ ایضا لا یملک ما یعطاہ بل یصرفہ فی الزاد والراحلۃ معًا فلیس نصیبہم مصروفًا الی ایدیہم حتی یعبر عن ذلک باللام المشعرۃ بتملکہم لما یصرف نحوہم وانما ہم محال لہذا الصرف فقط وایضًا فتوہم ان لا یکون سہم سبیل اللہ مصروفًا الی الغزاۃ کلہ بلفظۃ فی لا یتاتی علی مذہب الحنفیۃ الذین لا یوجبون تقسیم الصدقات علی ثمانیۃ اسہم وکذا کون اللام للملک والعدول عن اللام الی فی اشارۃ الی نفیہ وانما یتاتی کل ذلک علی مذہب الشافعیہ ویجیبون عن ہذا التوہم بما ذکرناہ فی وجہ العدول عن اللام الی فی فافہم واللہ تعالیٰ اعلم۔ ولیکن ہذا آخر الکلام ومسک الختام فی مسئلۃ التملیک فی الزکوٰۃ الواجبۃ فی النقود والعروض والزروع والانعام، وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا النبی محمد افضل الصلوٰۃ وازکی السلام وعلی آلہ واصحابہ البررۃ الکرام الی یوم القیام، ظفر احمد عفا عنہ، ۳ رصفر ۴۷ھ۔

اولویت صرفِ زکوٰۃ ببلدے کہ مال موجود باشد

سوال (۱۲) ایک شخص سوداگر ہے، وہ اپنے مال کو سوداگری کے لئے مال فروخت کرنے کو آتا ہے، جب مال فروخت ہو جاتا ہے مکان چلا جاتا ہے، وہ شخص صاحبِ زکوٰۃ ہے، وہ شخص زکوٰۃ یہاں والوں کو دے یا اپنے وطن کے لوگوں کو دے؟

الجواب: اس مسئلہ کی نظیر مضارب کا مسئلہ ہے، اور اس میں علامہ شامی نے فلیراجع کہکر تامل ظاہر کیا ہے (ص ۱۲ج ۲) اصل مسئلہ کی یہ ہے کہ زکوٰۃ میں مکانِ مال معتبر ہے، پس اگر اس سوداگر کے مال پر وہیں سال گذر جائے جہاں وہ تجارت کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے ذمہ اسی جگہ کے فقراء کو زکوٰۃ دینا ہے، اور اگر حولانِ حول وہاں سے وطن واپس آکر ہوا ہے اور مال وطن میں ساتھ ہے تو اس صورت میں ظاہر یہ ہے کہ فقراءِ وطن کو زکوٰۃ دے، فقد اعتبروا یوم الاداء فی تقویم المال فکذا یکون معتبراً ھنالک وھو الظاھر لکون وجوب الاداء بحولان الحول فحیث کان یحول الحول یعتبر مکانہ فان کان حقاً فمن اللہ وان کان باطلاً فمن الشیطان اور اگر حولان حول وطن آکر ہوا مگر مال وطن میں ساتھ نہیں، بلکہ مال جائے تجارت ہی ہے، تو زکوٰۃ مکانِ مال کے فقراء کو دی جائے، کما ہو مقتضی قولہم المعتبر فی الزکوٰۃ مکان المال فافہم، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ر رمضان ۴۷ھ

واپسی زکوٰۃ کی ایک صورت کا حکم

سوال (۱۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو سے قرض رقم طلب کی، اس پر عمرو نے زکوٰۃ کی نیت سے اس کو دام دیتے (اس لئے کہ زید معزز ہونے کی وجہ سے غربت کی حالت میں بھی مانگنا پسند نہیں کرتا) زکوٰۃ تو ادا ہوگئی، مگر چند روز کے بعد زید اُتنی ہی رقم عمرو کی خدمت میں لے کر آیا، اور کہتا ہے کہ تمھارے دام لو، اب عمرو اس کو کسی صورت سے سمجھا نہیں سکتا، کہ بھائی ہم نہیں لیتے، اگر یہ کہا جائے تو زید بگڑتا ہے، اور کہتا ہے کہ کیا تم نے مجھے ایسا سمجھا تھا؟ تو ایسی حالت میں اس رقم کو زید سے عمرو لے سکتا ہے؟ اگر لے سکتا ہے تو کون سے قاعدہ سے، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ عمرو لے سکتا ہے اور یہ عمرو کے لئے ہبہ ہوجائے گا، کہ ہبہ کی تعریف یہ ہے تملیک العین مجاناً اے بلاعوض، اور وہ بلاعوض مالک بنانا یہاں صادق آرہا ہے، اس لئے جائز ہے، ....

دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ یہ زید کا عمرو کو پھر دام دینا یہ تملیک بلاعوض نہیں، بلکہ زید بعوض دَین یہ دے رہا ہے، ورنہ پھر اور زائد یا دوسری شے کیوں نہیں دیتا، وہ اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس کا ہم پر دَین ہے، اور اس کو ادا کریں، کس کا قول صحیح ہے اور صحیح جواب مسئلہ کا کیا ہے؟

الجواب: اگر زید نے یہ رقم عمرو کو دیتے ہوئے یہ کہدیا تھا کہ یہ رقم قرض نہیں

بلکہ ہبہ ہے تب تو زید کو عمرو کی دی ہوئی رقم قبول کرلینا جائز ہے، لکون ہذہ ہبۃ مستانفۃ لاعوداً فی الصدقۃ، اور اگر زید نے عمرو کو وہ رقم دیتے ہوئے نفیِ قرض و اثبات ہبہ کی تصریح نہیں کی تھی تو زید کو عمرو سے اس رقم کا لینا جائز نہیں، کیونکہ عمرو ہبہ مستانفہ کی وجہ سے نہیں دے رہا بلکہ محض ادائے قرض کے لئے دے رہا ہے، اور زید کا قرض عمرو پر ہے نہیں، پھر یہ کیونکر اس رقم کو لے سکتا ہے، اور اگر کسی وجہ سے اس وقت عمرو کو نہ سمجھا سکے تو دوسرے وقت کسی حیلہ سے یہ رقم عمرو کو دیدے، واللہ اعلم، وان شئت تفصیل الجواب فاطلب فتوےٰ مفصلۃ بارسال اجرۃ النقل والبرید۔ ۱۲ر رمضان ۴۵ھ ظفر احمد عفا عنہ۔

الجواب، صورت مذکورہ میں عمرو زید سے زکوٰۃ دی ہوئی واپس نہیں لے سکتا، مگر بسبب ناراض ہونے و بگڑنے زید کے، عمرو سے زید اس وقت تو لے لے، لیکن کوئی اور چیز خرید کر کے بطور تحفہ و ہدیہ کے عمرو کی تملیک کردے، واللہ اعلم،

اجابہ وکتبہ حبیب المرسلین عفی عنہ نائب مفتی مدرسۂ امینیہ دھلی۔

التفسیر: نائب مفتی مدرسۂ امینیہ کا یہ لکھنا کہ "لیکن کوئی چیز خرید کر کے بطور تحفہ و ہدیہ عمرو کی تملیک کردے اھ، یہ صورت ٹھیک نہیں، کیونکہ اس میں اوّل تو عمرو کی رقم میں تصرف بلا اذن لازم آتا ہے، اور چونکہ وہ رقم زید کے پاس امانت ہوگی اور امانت میں بلا اذن تصرف کرنا خیانت ہے، اس لئے یہ تصرف جائز نہیں، دوسرے اس رقم سے خرید کر جو چیز عمرو کو دی جاتی ہے وہ جنسِ حق سے نہ ہوگی، بلکہ غیر جنس سے ہوگی، اور غیر جنس سے ادا ءِ حق مختلف فیہ ہے، اس لئے یہ صورت درست نہیں، بلکہ بہتر صورت یہ ہے کہ زید اسی رقم کو دوسرے وقت ہدیہ کے طور پر عمرو کو دیدے، اور یہ کہدے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو بچوں کے واسطے کچھ ہدیہ دوں، واللہ اعلم، ظفر احمد ۲۲ر رمضان ۴۷ھ۔

وکیل نے زکوٰۃ کی رقم ہاشمی کو دیدی تو وکیل پر ضمان لازم آئیگا یا نہیں، یا اس کی اطلاع لازم ہے، ضمان لازم نہیں

سوال (۱۴) زید نے بکر کو رقم فدیہ یا زکوٰۃ کے دینے کا وکیل بنایا، اتفاق سے بکر نے اس کو کسی ہاشمی کو دیدیا، اب ظاہر ہے کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اس صورت میں بکر کو اپنی طرف سے رقم زکوٰۃ کی ادا کرنی چاہئے، یا صرف اس کی اطلاع دہی زید کو لازم ہوگی، اور زید کو وہ رقم پھر سے ادا کرنی چاہئے، اور اگر وہ ہاشمی یہ معلوم کرے کہ جو رقم مجھ کو دی گئی ہے زکوٰۃ کی ہے، اور قبل معلوم ہونے کے وہ رقم خرچ بھی

ہوچکی ہے تو وہ رقم خود بکر کو دینا چاہتا ہے اپنی طرف سے تو بکر کو وہ رقم لینا اس ہاشمی سے اور پھر اس کو زکوٰۃ میں دوسرے کو دینا زید کی طرف سے جس کا وہ مؤکل ہے جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اگر بکر کو ہاشمی کا ہاشمی ہونا معلوم نہ تھا نہ اس کا شبہ تھا، یا معلوم تھا مگر مسئلہ معلوم نہ تھا، اس لئے اس کو زکوٰۃ دیدی، تو صورتِ اوّل میں تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، اور صورتِ ثانیہ میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، مگر بکر کے ذمہ ضمان بھی نہیں، بلکہ زید کو اطلاع کردینا کافی ہے، لکون المسئلۃ مختلفاً فیہا فیتعذر بالجہل عنہا ولا یعد متعدیاً، اور اگر ہاشمی ہونا بھی معلوم تھا اور ہاشمی کا مصرف نہ ہونا بھی معلوم تھا تو بکر ضامن ہے، صرف زید کو اطلاع کرنا کافی نہیں، لکونہ خالف امر المؤکل فان التوکیل بصرف الزکوٰۃ وادائہا ینصرف الی اعطائہا محلا قابلاً لہا حتی لو اعطاہا ولدہ ووالدیہ یضمن کذا ہہنا، واللہ اعلم بالصواب۔

اور اگر ہاشمی خوشی سے رقمِ زکوٰۃ واپس کرے لیلی جاوے، ورنہ جبر کا حق نہیں، قال الشامی ولا یسترد منہ لو ظہر انہ عبد او حربی وفی الہاشمی روایتان وھل یطیب لہ فیہ خلاف واذا لم یطب قیل یتصدق وقیل یرد علی المعطی اھ (ص ۱۰۹ ج ۲) ولکن المختار عندنا عدم الاسترداد من الہاشمی ایضاً لکون روایۃ فی المذہب فی جواز اعطائہم الزکوٰۃ وھل یطیب لہ المختار عندنا لا بل یرد علی المعطی، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ۔

ہاشمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے

سوال (۱۵) ہاشمی کو زکوٰۃ دینا اس روایتِ فقہ کی بناء پر کہ "خمس الخمس نہ ملنے کے وقت ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے" آجکل عمل کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: وہ روایت نوادر سے ہے، ظاہر مذہب کے مقابلہ میں قابلِ عمل نہیں ہے، ضرورتِ شدیدہ کے وقت حیلۂ تملیک کے بعد ہاشمی کی خدمت ہوسکتی ہے، واللہ اعلم۔

بغیر اجازت مزکی غیر مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرنے کا حکم

سوال (۱۶) آجکل جو سکہ چاندی کا یہاں رائج ہے اس کا وزن دو روپے بھر ہے، اور قیمت ایک روپیہ چھ آنہ ہے، پس جس کے ذمہ سو روپیہ زکوٰۃ کے واجب ہوں اس کی طرف سے ایک سو بینتالیس روپیہ وزن بھر چاندی زکوٰۃ میں صرف کی گئی جس میں دو چار شخص بنی ہاشم یا غنی نکل آویں تو بظاہر تو ادائگی زکوٰۃ یقینی معلوم ہوتی ہے؟

الجواب: بظاہر اس تصرف کی اجازت مزکی سے لینا ضروری ہے، اس کی اجازت بغیر مصرفِ زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر مصرف سمجھ کر دیا بعد میں غیر مصرف نکل آیا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ۔

مدارسِ عربیہ میں زکوٰۃ دینے کے متعلق ایک استفتاء مشتمل بر چند سوالات

سوال (۱۷) جو لوگ مدارسِ اسلامیہ کو چندہ مدِ زکوٰۃ سے دیتے ہیں اُن کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ادائگی زکوٰۃ سے وہ عند اللہ بریٔ الذمہ ہوجاویں، مدرسہ کی امداد اس سے ہوجائے یا نہ ہو قواعد مدرسہ کے موافق ہو تو فبہا ورنہ ان کو تو اپنی بریٔ الذمگی عند اللہ مقصود ہے، اگر اس کے ساتھ دوسرا دینی فائدہ یعنی امدادِ مدرسہ میسّر ہوجائے تو فبہا ورنہ حصول مقصود مقدم۔ پس مہتمم مدرسہ کا یہ شرط کرنا کہ اگر طالب علم ایسا ہے یا اس قابلیت کا ہے تو ہم وظیفہ دیں گے ورنہ نہیں کہاں تک درست ہے؟

الجواب: مدرسہ میں غیر زکوٰۃ کی رقم داخل کرنے سے تو مدرسہ کی ملک ہوجاتی ہے پس اس کو قواعدِ مدرسہ کے موافق ہی صرف کیا جائے گا، اور قواعد میں امداد کے لئے مناسب شرط لگانا مضائقہ نہیں رکھتا، اور زکوٰۃ کی رقم مدرسہ میں داخل کرنے سے گو ملک مدرسہ نہیں ہوتی، مگر مزکی نے جب اس کو طلبہ کو دینے کا وکیل بنایا ہے تو غیر طلبہ کو دینا جائز نہیں بدون اذن المؤکل، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مہتمم مدرسہ کو مہتمم ہونے کی وجہ سے وکیل بنایا گیا ہے، اس لئے مجلسِ شوریٰ وغیرہ کی تجاویز و قواعد کے خلاف مہتمم کو صرف کرنا جائز نہیں، کیونکہ مدرسہ میں زکوٰۃ داخل کرنا ان تمام شرائط کے ماتحت وکیل بنانا ہے جو قواعدِ مدرسہ کے لحاظ سے مہتمم کے ذمہ عائد ہوں، واللہ اعلم۔

سوال: اگر طالب علم غنی یا کم محنت یا بد خلق یا لعاب ہو مگر مسکین مصرفِ زکوٰۃ ہے تو مہتمم مدرسہ کو باوجود وکیل ادائے زکوٰۃ ہونے کے ایسے طالب علم کی امداد نہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مدرسہ سے زکوٰۃ دینے کے لئے صرف مصرفِ زکوٰۃ ہونا کافی نہیں بلکہ قواعدِ مدرسہ سے استحقاق ہونے کی بھی ضرورت ہے، اور بدونِ استحقاق کے اگر مہتمم اپنی مصلحت سے دے تو جائز نہیں، اور مدرسے کی تعلیمی مصلحت سے دے تو جائز ہے جب کہ طالب علم مصرفِ زکوٰۃ ہے،

سوال: زکوٰۃ دینے والے شخص کو جبکہ معلوم ہے کہ مثلاً زید مصرفِ زکوٰۃ اور مستحق ہے مگر وہ زید کو دینے سے منع کر کے عمرو کو دلادے تو کیا حکم ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ عمرو میں کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے؟

الجواب: چونکہ زکوٰۃ کی رقم صرف ہونے سے پہلے پہلے معطی کی ملک ہے لہٰذا اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی خاص شخص کے دینے سے منع کردے۔

سوال: زکوٰۃ دینے والے کے وکیل یعنی مہتمم مدرسہ کو اپنے قواعد ممہدہ یا مصالحِ مدرسہ کی بنا پر رقمِ زکوٰۃ کو روک روک کر خرچ کرنا یعنی دو دو تین تین برس تک مؤخر کرنا کہاں تک درست ہے، اور ایسی صورت میں مؤکل کی زکوٰۃ وکیل کے قبضہ کرنے کے ساتھ ہی ادا ہوگئی، یا جب وکیل مصرفِ زکوٰۃ میں خرچ کرے گا اس وقت ادا ہوگی؟

الجواب: جب وکیل مصرف میں خرچ کرے گا ادائے زکوٰۃ کا حکم اُس وقت کیا جائے گا اور جب مؤکل کی تاخیر میں کوئی مصلحت نہ ہو تو پھر دیر کرنا ٹھیک نہیں، اس لئے بہترین صورت یہ ہے کہ وکیل اُسی وقت زکوٰۃ ادا کردے، اور اگر مدرسہ کی ضرورت سے رکھنا پڑے تو اسی وقت حیلۂ تملیک کر کے مدرسہ میں داخل کرے، تاکہ زکوٰۃ فوراً ادا ہوجائے، اور مدرسہ کی مصلحت بھی فوت نہ ہو، و نیز اس تاخیر میں اور بھی خرابیاں ہیں، اس لئے یہ صورت کرلینا نہایت ضروری ہے۔

سوال: جس شخص کے ذمہ سو روپے زکوٰۃ کے واجب الادا تھے، اس نے سو روپیہ کا نوٹ مہتمم مدرسہ کو دیا کہ یہ مدِ زکوٰۃ کے ہیں، مہتمم مدرسہ اس کو سونے کے ساتھ بدلے گا کیونکہ چاندی کے ساتھ بدلنے میں ربوٰا واقع ہوتا ہے، اب یہ سونا جو اس نوٹ کے عوض میں آیا ہے اُس شخص کی واجب الادا زکوٰۃ ہے، یا وہی سو روپیہ بھر چاندی، اور جبکہ پھر اس سونے کو چاندی کے دوسرے مصرف میں خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جس طرح نوٹ کے عوض زائد چاندی لینا جائز نہیں بوجہ لزوم ربا الفضل، اسی طرح بوجہ تقابض متحقق نہ ہونے کے نوٹ سے سونا لینے میں بھی ربا ہے، یعنی ربا النسیئۃ کما ھو مصرح فی العالمگیریۃ عن الکافی ونصہ علی المحیل دراہم ودین المحیل دنانیر فاحال علی ان یعطیہ الدنانیر او علی ان یعطیہ دراہم من الدنانیر التی علیہ بطلت اھ، پس نوٹ کے عوض روپیہ ہی لینا چاہئے،

پھر اگر چاہیں تو روپیوں سے سونا لے لیا جاوے، اور اگر اولاً ہی سونا لینا مقصود ہو اور معطی کی طرف سے اس کی اجازت بھی ہو تو یہ حیلہ ہو سکتا ہے، کہ صراف سے مثلاً سو روپے قرض لے لے پھر اُن روپیوں سے سونا خریدلے، اور نوٹ خواہ سونا خریدنے سے پیشتر یا بعد صراف کو ادائے قرض میں دیدے، اور سوال ہذا کے جزو اول کے متعلق پیشتر معروض ہوچکا ہے کہ یہ تصرف بدونِ اذنِ معطی جائز نہیں، واللہ اعلم۔

سوال: چندہ دینے والے جبکہ ہر طرح سے مہتمم کو وکیل و مفوض صراحتاً یا دلالۃً قرار دیتے ہیں، تو پھر جزئیاتِ واقعہ کی صحت کے واسطے ان کے استخراج کی ضرورت ہے یا نہیں؟

الجواب: کوئی حاجت نہیں۔

السوال: مدرس کو اس کی تنخواہ معینہ کے علاوہ مہتمم مدرسہ اس کے مصرفِ زکوٰۃ ہونے کی صورت میں مدِ زکوٰۃ سے اس کی امداد کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مدرسہ میں محض اعانتِ مساکین کی مد نہ ہو جیساکہ عام طور سے یہاں کے مدارس میں نہیں ہے، تب تو یہ امدادِ مدرس جائز نہیں، اور اگر کوئی مدِ اعانت مساکین وغیرہ کی موجود ہو تو جائز ہے۔

السوال: جبکہ مہتمم مدرسہ کے پاس مدِ زکوٰۃ کی رقم مصرفِ زکوٰۃ میں خرچ کرنے کے واسطے موجود ہے، اور یہ بھی بدیہی اور واضح ہے کہ صاحبِ زکوٰۃ کو ادائگی زکوٰۃ سے سبکدوش ہونا اہم ہے، پس طلبا یا مدرسین و متعلقینِ مدرسہ کے علاوہ شخص مستحق مصرفِ زکوٰۃ موجود ہونے پر مہتمم کو اس کی اعانت نہ کرنے کا استحقاق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: اس کی اعانت کرنے کا استحقاق نہیں ہے، الّا آنکہ محض مساکین کی اعانت کی مد موجود ہو، کما مر۔

السوال: اپنے مؤکل سے اجازت حاصل کرنا تو اس وجہ سے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسے مؤکل کا اہم مقصد ادائگی زکوٰۃ ہے نہ کہ تخصیص زید یا عمرو، البتہ (استفادہ اعانۃ امر دینی آخر) کو اَولیٰ و انسب سمجھتا ہے۔

الجواب: پیشتر لکھا گیا ہے کہ جو رقم زکوٰۃ مدرسہ میں اعانتِ طلبہ کے لئے داخل ہوگی قواعدِ مدرسہ کے خلاف صرف نہیں ہوسکتی، لکون الوکالۃ مقیدۃ۔

سوال؛ مدارس اسلامیہ میں اکثر ہر طرح کی رقوم مخلوط ہوا کرتی ہیں، البتہ ان کا حساب کتاب دفتروں میں ممیز و مہذب ہوتا ہے، پس اسی قدر ادائگی زکوٰۃ کے واسطے کافی ہے، یا کسی اور احتیاط کی بھی ضرورت ہے؟

الجواب؛ رقوم کا خلط کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ خود زکوٰۃ کی رقمیں جو کئی شخصوں نے دی ہوں ان کو بھی یک جا مخلوط کر دینا جائز نہیں ہے، اور خلط کی صورت میں وکیل ضامن ہو جاتا ہے، اور وکالت ختم ہو چکی، لہذا جب تک صریحًا یا دلالۃً ادا کا امر دوبارہ نہ پایا جائے اس وقت تک اس کا ادا کرنا کافی نہیں ہے، البتہ اگر خلط عام طور پر مروّج ہو اور دافع کو بھی اس کا علم ہے تو پھر خلط اور بعد خلط ادا کی گنجائش نکل سکتی ہے بشرطیکہ رقوم زکوٰۃ ہی کو باہم مخلوط کیا جائے، غیر زکوٰۃ کی رقوم زکوٰۃ کی رقوم سے مخلوط نہ ہوں، کہ اس کی گنجائش نہیں۔

سوال؛ وکیل ادائگی زکوٰۃ کے پاس جبکہ زکوٰۃ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ ہر طرح کی رقوم کا مجموعہ مخلوط موجود ہے، اور وہ بلا تمیز و تعیین مصرفِ زکوٰۃ و غیر مصرفِ زکوٰۃ پر خرچ کر رہا ہے، مگر ظنِ غالب ہے کہ زکوٰۃ واجبہ کی مقدار مصرفِ زکوٰۃ ہی میں خرچ ہوئی ہے البتہ تحقیق و تمیز تام حاصل ہونا مشکل ہونے کی وجہ سے متروک ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں توسع کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ خلط جائز نہیں، مکمل، اور مکمل حساب کرنا ضروری ہے، اور آئندہ رقوم جداگانہ رکھنا لازم ہے، جب سبیل یقینی یعنی حساب لکھا ہوا موجود ہے تو میزانوں کی دشواری ایسی چیز نہیں جس کے باعث غلبۂ ظن کو کافی سمجھا جائے۔

السوال؛ اطفال کو اگر ماہوار رقم مدِ زکوٰۃ سے دی جائے اور ان پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ اس رقم سے اپنی ضروریاتِ تعلیم کاغذ قلم دوات وغیرہ خریدیں، تو یہ شرط تملیک لازمہ میں تو مخل نہیں ہوگی؟

الجواب؛ کچھ مخل نہیں۔

السوال؛ جو روپیہ مدِ زکوٰۃ کا لوگ مدرسۂ اسلامیہ میں علوم دینیہ حاصل کرنے والے طلبہ کے واسطے دیتے ہیں، اگر ان طلبہ کو آدھے دن علوم دینیہ و دنیویہ مثل حساب وغیرہ کیلئے مختص رکھ کر بقیہ آدھے دن میں صنعت و حرفت طلبہ کو سکھلائی جائے اور اس حالت میں بمقابلہ تعلیم صنعت و حرفت اُن

اطفال کی امداد زکوٰۃ سے کی جائے گی تو ادائگی زکوٰۃ میں تو کوئی حرج واقع نہ ہوگا؟

الجواب؛ مصرفِ زکوٰۃ کے واسطے تعلیم دین بلکہ مطلق تعلیم بھی شرط نہیں ہے۔ پس اگر کسی کام کے واسطے چندہ دیا جاوے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن جو چندہ تعلیم دینی کے لئے آیا ہو اس کو خرچ نہیں کر سکتے۔

سوال؛ زمانۂ تعلیم صنعت و حرفت میں جو کام سیکھنے والے طلبا صاحب معمل کا کرتے ہیں اُس کی اجرت کا استحقاق ان طلباء کو ہے یا نہیں؟ اور اگر صاحب معمل اپنی شرائط کی بناء پر کوئی اجرت نہ دے تو وہ عند اللہ مسئول ہوگا یا نہیں؟

الجواب؛ جب اس کے شرائط میں ہے کہ اجرت نہ ملے گی تو طلبہ کو اجرت کا کوئی استحقاق نہیں، اجرت جب واجب ہوتی ہے کہ عقدِ اجارہ کیا گیا ہو، پس بلا اجارہ بلکہ تصریح عدم اجارہ میں اجرت کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟

سوال؛ انعام میں مدِ زکوٰۃ کی رقم سے کتب یا دیگر ضروریاتِ تعلیم مثل قلم، دوات کاغذ وغیرہ خرید کر طلباء کو دینا، محتاج حیلۂ شرعی کا ہے یا نہیں؟

الجواب؛ رقمِ زکوٰۃ سے اشیاء خریدنے کے بعد وہ اشیاء مصرفِ زکوٰۃ کو تملیکًا دیدینا کافی ہے، خرید سے پیشتر حیلہ کی حاجت نہیں، مگر معطی زکوٰۃ کا اذن شرط ہے۔

سوال؛ شریعت نے جو شروط مصرفِ زکوٰۃ ہونے کے ملحوظ فرمائے ہیں ان سے تجاوز کر کے مہتمم مدرسہ کا اپنے مدرسہ کے بعض شرائط کا لحاظ کرنا تجاوز عن حدود اللہ تو نہیں شمار ہوگا، کیونکہ مبنیٰ ان شروطِ زائدہ کا محض مصلحتِ دینی ہے، نہ غرض ذاتی؛ والمجتہد یخطی و یصیب؟

الجواب؛ تجاوز عن الحدود تو یہ ہے کہ غیر مصرف کو دیدے، اور جو لوگ مصرف ہیں ان میں سے بعض کو دینا، بعض کو نہ دینا اگر بدون وجہ ترجیح محض اپنی رائے سے بھی ہو تب بھی مضائقہ نہیں، اور جب ترجیح کی وجہ ہو تو پھر کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

سوال؛ جو صورت کہ تملیک لفظی و صوری قرار دی گئی، اس میں اگر مملک احکام و مسائل سے واقف ہو مگر رغبۃً فی اللہ کوئی بات اس پر گراں نہیں ہوتی تو یہ تملیک حقیقی متصور ہوگی یا نہیں؟

الجواب؛ اس حیلۂ معروفہ کو محض لفظی تملیک تو اس بناء پر قرار دیا گیا ہے کہ

دینے والے کی نیت تملیک کی نہیں ہوتی، بلکہ وہ صرف ہیر پھیر کا قصد کرتا ہے، اور حملک لہ کے اخلاص سے یہ محذور مرتفع نہیں ہوسکتا، کما لا یخفی۔

سوال؛ وکیل کے قبضہ کرنے اور اپنے مال میں ملالینے سے رقم مؤکل کے قبضہ سے نکل جاتی ہے، یا باقی رہتی ہے، غالب گمان ہے کہ نکل جاتی ہے، اور اس حالت میں وکیل مدیون شمار ہوتا ہے، ایسی حالت میں وکیل کو کن امور کی احتیاط اشد ضروری ہے؟

الجواب؛ بیشک اس صورت میں وکیل مدیون ہے، لیکن پیشتر گذر چکا ہے کہ بعد خلط وکیل کو بلا اذن مستقل (صراحۃً یا دلالۃً) ادائے زکوٰۃ کا اختیار نہیں، پس مؤکل سے دوبارہ اذن لے لینا چاہئے، حررہ احقر عبدالکریم عفی عنہ رمضان المبارک ۴۸ھ

الاجوبۃ کلہا صحیحۃ۔ ظفر احمد، ۵ رمضان ۴۸ھ۔

وصیت بالتصدق اور اغنیاء کے لئے ایسے صدقہ کا حکم

سوال (۱۸) ایک شخص نے کہا کہ پچاس من غلہ خیرات کردو، اس کے خدام نے کہا کہ کل کردیں گے، اس پر اس نے کہا کہ اگر میں زندہ نہ رہا تو تم خیرات کردینا، بعدازاں وہ شخص اسی روز فوت ہوگیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس صدقہ میں سے غنی صاحبِ نصاب کو دینا اور لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جائز نہیں ہے، بلکہ صرف فقراء کو دیا جاوے، لما فی الدر المختار (ھی الوصیۃ المطلقۃ) کقولہ ھذا القدر من مالی اوثلث من مالی وصیۃ (لا تحل للغنی) لانہا صدقۃ وھی علی الغنی حرام (وان عممت کقولہ یاکل منہا الغنی والفقیر) لان اکل الغنی منہا انما یصح بطریق التملیک والتملیک انما یصح لمعین والغنی لا یتعین ولا یحصی (ولو خصصت) الوصیۃ (بہ) ای بالغنی کقولہ ھذا القدر من مالی وصیۃ لزید وھو غنی (او لقوم) اغنیاء (محصورین حلت لہم) لصحۃ تملیکہم قال الشامی تحت قولہ (علی الغنی حرام) ولا یمکن جعلہا ھبۃ لہ بعد موت الموصی بخلاف الصدقۃ علیہ حالاً فانہا تجعل ھبۃ لما قالوا ان الصدقۃ علی الغنی ھبۃ والھبۃ للفقیر صدقۃ ط (۸۴/۵)۔

۲۹ رجب ۵۰ھ۔

صاحب نصاب کے لئے زکوٰۃ صدقہ فطر اور عشر وغیرہ لینے کا حکم

سوال (۱۹) ایں عاصی را از مطالعہ کتب مفہوم گردید کہ ملکیت مبلغ پنجاہ و پنج روپیہ کلدار مانع

از اخذ زکوٰۃ و عشر غلہ و صدقہ فطر می شود فیاضا دریں دیار با ماماں مساجد حصول اینہا از اہل محلہ عرفا جاریست دیگر ہیچ تنخواہ وغیرہ معین است و ایں راقم نیز بدیں معاملہ گرفتار است و تا انداز نصاب مذکور زیور و یا نقدی در ملکیت خود موجود میدارد برائے حوائج خوانگی از معالجہ بیماری یا برائے تجہیز و تکفین میت از حد ضرورت است بلکہ باندازِ نصابِ شرعی کار یک مہم نیز لبر انجامی کافی نمیشود و بر سر ضرورت قرضہ ہم میسر نمیشود، پس ازیں قدر مایہ داری لابدی است، دریں امر از روئے شرع شریف بصورت اگر بنظرِ فیض اثر بظہور آید تحریر کنند کہ بریں عامل شدہ نجات اخروی یابیم دیگر ہیچ حصول در کار امامت میسر نمی شود عند اللہ علاج کافی و نسخہ شافی ارشاد فرمایند؟

الجواب؛ قال فی البحر یجوز دفع الزکوٰۃ الی من یملک ما دون النصاب او قدر نصابا غیر نام وھو مستغرق فی الحاجۃ اھ (ص ۲۴۰ ج ۲) لاریب کہ دفع زکوٰۃ ہر کسے را کہ مالکِ نصابِ نامی باشد یا مالکِ نصاب غیر نامی فاضل از حاجتِ اصلیہ باشد روا نیست و او را اخذ زکوٰۃ ہم جائز نیست، پس ایں چنیں کساں را اخذ زکوٰۃ و صدقات واجبہ نشاید، مگر آنکہ نصابِ نامی را ملک زوجات یا اولاد خود نمایند و نصاب غیر نامی را مستغرق حاجت سازند مثلاً بعوض آں غلہ برائے خوردن خرید کنند کہ از حوائج اصلیہ ہست، واللہ تعالیٰ اعلم

و بعد ازاں نیز اخذ زکوٰۃ و عشر و صدقۂ فطر بعوض خدمتِ امامت روا نیست و زکوٰۃ و عشر و صدقۂ فطر از ذمہ ادا کنندہ ساقط نخواہد شد، زیرا کہ در صدقاتِ واجبہ تملیک فقیر بلا عوض واجب است و امام مسجد اگر صاحبِ نصاب ہم نہ باشد چوں عوض عمل می گیرد او را زکوٰۃ و عشر وغیرہ دادن بعوض امامت ہرگز روا نیست، ولا حیلۃ بجواز ذلک اصلاً۔

۹ محرم الحرام ۴۹ھ۔

جس کی ماں جولاہن اور باپ سید ہو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۲۰) ایک لڑکی جس کا باپ سید اور ماں جولاہن ہے، یہ لڑکی یتیم ہے، صاحبِ نصاب نہیں، بیمار ہے، کیا اس کی امداد مدِ زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے؟

الجواب؛ نسب میں شرعاً باپ کا اعتبار ہے، ماں کا اعتبار نہیں، پس یہ لڑکی سید زادی ہے، اس کو زکوٰۃ کی رقم بجنسہٖ نہ دی جائے، بلکہ یہ حیلہ کیا جائے کہ ایک غریب سے جو سید نہ ہو کہا جائے کہ تم اپنے پاس سے یا کسی سے قرض لے کر اس سید زادی کی اتنی روپیہ سے

امداد کر دو تم کو ثواب ہوگا اور ہم تم کو اسی قدر رقم اپنے پاس سے دیدیں گے، پس دنیا میں تمہارا نقصان نہیں اور آخرت میں ثواب ہوگا جب وہ غریب اس سیدزادی کی امداد اپنے پاس سے یا قرض لے کر کردے، تو اس کو اُس کے بعد زکوٰۃ کی رقم دیدی جائے کہ اس سے تم اپنا قرض ادا کردو یا اپنی رقم کی تلافی کرلو، اس صورت میں سیدزادی کی امداد بھی ہوجائے گی، اور زکوٰۃ ادا ہونے میں شبہ بھی نہ رہے گا، گو بعض علماء نے آجکل سیدوں کو زکوٰۃ دینا ایک روایت کی بناء پر جائز کردیا ہے، مگر احتیاط کے خلاف ہے، کہ فرض کو اختلافِ روایت میں ڈالا جائے، خصوصاً جبکہ حیلہ بآسانی ہوسکتا ہے، واللہ اعلم، ۲۷ر محرم سنہ ۴۹ھ۔

کمپنی، اُس کے شیئرز اور مشترک اموالِ تجارت کی زکوٰۃ؛

ریلوے کمپنی کے حصص پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم

سوال (۱) زید نے ریلوے کمپنی کے حصص خریدے اور ٹرام کے بھی خریدے، اور مذکورہ دونوں کمپنیاں کرایہ کا کام کرتی ہیں تو جس قدر روپے سے حصص خریدے ہوں، مثلاً ۲۰۰۰ دو ہزار کو خریدے ہوں، تو دو ہزار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا اس کی آمدنی پر واجب ہوگی؟

الجواب: ریلوے کمپنی وغیرہ کو جو روپیہ دیا جاتا ہے اور اس سے حصص خریدے جاتے ہیں بظاہر اس کی حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کو یہ روپیہ قرض دے کر ریلوے کے کارخانہ میں یہ شخص شریک ہوجاتا ہے، اور ریلوے اُس روپے کو اپنے کام میں لگالیتی ہے، اس صورت میں دو ہزار کی رقم جو سائل نے ریلوے کمپنی وغیرہ کو دی ہے، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس کے منافع پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، کذا فی حوادث الفتاوی لشیخنا، ص ۲۹ واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ر رمضان سنہ ۴۶ھ۔

کتاب الصوم

افطار میں جلدی کرنا

سوال (۱) الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، علماء دیار ما در تعیین وقت افطار وصلوٰۃ مغرب مختلف و دو فریق شدند فریق اول بمجرد غروب آفتاب از افق حسی وظہور ظلام شرقی حکم بافطار صوم وصلوٰۃ مغرب می کنند بحجت دلائل ذیل حدیث اذا اقبل اللیل من ھھنا وادبر النھار من ھھنا فقد افطر الصائم وقول امام محمدؒ فی المؤطا: تعجیل الافطار افضل من تاخیرھا وھو قول ابی حنیفۃؒ والعامۃ، قال شارح المؤطا قولہ "والعامۃ" ای جمہور اھل السنۃ وبکثرۃ احادیث، دیگر در تاکید تعجیل مغرب واجتناب از تاخیر آں حسب عمل ابن عمرؓ اخر الصلوٰۃ یوماً الی ان بدا نجم فاعتق رقبتہ کما ذکر فی فتح القدیر ودیگر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ امت من بخیر باشند مادامیکہ درصلوٰۃ مغرب تاخیر نکنند، فریق ثانی بعد زوال حمرۃ شرقی وبلند شدن سواد شرقی تا نصف سما حکم بافطار وغیرہ می نمایند بدلائل ذیل احتجوا بما رواہ النسائی والطحاوی عن ابی بصرۃ الغفاریؓ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ العصر بالمخمص فقال ان ھذہ الصلوٰۃ عرضت علی من کان قبلکم وضیعوھا فمن حافظ علیھا منکم اوتی اجرہ مرتین ولاصلوٰۃ بعدھا حتی یطلع الشاھد والشاھد النجم فقالوا لطلوع النجم ھو اول وقتھا قال الطحاوی وما حاصلہ یحتمل ان یکون الشاھد ھو اللیل، وعلمائے خطہ پشاور وسرحد واماں برایں متفق شدند کہ ازیں حدیث درضمن لفظ شاہد اختلاف واقع شدہ بعضے از شاہد نجم مراد گرفتہ وبعضے لیل، پس بنا برقاعدہ اصول عمل باحتیاط کردہ ومعنی شاہد کہ نجم است عمل را برآں قرار دادہ اند واز ہر دو فریق در بارہ مدعا خویش رسائل اشاعت یافتہ پس ایں لاشئ از مطالعہ ہر دو رسائل از جہت کم علمی ونافہمی در تلاطم تحیر وتفکر غوطہ زن ماندہ لہذا بخدمت عالی التماس است کہ از اقوال ودلائل فریقین ہر کدام بسند قوی وبآثار نبوی وصحابہ کرام مستند باشد بدلائل کتب معتبرہ تسطیر نمودہ باحقر روانہ فرمایند کہ باحجت دلائل کتب جواب مخاصم ازاں کردہ شود وبلا سند کتب غیر قبول ونامسموع مخاصم باشد

وبلدہ سکونتی این مہجور در موضعی است کہ مغرباً آن بفاصلہ شش میل جبل واقع است، پس دریجا چگونہ صورت مغرب باشد؟

الجواب ؛ قال العلامة الشامی: والمراد بالغروب زمان غیبوبة جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة الشرق، وقال صلی اللہ علیہ وسلم: "اذا اقبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم" ای اذا وجدت الظلمة حسا فی جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر او صار مفطرا فی الحکم لان اللیل لیس ظرفاً للصوم وانما ادی بصورة الاخبار ترغیباً فی تعجیل الافطار، کما فی فتح الباری اھ ص ۱۳۹ ج ۲ قال الحافظ ابن حجر فی الفتح تحت حدیث ابن ابی اوفی: قال: کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فلما غابت الشمس قال لبعض القوم: یا فلان قم فاجدح لنا فقال یا رسول اللہ لو امسیت قال انزل فاجدح لنا قال ان علیک نهارا قال انزل فاجدح لنا الحدیث ما نصہ وفی الحدیث ایضاً استحباب تعجیل الفطر وانہ لا یجب امساک جزء من اللیل مطلقاً بل متی تحقق غروب الشمس حصل الفطر اھ وقال تحت حدیث سہل بن سعد رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر ما نصہ زاد ابو ہریرة رض فی حدیثہ: لان الیهود والنصاری یؤخرون اخرجہ ابوداؤد وابن خزیمة رح وغیرهما وتأخیر اهل الکتاب لہ امد وهو ظهور النجم وقد روی ابن حبان والحاکم من حدیث سہل ایضا بلفظ لا تزال امتی علی سنتی ما لم تنتظر بفطرها النجوم الی ان قال: قال ابن دقیق العید: فی هذا الحدیث رد علی الشیعة فی تاخیرهم الفطر الی ظهور النجوم الخ ص ۱۷۳ ج ۲۔

وفی رد المحتار: لان ظاهر مذهب اصحابنا جواز الافطار بالتحری کما نقلہ فی المعراج عن شمس الائمة السرخسی لان التحری تفید غلبة الظن وهی کالیقین کما تقدم فلو لم یتحر لا یحل لہ الفطر لان الاصل بقاء النهار اھ وفی البحر من البزازیة: لا یفطر ما لم یغلب علی ظنہ الغروب وان اذن المؤذن اھ ص ۱۷۰ ج ۲۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ غروب آفتاب کے تحقق کے بعد معاً افطار و نماز

جائز ہے، بلکہ تعجیل فی الافطار مستحب ہے، بشرطیکہ ظنِ غالب غروب کا ہو جائے، اور سائل کو تحری و غلبۂ ظن سے افطار کرنا چاہیے، باقی طحاوی و نسائی کی روایت اِن احادیث کے متعارض نہیں کیونکہ ایک دو ستارہ غروب کے ساتھ ہی طلوع ہو جاتا ہے، البتہ اشتباکِ نجوم غروب کے بعد دیر میں ہوتا ہے، اور اشتباکِ نجوم کا انتظار مکروہ ہے، ۲۰ رجب ۱۳۴۱ھ۔

سوال (۲) | حکم صوم یوم الشک | ما قولکم رحمکم اللہ فی صوم یوم الشک وما الراجح فیہ عندکم؟

الجواب ؛ قلت اخرج الشیخان وغیرهما عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: لا یتقدمن احدکم رمضان بصوم یوم او یومین الا ان یکون رجل کان یصوم صوما فلیصم ذلک الیوم۔ و للترمذی واحمد بلفظ: الا ان یوافق ذلک صوما کان یصومہ احدکم اھ قال الحافظ ابن حجر: قال العلماء: معنی الحدیث لا تستقبلوا رمضان بصیام علی نیة الاحتیاط لرمضان، ای لا یتقدم رمضان بصوم یوم یعد منہ بقصد الاحتیاط لہ فان صومہ مرتبط بالرؤیة فلا حاجة الی التکلف، و (قیل) الحکمة فیہ التقوی بالفطر لرمضان لیدخل فیہ بقوة ونشاط وهذا فیہ نظر لان مقتضی الحدیث انہ لو تقدمہ لصیام ثلاثة ایام او اربعة جاز وسنذکر ما فیہ قریبا وقیل الحکمة فیہ خشیة اختلاط النفل بالفرض وفیہ نظر ایضاً لانہ یجوز لمن لہ عادة کما فی الحدیث وقیل لان الحکم علی رمضان بالرؤیة فمن تقدمہ بیوم او یومین فقد حاول الطعن فی هذا الحکم وهذا هو المعتمد، ومعنی الاستثناء ان من کان لہ ورد فقد اذن لہ فیہ لانہ اعتادہ والفہ وترک المألوف شدید ولیس ذلک من استقبال رمضان فی شیء، وفیہ رد علی من یری بتقدیم الصوم علی الرؤیة کالرافضة ورد علی من قال بجواز النفل المطلق وابعد من قال المراد بالنهی التقدم بنیة رمضان و استدل بلفظ التقدم لان التقدم علی الشیء بالشیء انما یتحقق اذا کان من جنسہ فعلی هذا یجوز الصیام بنیة النفل المطلق لکن السیاق یابی هذا التاویل ویدفعہ وفیہ منع انشاء الصوم قبل رمضان اذا کان لاجل الاحتیاط اھ (ص ۱۱۰ ج ۴) ملخصاً۔

واخرج الترمذی عن عمار بن یاسر من صام الیوم الذی یشک فیہ فقد
عصی ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم وقال حسن صحیح والعمل علی ھذا عند اھل
العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن بعدھم کرھوا ان یصوم الرجل
الیوم الذی یشک فیہ اھ (ص ۹۱ ج ۱) قلت واخرجہ البخاری تعلیقا ووصلہ
اصحاب السنن الاربعۃ واخرجہ ایضا ابن خزیمۃ وابن حبان والحاکم
وقال صحیح علی شرطھما ولم یخرجاہ کذا فی العمدۃ للعینی (ص ۱۹۰ و ۱۹۱ ج ۵)
قلت ولا یخفی انہ موقوف فی حکم المرفوع قال العینی ان فیہ تفصیلا واختلافا
للعلماء فذھب داؤد الی انہ لا یصح صومہ اصلا ولو وافق عادۃ لہ وذھبت
طائفۃ الی انہ لا یجوز ان یصام اخر یوم من شعبان تطوعا الا ان یوافق صوما
کان یصومہ واخذوا بظاھر ھذا الحدیث روی ذلک عن عمر بن الخطاب رض
وعلی رض وعمار رض وحذیفۃ رض وابن مسعود رض ومن التابعین سعید بن المسیب رح والشعبی رح
والنخعی والحسن وابن سیرین رح وھو قول الشافعی رح وکان ابن عباس رض وابو ھریرۃ رض
یامران بفصل یوم او یومین کما استحبوا ان یفصلوا بین الصلوۃ الفریضۃ و
النافلۃ بکلام او قیام او تقدم او تأخر وقال عکرمۃ من صام یوم الشک فقد
عصی اللہ ورسولہ واجازت طائفۃ صومہ تطوعا وھو قول اللیث والاوزاعی رح
وابی حنیفۃ رح واحمد رح واسحق روی عن عائشۃ رض واسماء رض اختھا انھما کانتا تصومان
یوم الشک اھ (ص ۲۰۰ و ۲۰۱ ج ۵) ملخصا، وقال فی الھدایۃ والمراد بقولہ
صلی اللہ علیہ وسلم لا تتقدموا رمضان بصوم یوم ولا بصوم یومین الحدیث.
التقدم بصوم رمضان لانہ یؤدیہ قبل اوانہ ثم ان وافق صوما کان یصومہ
فالصوم افضل بالاجماع وکذا اذا صام ثلثۃ ایام من اخر الشھر فصاعدا
وان افردہ (ای یوم الشک) فقد قیل الفطر افضل احترازا عن ظاھر النھی
(والقائل الفقیہ محمد بن مسلمۃ کذا فی العنایۃ) وقد قیل الصوم افضل
اقتداء بعلی وعائشۃ رضی اللہ عنھما فانھما کانا یصومانہ والمختار ان
یصوم المفتی بنفسہ اخذا بالاحتیاط اھ (مع فتح القدیر ص ۲۴۷ ج ۲) قلت:
اما تاویل صاحب الھدایہ فی معنی الحدیث فما ابعدہ من السیاق کما قالہ

الحافظ ابن حجر واما استدلالھم بفعل علی رض فلا یصح فان مذھب علی رض خلاف ذلک
کما مر عن العینی وصرح بہ فی فتح القدیر نقلا عن الغایۃ واما بفعل عائشۃ رض فلا
یستقیم ایضا لان المنقول من قولھا انما قالت لان اصوم یوما من شعبان احب
الی من ان افطر یوما من رمضان کما فی الفتح وذکرہ العینی ایضا وصوم یوم
الشک بنیۃ کذلک لا یجیزہ اصحابنا قال العلامۃ ابن الھمام رح والاولی فی
التمسک علی الافضلیۃ حدیث السرار اھ (ص ۲۴۷ ج ۲) قلت وحدیث السرار
ما اخرجہ الشیخان انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل ھل صمت من سرر
شعبان قال لا قال فاذا افطرت فصم یوما مکانہ وفی لفظ فصم یوما وسرر
الشھر اخرہ کذا ذکرہ ابن الھمام فی الفتح ایضا (ص ۲۴۵ ج ۲) قلت ولا یخفی
ما فیہ فانہ یمکن حمل حدیث السرر علی صوم کان یعتادہ الرجل وبعد ذلک
فلا منافاۃ بینہ وبین حدیث النھی عن التقدم علی رمضان ذکرہ الحافظ
ابن حجر رح فی الفتح (ص ۲۰۱ ج ۴) وایضا فقد قیل السرر وسط الشھر حکاہ
ابو داؤد ورجحہ بعضھم ووجھہ بان السرر جمع سرۃ وسرۃ الشیء وسطہ، و
یؤیدہ الندب الی صیام البیض وھی وسط الشھر (والندب الی صوم یوم
النصف من شعبان خاصۃ ۱۲) وانہ لم یرد فی صیام اخر الشھر (من شعبان)
ندب بل ورد فیہ نھی خاص اھ قالہ الحافظ ایضا وبالجملۃ فدلیل من
منع عن صوم یوم الشک الا المعتاد اقوی روایۃ ودرایۃ وما ذکرہ اصحابنا فی
تاویل الحدیثین ومن استثناء الخواص عن ھذا النھی مجرد تاویل فی معرض
النص ھذا ولکنی لا افتی علی کراھتہ للخواص لکونی مقلدا للامام الاعظم
ابی حنیفۃ رح واصحابہ ولکن الاولی عندی قول محمد بن سلمۃ رح من الحنفیۃ ان
افراد یوم الشک بصومہ خلاف الاولی والفطر فیہ افضل للعوام والخواص
جمیعا خصوصا وقد قال اصحابنا ان الخروج من خلاف العلماء مستحب وفیہ
خلاف کما تری واللہ اعلم، ولا سیما فی ھذا الزمان فان صوم المفتی والقاضی
قلما یخفی علی العامۃ کما ھو مشاھد والحنفیۃ انما اجازوہ للخواص بشرط الاخفاء
التام عن العوام کما ذکرہ فی فتح القدیر (ص ۲۴۷ و ۲۴۸ ج ۲) وان کان الصوم

بشرط الاخفاء ایضاً خلاف الافضل عندی وبه قال محمد بن مسلمةؒ من اصحابنا وکفٰی به لی قدوةً اذا تأید قوله بالحدیث وتقوی روایةً ودرایةً ھذا واللہ تعالٰی اعلم وعلمه اتم واحکم۔ ۳۰؍ شعبان سنہ ۴۳ھ۔

مسجد میں افطار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۳) مسجد میں روزہ افطار کرنا اس خیال سے کہ اگر افطار کر کے مسجد میں گئے تو جماعت کا کچھ حصہ نہیں ملے گا، افطار سے مطلب یہ ہے کہ افطاری میں کھانا وغیرہ اچھی طرح سے کھا لیا جاوے، ورنہ یہ ممکن ہے کہ اگر ایک گھونٹ پانی یا صرف چھوارا وغیرہ کھا کر چلے تو اوّل رکعت میں بخوبی شامل ہو سکتا ہے، اور مسجد والوں سے یہ دشوار ہے کہ وہ اذان وتکبیر میں اس قدر وقفہ کریں کہ گھر کے افطار کرنے والے جماعت کی اوّل رکعت میں شامل ہو جاویں، تو ایسی صورت میں مسجد میں افطار کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایسی حالت میں افطار مسجد میں کیا جائے، مگر مسجد کی حد کے اندر نہ کھائیں بلکہ باہر کھائیں، اور باہر کوئی جگہ مناسب نہ ہو تو مسجد ہی میں کھا لیں، اور کھانے سے کچھ دیر پہلے اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں آجایا کریں، امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف قدرِ قلیل زمان کا بھی صحیح ہے، قال فی الدر وکرہ اکل ونوم الا لمعتکف الخ قال الشامی فی قوله اکل ونوم الخ واذا اراد ذلك ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل ویذکر اللہ تعالٰی بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء فتاوٰی ھندیة (ص ۱۹۱ ج ۱) واللہ اعلم۔ غرہ رمضان سنہ ۴۵ھ۔

ایضاً ایضاً ایضاً

سوال (۴) رمضان شریف میں اہلِ محلہ کا بخوفِ ترکِ جماعت نماز مغرب مسجد محلہ میں جمع ہو کر شربت وغیرہ قلیل اشیاء سے روزہ افطار کرنا بلا کراہت جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مسجد میں اکل وشرب مکروہ ہے، مگر ضرورت کے وقت بلا کراہت جائز ہے، کالمسافر یباح له النوم فیه اور ترکِ جماعت کا اندیشہ بھی عذر ہے، اس لئے اگر مسجد سے باہر کوئی جگہ ایسی نہ ہو جہاں افطار کر سکیں تو مسجد ہی میں افطار کر لینا جائز ہے بشرطیکہ مسجد کو ملوث نہ کیا جائے، قال علی القاری فی وجه تاخیر عمرؓ وعثمانؓ الافطار عن الصلوٰۃ انھما کانا فی المسجد وکانا غیر معتکفین ورأیا الاکل والشرب لغیر المعتکف مکروھین (فی المسجد) لکن اطلاق احادیث التعجیل ظاھر فی استثناء حال الافطار (ص ۲۱۳ ج ۲) کوئی کپڑا وغیرہ ایسا بچھا لیا جائے جس سے مسجد کی حفاظت رہے، اور بہتر یہ ہے کہ اس وقت افطار سے کچھ پہلے اعتکاف کی نیت کر کے

مسجد میں داخل ہو، اور امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف ساعت بھی درست ہے، وبہ یفتی، پھر یہ کراہت کلیہ مرتفع ہو جاوے گی، واللہ اعلم۔ ۱۷؍ رمضان سنہ ۴۵ھ۔

تفصیل الآثار فی تعجیل الافطار

سوال (۵) مؤطا امام مالکؒ میں کتاب الصوم میں ہے:۔ ان عمر بن الخطابؓ وعثمان بن عفان کانا یصلیان المغرب حین ینظران الی اللیل الاسود قبل ان یفطرا ثم یفطران بعد الصلوٰۃ وذلك فی رمضان۔

اس پر مسوّٰی میں شاہ ولی اللہ محدثؒ نے کہا ہے وعلیه اھل العلم انه یستحب ذلك ما لم یقع فی شك الاستثناء التاخیر، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعجیل فطر پر احادیث کثیرہ موجود خود مؤطا میں یستحب تعجیل الفطر کا ایک باب ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وحضرت عثمان رضی اللہ عنہ تاخیر کیسے فرماتے تھے؟ اور پھر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس تاخیر کو مستحب لکھ دیا، اگر تاخیر کے شبہ میں نہ پڑے، غالباً شاہ صاحبؒ کا منشا یہ ہے کہ شبہ کی وجہ سے تاخیر نہ کرے، اور بلا شبہ تاخیر کرے تو مستحب ہے، پھر تعجیلِ فطر کا استحباب کہاں رہا؟

الجواب الملقب بتفصیل الآثار فی تعجیل الافطار:

قال الحافظ فی الفتح قال ابن عبد البر احادیث تعجیل الافطار وتاخیر السحور صحاح متواترة وعند عبد الرزاق وغیرہ باسناد صحیح عن عمرو بن میمون الاودی قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اسرع الناس افطاراً وابطأھم سحوراً واخرج البخاری عن سھل بن سعد ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر، زاد ابوداؤد فی حدیثه واخروا السحور اخرجه احمدؒ وزاد ابوھریرة فی حدیثه لان الیھود والنصارٰی یؤخرون اخرجه ابوداؤد وابن خزیمة وغیرھما وتاخیر اھل الکتاب له امد وھو ظھور النجم وقد روی ابن حبان والحاکم من حدیث سھل ایضاً بلفظ لا تزال امتی علی سنتی ما لم تنتظر بفطرھا النجوم۔ قال المھلب والحکمة فی ذلك ان لا یزاد فی النھار من اللیل ولانه ارفق بالصائم واقوی له علی العبادة واتفق العلماء علی ان محل ذلك اذا تحقق غروب الشمس بالرؤیة او باخبار عدلین وکذا عدل واحد فی الارجح اھ

(ص ۱۷۳ ج ۵) وفیه دلالة علی اتفاق العلماء علی ان التعجیل المذکور فی الحدیث المنوط نفی الخیر بالتاخیر عنه محلّه ما اذا تحقق الغروب ثم نبّه الحافظ فی الصفحة المذکورة علی ما احدث فی زمانه من البدعة المنکرة من ایقاع الاذان الثانی قبل الفجر بنحو ثلث ساعة فی رمضان واطفاء المصابیح التی جعلت علامة لتحریم الاکل والشرب علی من یرید الصیام زعمًا ممن احدثه انه للاحتیاط فی العبادة وقد جرهم ذلک الی ان صاروا لا یؤذنون الا بعد المغرب بدرجة لتمکین الوقت زعموا فاخروا الفطر وعجلوا السحور وخالفوا السنة فلذلک قل عنهم الخیر وکثر فیهم الشر واللّٰه المستعان، (ص ۱۷۳ ج ۴) وهو یدل علی ان التاخیر بدرجة بعد تحقق الغروب خلاف السنة ایضًا وروی مسلم والترمذی والنسائی من روایة ابی عطیة قال دخلت انا ومسروق علی عائشة فقلنا یا امّ المؤمنین رجلان من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلّم احدهما یعجّل الافطار ویعجّل الصلوٰة والآخر یؤخر الافطار ویؤخر الصلوٰة قالت ایهما یعجل الافطار ویعجل الصلوٰة قلنا عبد اللّٰه بن مسعودؓ قالت هکذا کان یصنع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم والآخر ابو موسیٰؓ۔

واخرج ابو یعلی فی مسنده عن انس رضی اللّٰه عنه قال ما رأیت النبی صلی اللّٰه علیه وسلّم قط صلّی صلوٰة المغرب حتی یفطر ولو کان علی شربة من ماء واسناده جید کذا فی العینی علی البخاری (ص ۲۹۲ ج ۵)

واخرج البخاری عن عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم اذا اقبل اللیل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس فقد افطر الصائم اھ وقال ابن خزیمة قوله فقد افطر الصائم لفظ خبر ومعناه الامر ای فلیفطر الصائم ولو کان المراد فقد صار مفطرًا (کما زعمه بعضهم) لم یکن للترغیب فی تعجیل الافطار معنی وکان فطر جمیع الصوام واحدًا کذا فی الفتح ایضًا (ص ۱۷۱ ج ۴) وفیه ایضًا فی باب صوم الوصال واحتجوا للتحریم ای تحریم الوصال بقوله فی الحدیث المتقدم اذا اقبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم اذ لم یجعل اللیل محلا سوی

الفطر فالصوم فیه مخالفة لوضعه کیوم الفطر (ص ۱۷۸ ج ۴)۔

وفیه ایضًا حدیث بشیر بن الخصاصیة اخرجه احمد والطبرانی وسعید بن منصور وعبد بن حمید وابن ابی حاتم فی تفسیرهما بسند صحیح الی امرأته عنه مرفوعًا صوموا کما امرکم اللّٰه تعالیٰ اتموا الصیام الی اللیل فاذا کان اللیل فافطروا (ص ۱۷۶ ج ۴) وقال العینی فی العمدة قال ابو عمر فی الاستذکار اجمع العلماء علی انه اذا حلت صلوٰة المغرب فقد حل الفطر للصائم فرضًا وتطوعًا، واجمعوا علی ان صلوٰة المغرب من صلوٰة اللیل اھ (ص ۲۶۶ ج ۵) وفی الترغیب للمنذری عن انس رضی اللّٰه عنه قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یفطر قبل ان یصلی علی رطبات فان لم تکن حسی حسوات من ماء رواه ابو داؤد والترمذی وحسنه اھ (۱۸۵) وقال علی القاری فی شرح المشکوٰة تحت حدیث لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر ای ما داموا علی هذه السنة ویسن تقدیمه علی الصلوٰة للخبر الصحیح به وقال التوربشتی فان فی التعجیل مخالفة لاهل الکتاب فانهم یؤخرونه ثم صار عادة لاهل البدعة فی ملتنا اھ قال بعض علمائنا ولو اخر لتأدیب النفس غیر معتقد وجوب التاخیر لم یضره ذلک۔ اقول بل یضره حیث یفوته السنة وتعجیل الافطار بشربة ماء لا ینافی التأدیب ثم رأیت التوربشتی قال وهذه الخصلة التی لم یرضها رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم واقول یشابه هذا التاخیر تقدیم صوم یوم او یومین علی صوم رمضان الی ان قال ویؤیده ما صح ان الصحابة کانوا اعجل الناس افطارًا وابطأهم سحورًا (ص ۵۱۰ ج ۲) قلت ومقتضی هذا الذی ذکرنا کون تقدیم الافطار علی صلوٰة المغرب سنته وان التاخیر عنها خلاف السنة وما کان خلاف السنة وان کان مباحًا فلا یخلو عن کراهة ولو تنزیها لا سیما اذا انضم الی ذلک قوله صلی اللّٰه علیه وسلم اذا اقبل اللیل فافطروا وقوله اذا اقبل اللیل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس فقد افطر الصائم ای فلیفطر۔ واما ما روی بسند صحیح عند مالکؒ فی موطاه وعند محمدؒ به ان عمر بن الخطابؓ وعثمانؓ بن عفان کانا یصلیان المغرب حین ینظران اللیل

الاسود رای سواد اولہ) قبل ان یفطر اثم یفطران بعد الصلوٰۃ فی رمضان اھ فلا یحتاج الی الجواب لکونہ خلاف عمل الرسول وعامۃ اصحابہ وایضا لاندری ھل اخر الفطر بعذر او بغیر عذر وقال القاری ھو اما لبیان الجواز اشعارا بان مثل ھذا التاخیر لاینافی الامر بالتعجیل او لعدم ما یفطران بہ عندھم قبل الصلوٰۃ او یحمل الافطار علی التعشی بالطعام لان الافطار المتعارف عندھم ان یتعشوا بطعامھم کذا فی تعلیق الممجد محصلاً (ص ۱۸۴) وحاصلہ انھما لم یکونا یتعشیان قبل الصلوٰۃ بالطعام ویقتصران علی شربۃ من ماء ونحوہ ولم یکن ذلک الافطار افطاراً متعارفاً بینھم فقال الراوی بناء علی ذلک انھما کانا یفطرا بعد الصلوٰۃ وبالجملۃ ففی الاثر حکایۃ حال لاعموم لھا ویحتمل الوجوہ العدیدۃ فلا یترک بہ ما ثبت عنہ صلی اللہ وسلم قولاً وفعلاً وامرا وترغیبا فالحاصل ان تقدیم الفطر علی صلوٰۃ المغرب ھو السنۃ وتاخیرہ عنھا خلاف السنۃ ولکن لایدخل فی حد الکراھۃ مالم یشتبک النجوم لایقال ینافی ما قلت قول محمدؒ فی المؤطا بعد تخریجہ اثر عمرؓ وعثمانؓ ھذا کلہ واسع فمن شاء افطر قبل الصلوٰۃ ومن شاء افطر بعدھا وکل ذلک لاباس بہ اھ لان قولہ واسع لاباس بہ اھ لاینافی کونہ خلاف السنۃ فربما یطلق الفقہاء لاباس بہ علی ما یکون مکروھاً تنزیھاً وخلاف الاولی کما لایخفی ولابد من تقیید قولہ واسع ولاباس بہ بان لایبلغ مبلغ اشتباک النجوم کما قید بہ المحشی۔

واما ما فی رد المحتار عن شرح الجامع لقاضی خان: التعجیل المستحب قبل اشتباک النجوم اھ (ص ۱۸۳ ج ۲) وھو یفید بظاھرہ ان کل ما کان قبل اشتباک النجوم فھو من التعجیل المستحب فیعارضہ ما مر عن القاری من تصریحہ بکون تقدیمہ علی الصلوٰۃ سنۃ وکون تاخیرہ عنھا خلاف السنۃ وتاویلہ فی اثر عمرؓ وعثمانؓ بوجوہ عدیدۃ فکیف یکون ما بعد المغرب الی اشتباک النجوم کلہ وقتاً مستحباً التعجیل وقال فی البدائع ویسن تعجیل الافطار اذا غربت الشمس ھکذا روی عن ابی حنیفۃؒ لما روینا من الحدیث

ثلاث من سنن المرسلین ومن جملتھا تعجیل الافطار وروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لاتزال امتی بخیر مالم ینتظر والافطار طلوع النجم والتاخیر یؤدی الیہ اھ ای الی الانتظار طلوع النجوم (ص ۱۰۶ ج ۲) وھذا یفید ان التعجیل المسنون المستحب ما کان قبل طلوع النجم وما بعدہ داخل فی التاخیر نعم تاخیرہ الی طلوع النجم لایکرہ کراھۃ التحریم وانما التاخیر المکروہ کذلک ما کان الی اشتباک النجوم لانہ ھو الذی یفضی الی مشابھۃ اھل الکتاب فکانوا یؤخرون الی حد الاشتباک، واللہ اعلم۔

ہمارے نزدیک جواہر تعجیل افطار کے متعلق کتب احادیث وفقہ سے منقح ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تحقق غروب کے بعد معاً قبل نماز مغرب افطار کرنا مسنون ہے اور بعد نماز کے افطار کرنا خلافِ سنت ہے، مگر حدِ اشتباک سے پہلے پہلے افطار کرے تو تاخیر مکروہ میں داخل نہ ہوگا، اور حدِ اشتباک تک تاخیر مکروہ تحریمی ہے، اور مسوّی کی عبارت کے متعلق بدون کتاب دیکھے ہوئے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، سوال میں اس کی عبارت ناتمام نقل کی گئی ہے، اور وہ بھی پڑھی نہیں گئی اور حضرت عمرؓ وعثمانؓ کے اثر کا جواب چند وجوہ سے دیا گیا ہے، جو عبارت عربیہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم، ۱۷ رمضان ۴۵ھ۔

نیت معلق سے صوم متحقق نہیں ہوتا تحقق صوم کے لئے قصد جازم شرط ہے۔

سوال (۶) ایک عورت نے رمضان شریف کے قضا روزہ رکھنے کا رات کو ارادہ کیا، یہ عورت رمضان شریف کے علاوہ اور روزہ خواہ وہ رمضان شریف کا قضا شدہ کیوں نہ ہو اپنی ساس سے اجازت لے کر رکھا کرتی تھی اس روز بھی اس نے یہ ارادہ کیا کہ نماز صبح کے وقت اپنی ساس سے دریافت کرلوں گی، اگر ساس نے اجازت دی رکھوں گی ورنہ نہیں، لیکن گمان یہی تھا کہ ساس ضرور اجازت دے گی، صبح کی نماز کے وقت دریافت کیا تو ساس نے انکار کردیا، اس عورت نے روزہ نہیں رکھا، دریافت طلب یہ ہے کہ آیا اس روزہ کی قضا رکھنی چاہئے، یا کفارہ دینا پڑے گا اور کفارہ کیا ہوگا، اگر ساٹھ روزے رکھنے کے بجائے ساٹھ آدمیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے تو کفارہ ادا ہو جاوے گا یا نہیں، ایک بات اور اظہار طلب ہے کہ یہ عورت ہمیشہ اپنی ساس سے روزہ کے متعلق رات کو دریافت کرلیا کرتی تھی، اگر اس نے اجازت دی تو روزہ رکھا ورنہ نہیں، اس روز رات کو دریافت کرنا یاد نہیں رہا تھا، اور صبح کی نماز کے

بعد دریافت کیا تھا جیسا کہ میں پیشتر تحریر کر چکا ہوں۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں نہ قضا واجب ہوئی نہ کفارہ، کیونکہ روزہ کا تحقق ہی نہیں ہوا، تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ روزہ کو توڑ اگیا، کیونکہ تحققِ صوم کے لئے نیت شرط ہے، اور نیت کی حقیقت قصد جازم ہے، جو صورتِ مسئولہ میں نہیں پایا گیا، بلکہ نیت معلق تھی ساس کی اجازت پر اور ایسی نیت سے صوم کا تحقق نہیں ہوتا، پس افسادِ صوم بھی نہیں پایا گیا، قال فی مراقی الفلاح: وحقیقۃ النیۃ قصدہ عازما بقلبہ صوم غد الخ (ص ۳۷۴) وفیہ ایضاً واما القسم الثانی وھو ما یشترط لہ تعیین النیۃ وتبییتھا فھو قضاء رمضان وقضاء ما افسدہ من نفل وصوم الکفارات بانواعھا ککفارۃ الیمین وصوم التمتع والقران والنذر المطلق اھ (ص ۳۷۶)۔

۴ رشعبان ۴۷ھ

سحری کے وقت طلوعِ فجر سے قبل اذان دینے اور ایسے اذان کے اعادہ کا حکم۔

سوال (۷) حضرت! دیہات میں اکثر لوگ اذان سنکر کھانا پینا بند کرتے ہیں، اور گھڑی بھی ہمیشہ صحیح نہیں رہ سکتی، کیونکہ کوئی بہتر ذریعہ ملانے کا نہیں ہوتا، کبھی کبھی طلوع غروب سے بھی بوجہ ابر ہونے کے نہیں ملا سکتے، تو ایسی حالت میں ان لوگوں کا روزہ ہوگا یا کہ کچھ نقصان پڑے گا، اسی خیال سے کہ لوگ کھانے سے بند ہوجائیں گے اذان صبح صادق سے دس یا پانچ منٹ قبل پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں، کیونکہ دیہات میں کوئی ذریعہ دیگر بند کرنے کا نہیں ہوتا، حکمِ شرعی سے حضور اطلاع بخشیں؟

الجواب: اگر یہ لوگ اذان کے بھروسہ پر نہ رہتے ہوں، بلکہ اپنے دل کی گواہی کے موافق کھاتے ہوں اور بند کرتے ہوں تو ان کے روزہ میں شبہ نہ ہوگا، اور دل کی گواہی وہ معتبر ہے جو خوفِ خدا کے ساتھ ہو اور وقت کی پہچان بھی ہو، اور اگر اذان کے بھروسہ ہی پر رہتے ہوں تو اُن کے روزوں میں شبہ رہے گا، اگر مؤذن صبح ہونے کے بعد اذان کہتے ہوں اور ایسی حالت میں مؤذن کو یہ جائز ہے کہ اذانِ فجر صبح صادق سے دس پندرہ پہلے کہہ دی جائے، تاکہ لوگ کھانے پینے سے رُک جائیں، مگر صبح صادق ہونے کے بعد اس اذان کا اعادہ کر دیا جائے گو اعادہ زیادہ بلند آواز سے نہ ہو، معمولی ہی آواز سے ہو، قلت وعلیٰ ذلک حملت الحنفیۃ الاذانین فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الاول کان لمصلحۃ اخریٰ غیر اعلام الوقت وھذہ ایضاً مصلحۃ قد مست الحاجۃ الیھا فی القریٰ فان

اھلھا لا یمتنعون عن الاکل الا بالاذان، مگر اس کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہے کہ گاؤں کے سر برآوردہ لوگ ایک دو مؤذن اس کام کے لئے مخصوص کر دیں ورنہ گڑبڑ ہوگی۔

۲۱ رمضان ۴۷ھ

حکم افطار قبل از اذان

سوال (۸) در رمضان المبارک از اذان و افطار کدام را مقدم نمودن مسنون است در تاخیر نماز از افطار کلام نیست، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با اصحاب صلعم اولاً افطار کردند یا اذان کردند، دریں بارہ حدیثے صحیح ارشاد فرمایند؟

الجواب: تقدیم افطار قبل از نماز مغرب مسنون است، واما اذان، پس مؤذن قبل اذان افطار کند وغیر مؤذن مع الاذان، الا ان یکون عارفاً بالوقت او لفعل المؤذن فلہ ان یقدم الفطر علی الاذان، مگر مراد از افطار شبع بالطعام نیست بلکہ افطار بر تمرہ یا شربۃ ماء ونحوہ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثلث من سنن المرسلین تعجیل الافطار وتاخیر السحور الخ رواہ الطبرانی (زیلعی ص ۲۵۳ ج ۱) ولا شک ان فی الافطار بعد الصلوٰۃ تاخیرا وما روی عن بعض الصحابۃ انھم کانوا یفطرون بعد المغرب ای بعد الصلوٰۃ فمحمول علی الشبع ای کان یاکل الطعام بعد المغرب دون تاخیر الفطر مطلقاً، واللہ اعلم۔

۱۶ رمضان ۴۸ھ

فصل فی رؤیۃ الہلال

اگر رویتِ ہلال کی شہادت عید کے دن طلوعِ آفتاب سے قبل مل گئی، تو مجمع کے خیال سے اگلے دن تک تاخیر کرنا صحیح نہیں

سوال (۱) ایک شہر میں انتیس تاریخ رمضان المبارک رُویتِ ہلال نہ ہوئی، تیس تاریخ کی صبح کو فجر کی نماز کے متصل ہی اطول ایام میں رُویت پر شہادت گذری، اور قبول ہونے کے بعد ہی فوراً شہر میں اعلان افطار کا امام شہر کی جانب سے کر دیا گیا، اور اس کا بھی اعلان ہوا کہ نماز عیدگاہ میں اپنے مقررہ وقت پر آج ہی پڑھی جائیگی اس اعلان پر بعض حضرات شہر نے امام شہر سے یہ کہا کہ آج نماز کو ملتوی رکھنا چاہئے، کیونکہ کامل اجتماع ساکنانِ شہر و نیز اہل قریات کا آج دشوار ہے، اس کو امام صاحب نے تسلیم کر کے دوبارہ دوسرے روز نماز کی ادائیگی کا اعلان کرایا، چنانچہ عیدگاہ میں نماز دوسرے ہی روز پڑھی گئی، لیکن چند مساجد شہر میں افطار کے روز ہی نمازِ عید وقت پر پڑھ لی، اس پر بہت سے

لوگوں کا اعتراض ہوا کہ یہ امر تفریق بین المسلمین ہے اور حکم امام کے خلاف ہے، اب دریافت طلب
یہ امر ہے کہ اگر اطول ایام میں آفتاب طلوع ہونے کے متصل ہی رویت پر شہادت گذر جائے
اور قبول ہونے پر روزہ افطار کرلیا جائے تو نماز عید اسی روز پڑھنا واجب ہے یا امر موہوم
عدمِ اجتماعِ کثیر کے احتمال پر ادائگی نماز دوسرے روز پر ملتوی کردی جائے؟ درمختار کتاب
الاضحیۃ میں قبیل عبارۃ کرہ تنزیہًا الذبح لیلاً پر صاحب شامی تحریر فرماتے ہیں لو شہدوا بعد
نصف النہار انہ العاشر جاز لہم ان یضحوا ویخرج الامام من الغد فیصلی
بہم العید وان علم فی صدر النہار انہ یوم النحر فشغل الامام عن الخروج
اوغفل فلم یخرج ولم یأمر احدا ان یصلی بہم فلا ینبغی لاحد ان یضحی حتی
یصلی بہم الامام الی ان تزول الشمس فاذا زالت قبل ان یخرج الامام ضحی الناس
اھ، یہ عبارت مفید اس معنی کو ہے کہ اگر صدر نہار میں اس امر پر شہادت گذری کہ آج عید کا روز
ہے تو امام پر واجب ہے کہ اُس ہی روز نماز عید پڑھادے، اور حدیث سے جو یہ امر ثابت ہے کہ
ایسی صورت میں دوسرے روز نماز پڑھی گئی، تو بعض روایت میں تصریح اس امر کی ہے کہ
اطلاع رویت کی بعد الزوال ہوئی تھی، اور مذکورہ صورت میں اگر امام عید کی نماز دوسرے
روز پڑھنے کا اعلان کرے تو شہر کے لوگوں کو کیا کرنا چاہئے؟ آیا وہ اپنے اپنے محلوں کی مساجد
میں نماز عید پڑھ لیں یا دوسرے ہی روز پڑھیں؟ کتبِ فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
قولِ راجح پر دوسرے روز عذر کی بناء پر ہے، نماز قضا ہوتی ہے ادا نہیں ہوتی، اور بلا عذر کے
نیز ایسے عذر کی بناء پر کہ شرع شریف میں وہ معتدبہ عذر شمار نہ ہو، دوسرے روز نماز پڑھنا
صحیح نہیں، بلکہ شغل بما لا یصح میں داخل ہوکر دیگر محظوریوں کو مستلزم ہوتا ہے۔

الجواب: جب فجر کی نماز سے متصل شہادت رویت گذری ہے تو اب محض دیہات
والوں یا سست مزاج شہریوں کے عدم اجتماع کے خیال سے عید الفطر کو اگلے دن کے
لئے امام کا مؤخر کرنا جائز نہ تھا، بلکہ یہ تاخیر چونکہ بلا عذر ہوئی ہے اس لئے اگلے دن نماز صحیح
نہیں ہوئی، اس صورت میں جن مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد میں نماز عید ادا کی اُن کا فعل
موافقِ شرع ہے، ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، اور تفریق بین المسلمین اس وقت حرام ہے جبکہ
دوسری طرف بھی گنجائش ہو، اور اگر دوسری طرف شریعت کی مخالفت ہو تو حسبِ قدرت
اُن سے مفارقت کا اظہار ضروری ہے، قال فی الدر وتوخر ای صلوٰۃ عید الفطر (۱۲)

بعذر کمطر الی الزوال من الغد فقط، فوقتہا من الثانی کالاول وتکون قضاءً
لا اداء اھ وفیہ ایضاً فالعذر ہٰہنا لنفی الکراہۃ وفی الفطر للصحۃ اھ قال
الشامی قولہ بعذر کمطر دخل فیہ ما اذا لم یخرج الامام وما اذا غم الہلال و
شہدوا بہ بعد الزوال او قبلہ بحیث لا یمکن جمع الناس اھ (ص ۸۰۵ ج ۱)
قلت والمراد بالامام ہو الامام الاعظم او نائبہ فان خلافہ لا یطاق فعدم
خروجہ عذر فی حق العامۃ ولو کان ہو آثما واما امام العیدین والجمعۃ فی
بلادنا فعدم خروجہ لیس بعذر لان خلافہ لا یضر فاذا لم یخرج بلا عذر و
خالف حکم الشریعۃ لا تترک العامۃ صلوٰتہم بل یجتمعون علی امام غیرہ او
یصلون فی مساجد مختلفۃ باختلاف المحال قال فی مراقی الفلاح وقیل العذر
للجواز لا لنفی الکراہۃ فاذا لم یکن عذر لا تصح فی الغد اھ (ص ۳۱۱) ۲۲ صفر ۴۲ھ

خط اور تار کے ذریعہ رویتِ ہلال کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟

سوال (۲) رویتِ ہلال میں خط یا تار کا اعتبار ہے یا نہیں فی زماننا جو تاریں موصول ہوتی ہیں ان کے مرسل کا بھی حال عموماً مستور ہی ہوتا ہے، اور بسا اوقات مرسل اہلِ ہنود نکلتے ہیں، ایسے حال میں کیا حکم ہے؟

الجواب: رویتِ ہلال میں تار بالکل معتبر نہیں، ہاں خط کا چند قیود سے اعتبار کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل امداد الفتاویٰ، ص ۱۷۲ جلد اول و صفحہ ۶۴ جلد اول تتمہ امداد الفتاویٰ میں موجود ہے، اور اس کے ساتھ صفحہ ۱۶ تتمہ مذکور کو بھی ضرور دیکھا جاوے۔

۱۴ر جمادی الثانی ۴۵ھ

تحقیق رویتِ ہلال درحالتِ غیم وقبولِ شہادت وغیرہ

سوال (۳) احکام الادلۃ فی احکام الاہلۃ

اگر ہلالِ رمضان یا شوال در روز غیم یک کس عادل، حُر، عاقل یا دو کس دیدہ پیش عالم ثقہ در قریہ یا مصر گواہی دادند، عالم ثقہ گواہی ایشان قبول کرد و حکم صوم یا افطار کرد و در دیگر قری بذریعہ یک مردم یا دو مردم اطلاع داد کہ نزد ما ثبوت ہلال بقواعد شرعیہ شدہ است آیا مردمہائے قریہ را بقول ایں عالم ثقہ صوم و افطار واجب است یا خود بخود از بینندگانِ ہلال شنوند وگواہی قبول کنند یا قبول کردن گواہی عالم ثقہ کافی است، ہرچہ حکم شریعت مطہرہ است بسند کتاب مطلع فرمایند؟

الجواب: فی الدر المختار وتقبل شہادۃ واحد علی آخر کعبد وانثی ولو علی

مثلهما وقال الشامی بر قوله وتقبل شهادة واحد علی آخر) بخلاف الشهادة علی الشهادة فی سائر الاحکام حیث لا تقبل مالم یشهد علی شهادة کل رجل رجلان او رجل وامرأتان (قوله کعبد وانثی) ای کما تقبل شهادة عبد وانثی (قوله ولو علی مثلهما) افاد بهذا التعمیم قبول شهادتهما علی شهادة حر اوذکر وهو بحث لصاحب النهر وقال اولم اره (ص ۱۴۶ ج ۲)۔

(۲) ولا یشترط فی هذه الشهادة لفظ الشهادة ولا الدعوی وحکم الحاکم حتی انه لوشهد عند الحاکم وسمع رجل شهادته عند الحاکم وظاهره العدالة وجب علی السامع ان یصوم ولا یحتاج الی حکم الحاکم (عالمگیریہ ص ۱۲۷ ج ۱)۔

(۳) ثم انما یلزم الصوم علی متاخری الرؤیة اذا ثبت عندهم رؤیة اولئک بطریق موجب حتی لوشهد جماعة ان اهل بلدة قد راؤا هلال رمضان قبلکم بیوم فصاموا وهذا الیوم ثلثون بحسابهم ولم یرهؤلاء الهلال لایباح فطر غد ولایترک التراویح فی هذه اللیلة لانهم لم یشهدوا بالرؤیة ولا علی شهادة غیرهم وانما حکوا رؤیة غیرهم (عالمگیریة ص ۱۲۸ ج ۱)۔

(۴) فی الدر نعم لو استفاض الخبر فی البلدة الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب مجتبی وغیره وقال الشامی تحت (قوله نعم) قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تأتی من تلک البلدة جماعات متعدد دون کل منهم یخبر عن اهل تلک البلدة انهم صاموا عن رؤیة لامجرد الشیوع من غیر علم بمن اشاعه کما قد تشیع اخبار یتحدث بها سائر اهل البلدة ولا یعلم من اشاعها (ص ۱۵۱ ج ۲)۔

(۵) (ولو کانوا ببلدة لا حکم فیها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلین) مع العلة (للضرورة) وقال الشامی (قوله لاحاکم فیها) ای لاقاضی ولاوالی کما فی الفتح (قوله صاموا بقول ثقة) ای افتراضا لقول المصنف فی شرحه وعلیهم ان یصوموا بقوله اذا کان عدلا اھ (قوله وافطروا الخ) عبارة غیره لا بأس ان یفطروا۔ والظاهر ان المراد به الوجوب ایضاً والتعبیر بنفی البأس لانه مظنة الحرمة کما فی نفی الجناح فی قوله تعالیٰ فلا جناح علیکم ان تقصروا من الصلوٰة ومثله کثیر فی کلامهم فافهم (ص ۱۴۶ ج ۲)۔

(۶) (وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ اشهد وعدم الحد فی قذف لتعلق نفع العبد الخ ص ۱۴۶ ج ۲، درمختار مع الشامی)۔

(۷) لایجوز علی شهادة رجل اقل من شهادة رجلین اورجل وامرأتین وکذا علی شهادة المرأة وهذا عندنا کذا فی الخلاصة رجلان شهدا علی شهادة رجلین او علی شهادة قوم جاز عندنا کذا فی فتاویٰ قاضی خاں (عالمگیریہ (ص ۲۷۳ ج ۴)۔

(۸) (هی مقبولة) وان کثرت استحسانا قال الشامی تحت قوله وان کثرت) اعنی الشهادة علی شهادة الفروع ثم وثم الخ ص ۶۰۷ ج ۴ شامی۔

(۹) فی الدر المختار (و) هلال (الاضحی) وبقیة الاشهر التسعة (کالفطر) علی المذهب وقال الشامی (قوله والاضحی کالفطر) ای ذو الحجة کشوال فلا یثبت بالغیم الابرجلین اورجل وامرأتین وفی الصحو لابد من زیادة العدد علی ماقدمناه وفی النوادر عن الامام انه کرمضان وصححه فی التحفة والاول ظاهر المذهب وصححه فی الهدایة وشروحها والتبیین فاختلف التصحیح وتأید الاول بانه المذهب بحر (قوله وبقیة الاشهر التسعة) فلا یقبل فیها الاشهادة رجلین اورجل وامرأتین عدول احرار غیر محدودین کما فی سائر الاحکام عن شرح مختصر الطحاوی للامام الاسبیجابی، وذکر فی الامداد انها فی الصحو کرمضان والفطر ای فلابد من الجمع العظیم ولم یعزه لاحد لکن قال الخیر الرملی الظاهر انه فی الاهلة التسعة، لا فرق بین الغیم والصحو فی قبول الرجلین لفقد العلة الموجبة لاشتراط الجمع الکثیر وهی توجه الکل طالبین ویؤیده قوله کما فی سائر الاحکام فلو شهدا فی الصحو بهلال شعبان وثبت بشروط الثبوت الشرعی یثبت رمضان بعد ثلاثین یوماً من شعبان وان کان رمضان فی الصحو لایثبت بخبرهما لان ثبوته حینئذ ضمنی ویغتفر فی الضمنیات مالا یغتفر فی القصدیات اھ (شامی ص ۱۵۲ ج ۲)۔

رویت ہلال رمضان کی شہادت میں ابر وغیرہ کے وقت جس طرح ایک عادل مرد یا عورت کافی ہے، اسی طرح ایک عادل مرد یا عورت اگر یہ شہادت دے کہ فلاں عادل عورت یا مرد نے رویت کی شہادت دی ہے تب بھی رویت ثابت ہوجاتی ہے (جیسا کہ روایت ۱ میں ہے) اور رمضان کے لئے شہادت کا لفظ بھی ضروری نہیں، اگر یوں کہدے کہ میں نے

چاند دیکھا ہے تب بھی کافی ہے، ونیز قاضی وغیرہ کا حکم بھی شرط نہیں، بلکہ بدون حکم حاکم بھی شہادتِ عادل پر عمل واجب ہے، اور مستور الحال بھی عادل کے حکم میں ہے، (ملاحظہ ہو روایت نمبر ۲) اور ظاہر یہ ہے کہ شہادت علی الشہادت میں بھی لفظ شہادت شرط نہیں، بلکہ یہ خبر دینا ہی کافی ہے کہ فلاں شخص نے رُویتِ ہلال کی شہادت یا خبر دی ہے) اور اگر شہادت کی خبر نہیں دی بلکہ ویسے ہی ذکر کیا کہ فلاں شہر والوں (یا فلاں شخص) نے چاند دیکھا ہے تو رویت ثابت نہیں ہوتی، (جیسا کہ روایت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے) البتہ اگر کسی جگہ عام طور پر بطریقِ معتبر روزہ رکھا جاوے اور وہاں کی خبر بطریق شہرت پہونچے تو روزہ واجب ہوگیا، اس میں یہ ضروری نہیں کہ شہادت علی الشہادت کے طریق پر کہا جاوے (ملاحظہ ہو روایت نمبر ۴) اور جس طرح ہلال رمضان بدونِ حکم حاکم ثابت ہوجاتا ہے اسی طرح ہلال عید الفطر بھی فقط شہادت سے ثابت ہوجاتا ہے، جبکہ وہاں حاکم وقاضی وغیرہ نہ ہو (روایت نمبر ۵ ملاحظہ ہو) لیکن ھلالِ فطر میں لفظ شہادت ہونا ضروری ہے البتہ اگر شہادت حاکم وقاضی کے ہاں نہیں تو باخبار عدلین سے (معلوم ہوتا ہے کہ بدون لفظ شہادت بھی رویت ثابت ہوجاتی ہے (لیکن لفظ شہادت کا استعمال کرنے میں احتیاط ہے) ونیز ابر وغیرہ میں ۲ دو شاہد ہونا شرط ہے، (جیسا روایت نمبر ۶ میں ہے) اور ہلالِ فطر میں شہادت علی الشہادت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ایک گواہ کیلئے نصاب کامل ہو، یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں کہ فلاں شخص نے گواہی دی ہے، اور دوسرے شخص کے لئے بھی اسی طرح ایک مرد دو عورت یا دو مرد گواہ ہوں، البتہ اگر دو مرد (یا ایک مرد اور ۲ دو عورتیں) یہ گواہی دیں کہ ہمارے سامنے ان دونوں گواہوں نے گواہی دی ہے تب ایک ہی نصاب کافی ہے (ملاحظہ ہو روایت ۷)

پس اگر وہ فرستادہ خود بھی شہادت کے وقت موجود تھا تو اس کی خبر معتبر ہے، اور اگر فرستادہ وقتِ شہادت موجود نہ تھا تو جو اُس وقت موجود تھے وہ فرستادہ کے پاس شہادت دیکر بھیجیں (ملاحظہ ہو روایت نمبر ۸) اور فرستادہ رمضان میں ایک مرد یا عورت کافی ہے، اور شوال میں ۲ دو مرد یا ایک مرد دو عورت کی ضرورت ہے، جبکہ دونوں شاہد ولنے ان کے سامنے شہادت دی ہو، ورنہ ہر شاہد کی شہادت پر نصاب کامل کی ضرورت ہے، کما مر، اور اگر یہ فرستادہ نہ تو وقتِ شہادتِ رویت موجود ہو اور نہ اُن کے پاس اس

وقت کے شاہدوں نے شہادت دی بلکہ ویسے ہی بھیجدیا، کہ جاکر رمضان یا شوال کی اطلاع کردو، تو اس سے اُن دیگر اہل قری پر نہ روزہ واجب ہوگا نہ عید جائز ہوگی، کما ھو الظاہر) اور شامی ص ۱۵۰ ج ۲ میں ہے: قلت وکذا لو شھدوا برؤیة غیرھم وان قاضی تلک المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حکایة لفعل القاضی ایضاً ولیس بحجة بخلاف قضائه الخ وایضاً فی الصفحة المذکورة قلت وجه الاستدراک ان ھذه الاستفاضة لیس فیھا شھادة علی قضاء قاض ولا علی شھادة لکن لما کانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بھا ان اھل تلک البلدة صاموا یوما کذا لزم العمل بھا لان البلدة لا تخلوا عن حاکم شرعی عادة فلا بد من ان یکون صومھم مبنیاً علی حکم حاکمھم الشرعی فکانت تلک الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وھی اقوی من الشھادة بان اھل تلک البلدة رأوا الھلال وصاموا لانھا لا تفید الیقین فلذا لم تقبل الا اذا کانت علی الحکم او علی شھادة غیرھم لتکون شھادة معتبرة والا فھی مجرد اخبار بخلاف الاستفاضة فانھا تفید الیقین فلا ینافی ما قبله ھذا ما ظھر لی فتأمل اھ۔

وایضاً فی صفحه ۱۵۵ تحت (قوله بطریق موجب) کان یتحمل اثنان الشھادة او یشھدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر الخ۔

اس سے معلوم ہوا کہ قاضی وحاکم کے حکم کی شہادت بھی پہونچ جاوے تب بھی رویت ثابت ہوجاتی ہے، خواہ شہادت علی الحکم کے ساتھ شہادتِ رویت کا بیان ہو، یا نہ ہو۔

اب رہی یہ بات کہ مفتی کا حکم اور فتویٰ حکم حاکم کے قائم مقام ہوگا یا نہیں، اس کی تصریح تو کہیں ملی نہیں، مگر ضرورت کی وجہ سے قاضی وغیرہ نہ ہونے کی حالت میں جیسا کہ خطیب جمعہ مسلمانوں کے مقرر کرنے سے ہوجاتا ہے، کما فی الدر (ونصب العامة الخطیب (غیر معتبر مع وجود من ذکر) اما مع عدمھم فیجوز للضرورة، اھ۔ اسی طرح اس میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، مگر زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ عالم فقط اپنا فیصلہ سُنا کر کسی کو نہ بھیجے، بلکہ اشہاد کے بعد بھیجے، اور رمضان میں ایک عادل اور فطر میں دو عادل جب کافی ہیں جبکہ ابر یا غبار ہو، ورنہ جم غفیر کی حاجت ہے، البتہ اگر کسی جگہ جم غفیر نے شہادت دی اور پھر اُس شہادت پر دو شاہد دوسری جگہ شہادت دیں تب وہی

شاہد کافی ہیں لما فی الدر (فیلزم اهل المشرق برؤیة اهل المغرب) اذا ثبت عندهم رؤیة اولئك بطريق موجب كما مرّ وقال الشامی تحت (قوله بطریق موجب) كان يتحمل اثنان الشهادة او یشهد اعلیٰ حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة كذا رأوه لأنه حكاية ح، اور عید الاضحیٰ کا حکم عید الفطر کی طرح ہے اور بقیہ نو مہینوں کا چاند ہر حال میں دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں کی شہادت سے ثابت ہوجاتا ہے، خواہ ابر ہو یا نہ ہو، جیسا کہ روایت نمبر ۹ سے ثابت ہے، اور اگر کسی جگہ رویت نہ ہوا ور نہ کہیں سے معتبر شہادت پہونچے تو بظاہر اُن پر یہ واجب نہیں کہ دوسری جگہ سے رویت کی تحقیق کریں، جیسا کہ عالمگیریہ، ص ۱۲۷ ج ۱ سے معلوم ہوتا ہے، یجب ان یلتمس الناس الهلال فی التاسع والعشرین من شعبان وقت الغروب فان رأوه صاموه وان غم اكملوه ثلثين يوما كذا فی الاختيار شرح المختار ام۔

حرره الاحقر عبد الکریم عفی عنہ۔

(قلت والالتماس هو طلب الشئ بنفسه لا التنقب من الغير فقد ورد فی لیلة القدر التمسوه فی العشر الاواخر ای اطلبوه منفردین لا ان تسئلوه عن كل احد) (۱۲) والاجوبة كلها صحيحة، ظفر احمد عفا الله عنه ۳۰ رشوال ۴۳ھ۔

رویتِ ہلال اور صوم یوم الشک کے بارے میں ایک استفتاء۔

سوال (۴) اس سال ہلال رمضان کے بابت ہمارے دیار میں سخت اختلاف پڑا ہے، چھ سات محلہ کے آدمی بوجہ شہادت پانچ شخص کے بر دیۃ ہلال فی الصحرا، نزدیک ایک فقیہ کے اور قبول ہونے شہادت ان کے بُدھ کے دن سے روزہ رکھیں، اور تیسویں تاریخ جمعرات کو ہلال شوال نہ دیکھنے کی وجہ سے جمعہ کے دن بھی روزہ رکھیں، اور روزے اُن کے اکتیس ہوگئے، اور جمعرات کے روزہ داروں کے تیس ہوگئے، اب بعضے عالم بُدھ کے دن کے روزہ کو صوم یوم الشک بنیۃ رمضان پر حمل کرکے مکروہ تحریمی فرماتے ہیں، لما فی الدر المختار ولو جزم ان یکون من رمضان کرہ تحریمًا، اور بُدھ کے دن کے روزہ دار کہتے ہیں جب حسب عبارت رد المحتار، بحر، بدائع وغیرہ روایت حسن از امام یصوم رمضان بشہادۃ الاثنین عند الصحو ایضًا مفتی بہ ہونا قرار پایا، تو ہمارا روزہ رکھنا حسب شریعت صحیح اور درست ہی، پھر مکروہ ہونیکا کیا معنی؟ فی رد المحتار، ج ۲ ص ۱۰۱ مصری قوله وعن الامام انه يكتفى بشاهدين

واختاره فی البحر الخ حيث قال وينبغی العمل علیٰ هذه الرواية فی زماننا لان الناس تكاسلت عن ترائی الاهلة فانتفی قوله مع توجههم طالبين لما توجه هو اليه فكان التفرد غير ظاهر فی الغلط ثم ايد ذلك بان ظاهر الولوالجية والظهيرية يدل علیٰ ان ظاهر الرواية هو اشتراط العدد لا الجمع العظيم والعدد يصدق باثنين ام اقره فی النهر والمنح ونازعه محشيه الرملی بان ظاهر المذهب اشتراط الجمع العظيم فيتعين العمل به لغلبة الفسق والافتراء علی الشهر الخ اقول انت خبير بان كثيرا من الاحكام تغيرت لتغير الازمان ولو اشترط فی زماننا الجمع العظيم لزم ان لا يصوم الناس الا بعد ليلتين او ثلاث لما هو مشاهد من تكاسل الناس بل كثيرا ما رأيناهم يشتمون من يشهد بالشهر ويؤذونه وحينئذ فليس فی شهادة الاثنين تفرد من بين الجمع الغفير حتی يظهر غلط الشاهد فانتفت علة ظاهر الرواية فتعين الافتاء بالرواية الاخری، انتهی۔

بلکہ دیگر ممالک سے جمعہ کے دن عید ہونے کی خبر سن کے فرماتے ہیں کہ جمعرات سے روزہ داروں پر ایک روزہ قضا کرنا ضروری ہے۔ لما فی البدائع ج ۲ ص ۸۲ مصری ولو صام اهل بلد ثلثين يومًا وصام اهل بلد آخر تسعة وعشرين يومًا فان كان صوم اهل ذلك برؤية الهلال وثبت ذلك عند قاضيهم او عدوا شعبان ثلاثين يومًا ثم صاموا رمضان فعلیٰ اهل البلد الآخر قضاء يوم لانهم افطروا يومًا من رمضان لثبوت الرمضانية برؤية اهل ذلك البلد وعدم رؤية اهل البلد الآخر لا يقدح فی رؤية اولئك اذ العدم لا يعارض الوجود الخ۔

اب معروض خدمت میں یہ ہے کہ (۱) بُدھ کے دن کے روزہ کا کیا حکم ہے، (۲) اور جمعرات کے روزہ رکھنے والوں پر ایک روزہ قضا ادا کرنا واجب ہی یا نہیں (۳) اور باوجود سننے خبر رویتِ ہلال کے بُدھ کے دن روزہ نہ رکھنے والوں پر اور رکھکر توڑ دینے والوں پر کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ حضورِ عالی کے دستخط نہایت ضروری ہے، بجز اس کے لوگ اعتبار نہ کریں گے۔

الجواب: بُدھ کے دن سے روزہ رکھنے والوں پر کراہت صوم یوم الشک کا الزام صحیح نہیں، جبکہ انھوں نے فقیہ کے سامنے شہادت گذرنے اور اس کے قبول ہوجانے کی

بناء پر روزہ رکھا، گو اس فقیہ نے روایت متون کے خلاف حالتِ صحو میں جمِ غفیر کے بغیر ثبوتِ ہلال کا فتویٰ دیدیا، مگر عوام کو تو علماء کا اتباع لازم ہے جبکہ اس کا فتویٰ کسی ایک روایت کے موافق ہے۔

(۲ و ۳) جمعرات سے روزہ رکھنے والے دو قسم کے ہیں، ایک علماء، دوسرے جہلاء، علماء کو اگر فقیہ مذکور کا فتویٰ اس وجہ سے مسلّم نہ ہوا کہ اس نے روایت متون کے خلاف فتویٰ دیا تو ان کو گناہ نہیں ہوا، اور یہی حکم ان جہلاء کا ہے جو اُن علماء کے معتقد ہیں جنھوں نے اُن علماء کے اختلاف کی وجہ سے فقیہ مذکور کے فتویٰ کو تسلیم نہیں کیا، اور اس کی صحت میں ان کو شبہ ہو گیا، رہے وہ جہلاء جن کو فقیہ مذکور کے فتویٰ کا علم ہوا اور دوسرے علماء کے خلاف کا علم نہیں ہوا ان کو بُدھ کے دن روزہ نہ رکھنے سے گناہ ہوا۔

رہا یہ کہ ان لوگوں کے ذمہ ایک روزہ کی قضا اور اس کے عمداً توڑنے سے کفارہ واجب ہوگا یا نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت مذکورہ کے موافق تیس دن پورا کرنے کے بعد بھی چاند نہ ہونے سے شہادت مذکورہ کا کذب و غلط محقق ہو گیا، اس لئے بُدھ کے دن ثبوت رمضان قطعی نہ رہا، پس وجوب کفارہ کی کوئی وجہ نہیں اور نہ قضا واجب ہے، البتہ جن مقامات سے جمعہ کی عید کی خبر آئی ہے اگر وہاں سے بُدھ کے دن یکم رمضان ہونے کی بھی اطلاع آجائے، اور یہ اطلاع بطریق موجب شرعی حاصل ہو تو ان لوگوں پر بُدھ کے دن ایک روزہ کی قضا واجب ہوگی، ورنہ نہیں، ۲۲ر شوال ۴۶ھ۔

دو شخص مقبول الشہادت ۲۹ر رجب کو رویتِ ہلال کی شہادت دیں تو بصورت قبولِ شہادت شعبان کے تیس دن پوری ہونے پر چاند نظر آئے یا نہ روزہ رکھا جائے گا یا نہیں، اور اس حساب سے تیس روزے پورے ہونے کے بعد عید منائی جائے گی یا نہیں؟

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر رجب المرجب کی ۲۹ر تاریخ کو باوجود مطلع صاف ہونے کے دو شخص مقبول الشہادت اور عادل رویتِ ہلال کی شہادت دیں تو ان کی شہادت سے شعبان کا چاند ثابت ہوگا یا نہیں، در صورتِ ثبوتِ شعبان کے تیس دن پورے ہو جانے کے بعد اگر چاند نظر نہ آئے خواہ مطلع صاف ہو یا نہ ہو تو رمضان مان کر روزہ رکھا جاوے اور تراویح پڑھی جائیں یا نہیں، صورتِ ہذا میں اگر روزہ رکھنا ضروری ہے تو تیس روزے رکھنے کے بعد چاند نظر نہ آنے کی صورت میں عید منائی جائے گی، یا

اکتیسواں روزہ رکھنا ضروری ہوگا، اور در صورت عدمِ ثبوت ہلال شعبان شامی کی عبارت تحت قول وبقية الاشهر التسعة الخ و بحر الرائق، ص ۲۶۹ ج ۲ اور عبارت دیگر کتب فقہ کا کیا جواب ہوگا، مفصل اور مدلل بحوالۂ کتب جواب تحریر فرما کر ماجور ہوجئے۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں دو[۲] عادل گواہوں کی شہادت سے ثبوتِ ہلالِ شعبان ہو جائے گا، اور شعبان کے تیس[۳۰] دن پورے ہو جانے پر رمضان کا ثبوت ہو جائیگا مگر اس امر کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ ہلالِ رجب کا ثبوت شرعی ہو گیا تھا یا نہیں اور گواہ عادل تھے یا نہیں، اگر عادل تھے تو اُن کو رویتِ ہلال کا جزم تھا، اور ایسا جزم تھا کہ اس پر قسم کھا سکتے تھے، یا محض شبہ اور خیال ہی تھا۔

قال الشامی نقلاً عن الخير الرملی فلو شهدا فی الصحو بهلال شعبان وثبت بشروط الثبوت الشرعی يثبت رمضان بعد ثلاثين يوماً من شعبان وان كان رمضان فی الصحو لا يثبت بخبرهما لان ثبوته حينئذ ضمنی ويغتفر فی الضمنيات ما لا يغتفر فی القصديات اھ (ص ۱۵۲ ج ۲) ۱۴ر رمضان ۴۷ھ

اس کے بعد اس جواب کو اس طرح بدلا گیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، شامی نے رد المحتار میں تو امام اسبیجابی اور رملی کے قول پر اکتفاء کیا ہے، اور صاحبِ امداد کے قول پر زیادہ زور نہیں دیا، مگر حاشیہ بحر میں رملی کا قول نقل کر کے فرمایا ہے، لکن صرح فی الامداد بخلافه فاشترط الجمع العظيم (فی سائر الاشهر) ويوافقه اطلاق عبارة مواهب الرحمن فتدبرها، چونکہ صاحب امداد نے بہت صراحت کے ساتھ جمیع اشہر میں بحالتِ صحو جمع عظیم کو شرط کہا ہے، پس اس کے خلاف فتویٰ پر جرأت کرنا نص صریح مذہب کا محتاج ہے، علامہ رملی کا محض الظاہر کہنا کافی نہیں، واللہ اعلم، ۱۵ر رمضان ۴۷ھ

رویتِ ہلال کے متعلق ایک استفتاء۔

سوال (۶۰) جالنہ و ریاست نظام دکن میں بروز جمعہ چاند نظر آیا، اور رمضان المبارک پہلی تاریخ شنبہ قرار پائی، اور شنبہ کے روز روزہ بھی رکھا گیا، ۲۹ر رمضان المبارک روز شنبہ کچھی یعنی (میمن) کے دو ملازم کھانا پکانیوالوں نے صرف چاند دیکھا، اور اس کی اطلاع قاضی صاحب صدر بازار کو دی، قاضی صاحب نے ان کا بیان لیا، اور اس کی تائید میں ایک مدینہ منورہ کا میمن صاحبان نے پیش کیا کہ مدینہ منورہ میں چاند رمضان کا بروز پنجشنبہ دیکھا گیا، اور جمعہ کے روز پہلا روزہ

رکھا گیا، اس لحاظ سے مدت یعنی ۳۰ رمضان ہے، یہاں (۳) سہ آبادی ہے، صدر بازار، جالنہ قدیم وقادر آباد، اور اس روز ابر بھی نہ تھا، ان دونوں ملازموں کے سوائے اور کسی نے نہ دیکھا اور قرب وجوار سے آنے والے اور موٹر سے آنے والے صاحب سے معلوم ہوا کہ آج چاند نہیں دیکھا، یعنی بروز شنبہ ۲۹ رمضان کو۔

الجواب؛ جب مطلع صاف تھا تو دو گواہ ہرگز کافی نہ تھے، اس حالت میں جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، یا رکھکر توڑ دیا، انھوں نے سخت غلطی کی اور قاضی صاحب نے جو فتویٰ دیا وہ صحیح نہیں ہے۔

سوال؛ قاضی صاحب نے اس واقعات کے معلوم ہونے کے بعد بھی تحصیلدار صاحب جالنہ کے پاس خط مدینہ منورہ کا اور ان دو کا بیان پیش کیا، تحصیلدار صاحب نے منادی کرانے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ گواہ عادل نہیں ہے، اور خط دور دراز مقام کا ہے، (۳۶) میل کے فاصلہ سے زائد ہے۔

الجواب. مطلع صاف ہونے کی حالت میں تو دو عادل بھی ہوتے تو قبول نہ کیا جاتا خط خود حجت نہیں ہے، اور فاصلہ زیادہ ہونا تو مضر نہیں، لیکن جہاں سے بھی خبر آوے معتبر شاہدین کے ذریعہ آنا شرط ہے۔

سوال؛ قاضی صاحب صدر بازار نے خود روزہ توڑ دیا اور لوگوں سے کہا روزہ مت رکھو تقریباً دو سو یا تین سو حضرات نے روزہ توڑ دیا، جن لوگوں نے روزہ توڑ دیا، ان کو ایک روزہ رکھنا ہوگا یا ۶۰ روزے؟

الجواب؛ مطلع صاف ہوتے ہوئے کوئی وجہ شبہ کی نہ تھی، لیکن قاضی صاحب کے فتویٰ کی وجہ سے عوام کو ایک گونہ شبہ ہو جاتا ہے، اس لئے کفارہ واجب نہیں، فقط قضا رکھنا کافی ہے، ونظیرہ فی الدر المختار (او احتجم فظن فطرہ به فاکل عمداً، قضیٰ وکفر) لانه ظن فی غیر محله حتی لو افتاہ مفتی یعتمد علیٰ قوله او سمع حدیثاً ولم یعلم تاویله لم یکفر للشبهة وان اخطاء المفتی الخ واللہ اعلم۔

تار، خط اور ٹیلیفون کے ذریعہ رویت ہلال کی خبر معتبر نہیں

سوال (۷) تار یا ٹیلیفون کے ذریعہ چاند کی اطلاع آوے تو اس کا اعتبار کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب؛ تار اور ٹیلیفون کی خبر معتبر نہیں ہے۔

سوال؛ خط کتنے میل سے آیا ہوا ہونا اس کا اعتبار اور قابل سند ہے؟

الجواب؛ میل کی کوئی تفصیل نہیں ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ چند خط ہوں، اور ان کے لکھنے والے عادل ہوں، اور ان کا خط شناخت کر لیا ہو، اور جو خبر اُن میں لکھی ہو وہ محض سُنی سُنائی بات نہ ہو بلکہ پختہ شاہدوں کی شہادت ہو۔

سوال؛ تار یا ٹیلیفون کے ذریعہ ریاست نظام حیدر آباد سے اطلاع آوے یا قرب وجوار سے مقامی عہدہ دار منصف صاحب یا تحصیلدار صاحب کے، اور اس روز ابر نہ ہو، یا ابر ہو اور ابھی مدت ختم نہ ہوئی ہو تو کیا عمل کرنا چاہئے؟

الجواب؛ تار اور ٹیلیفون کا کسی حال میں اعتبار نہیں۔

رویت ہلال کے متعلق سرکاری منادی کا حکم

سوال (۸) اگر منادی کجائے منجانب سرکار کہ آج عید ہے، کیا روزہ توڑ دینا اور دوگانہ ادا کرنے جانا ہوگا؟

الجواب؛ اس کی بناء دیکھی جاوے، اگر شہادت معتبرہ کی وجہ سے منادی کی ہے تو عید کرنا لازم ہے، اور تار وغیرہ کی بناء پر منادی کردی تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، واللہ اعلم۔

احقر عبد الکریم، ۹ شوال ۴۸ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۹ شوال ۴۸ھ

ثبوتِ رُویت کے بارے میں

سوال (۹) بجواب استفتاء مسلمانان بیکانیر جملہ کاغذات بایں تنقیحات کہ اُنتیس رمضان شنبہ کو مطلع صاف تھا یا نہیں واپس موصول ہوئے، جواباً بذریعہ عریضہ ہذا جملہ کاغذات واپس بھیجکر التماس ہے کہ جہاں تک ہمارا خیال ہے ۲۹ شعبان کو مطلع غبار آلود نہ تھا، اور نہ ہمارے شہر میں کسی کو رویت ہلال ہوئی، البتہ ۳۰ شعبان بروز جمعہ کو چاند دیکھکر بالاتفاق تمام اہل شہر نے شنبہ سے روزہ رکھنا شروع کئے، پھر ۲۹ رمضان المبارک شنبہ کو حالانکہ مطلع صاف تھا (ہمارے یہاں کے مطابق) چاند نظر نہ آیا، چنانچہ یکشنبہ کو ہم نے چاند دیکھا، اور دوشنبہ کو نمازِ عید پڑھی، مگر ہمارے مخالفین نے یکشنبہ ہی کو بغیر چاند دیکھے عید کرلی، ان کا استدلال یہ ہے کہ "اخبار زمیندار میں قاضی انب کا فتویٰ شائع ہوا تھا، کہ ہزارہ کے علاقہ میں روزے جمعہ سے شروع کئے گئے" مگر ہم نے اس استدلال کو نہیں تسلیم کیا، اور کہدیا کہ یہ اخبار کا فتویٰ ہے، ہم نہیں مانتے۔ اُن کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ "حافظ لیسین پیش امام مسجد علاقہ جیسلمیر میں اپنے دو مریدوں سے یہ سنکر آیا ہے کہ جیسلمیر میں بھی چاند جمعرات کو دیکھا گیا تھا" مگر ہم نے

حافظ یٰسین کے اس بیان پر بھی اپنے روزے موقوف نہیں کئے، اور کہا کہ ہمارے سامنے یہ بیان ایک شخص کا ہے آج ہم عید نہیں مانتے، اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے مزید اطمینان کے لئے ایک تار مولوی کفایت اللہ صاحب کو دیا تو جواب آیا کہ عید آج نہیں ہے، کل ۳ر مارچ ۱۹۲۵ء بروز پیر کو ہوگی، اب ہم کو کسی قدر اطمینان ہوگیا، ہم نے روزہ موقوف نہیں کیا، شام کو چاند دیکھکر دوشنبہ کو عید کی۔

اب مخالفین تو یہ کہتے ہیں کہ ۲۹ر رمضان کو مطلع غبار آلود تھا، ہم کہتے ہیں کہ نہیں، مطلع صاف تھا، ورنہ دہلی میں تو نظر آجاتا، وہاں بھی تو عید دوشنبہ کو ہوئی۔

دوسری تنقیح سامی کہ بچھا سروالوں کا بیان متفقہ لکھو، اس کے جواب میں یہ گذارش ہے کہ بچھا سروالوں نے ہمارے ساتھ دوشنبہ کے دن نماز عید پڑھی ہے، ان کا چاند کے متعلق کوئی بیان نہیں گذرا، ورنہ ہم خود اسی روز کیوں نہ نماز ادا کرتے؟

اب حل طلب تین سوال نکلے:۔

(۱) ایک تو یہ کہ حافظ یٰسین کا اپنے دو مریدوں سے کسی گاؤں میں سنکر آنا کہ وہاں جمعہ سے روزے رکھے گئے تھے ہمارے لئے شرعاً فطر کے لئے کافی تھا یا نہیں؟

جواب: کافی نہ تھا۔

سوال دوسرا یہ کہ فتویٰ قاضی انب مطبوعہ زمیندار کہ روزے موثق شہادت پر جمعہ سے شروع کئے گئے ہیں، ہمارے لئے موجب فطر تھا یا نہیں؟

جواب: موجب فطر نہ تھا۔

سوال: اس وقت تک ہمارے صرف ۲۹ روزے ہوئے تھے، کیونکہ ہم اہل شہر نے شنبہ کو چاند دیکھکر روزہ رکھا تھا، شوال کا چاند سنیچر کو نظر نہیں آیا، تار سے دلی میں بھی عید نہ ہونا پایا گیا، پھر کیا ہم کو اپنے روزے اُن وجوہ پر کھول دینے چاہئے تھے؟ لہذا استفتاء ہے کہ ہمارا دوشنبہ کے دن عید کرنا صحیح تھا یا ہمارے مخالفین کا یکشنبہ کے دن کرلینا؟

جواب: آپ کا دوشنبہ کو عید کرنا صحیح ہوا، اور مخالفین کے دلائل اگر وہی ہیں جو اوپر مذکور ہیں تو ان کا یکشنبہ کو افطار کرنا غلط تھا۔

سوال: ہم دونوں میں سے برسر صحت و موقع ملامت شرعاً کون تھا؟

جواب: اوپر لکھدیا گیا۔

سوال: قاضی صاحب انب نے یہ کیسے شائع کردیا کہ موثق شرعی شہادت سے روزے جمعہ کو شروع کئے گئے ہیں، لہذا اتوار کو عید کرلو، حالانکہ دلی، لکھنؤ، دیوبند لاہور میں سب جگہ عید دوشنبہ کو ہی ہوئی ہے۔

الجواب: یہ سوال قاضی صاحب سے کیا جاوے۔

سوال: اور ان شہر والوں نے قاضی انب کے فتویٰ کو کیوں نہیں تسلیم کیا؟

الجواب: اس لئے کہ اس میں کتاب القاضی کے شروط متحقق نہ تھے۔

سوال: اور ان کو ایسا فتویٰ قبل از وقت شائع بھی کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: ہرگز نہیں، کیونکہ یہ کتاب القاضی کی صورت میں داخل نہیں، جو حجت ہو، پھر بجز تشویش عوام کے اس سے کیا نفع تھا؟

سوال: مطبوعہ فتویٰ اخبارات کا واجب العمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں، بدلائل شرعیہ جواب مرحمت فرمایا جاوے؟

الجواب: تحریر وہ معتبر ہے جو شاہد کی ہو، یعنی جس نے خود چاند دیکھا ہو اور خود اس کے قلم کی ہو، اور اس تحریر کو بہت لوگ وثوق سے پہچانتے ہوں، یا قاضی کی دستخطی تحریر ہو، جو کسی قاضی یا عالم کے نام ہو، اور اس میں قاضی نے شہود کا نام اور پتہ لکھ کر مع اُن کے بیان اور اپنے فیصلہ کے دستخط کے ساتھ تحریر کیا ہو، اور دو معتبر مسلم گواہوں کے ہاتھ اُس خط کو دوسرے قاضی یا عالم کے پاس بھیجا ہو، جو اس کی گواہی دیں کہ یہ خط ہمارے سامنے قاضی نے لکھا ہے، اور جس کے نام خط ہو وہ قاضی کی تحریر کو خوب پہچانتا ہو، ورنہ اس کی بھی ضرورت ہوگی کہ دو گواہ مسلمان اس کی بھی شہادت دیں کہ ہمارے سامنے قاضی کے پاس شاہدین کا یہ بیان ہوا، اور اس پر قاضی نے یہ فیصلہ کیا، وہذا کلہ مذکور فی الہدایۃ وغیرہا فی کتاب القاضی الی القاضی، چونکہ اخباری فتاویٰ اس شرط سے خالی ہوتے ہیں، اس لئے وہ حجت نہیں ہوسکتے، واللہ اعلم۔

نوٹ: یہ جواب تو اس امر کے متعلق تھا کہ عید کے موقع پر وجوہ مذکورہ سوال کی بنا پر کس فریق کا عمل صحیح ہوا، لیکن اب مختلف و متعدد خبروں سے جو اس ایک مہینہ میں موصول ہوئیں، اور استفاضہ کی حد کو پہونچ گئیں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے رمضان جمعہ سے شروع نہیں کیا، وہ ایک روزہ رکھ لیں۔ ۱۳ر ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

ٹیلیفون کے ذریعہ رویتِ ہلال کی خبر کا اعتبار ہے یا نہیں؟

سوال (۱۰) اگر رویتِ ہلال کی خبر مختلف مقامات سے ٹیلیفون کے ذریعہ آوے اور ٹیلیفون میں بولنے والے کی آواز کو وہ شخص شناخت بھی کرلے کہ فلاں شخص بول رہا ہے، اور ٹیلیفون میں بولنے والے کی آواز کو وہ شخص شناخت کرسکتا ہے جسکو اس کا کام پڑتا ہے اور اس کا محاورہ ہے، اور اس وجہ سے ٹیلیفون کی خبر کو ٹیلی گرام کی خبر سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے، اور پھر سننے والے کو متفرق مقامات کی خبریں سننے سے اسکا اطمینان بھی ہوجاوے کہ یہ خبریں سچی ہیں، اور ضرور چاند ہوگیا ہے تو ایسی صورت میں ٹیلیفون کی خبر کا اعتبار کر کے روزہ رکھنے یا افطار کا شرعاً حکم دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اس سوال کا جواب لکھنے سے پیشتر چند امور ضروریہ درج ہیں:۔

۱، جب مطلع صاف نہ ہو یعنی چاند نظر آنے کی جگہ ابر یا غبار وغیرہ ہو تو ہلالِ رمضان میں اصطلاحی شہادت شرط نہیں، بلکہ ایک عادل یا مستور الحال کی خبرِ رویت مقبول ہے، خواہ وہ خبر دہندہ غلام یا عورت ہی ہو، فی الدر المختار (وقبل بلا دعوی) بلا (لفظ اشهد) وبلا حكم ومجلس قضاء لانه خبر لا شهادة (للصوم مع علة كغيم وغبار (خبر عدل) او مستور على ما صححه البزازی علی خلاف ظاهر الرواية لا فاسق اتفاقا وهل له ان يشهد مع علمه بفسقه قال البزازی نعم لان القاضی ربما قبله (ولو) كان العدل (قنا او انثى او محدودا فی قذف تاب) بين كيفية الرؤية اولا على المذهب وتقبل شهادة واحد على آخر كعبد وانثى ولو على مثلهما (شامی ص ۱۴۵ ج ۲)۔

۲، ہلالِ فطر میں شہادتِ اصطلاحیہ شرط ہے، اس لئے لفظ شہادت بھی ضروری ہے اور شاہد کا عادل ہونا بھی لازمی ہے، مستور الحال کی شہادت قابلِ قبول نہیں، نصابِ شہادت بھی شرط ہے، یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، نیز غلام و محدود فی القذف کا قول بھی اس باب میں معتبر نہیں فی الدر (وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ اشهد) وعدم حد فی قذف لتعلق نفع العبد لكن (لا تشترط الدعوى) كما لا تشترط فی عتق الامة وطلاق الحرة (شامی ص ۱۴۶ ج ۲)۔

۳، چونکہ اخبار میں خط مقبول ہے اور شہادت میں مقبول نہیں، اس لئے ہلالِ فطر میں زبانی شہادت شرط ہے، خط غیر معتبر اور نا قابل قبول ہے، اور ہلالِ رمضان میں خط

بھی قابلِ قبول ہے، جبکہ اوس کو بخوبی شناخت کرلیا ہو۔

۴، یہ سب احکام مذکورہ اس جگہ کے لئے مصرح موجود ہیں جہاں قاضی وغیرہ موجود ہو اور جہاں اسلامی حکام نہ ہوں، چونکہ وہاں ادائے شہادت ممکن نہیں، لان من ارکانها مجلس القضاء، اس لئے ایسی جگہ کے واسطے فقہائے کرام نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة (در مختار) وقال العلامة الشامی تحت قوله لا حاكم فيها: ای لا قاضی ولا والی كما فی الفتح، وتحت قوله للضرورة: ای ضرورة عدم وجود حاكم يشهد عنده، اس کے جزو اول یعنی صاموا بقول ثقة میں تو کوئی تامل نہیں، کیونکہ ہلالِ رمضان کی شہادت وجودِ حاکم کے وقت بھی خبر ہی کے حکم میں ہے، اور مجلسِ حاکم اس کے لئے فی نفسہ شرط نہیں، بلکہ صرف انتظام کی وجہ سے حاکم کے ہاں بیان دینے کی ضرورت ہے، مگر جزو ثانی یعنی افطروا باخبار عدلین میں یہ سوال ہے کہ اس حالت میں ہلالِ فطر کی شہادت اخبارِ محض کے ساتھ ملحق ہو کر اس میں شہادت کے تمام شرائط علاوہ نصاب و عدالت غیر ضروری ہوگئے، یا صرف مجلسِ حاکم ہی کی شرط کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے سو لفظ اخبار کے اطلاق سے تو شقِ اول مفہوم ہوتی ہے، مگر جو علت بیان کی گئی ہے اس سے شقِ ثانی متبادر رہی، کیونکہ عدمِ حاکم کی وجہ سے صرف اسی کی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ مجلسِ قضا کی شرط کو اٹھا دیا جائے، اور بقیہ شرائط کے ارتفاع کی کوئی ضرورت نہیں، لہذا ان کو بحالہا رکھا جائے گا، اور البحر الرائق میں ہے: فيشترط فيه ما يشترط فی سائر حقوقهم من العدالة والحرية والعدد وعدم الحد فی قذف ولفظ الشهادة والدعوى على خلاف فيه ان امكن ذلك والا فقد تقدم انهم لو كانوا فی بلدة لا قاضی فيها ولا والی فان الناس يصومون بقول الثقة ويفطرون باخبار عدلين للضرورة۔

اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ حاکم نہ ہونے کی صورت میں جو شرط غیر ممکن ہوگئی ہے صرف وہی مرتفع ہوگی، یعنی دعویٰ اور لفظ شہادت اور بقیہ شرائط پر کوئی اثر نہ پڑیگا، اور گو قواعد سے یہ شقِ ثانی ظاہراً راجح معلوم ہوتی ہے، مگر ہنوز اس میں شرح صدر نہیں ہوا، اس لئے علمائے کرام سے مراجعت کرلی جاوے۔

۵، خط کے متعلق جو تفصیل ۳ میں گذر چکی ہے جہاں حاکم نہ ہو وہاں غیر حاکم کو

بھی اسی تفصیل کا پابند ہونا ضروری ہے، کما لایخفی، پس ہلالِ رمضان میں خط کو بشرطِ شناخت قبول کیا جائے گا، اور شناخت میں شبہ ہو تو بالکل غیر معتبر ہے، اور ہلالِ فطر میں جس طرح حاکم خط کو قبول نہیں کرسکتا اسی طرح غیر حاکم بھی قبول نہیں کرسکتا، خواہ ۳ کے جزو ثانی میں شق اول کو لیا جاوے، (یعنی ہلالِ فطر کی شہادت کو عدم الحاکم کے وقت تمام شرائط میں اخبار کے ساتھ ملحق کیا جاوے) خواہ شقِ ثانی کو (یعنی عدم الحاکم کے وقت مجلسِ قضا کے علاوہ بقیہ شرائط میں شہادت کا حکم رکھا جاوے) ہر دو شق کا ایک ہی حکم ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ شقِ ثانی اختیار کرنے کی صورت میں تو خط کے عدمِ قبول کا حکم اصلی ہوگا، اور شقِ اول اختیار کی جاوے تو فی نفسہٖ قبولِ خط کی گنجائش ہے، بشرط شناخت، مگر عام بے احتیاطی پر نظر کر کے علی الاطلاق عدم قبول ہی کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

(۶) ٹیلیفون گو اپنی اصل کے اعتبار سے خط کے مثل ہے، لان النغمۃ یشبہ النغمۃ کما ان الخط یشبہ الخط، لیکن غور کیا جائے تو اس میں خط سے زیادہ اشتباہ ہے، کیونکہ خط میں مکرر نظر کر کے بخوبی شناخت کا موقع ملتا ہے، اور ٹیلیفون میں قلتِ وقت کی وجہ سے مکرر غور کی نوبت نہیں آسکتی، نیز خط کو دوسرے لوگ بھی دیکھ سکتے ہیں، اور ٹیلیفون کو صرف سننے والا تنہا سنتا ہے، اس واسطے اس کی خبر میں خط سے بھی زیادہ احتمال ہے۔

ان امور مندرجہ بالا سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اگر ٹیلیفون میں آواز کی بخوبی شناخت نہ ہو تب تو وہ بالکل ہی قابلِ التفات نہیں، اور اگر بخوبی شناخت ہو جائے تو ہلالِ فطر میں اس وقت بھی قابلِ قبول نہیں، اور ہلالِ رمضان میں بخوبی شناخت کے بعد فی نفسہٖ قبول کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن عام طور پر لوگوں کی بے احتیاطی کا غالب اندیشہ ہے اسلئے اس میں بھی عدمِ قبول ہی کا فتویٰ دیا جاتا ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

تنبیہ :۔ آجکل رویتِ ہلال کے بارے میں یہ بھی کوتاہی کی جاتی ہے کہ ہر قسم کی خبر کو معتبر سمجھ لیتے ہیں، اس کا امتیاز نہیں کرتے، کہ یہ شہادت ہے یا شہادت علی الشہادت یا مجرد حکایت، حالانکہ اس میں تفصیل طویل ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ تفصیل معلوم کرلی جاوے، فقط کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۵ر شعبان ۵۳ھ۔

الجواب عندی صحیح، اشرف علی یکم رمضان ۵۳ھ۔

فصل فیما یفسد الصوم وما یکرہ للصائم

روزہ کی حالت میں سفوفِ تمباکو منہ میں رکھنا

سوال (۱) سفوفِ تمباکو مرکب بر ماد ورق نارجیل یا نخل صائم کو استعمال کرنا بالاحتیاط اور بغیر احتیاط اور دو تین منٹ کے بعد کلی کرنا جائز ہے یا نہیں، اور حلق کے نیچے یقیناً نہیں اترتا ہے احتیاط کی صورت میں؟

الجواب: قال فی العالمگیریۃ ولو مس الهليلج فدخل البزاق حلقه لم يفسد ما لم يدخل عينه كذا في الظهيرية اھ ص ۱۳۱ ج ۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ سفوف تمباکو مرکب کا اس طرح دانتوں میں استعمال کرنا کہ حلق سے نیچے یقیناً نہ اترے، مفسد صوم نہیں، اور اگر ذرا سا بھی حلق سے نیچے اتر جائے گا تو روزہ فاسد ہے، اور اس سفوف کا استعمال بحالتِ صوم بلاضرورت مکروہ ہے، لما فیہ من تعریض الصوم للفساد ولا یصح قیاسہ علی السواک لانہ ثبت بالسنۃ علی خلاف القیاس ولا علی العلک لکونہ ملتئم الاجزاء دون السفوف کذا قال الشیخ مد ظلہ، اور ضرورت بعد مغرب کے استعمال کرنے سے بھی رفع ہو سکتی ہے، ۲۲ر رمضان ۴۰ھ۔

ادخال مسہائے بواسیری بید مبتلوہ در صوم

سوال (۲) پچیس برس سے زائد زید کے بواسیری مسّے ہیں، وقتِ رفعِ حاجت باہر آجاتے ہیں، ان کو پانی سے دھو کر کپڑے وغیرہ سے خشک کرتا ہے تو بوجہ جلن ہوتی ہے، قبض سخت ہو جاتا ہے اور خون تک آجاتا ہے، صرف پانی سے دھو کر تر گیلے آہستہ آہستہ اندر کو چڑھا دیتا ہے، تو تکلیف نہیں ہوتی، زید ہمیشہ بفضلہ تعالیٰ رمضان شریف کے باقی ہر ماہ نفل روزہ بھی رکھتا ہے، حال میں اس کو معلوم ہوا کہ تر گیلے مسّے اندر چڑھ جانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے قضا لازم آتی ہے، اب ایسی صورت میں پچیس برس سے زائد روزوں کا وہ کیا کرے، اور آئندہ روزہ کس طرح رکھے، تکلیف کی وجہ سے اس کو بوجہ عذر مسّے اندر گیلے تر چڑھانا کس طرح چاہئے، اور روزہ کس طرح رکھنا چاہئے؟ فدیہ کی بھی اس قدر اس میں قوت نہیں ہے۔

الجواب: قال فی الدر ولو بالغ فی الاستنجاء حتی بلغ موضع الحقنة

فسد وهذا قلما یکون ولو کان فیورث داءً عظیماً اھ قال الشامی ثم فی بعض النسخ المحقنة بالمیم وھی اولیٰ قال فی الفتح والحد الذی یتعلق بالوصول الیہ الفساد قدر المحقنة اھ ای قدر ما یصل الیہ رأس المحقنة التی ھی آلة الاحتقان وعلی الاول فالمراد الموضع الذی ینصب منہ الدواء الی الامعاء اھ (۱۵۸ ج ۲) قلت وثبور البواسیر التی تخرج وقت الاستنجاء انما تکون داخلة قدر الاصبع والقدر الذی یصل الیہ رأس المحقنة ھو خمسة اصابع الیٰ ستة لایکون اقل من ذلک کما افادہ الطبیب الحاذق القاضی بشیر الدین اللکنوی فالبلة الکائنة علی تلک البثور لاتبلغ قدر المحقنة اصلا فلزم القول بعدم فساد الصوم بتلک البلة واللہ اعلم وقول الدر ولو الاصبع مبتلة فسد قید الشامی بما لو ادخل الاصبع الی موضع المحقنة (ص ۱۵۸ ج ۲)

عبارات درمختار اور شامی اور فتح القدیر سے معلوم ہوا کہ استنجے میں تری کا اندر پہنچنا جب مفسدِ صوم ہے کہ تری قدر محقنہ پر پہونچ جائے اس سے کم مقدار میں اندر تری پہنچنا مفسد نہیں، اور ہم کو طبیب حاذق کے قول سے جن پر ہم کو اعتماد و وثوق ہے معلوم ہوا ہے کہ حالتِ احتقان میں رأس محقنہ پانچ چھ انگل اندر پہونچایا جاتا ہے، تب احتقان ہو سکتا ہے، اس سے کم میں نہیں، اور بواسیری مسّے اتنے اندر نہیں ہوتے بلکہ ایک دو انگل اندر ہوتے ہیں، تو ان پر تری کا لگا رہنا اور اسی حالت سے اندر پہونچنا قدر محقنہ تک تری پہونچنے کو مستلزم نہ ہوگا، لہذا اس حالت میں روزہ بھی فاسد نہ ہوگا، باقی احتیاط یہ ہے کہ ایسا مریض حتی الامکان جس قدر تری کو بلا مشقت خشک کرکے مسّے اندر کر سکتا ہو اس کے خشک کرنے میں کوتاہی نہ کرے، باقی مسّوں کے خشک کرنے میں مبالغہ کی ضرورت نہیں، قال فی مراقی الفلاح او ادخل اصبعہ مبلولة بماء اودھن فی دبرہ او استنجی فوصل الماء الی داخل دبرہ او فرجھا الداخل بالمبالغة فیہ والحد الفاصل الذی یتعلق بالوصول الیہ الفساد قدر المحقنة اھ قال الطحطاوی ای قدر ما تاخذ من المحل الذی تصل الیہ اھ (ص ۳۹۳ و ۳۹۴) وفی الدر ولو بقی بلل فی فیہ بعد المضمضة او ابتلعہ مع الریق اھ قال الشامی وینبغی اشتراط البصق بعد مج الماء لاختلاط

الماء بالبصاق فلا یخرج بمجرد المج نعم لایشترط المبالغة فی البصق لان الباقی بعدہ مجرد بلل ورطوبة لایمکن التحرز عنہ اھ (ص ۱۵۷ ج ۲) واللہ اعلم،

۲ ذیقعدہ سنہ ۴۳ھ۔

طاعونی ٹیکہ لگوانا مفسدِ صوم ہے یا نہیں

سوال (۳) روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا کیسا ہے ٹیکہ لگانے سے روزہ جاتا رہتا ہے یا نہیں، تحریر فرمائیں؟

الجواب: قال فی الدر او اقطر فی احلیلہ ماءً اودھناً وان وصل الی المثانة علی المذھب ای لایفسد ۱۲ واما فی قبلھا فمفسد اجماعاً لانہ کالحقنة اھ قال الشامی علی المذھب ای قول ابی حنیفة ومحمد معہ فی الاظھر وقال ابو یوسف یفطر والاختلاف مبنی علی انہ ھل بین المثانة والجوف منفذ اولا وھو لیس باختلاف علی التحقیق والاظھر انہ لامنفذ لہ کذا یقول الاطباء زیلعی وافاد انہ لو بقی فی قصبة الذکر لایفسد اتفاقاً لان العلة من الجانبین الوصول الی الجوف وعدمہ بناء علی وجود المنفذ وعدمہ لکن ھذا یقتضی عدم الفساد فی حشو الدبر وفرجھا الداخل ولا مخلص الا باثبات ان المدخل فیھما تجذبہ الطبیعة فلا یعود الا مع الخارج المعتاد وتمامہ فی الفتح، قلت الاقرب التخلص بان الدبر والفرج الداخل من الجوف اذلا حاجز بینھما وبینہ فھما فی حکمہ والفم والانف وان لم یکن بینھما وبین الجوف حاجز الا ان الشارع اعتبرھما فی الصوم من الخارج وھذا بخلاف قصبة الذکر فان المثانة لامنفذ لھما علی قولھما اھ (ص ۱۶۱ ج ۲)۔

وفی الدر ایضاً او اکتحل او ادھن وان وجد طعمہ فی حلقہ اھ قال الشامی ای طعم الکحل او الدھن وکذا لو بزق فوجد لونہ فی الاصح بحر قال فی النھر لان الموجود فی حلقہ اثر داخل من المسام الذی ھو خلل البدن والمفطر انما ھو الداخل من المنافذ اھ (ص ۱۵۶ ج ۲) وفی الکنز وان احتقن او استعط او اقطر فی اذنہ او داوی جائفةً او آمة بدواء ووصل الدواء الی جوفہ او دماغہ افطر اھ وکذا ھو فی اکثر المتون قال الشامی الجائفة الطعنة التی بلغت الجوف او نفذتہ والآمة من اممتہ بالعصاء اذا ضربتہ اھ رأسہ

وهى الجلدة التى تجمع الدماغ قال فى البحر والتحقيق ان بين جوف الرأس وجوف المعدة منفذًا اصليًا فما وصل الى جوف الرأس يصل الى جوف البطن اھ ط (ص ۶۴ ج ۲) وفى البدائع وما وصل الى الجوف اوالى الدماغ من المخارق الاصلية كالانف والاذن والدبر بان استعط او احتقن او اقطر فى اذنه فوصل الى الجوف اوالى الدماغ فسد صومه اما اذا وصل الى الجوف فلاشك فيه لوجود الاكل من حيث الصورة وكذا اذا وصل الى الدماغ لان له منفذًا الى الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف وقد روى عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال للقيط بن صبرة عہ بالغ فى المضمضة والاستنشاق الا ان تكون صائمًا ومعلوم ان استثناءه حالة الصوم للاحتراز عن فساد الصوم والا لم يكن للاستثناء معنًى واما ما وصل الى الجوف اوالى الدماغ عن غير المخارق الاصلية بان داوى الجائفة والآمة فان داواها بدواء يابس لا يفسد لانه لم يصل الى الجوف ولا الى الدماغ ولو علم انه وصل يفسد فى قول ابى حنيفة رح وان داواها بدواء رطب يفسد عند ابى حنيفة رح وعندهما لا يفسد هما اعتبرا المخارق الاصلية لان الوصول الى الجوف من المخارق الاصلية متيقن به ومن غيرها مشكوك فيه فلا نحكم بالفساد مع الشك، ولابى حنيفة رح ان الدواء اذا كان رطبًا فالظاهر هو الوصول لوجود المنفذ الى الجوف فيبنى الحكم على الظاهر، واما الاقطار فى الاحليل فلا يفسد عند ابى حنيفة وعندهما يفسد، قيل ان الاختلاف بينهم بناء على امر خفى وهو كيفية خروج البول من الاحليل فعندهما ان خروجه منه لان له منفذًا فاذا اقطر فيه يصل الى الجوف كالاقطار فى الاذن وعند ابى حنيفة ان خروج البول منه من طريق الترشح كترشح الماء من الخزف الجديد فلا يصل بالاقطار فيه الى الجوف والظاهر ان البول يخرج منه خروج الشئ من منفذه كما قالا، وروى الحسن عن ابى حنيفة رح مثل قولهما وعلى هذه الرواية اعتمد استاذى، واما الاقطار فى قبل المرأة فقد قال مشائخنا انه يفسد صومها

عہ قلت حدیث صحیح صححه ابن القطان كما فى الاستدراك الحسن ۱۲ منه

بالاجماع لان لمثانتها منفذًا فيصل الى الجوف كالاقطار فى الاذن اھ (ص ۹۳ ج ۲)

ان عبارات سے چند مقدمات ممہد ہوئے:۔

(۱) جو چیز جوف کی طرف بدون منفذ کے پہونچے وہ مفطر نہیں، ودلیلہ مسئلۃ الاکتحال وغیرہ۔

(۲) افطار کا مدار دخول من المنفذ پر ہے، صاحبینؒ کے نزدیک تو منافذ اصلیہ سے دخول شرط ہے، اور امام صاحبؒ کے نزدیک منافذ اصلیہ کے سوا دیگر منافذ سے بھی دخول مفطر ہے۔

(۳) منفذ سے مراد یہ ہے کہ دماغ یا جوف تک بلا واسطہ عروق کے رستہ ہو جائے چنانچہ مخارق غیر اصلیہ کی مثال میں جائفہ اور آمہ کا بیان کرنا اس کی دلیل ہے تمام متون وشروح میں مخارق غیر اصلیہ میں امامؒ وصاحبینؒ کے اختلاف کو جائفہ اور آمہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؛ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر جراحت جائفہ اور آمہ کی حد تک نہ پہونچے، اور جوف ودماغ تک بلا واسطہ منفذ نہ ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک بھی اس کے ذریعہ سے وصول مفطر نہیں، لان المفطر انما ہو الداخل من المنافذ۔

اور صاحب بدائع نے امام صاحب کی طرف سے جو دلیل بیان کی ہے وہ اس پر صاف دلالت کر رہی ہے، "وہو قول ابی حنیفۃ ان الدواء اذا کان رطبًا فالظاہر ہو الوصول لوجود المنفذ الی الجوف" اس سے معلوم ہوا کہ جائفہ اور آمہ میں دواء رطب کا استعمال اسی لئے مفطر ہے کہ اس صورت میں دخول الی الجوف منفذ سے ہو رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں منفذ سے وہ راستہ مراد ہے جو بلا واسطہ جوف سے متصل ہو نہ کہ بواسطۂ عروق کے، ورنہ امام صاحبؒ اقطار فی الاحلیل میں صاحبینؒ کے خلاف نہ کرتے، کیونکہ گو وہاں منفذ بلا واسطہ نہ ہو مگر منفذ بواسطہ تو یقینًا ہے، جس سے ترشح بول بمقدار کثیر ہوتا ہے، مگر اس کو امام صاحب منفذ نہیں مانتے، پس معلوم ہوا کہ امام صاحب مخارق اصلیہ کے سوا دیگر مخارق کو بحکم مخارق اصلیہ اس وقت مانتے ہیں جبکہ وہ مخارقِ اصلیہ کی طرح بلا واسطہ جوف ودماغ تک متصل ہوں۔

اس تمہید کے بعد طاعونی ٹیکہ کا حکم ظاہر ہے، کہ وہ مفطر صوم نہیں، کیونکہ جس مقام پر وہ لگایا جاتا ہے وہاں سے جوف ودماغ تک منفذ نہیں، اور اگر منفذ ہو بھی تو بلا واسطہ نہیں بلکہ بواسطۂ عروق کے ہے، پس اس سے دوا کا جوف میں وصول ایسا ہی ہوگا جیسا کہ احلیل سے جوف میں دوا کا اثر ہوتا ہے، کہ وہ بھی بلا منفذ ہے، اور عروق

کے واسطہ سے ہے، علاوہ ازیں طاعونی ٹیکہ میں دوا کے چند قطرات ہوتے ہیں جو اول بازو کے خون میں پہونچتے ہیں، پھر اس خون کے دوران سے بقیہ جسم کے خون میں پہونچتے ہیں، اسی طرح اگر کچھ خون اس دوا کا اثر لئے ہوئے جوف میں بھی پہونچتا ہو تو اس سے افطار کیونکر ہوسکتا ہے، کیونکہ اس وقت وہ جوف میں تلاشی کے بعد پہونچتا ہے، کما اذا مضغ العلک والسمسم ثم ابتلعہ، نیز ہم کو ایک طبیب سے معلوم ہوا ہے کہ ٹیکہ کی دوا جوف میں نہیں پہنچتی بلکہ صرف عروقِ جسم میں سرایت کرتی ہے، مگر اس پر مدار فتویٰ نہیں، بلکہ مدار پہلی دلیلوں پر ہے، اس کو محض تائید کے درجہ میں لکھ دیا گیا، واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ — نعم التحقیق وبالقبول الحقیق

۲۱ رشوال ۱۳۴۴ھ — کتبہ اشرف علی، ۲۳ رشوال ۴۴ھ

بعد افطار ادام نہانی میں کوئی دوا بحالتِ صوم باقی رہے تو روزہ پر اس کا کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

سوال (۴) اس امر کا تو ہدایہ سے پتہ چل گیا کہ اقبالِ نساء میں اگر دوا ٹپکائی جاوے تو روزہ ٹوٹ جائے گا، مگر یہ اس سے بھی نہ معلوم ہوا کہ بعد افطار اگر کوئی ذی جرم دوا اس میں رکھدی جاوے اور وہ بحالتِ صوم بھی باقی رہے تو روزہ پر اس کا کیا اثر ہوگا اسی امر کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے؟

الجواب: او ادخل قطنۃ او خرقۃ او خشبۃ او حجرا فی دبرہ او ادخلتہ فی فرجہا الداخل وغیبہا لانہ تم الدخول بخلاف ما لو بقی طرفہ خارجا لان عدم تمام الدخول کعدم دخول شیئ بالمرۃ اھ (ص ۳۹۴ مراقی الفلاح) بعد افطار کے جو شے داخل کی جائے خواہ تر ہو یا خشک اس کے بقاء بحالِ صوم سے تو فطر کا کچھ شبہ نہیں، اسی لئے فقہاء نے اس سے تعرض نہیں کیا، اس صورت میں روزہ صحیح ہے، اور خشک چیز کا تو بحالِ صوم رکھنا بھی اُس وقت موجبِ فطر ہے، جبکہ پوری اندر ہو، اور اگر کچھ حصہ باہر فرجِ خارج میں نکلا ہے تو مفطر نہیں، واللہ اعلم۔

طاعونی ٹیکہ اور فصد لگوانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

سوال (۵) رمضان میں ٹیکہ لگانا یا فصد کرانا یا بذریعہ آلہ دوا بازو میں پہنچانا جیسا کہ اس نواح میں اب ڈاکٹر لوگ بوجہ پلیگ کے کرتے ہیں، روزہ میں نقصان کرے گا یا نہیں، اللہ سے امید ہے کہ حضور تسلی بخش جواب دے کر مشکور فرمادیں گے؟

الجواب: طاعونی ٹیکہ یا چیچک کا ٹیکہ یا فصد لگوانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

۲۱ رمضان ۴۷ھ

صوم معذور کا حکم

سوال (۶) زید کا دماغ یا پھیپھڑا یا مسوڑھوں کے پھول جانے یا دانتوں کے ہلنے کے سبب منہ کے راہ خون آتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سانس کے ذریعے فرد حلق بھی جاگتے سوتے ہوتا ہے، (ایسی حالت میں اگر زید روزے رکھے تو اس کا روزہ ادا ہوگا یا نہیں، اگر روزہ اس کا اس سبب سے نہیں ادا ہوتا ہے تو بدلے ان روزوں کے زید کو شرعاً کیا کرنا چاہئے؟ بینوا بالکتاب توجروا بالصواب۔

الجواب: جس شخص کے دانتوں میں سے اکثر خون آتا رہتا ہو، اور بلا اختیار جاگتے ہوئے یا سوتے ہوئے حلق میں بھی داخل ہوجائے اس کا حکم کسی جگہ صریح نہیں ملا، مگر علامہ شامی نے اتنا لکھا ہے کہ: ومن ہذا یعلم حکم من قلع ضرسہ فی رمضان ودخل الدم الی جوفہ فی النہار ولو نائما فیجب علیہ القضاء الا ان یفرق بعدم امکان التحرز عنہ فیکون کالقیئ الذی عاد بنفسہ فلیراجع، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے روزہ کو صحیح کہنے کی گنجائش ہے، اور اگر شامی کی عبارتِ ذیل پر نظر کی جاوے تو اور بھی زیادہ گنجائش معلوم ہوتی ہے، (قولہ ولم یصل الی جوفہ) ظاہر اطلاق المتن انہ لا یفطر وان کان الدم غالبا علی الریق وصححہ فی الوجیز کما فی السراج وقال ووجہہ انہ لا یمکن الاحتراز عنہ عادۃً فصار بمنزلۃ ما بین اسنانہ الخ، پس صاحبِ وجیز بدون مرض بھی دم خارج من بین الاسنان کو غیر ممکن الاحتراز قرار دے کر موجبِ فساد قرار نہیں دیتے، تو حالتِ مذکورہ فی السوال میں تو بدرجۂ اولیٰ دخولِ دم فی الجوف کو غیر مفسد کہیں گے، جس میں احتراز کا عدمِ امکان مسلم ہے، واللہ اعلم۔

ھدایت ضروری: چونکہ یہ مسئلہ قیاس سے لکھا گیا ہے اس واسطے دوسرے علماء کو دکھا لینا ضروری ہے۔

۱۱ رجب ۱۳۵۲ھ

عود اور اگربتی کا دھواں حلق میں جانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے یا نہیں

سوال (۷) حالتِ روزہ میں قرآن مجید پڑھتے وقت نزدیک عود اور اگربتی جلائی جائے اور اس سے دھواں حلق میں جائے تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اس صورت میں تو روزہ فاسد نہیں، ہاں، اگر بتی کو پاس رکھ کر اس کے دھویں کو سونگھا جائے، اور حلق میں داخل کیا جائے، تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔
قال فی الدر (ص ۱۵۶ ج ۲): او دخل حلقہ غبار او ذباب او دخان ولو ذاکراً استحساناً لعدم امکان التحرز عنہ ومفادہ انہ لو ادخل حلقہ الدخان افطر ای دخاناً کان او عوداً او عنبراً قال الشامی حتی لو تبخر ببخور فاواہ الی نفسہ واشتمہ ذاکراً الصومہ افطر اھ قلت قیود الفقہ احترازیۃ فلو تبخر ولم یؤوہ الی نفسہ ولم یشمہ لم یفطر فان ذلک من دخول الدخان لا من ادخالہ۔ واللہ اعلم۔
خلاصہ یہ کہ دھویں کو پاس رکھ کر سونگھا نہ جائے، دور رکھ کر بیٹھا جائے اور خوشبو آتی رہے تو مضائقہ نہیں، ۲۰ محرم ۱۳۴۹ھ۔

فصل فی القضاء والکفارۃ

مسافر اگر روزہ افطار کرے تو کفارہ نہیں

سوال (۱) مسافر در سفر بوجود قصر روزۂ رمضان روزہ نہاد، پس بمیانِ نیمروز آں روزہ نہادہ را عمداً افطار ساخت آیا کفارہ واجب گردد یا قضا؟

الجواب: وللمسافر الذی انشأ السفر قبل طلوع الفجر اذ لا یباح لہ الفطر بانشائہ بعد ما اصبح صائماً قال الطحطاوی لکن اذا افطر لا کفارۃ علیہ، نور الایضاح مع الطحطاوی، اس سے معلوم ہوا کہ مسافر افطار کر دے تو کفارہ نہیں۔ ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ۔

کفارۂ صیام میں بہت بوڑھے اور بڑھیا کو کھلانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۲) بہشتی زیور میں روزہ کے کفارہ کے لئے ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کے متعلق لکھا ہے، اگر بعضے بالکل چھوٹے بچے ہوں تو جائز نہیں، سوال یہ ہے کہ اگر بالکل بوڑھا بوڑھی ہوں تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بہت بوڑھا اور بوڑھی کو کفارہ میں کھلانا جائز ہے، قال فی الھدایۃ فان غداھم وعشاھم جاز قلیلاً کان ما اکلوا او کثیراً اھ قال صاحب النہایۃ لان المعتبر ھو الشبع لا المقدار اھ وقال الشامی عن البحر والمنح: ولو کان فیمن اطعمھم صبی فطیم لم یجزہ لانہ لا یستوفی

کما مرّ اھ وفی التاتارخانیۃ: اذا دعا مساکین واحدھم صبی فطیم او فوق ذلک لا یجزیہ کذا ذکر فی الاصل وفی المجرد: اذا کانوا غلماناً یعتمد مثلھم یجزاہ وبہ ظھر ایضاً ان المراد بالفطیم وبغیر المراھق من لا یستوفی الطعام المعتاد وفیہ ایضاً ولو کان فیھم شبعان قبل الاکل او صبی لم یجزاہ (ص ۹۵۹ و ۹۶۰ ج ۲) قلت والکبیر والکبیرۃ ممن یستوفی الطعام عادۃ وخلافہ نادر، واللہ اعلم۔
مورخہ ۴ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

حکم نیت کفارۂ رمضان بالتعلیق

سوال (۳) ایک شخص نے رات کو کفارۂ صوم کی نیت اس طرح کی کہ اگر کل کو یہ محقق ہو گیا کہ شروع ماہ سے روزہ شروع کرنے سے ساٹھ روزے پورے کرنے نہ پڑیں گے، بلکہ دو مہینہ کا روزے رکھنا کافی ہو جائے گا نیز شیخ نے بھی روزہ رکھنے کی اجازت دیدی تو کل کو میں ضرور کفارہ کا روزہ رکھوں گا، اس طرح نیت درست ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اس صورت میں نیت صحیح نہیں ہوئی، کیونکہ جزم نہیں پایا گیا بلکہ نیت معلق ہے، اور تعلیق کے ساتھ نیت قضاء وکفارات صحیح نہیں ہوتی، قال فی مراقی الفلاح: واما القسم الثانی وھو ما یشترط لہ تعیین النیۃ وتبییتھا فھو قضاء رمضان وقضاء ما افسدہ من نفل وصوم الکفارات بانواعھا الی ان قال: ولا تبطل النیۃ بقولہ: اصوم غداً ان شاء اللہ تعالیٰ لانہ بمعنی الاستعانۃ وطلب التوفیق الا ان یرید حقیقۃ الاستثناء اھ قال الطحطاوی: والتعلیل یفید ان المشیئۃ لا تبطل مطلقاً ولو قصد حقیقتہ (ای لکونہ بمعنی الاستعانۃ) ولکن لکلام المؤلف وجہ وھو انہ اذا قصد التعلیق کان غیر جازم بالنیۃ وھو ظاہر، واللہ تعالیٰ اعلم، (ص ۳۷۶)۔

کفارۂ صوم میں رمضان اور عید الفطر مبطل رہتا ہے

سوال (۴) اگر رجب کی یکم کو کفارۂ رمضان کا روزہ شروع نہ کر سکا، تو اب اگر یہ شخص ۲ رجب سے صیام کفارہ کو شروع کرے تو درمیان میں رمضان وعید الفطر کے واقع ہونے سے تتابع باطل تو نہ ہوگا، یا باطل ہو جائے گا، اور اس کو از سر نو استیناف کرنا ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں رمضان وعید الفطر کا توسط مبطلِ تتابع ہے،

بعد رمضان کے پھر ساٹھ روزے از سر نو رکھنے پڑیں گے، قال فی الدر (صام شہرین
متتابعین ولو ثمانیة وخمسین یومًا بالهلال والا فستین یومًا لیس فیهما
رمضان وایام نهی عن صومها وذلک لان کل صوم شرط فیه التتابع فان افطر بعذر
کسفر ونفاس بخلاف الحیض او بغیره او وطئها المظاهر استأنف الصوم اھ
(ص ۹۵۶ و ۹۵۷ ج ۲) واللہ اعلم، غرة رجب سنہ ۴۵ھ۔

نذر روزے اگر کسی عذر مثلاً بیماری کی وجہ سے نہ رکھ سکے تو کتنا کفارہ لازم ہوگا!

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین کہ ایک آدمی نے نذر کی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ میری بلا و مصیبت اگر دور ہو جائے تو میں تیرے واسطے ہر چاند میں یعنی ہر مہینہ میں پانچ پانچ روزے رکھوں گا، اب وہ بلا و مصیبت دور ہو گئی ہے، اب وہ شخص ہر مہینہ میں روزے رکھے یا نہیں؟ اور اس کے اوپر عمر بھر کے روزے رکھنا واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہو گیا تو اگر یہ روزہ ادا نہ کرے تو کفارہ دینے سے عمر بھر کے روزے ادا ہوں گے یا نہیں، اگر ادا ہو جائیں تو کتنا کفارہ دینے سے ادا ہوگا، یعنی کیا چیز دے گا اور یہ شخص بیماری کی وجہ سے لاچار ہے، لہٰذا فتویٰ منگوایا جاتا ہے؟

الجواب: جب یہ شخص بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنے سے عاجز ہے تو اس کو چاہئے کہ ہر ماہ میں پانچ روزوں کا فدیہ دیدیا کرے، یعنی ہر روزے کے عوض صدقہ فطر کے برابر گیہوں وغیرہ دیدے، یا ایک مسکین کو پیٹ بھر کر دو وقت کھانا کھلاوے، کما فی العالمگیریة (ص ۱۳۵ ج ۱) ولو اخر القضاء حتی صار شیخًا فانیًا او کان النذر بصیام الابد فعجز لذلک او باشتغاله بالمعیشة لکون صناعة شاقة له ان یفطر ویطعم لکل یوم مسکینا علی ما تقدم اھ وفیه ایضا (ص ۱۳۳ ج ۱) فالشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصیام یفطر ویطعم لکل یوم مسکینًا کما یطعم فی الکفارة وفی المجلد الثانی منه (ص ۱۵۱) فان غداهم وعشاهم واشبعهم جاز سواء حصل الشبع بالقلیل او الکثیر، کذا فی شرح النقایة لابی المکارم، ۲۸ جمادی الاول سنہ ۴۴ھ۔

استفتاء متعلق کفارۂ صوم

سوال (۶) ایک عرض ہے کہ عید الضحیٰ کی تعطیل میں احقر جناب کا قدمبوس ہوا تھا، جناب سے اپنے توڑے ہوئے روزوں کے متعلق دریافت

کیا تھا، آنحضور نے فرمایا تھا کہ اقصر ایام شتاء میں کفارہ ادا کیجیو، سو اب سردی کا زمانہ آ گیا ہے اور احقر کا ارادہ ہے کہ ۱۵ جمادی الاولیٰ سے روزے شروع کر دوں، اول تو جناب والا سے دوبارہ اجازت چاہتا ہوں، دوسرے یہ کہ ۱۵ رجب تک رکھنے چاہئیں یا ۱۵ جمادی الاول سے شمار کر کے ۶۰ روزے رکھنے چاہئیں؟ تیسرے یہ کہ اگر کسی رات کو نیت کرنی بھول جاؤں یا صبح صادق کے بعد آنکھ کھلے تو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے علاوہ بھی جو بات قابلِ عمل ہو تحریر فرماویں، فقط

الجواب: فی الدر المختار (صام شہرین ولو ثمانیة وخمسین) بالهلال والا فستین یومًا وفی الشامی قوله بالهلال حال من لفظ الشهرین المقدرین بعد لو وفی بعض النسخ لو بالهلال وحاصله انه اذا ابتدأ الصوم فی اول الشهر کفاه صوم شهرین تامین او ناقصین وکذا لو کان احدهما تامًا والآخر ناقصًا، (قوله والا) ای وان لم یکن صومه فی اول الشهر برؤیة الهلال بان غم او صام فی اثناء شهر فانه یصوم ستین یومًا وفی کافی الحاکم وان صام شهرًا بالهلال تسعة وعشرین وقد صام قبله خمسة عشر وبعده خمسة عشر یومًا اجزأه (ص ۵۰۲ ج ۲) وفی البحر وغیره کالدر المختار قلت وفیه الاحتیاط۔

پس صورت مسئولہ میں پورے ساٹھ روزے رکھے جاویں اور روزۂ کفارہ کی نیت غروب شمس و طلوع فجر کے درمیان ضروری ہے، اگر اس وقت میں نیت نہ ہوئی تو استیناف کرنا پڑیگا اس لئے بہت اہتمام کیا جاوے، فی تنویر الابصار والشرط للباقی النیة وتعیینها وقال الشامی تحت قوله للباقی وهو قضاء رمضان الی قوله کفارة الظهار والقتل والیمین والافطار (ص ۱۹۳ ج ۲) کتبہ الاحقر عبد الکریم

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۴ جمادی الاول سنہ ۴۵ھ

فصل فی الاعذار المبیحة للافطار

فصل کی کٹائی کے واسطے روزہ افطار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۱) فصل کٹائی یا کسی ایسے ہی سخت مشقت والے کام کے لئے روزہ کا افطار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر فصل کاٹنے میں تاخیر کرنے سے زراعت کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تب تو کاشتکار کو لازم ہے کہ فصل کو بعد رمضان کے کاٹے، اور اگر تاخیر سے زراعت کے

کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اس لئے رمضان ہی میں کاٹنا پڑے اور کٹائی کی حالت میں روزہ دشوار ہو تو کاشتکار کو اس حالت میں افطار جائز ہے، اور درست ہے کہ بعد رمضان کے ان ایام کی قضا کرے کفارہ نہ ہوگا۔ قال فی الفتاوی الکاملیۃ سئلت عن حصاد لم یقدر علی حصاد زرعہ مع الصوم واذا اخرہ یهلک ھل یجوز لہ الافطار حینئذ۔ فالجواب نعم یجوز لہ ذلک حینئذ فقد نقل المحقق ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی حواشیہ علی الدر عن الخیر الرملی ما نصہ وعلی ھذا الحصاد اذا لم یقدر علیہ مع الصوم ویهلک الزرع بالتاخیر لا شک فی جواز الفطر والقضاء اھ واللہ اعلم، ص ۱۶ و ۱۷، ۲۱ ر رمضان سنہ ۴۱ھ

سوال (۲) معذور علی الاعلان لوگوں کو کہدے کہ میں روزہ نہیں رکھوں گا، اور ظاہرا کھاتا پیتا پھرے، یا اپنے معاملہ کو محفوظ و	عذر کی بنا پر افطار کرنے والے کو افطار کا اعلان نہیں چاہئے

پوشیدہ رکھے؟

الجواب: جو لوگ عذر کی وجہ سے افطار کریں اُن کو اپنے افطار کا اعلان نہ کرنا چاہئے چھپکر کھانا پینا چاہئے، اور اپنے حال کو پوشیدہ رکھنا چاہئے، اور جو اتفاقاً کسی کو معلوم ہو جاوے تو اس سے اپنا عذر بیان کردے۔ ۲۱ ر رمضان سنہ ۴۱ھ

سوال (۳) روزہ دار کو بحالتِ روزہ حیض آگیا تو اب باقی وقت اسی طرح پورا کرے یا کچھ کھا پی لیوے، اگر کچھ	عورت کو حالتِ روزہ میں حیض آجائے تو باقی وقت میں کھا پی سکتی ہے یا نہیں؟

کھا لیوے تو گناہ تو نہیں ہوا؟ اور افضل کونسا ہے؟

الجواب: حیض کی حالت میں عورت کو روزہ داروں کی طرح رہنا جائز نہیں، بلکہ اس کو کھا پی لینا چاہئے، لیکن کھلم کھلا نہ کھانا چاہئے، چھپ کر کھاوے، قال فی نور الایضاح یجب علی الصحیح وقیل یستحب الامساک بقیۃ الیوم علی من فسد صومہ ولو بعذر ثم زال وعلی حائض ونفساء طہرتا بعد طلوع الفجر قال الطحطاوی فی حاشیتہ واما فی حالۃ تحقق الحیض والنفاس فیحرم الامساک لان الصوم منہما حرام والتشبہ بالحرام حرام وکذلک لا یجب الامساک علی المریض والمسافر لان الرخصۃ الافطار فی حقہما باعتبار الحرج ولو الزمنا ہما التشبہ لعاد الشیء علی موضوعہ بالنقض ولکن لا یاکلون جہرا بل سرا اھ قلت التعلیل یشتمل الحائض وقت طلوع الفجر والحائض بعدہ فکلاہما یحرم علیہما الصوم نعم

بینہما فرق من وجہ وہو ان الاولی فسد صومہا بعد الشروع فیہ والثانیۃ حرم علیہما الصوم ابتداء ولکنہما تشترکان فی حرمۃ الصوم بعد تحقق الحیض واللہ اعلم۔ ۳۰ ر شعبان سنہ ۴۵ھ

سوال (۴) فدوی نے پہلا روزہ رکھا دن بھر طبیعت خراب رہی بعد افطار بہت ہی خراب ہوگئی، کہ عرض نہیں کر سکتا، فدوی جانتا	استفتاء عن القلب اور معذور کیلئے افطار کا حکم

ہے یا فدوی کا خدا، بموجب حکم حضور پُر نور دل سے فتویٰ لیا، دل نے کہا کہ بموجب حکم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہم کو روزہ نہیں رکھنا چاہئے۔

اوّل حکم: اپنے کو تہلکہ میں مت ڈالو۔

دوسرا حکم: اللہ تعالیٰ جل جلالہ وجل شانہٗ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا ہے جو وہ برداشت نہ کر سکے۔

تیسرا حکم: جان بچانی فرض ہے۔

اب فدوی روزہ نہیں رکھتا ہے، دل کا فتویٰ صحیح ہے یا کیا؟

الجواب: دل سے فتویٰ لینا اور اس کے فتوے پر عمل کرنا ہر شخص کو جائز نہیں اور نہ ہر مسئلہ میں جائز ہے، بلکہ اس کا محل وہ امور ہیں جن میں دلیلیں متعارض ہوں، اور ظاہر میں کسی دلیل کو دوسری پر ترجیح نہ ہو تو ایسے مواقع میں فتویٰ قلب پر وہ شخص عمل کر سکتا ہے جو کامل الایمان ہو اور سلیم الفہم عارف بدقائق النفس ہو، صرح باصلہ الشیخ فی رسالۃ التشرف (ص)۔

پس آپ کا روزہ کے معاملہ میں قلب سے فتویٰ لینا بالکل غلط تھا جبکہ علماء حکم شرعی بتلانیوالے موجود تھے، جو معرفت وعلم وکمال ایمان میں آپ سے زائد ہیں، پس اوّل آپ کسی طبیبِ حاذق عادل سے نبض وغیرہ دکھلا کر دریافت کیجئے، کہ روزہ رکھنا آپ کو حالتِ موجودہ میں مضر ہے یا نہیں، اگر وہ صوم کو مُضر بتلائے اور یہ کہے کہ روزہ سے مرض شدید ہو جائے گا جس کا تحمل دشوار ہوگا، تو آپ کو روزہ نہ رکھنا جائز ہوگا، اور رمضان کے بعد قضا واجب ہوگی، خواہ سردیوں میں قضا کر دی جاوے، اور اگر روزہ کو مضر نہ بتلائے تو روزہ رکھنا فرض ہے، اور قدرِ قلیل تعب وسوء مزاج قابلِ اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۲ ر رمضان سنہ ۴۵ھ

فصل فی صوم النذر وصوم القضاء وصوم النفل

جس کے ذمہ دو رمضان کے روزے قضا ہوں اور وہ مطلق قضاء رمضان کی نیت کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال (۱) ایک شخص کے ذمہ دو رمضانوں کے روزے ہیں، اس نے رات کو قضاء رمضان کا روزہ رکھنے کی نیت کی، لیکن پہلے رمضان یا دوسرے رمضان کی تعیین نہیں کی مطلق قضاء رمضان کی نیت کرلی تو وہ روزہ قضاء کی جانب سے صحیح ہوجائیگا یا نفل ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صورت مسئولہ میں وہ روزہ قضاء رمضان میں محسوب ہوجائے گا، نفل نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ص ۱۲۶ ج ۱: اذا وجب علیہ قضاء یومین من رمضان واحد ینبغی ان ینوی اول یوم وجب علیہ قضاءہ من هذا الرمضان، وان لم یعین الاول یجوز وکذا لو کان علیہ قضاء یومین من رمضانین هو المختار ولو نوی القضاء لا غیر یجوز وان لم یعین کذا فی الخلاصۃ اھ واللہ اعلم۔

۶ر شوال سنہ ۴۰ھ

باب الاعتکاف

معتکف کے لئے مسجد میں ریح صادر کرنے کا حکم

سوال (۱) معتکف کو اگر ریح صادر کرنے کی ضرورت ہو تو وہ کیا کرے، آیا مسجد ہی میں ریح صادر کردے یا مسجد سے باہر نکل کر صادر کرے؟

الجواب: اصح یہ ہے کہ مسجد سے باہر نکل کر صادر کرے، قال فی العالمگیریۃ: سئل ابوحنیفۃ رح عن المعتکف اذا احتاج الی الفصد والحجامۃ هل یخرج؟ فقال لا، وفی الاولی واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیہ وهو الاصح کذا فی التمرتاشی اھ ص ۲۱۵، ج ۲، واللہ اعلم۔

۹ر جمادی الاولیٰ سنہ ۴۰ھ

معتکف کیلئے خارج مسجد نماز ادا کرنے کا حکم

سوال (۲) مسجد کے سامنے جو صحن ہے جس میں موسم گرمی میں نماز مغرب وعشاء ادا کرتے ہیں، لیکن اس کو لوگ نہ داخل مسجد سمجھتے ہیں نہ اس کی حرمت مسجد کی سی کرتے ہیں اور بانی کے طرز عمل سے بھی خارج مسجد ہونا معلوم ہوتا ہے، جب ایسی جگہ جماعت ہو معتکفین تراویح وفرائض ادا کرنے کے لئے وہاں آسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: جب بانی کے طرز عمل سے وہ جگہ مسجد سے خارج ہے تو معتکفین اس جگہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے، ورنہ اعتکاف باطل ہوجائے گا۔

معتکف اگر حاجت ضروریہ سے باہر جائے اور وہاں جمعہ کا غسل کرلے تو کیا حکم ہے؟

سوال (۳) معتکفین غسل مالابد منہ کے سوائے دوسرا غسل خارج مسجد میں کرسکتے ہیں یا نہیں، حاجت ضروریہ طبعیہ یا شرعیہ کے لئے باہر ہونے سے آتے وقت غسل غیر ضروری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قال فی رد المحتار ولیس کالمکث بعدها ما لو خرج لها رأی للحاجۃ الطبعیۃ ۱۲) ثم ذهب لعیادۃ مریض او صلوۃ جنازۃ من غیر ان یکون خرج لذلک قصدا فانہ جائز کما فی البحر عن البدائع اھ ص ۲۱۲ ج ۲ وفیہ ایضا ویجوز حمل الرخصۃ علی ما لو خرج لوجہ مباح کحاجۃ الانسان او الجمعۃ وعاد مریضا او صلی علی جنازۃ من غیر ان یخرج لذلک قصدا وذلک جائز اھ وبہ علم انہ بعد الخروج لوجہ مباح انما یضر المکث لو فی غیر مسجد لغیر عبادۃ اھ ص ۲۱۴ ج ۲

قلت ولا یخفی ان غسل الجمعۃ عبادۃ فلا یضرہ اذا خرج لحاجۃ الانسان ان یمکث لغسل الجمعۃ فافهم، حاجت ضروریہ کے لئے نکلنے کے بعد غسل جمعہ معتکف کرسکتا ہے، مگر اس کو چاہئے کہ پہلے کسی خادم یا دوست کے ذریعے غسل کا پانی بھروا کر رکھ دے تاکہ زیادہ دیر نہ ہو، اور اگر کوئی کام کرنے والا نہ ہو تو خود بھی گھڑا بھر سکتا ہے، مگر جہاں تک ممکن ہو جلدی کرے۔

۳ر شعبان

گاؤں میں اعتکاف کرنیوالے کے لئے نماز جمعہ کا حکم

سوال (۴) عرض یہ ہے کہ بندہ کا گھر دیہات میں ہے، یہاں کی مسجد میں علاوہ نماز پنجگانہ کے جمعہ کی نماز بھی پڑھائی جاتی ہے گزشتہ رمضان میں بندہ اسی مسجد میں معتکف تھا چونکہ نماز جمعہ کے وقت عدم مشارکت سے مشابہت منافقین لازم آتی ہے، اس خوف سے ابتداء سے اعتکاف ہی میں روز جمعہ کو ½ ۱۱ بجے سے ۳ بجے تک استثناء کرلیا تھا، اس وقت جاکر اپنے گھر میں بیٹھ رہتا تھا، اور بعد اس کے

پھر مسجد میں آ حاضر ہوتا، یہ ایک مولوی صاحب کی مشورت ہی سے کیا تھا، مگر تردد ہے کہ اعتکاف مسنونہ ادا ہوا ہے یا نہیں، کیونکہ پورے عشرہ میں تو کچھ نقص رہ گیا ہے، از روئے مہربانی اطلاع فرما کر ممنون فرمادیں؟

دوسری عرض یہ ہے کہ ہماری دیہات سے شہر کی بڑی جامع دو اڑھائی میل کی مسافت پر ہے کیا میں اپنی دیہاتی مسجد میں معتکف رہ کر شہر میں جاکر جمعہ پڑھ سکتا ہوں بلا استثناء مذکور الصدر کے؟

تیسری عرض یہ ہے کہ حالتِ اعتکاف میں وقت جمعہ میں گھر نہ جاکر اُن کے ساتھ بہ نیت نفل جمعہ ادا کرسکتا ہوں یا نہیں، مگر اس سے ایک مضحکہ پیدا ہوجاوے گا، کہ دیکھو اب ہمارے ساتھ جمعہ پڑھ رہا ہے، خیر جو مصلحت ہو حضور والا ارشاد فرمادیں، بندہ ہمیشہ اگر عذر نہ ہو شہر ہی میں جاکر جمعہ ادا کرتا ہے، ہمارا گاؤں فنائے شہر کے بھی باہر ہے، اس لئے وہاں جمعہ خود بھی نہیں پڑھتا ہوں اور دوسروں کو بھی منع کرتا ہوں، مگر لوگ اس طرف کم التفات کرتے ہیں۔

الجواب: قال فی الخلاصۃ ولا یخرج المعتکف من المسجد الا لحاجۃ طبعیۃ الخ ص ۲۶۷ ج ۱ وفی الدر المختار وفی التاتارخانیہ عن الحجۃ: لو شرط وقت النذر ان یخرج لعیادۃ مریض او صلوٰۃ جنازۃ وحضور مجلس علم جاز ذلک فلیحفظ، قال الشامی یشیر الیہ قولہ فی الھدایۃ وغیرھا عند قولہ ولا یخرج الا لحاجۃ الانسان لانہ معلوم وقوعھا فلابد من الخروج فیصیر مستثنی، والحاصل ان ما یغلب وقوعہ یصیر مستثنی حکما وان لم یشترطہ وما لا فلا الا اذا شرطہ اھ ص ۲۱۶ ج ۱۔

عبارتِ خلاصہ سے معلوم ہوا کہ گاؤں میں اعتکاف کرنے والے کو جمعہ کے لئے شہر میں جانا جائز نہیں، کیونکہ وہ حاجتِ لازمہ نہیں، لیکن اگر مستثنیٰ کرلے تو جانا جائز ہے، اور اس صورت میں یہ خروج ویسا ہی گا جیسا خروج لحاجۃ الانسان اور وہ مفسد نہیں، تو یہ بھی مفسد نہیں، اور جب اعتکاف فاسد نہ ہوا اور اکثر عشرہ بحالتِ اعتکاف گذرا تو اعتکاف مسنون ادا ہوگیا لان للاکثر حکم الکل، گاؤں میں بہ نیتِ نفل جمعہ ادا کرنا مقتدی کو جائز نہیں، بہتر یہ ہے کہ جمعہ کے کچھ وقت مستثنیٰ کرلیں، اور شہر میں جاکر جمعہ ادا کرلیا کریں، واللہ اعلم۔ ۲۲ رمضان ۴۱ھ

سوال (۵) ایک مسافر مولوی صاحب شمار دو سال سے یہاں سکونت فرماتھے، اعتکاف کے بارہ میں وعظ میں یوں فرمایا	کسی عذر کی بناء پر اعتکاف نہ کرنے کا حکم

رمضان شریف میں لوگوں کا اعتکاف میں بیٹھنا بہت اچھی بات ہے، یہ نہ ہوسکے تو ایک آدمی بیٹھے تو بھی سب کی طرف سے ادا ہوجاتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ خود کیوں نہیں بیٹھتے، ہاں ضرور بیٹھ سکتا ہوں مجھے تو بہت خواہش ہے، کیا کروں، چند وجوہات کے سبب سے نہیں بیٹھ سکتا ہوں، میرے مکان میں ہمراہ رہنے کے لئے کوئی نہیں ہے، یہاں میرے خویش و اقارب میں سے بھی کوئی نہیں، میرے گھر کے تلا طے ایک خالی میدان ہے، گھر میں عورت بچے بہت گھبراتے ہیں، اس لئے میں اعتکاف میں نہیں بیٹھ سکتا، سائل بھی ان وجوہات کو جو مولوی صاحب نے بیان فرمائے ٹھیک سمجھتا ہے اور اُن کے گھر میں راتوں کو کبھی کبھی پتھر آکر گرنا بھی سائل کو معلوم ہے، آیا مولوی صاحب نے جو عذر بیان کئے شرع میں یہ مقبول ہوں گے یا نہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ عذر مقبول ہے، واللہ اعلم، بلکہ اس حالت میں ان کو اعتکاف مناسب بھی نہیں، ۲۵ شعبان ۴۳ھ۔

سوال (۶) اعتکاف کی حالت میں سحری کھانے کے بعد کلی کے لئے مسجد سے باہر معتکف گیا، اس وقت مسجد کے اندر بھی	سحری کھانے کے بعد کلی کرنے کے واسطے معتکف کا مسجد سے باہر جانا

پانی موجود تھا، مگر نہ تو خیال تھا کہ پانی ہے اور نہ اعتکاف کا خیال رہا، مگر کلی کرتے ہی فوراً اپنی جگہ آگیا، اس صورت میں اعتکاف رہا یا نہیں، اور سحری کھانے کے بعد کلی کرنا ضرورت طبعی ہے یا نہیں، اگر اعتکاف ٹوٹ گیا تو اب اس کی قضا ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: سحری کے بعد صائم کے لئے کلی کرنا ضرورتِ شرعیہ ہے لما فیہ من صیانۃ الصوم عن بقایا الطعام فی الفم، اس لئے اس ضرورت کے لئے اس کو مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے بشرطیکہ مسجد میں پانی موجود نہ ہو، یا کلی کا موقع صحن مسجد سے متصل نہ ہو، اور اگر پانی مسجد کے اندر ہے، اور کلی کی جگہ بھی صحن مسجد سے متصل ہے، اس صورت میں خروج سے اعتکاف نفل ختم ہوجائیگا، (قلت: وفی حکمہ الاعتکاف المسنون) اور اعتکاف واجب یعنی منذور فاسد ہوجائے گا، قال فی مراقی الفلاح: فان خرج ساعۃ بلا عذر معتبر (فی عدم الفساد) فسد الواجب وانتہی بہ غیرہ ای غیر الواجب وھو النفل اذ لیس لہ حد اھ (ص ۴۰۹) پس کلی کے لئے نکلنا خروج بعذر ہے، اور مسجد کے اندر پانی کا موجود ہونا اس عذر کو جب زائل کرتا ہے، جبکہ صائم کو معلوم ہو کہ پانی یہاں موجود ہے، اگر معلوم نہ ہو یا یاد نہ ہو تو اس خروج سے اعتکاف منذور باطل نہ ہوگا، اور اعتکاف نفل و مسنون ختم نہ ہوگا، ہذا ما فہمتہ ولم ارہ صریحا، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۴ شوال ۴۲ھ۔

جو حجرہ جزوِ مسجد نہ ہو اس میں اعتکاف باطل ہے

سوال (۷) مسجد کی چہار دیواریوں کے اندر کوئی حجرہ میں عشرہ اواخر کے اعتکاف میں بیٹھ سکتا ہے یا نہیں، یا جامع مسجد کے اندر ہی اعتکاف کر لینا چاہئے؟

الجواب: اعتکاف کے لئے مسجد شرط ہے، بدون مسجد اعتکاف صحیح نہیں ہوتا، فی العالمگیریۃ ومنھا (ای من الشرائط) مسجد الجماعۃ فیصح فی کل مسجد لہ اذان واقامۃ ھو الصحیح، کذا فی الخلاصۃ، البتہ جامع مسجد شرط نہیں، بلکہ ہر مسجد میں ہو سکتا ہے جبکہ جماعت ہوتی ہو کما مر، فقط، پس حجرہ میں جو کہ مسجد کا جزو نہیں، اعتکاف باطل ہے، البتہ حجرہ جزو مسجد ہو تو اس میں اعتکاف صحیح ہوگا، یعنی محض احاطہ میں ہونا کافی نہیں، بلکہ جزئیت ضروری ہے۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ ر شوال ۴۳ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۰ ر شوال ۴۳ھ

معتکف اذان کہنے کے لئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے یا نہیں

سوال (۸) معتکف کے لئے اذان کہنے کو اور کوئی جگہ نہ ہونے کی تقدیر پر مسجد سے باہر جانا اعتکاف میں کسی قسم کی خرابی ہے یا نہیں اس کا جواب صرف نفی اثبات میں لکھ دینا، دلیل کی ضرورت نہیں؟

الجواب: اس ضرورت کے لئے مسجد سے نہ نکلے، مسجد میں ہی اذان کہہ دے، ولا یکرہ لہ الاذان داخل المسجد للضرورۃ کما لا یکرہ لہ ای للمعتکف البیع والشراء فیہ، پس اگر اذان کے لئے مسجد سے نکلے گا تو اعتکاف نفل و مسنون ناقص ہو جائے گا، اور اعتکاف واجب باطل ہو جاوے گا۔ ۲۷ ر رجب ۴۶ھ

معتکف مسجد میں جہاں چاہے اُٹھ بیٹھ سکتا ہے

سوال (۹) معتکف جو گوشہ اپنے لئے مقرر کرے، اس کو علاوہ ضروری حاجت کے ہر وقت اس میں ہی رہنا چاہئے، یا مسجد اور فرش مسجد میں بلا ضرورت سونا کھانا پینا اور تلاوتِ قرآن شریف اور نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ہر وقت گوشہ میں رہنا ضروری نہیں، بلکہ عبادتِ نافلہ و ذکر کے لئے اس میں رہنا بہتر ہے، باقی اوقات میں مسجد کے اندر جہاں چاہے اُٹھے بیٹھے، ۱۸ ر ذیقعدہ ۴۵ھ

معتکف کے بارے میں متعدد سوالات پر مشتمل ایک استفتاء

سوال (۱۰) معتکف علاوہ فرض نماز کے نوافل اور تلاوتِ قرآن و ذکر کے لئے سقاوہ سے جو مسجد کے اندر نہیں، یا کنوئیں سے پانی لا سکتا ہے

یا نہیں؟ ۴۵ھ میں میں نے دریافت کیا تھا تو آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "فرض نماز کے لئے تو وضو کے لئے باہر جا کر پانی لا سکتا ہے، تلاوت اور نفل نماز کے لئے باہر نہیں جا سکتا، اگر جاوے گا تو اعتکاف ناقص ہو جاوے گا"، اور دیوبند کے مفتی صاحب نے اس طرح پانی لانے کو ضرورت میں داخل فرمایا ہے۔

جواب: مفتی صاحب کا جواب صحیح ہے، اور میں بھی یہی فتویٰ دیتا ہوں، نہ معلوم آپ کو اس کے خلاف کس طرح جواب دیا گیا، فاستغفر اللہ واتوب الیہ۔ ۲۲ ر رمضان ۴۸ھ

سوال: مجھے خیال پڑتا ہے کہ جب میں تھانہ بھون حاضر ہوا تھا تو مسجد میں جو ہدایات معتکف کے لئے تحریر تھیں اس میں تحریر کیا تھا کہ ریح خارج کرنے کے لئے مسجد سے باہر جانا چاہئے۔ دیوبند کے مفتی صاحب دریافت کرنے پر تحریر فرماتے ہیں کہ "اخراجِ ریح کے لئے معتکف کو مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے"، اس مسئلہ میں جو محقق حکم ہو تحریر فرمایا جاوے، اگر میری سمجھ میں نہ آیا ہو تو توضیح فرما دی جاوے؟

جواب: علماء دیوبند و سہارنپور سب کا وہی خیال ہے جو مفتی صاحب نے تحریر فرمایا، مگر میں ایک جزئیہ کی بناء پر مسجد میں اخراج ریح کی اجازت معتکف و غیر معتکف کسی کے لئے نہیں سمجھتا، لیکن اس وقت مجھے بھی اس مسئلہ میں تردد ہو گیا ہے، تحقیق کر رہا ہوں، اس لئے احوط یہی ہے کہ مفتی صاحب کے قول پر عمل کیا جائے۔ تاریخ بالا۔

سوال: معتکف کو مسجد میں خط بنوانا بال کٹوانا کیسا ہے؟

الجواب: جائز ہے، جبکہ حجام باہر رہے۔ تاریخ بالا۔

بقیہ سوال: اور غسل کے لئے جانا جبکہ حالتِ جنابت پیش ہو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز نہیں۔

سوال: معتکف کی طبیعت دوسرے سے پانی لینے کو نہیں چاہتی تو خود مسجد سے باہر ہو کر پانی لینا بہتر ہے یا دوسرے ہی شخص سے لینا؟

الجواب: اگر دوسرے شخص سے بے تکلفی نہ ہو، بلکہ خدمت لینے سے اپنے اوپر یا اس پر گرانی کا شبہ ہو تو خود مسجد سے باہر جا کر پانی لینا اولیٰ ہے، ہاں بے تکلفی ہو تو خروج جائز نہیں، واللہ اعلم۔ ظفر احمد، عفا عنہ، ۲۲ ر رمضان ۴۶ھ

عشرۂ اخیرہ کامل کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ ہے

سوال (۱۱) زید کہتا ہے اعتکاف رمضان المبارک عشرۂ اخیرہ کامل کا سنت مؤکدہ ہے، اس سے کم مدت میں سنت ادا نہ ہوگی، حوالہ

مولانا عبد الحی صاحب کے رسالہ "الانصاف فی حکم الاعتکاف" کا دیتا ہے، عمرو کہتا ہے کہ کامل دس روز شرط نہیں، بلکہ اقل عشرہ سے بھی سنت ادا ہو جاوے گی، اپنے قول کے ثبوت میں خلاصۃ الفتاویٰ کی یہ عبارت پیش کرتا ہے:۔ (قال القاضی الامام الاعتکاف فی المسجد الجامع افضل اذا کان یصلی فیہ الصلوات الخمس بالجماعۃ اما اذا لم یکن فالاعتکاف فی مسجدہ افضل کیلا یحتاج الی الخروج عن معتکفہ فان اراد ان یعتکف اقل من سبعۃ ایام یعتکف فی مسجد حیہ وان اراد ان یعتکف فی الجامع الخ)

نیز مولانا بحر العلوم کے رسائل الارکان کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف مذکور سنتِ مؤکدہ نہیں، بلکہ مندوب محض ہے، جس پر اُن کی یہ عبارت شاہد ہے:۔ واعلم انہ لا شک فی مواظبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی اعتکاف العشر الاواخر من شہر رمضان لکن قد ثبت من الصحابۃ العظام ترک الاعتکاف ومنہم الخلفاء الراشدون فللاعتکاف نوع اختصاص بہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو انہ یلقی جبرئیل فیہ اسرار القرآن ومدارسۃ القرآن جبرئیل کانت مختصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم فلھذا کان للاعتکاف اختصاصاً بہ صلی اللہ علیہ وسلم فتارک الاعتکاف من الامۃ لا یلحقھم الاساءۃ ولذا کان صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤکد فی الاعتکاف تاکیدہ فی غیرہ من السنن ولا یعیب واحداً من الصحابۃ علی ترک الاعتکاف فالاعتکاف اما سنۃ مختصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مؤکدۃ علی الامۃ بل بقی فی حقھم مثل السنن الغیر المؤکدۃ او کان واجباً علیہ صلی اللہ علیہ وسلم مختصاً ففعلہ لامتثال الوجوب فلا یکون علی الامۃ سنۃ بل مندوباً محضا وھذا غیر بعید الخ

حضور والا کے نزدیک اقوالِ مذکورہ میں سے کونسا قول راجح ہے؟

الجواب: صحیح یہی ہے کہ تمام عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ ہے مگر علی الکفایہ، جیسا کہ مراقی الفلاح، عالمگیریہ، شامی وغیرہ میں ہے، اور خلاصۃ الفتاویٰ کی عبارت مندرجہ سوال سے عمرو کا مقصود کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا ہے، اس عبارت کو مقصودِ عمرو سے کوئی تعلق نہیں ہے، اُس عبارت کا تو محض یہ منشاء ہے کہ اگر سات یوم سے کم کا اعتکاف کرے اور ان ایام میں جمعہ نہ واقع ہوتا ہو کما ہو الظاہر، تب تو مسجدِ محلہ میں اعتکاف افضل ہے، اور اگر سات روز یا اس سے زائد کا اعتکاف کرنا ہو یا سات روز سے کم کا اعتکاف ہو مگر

ان ایام میں جمعہ واقع ہوتا ہو، تو جامع مسجد میں اعتکاف کرنا افضل ہے، کیونکہ اس صورت میں مسجدِ محلہ سے جمعہ کے لئے جانا پڑے گا، اور معتکف سے نکلنا خلافِ اولیٰ ہے، اس عبارت میں اس کا ذکر بالکل نہیں کہ کتنے دن کا اعتکاف سنت ہے، اس سے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سات روز سے کم کا اعتکاف کرنے سے سنت ادا ہو جاوے گی، اور رسائل الارکان کی تقریر کا جواب شامی نے عنایہ سے نقل کیا ہے کہ مواظبت بلا تاکید سے بھی سنت ثابت ہو جاتی ہے، اور اگر مواظبت مع الانکار علی التارک ہو تب تو اس سے وجوب ثابت ہوتا ہے، (ص ۳۰۸، ج ۲) اور جب سنت کفایہ کہا جاوے تو یہ اعتراض بالکل ہی عائد نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ ایسا ہوا کہ کسی نے بھی اعتکاف نہ کیا ہو نہ تاکید کی نوبت آئی، واللہ اعلم بالصواب۔ احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون، ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

للہ در المجیب فقد اوتی من الفقہ اوفر نصیب ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۱ر ج ۱۳۴۸ھ

معتکف کے متعلق متعدد سوالات پر مشتمل ایک استفتاء

سوال (۱۲) فتاوی ماہِ رمضان المبارک، زید جس مسجد میں معتکف ہے وہاں سے ایک جامع مسجد تو قریب ہے، اور دوسری کچھ فاصلہ پر ہے، اور زید کا معمول پہلے سے بعید کی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا تھا، کیا زید اب حالتِ اعتکاف میں قریب کی مسجد کے ہوتے ہوئے اپنی کسی مصلحت سے بعید کی مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے جا سکتا ہے؟

الجواب: اس کا جزئیہ تو نظر سے نہیں گذرا، لیکن عالمگیریہ میں ہے: وان کان لہ بیتان قریب وبعید قال بعضھم لا یجوز ان یمضی ای للخلاء الی البعید فان مضی بطل اعتکافہ کذا فی السراج الوہاج، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ مسئولہ میں اختلاف ہے، اور احتیاط اسی میں ہے کہ مسجد قریب میں جاوے، واللہ اعلم۔ ۷ر رمضان ۱۳۴۸ھ

بقیہ سوال: اور کیا زید کو وعظ سننے کی غرض سے جامع مسجد میں کچھ دیر ٹھہر جانا جائز ہے؟

جواب: مکروہ ہے، اور بہتر یہ ہے کہ بعد فراغ عن السنن البعدیۃ اپنی مسجد میں چلا آوے، تاریخ بالا۔

بقیہ سوال: وما الحکم ان نوی ذلک ای صلوۃ الجمعۃ فی المسجد البعید واستماع الوعظ وقت اعتکافہ؟

الجواب: اگر نیت کرلی ہو تو پھر مسجدِ بعید میں جمعہ پڑھنے اور وعظ کے لئے ٹھہرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ تاریخ بالا۔

بقیہ سوال: هل للمعتكف الخروج من معتكفه للوضوء للنوافل؟

الجواب: بلا ضرورتِ فرض خروج خلافِ احتیاط ہے[عہ]، ہاں جو حیلہ غسلِ جمعہ میں آئندہ لکھا ہے وہ یہاں بھی ہوسکتا ہے۔ تاریخ بالا۔

بقیہ سوال: غسلِ جمعہ ضرورتِ شرعیہ میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب: غسلِ جمعہ کے لئے خروج من المسجد جائز نہیں، فقط غسلِ احتلام کے واسطے باہر جانا جائز ہے، البتہ غسلِ جمعہ کے لئے (بعض علماء کے نزدیک) یہ صورت جائز ہے کہ جب استنجاء وغیرہ کے لئے باہر نکلے تو طہارت کے وقت طہارتِ کاملہ یعنی غسل کرلے۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ، از خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون، ۷ر رمضان سنہ ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۸ر رمضان سنہ ۴۸ھ

مثل استفتاءِ مذکورہ مشتمل برچند سوالات۔

سوال (۱۳) معتکف اپنے گھر آکر کھانا کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: معتکف کو کھانے کے واسطے گھر جانا جائز نہیں ہے، بلکہ مسجد ہی میں منگا کر کھانا چاہئے، البتہ اگر کوئی لانے والا نہ ہو تو مجبوری کو خود جاکر کھانا لے آئے، مگر فوراً واپس آجاوے اور مسجد ہی میں کھاوے، بدون سخت مجبوری کے کھانا لانے کے واسطے بھی ہرگز نہ جاوے۔ ۱۲ر رمضان سنہ ۴۸ھ۔

سوال: معتکف ضرورۃً اپنے گھر آرہا ہو اور راستہ میں کوئی آدمی اس سے بات کرنا چاہے تو جواب دے سکتا ہے یا نہیں یا خاموش چلا جاوے؟

الجواب: جب استنجاء وغیرہ کی ضرورت سے باہر نکلا ہو تو بولنے میں مضائقہ نہیں، مگر بات چیت کے لئے کھڑا نہ ہو، البتہ رفتار سست کردینے کی گنجائش ہے، واللہ اعلم۔ تاریخ بالا۔

سوال: کیا معتکف اپنے گھر آکر نہا سکتا ہے؟

الجواب: غسل اگر واجب ہوگیا ہو تو مسجد ہی کے غسل خانہ میں نہا دے، اور ویسے بدون احتلام کپڑے بدلنے وغیرہ کے واسطے نہانے کی اجازت نہیں۔ تاریخ بالا۔

عہ حضرت تھانوی مدظلہ العالی اس صورت سے بھی منع فرماتے ہیں، وہو الاقرب الی الاحتیاط، واللہ اعلم ۱۲ منہ

سوال: نوافل وغیرہ کے لئے بار بار وضو کے لئے وضو خانہ میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نوافل کے لئے بھی وضو کرنے کے واسطے باہر جاسکتا ہے، لیکن یہ جب ہے کہ فرش کے کنارہ پر وضو ممکن نہ ہو، اگر وہاں وضو کی جگہ ہو اور پانی بھی کنارہ پر گھڑے وغیرہ میں وہاں رکھ سکتا ہو تو فرض اور نفل سب کے واسطے یہی انتظام کرنا چاہئے۔ تاریخ بالا۔

سوال: اپنے گھر ضرورۃً آیا ہو تو اپنی ڈاک کا بکس کھول کر خطوط لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: گھر فقط استنجے کی ضرورت سے جاسکتا ہے، وہ بھی جبکہ گھر سے قریب تر کوئی جگہ ایسی نہ ہو جہاں یہ استنجا کرسکے، اور استنجے سے قبل یا بعد کسی کام کے واسطے ٹھہرنے کی بالکل اجازت نہیں، فقط۔ واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم گمتھلوی،

الاجوبۃ صحیحۃ، ظفر احمد عفا عنہ، ۱۲ر رمضان سنہ ۴۸ھ

اعتکاف میں مسجد کی خدمت کرنا

سوال (۱۴) حالتِ اعتکاف میں مسجد کی خدمت کرنا اور اذان واقامت کہنا کیسا ہے؟

الجواب: معتکف کو مسجد کی خدمت کرنا اور اذان وتکبیر پڑھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر معتکف کو، لیکن خدمت ایسی نہ ہو جس میں مسجد سے باہر جانا پڑے، ۱۵ر رمضان سنہ۔

حالتِ اعتکاف میں ورزش اور خط کا جواب تحریر کرنا

سوال (۱۵) جو شخص ورزش کرنے کا عادی ہے حالتِ اعتکاف میں کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: باہر جانا جائز نہیں، اور مسجد میں ورزش خلافِ ادب ہے، لہٰذا زمانۂ اعتکاف میں اس کو ترک کردیں، اگر تکلیف ہو اور اگر تکلیف زیادہ ناقابلِ برداشت ہو تو بمجبوری خلوت کے وقت کرلیا کریں۔ تاریخ بالا۔

سوال: اپنے خطوط یا دیگر شخص کا خط تحریر کرنا چاہیں تو تحریر کرنا کیسا ہے؟

الجواب: خط لکھنے میں مضائقہ نہیں، خواہ اپنا ہو یا دوسرے کا؟ احقر عبدالکریم

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔ ۱۵ر رمضان۔

جس کو ریح اور بواسیر کا عارضہ ہو مسجد میں اعتکاف کرسکتا ہے یا نہیں

سوال (۱۶) زید ہمیشہ آخر عشرۂ رمضان شریف میں معتکف ہوا کرتا ہے، مگر ریحی بواسیر کا عارضہ ہونے سے وضو قائم نہیں رہتا، اور مسجد میں بعض وقت ریح کو خارج نہ کرنا تکلیف دہ ہوتا ہے، کیا ایسے شخص کو اعتکاف بمسجد جائز ہے؟

الجواب: ہاں جائز ہے، مگر ریح خارج کرنے میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ مسجد میں خارج کرنا مضائقہ نہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ جب ضرورت ہو مسجد سے باہر چلا جاوے جیسا کہ پیشاب پاخانہ کے واسطے جاتا ہے، کما فی العالمگیریۃ (ص ۲۱۵ ج ۲) واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضھم بأسا وبعضھم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیہ وھو الاصح کذا فی التمرتاشی اھ، اس لئے اخراج ریح کے واسطے باہر جانا بھی معتکف کو جائز ہے، اور جب دونوں طرف گنجائش ہے تو حسب موقع دونوں قول پر عمل کی گنجائش ہے، یعنی جب اخراج ریح فی المسجد سے لوگوں کی ایذا کا احتمال ہو تو باہر چلا جانا چاہئے، اور جب بار بار جانے میں دقت ہو تو باہر نہ جانا بھی جائز ہے، اس طرح دونوں روایتیں جمع بھی ہوگئیں، واللہ اعلم،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون، مورخہ ۲ر شعبان ۵۱ھ

کتاب الحج

(فصل فیمن یفترض علیہ الحج)

معذور لیکن صاحبِ استطاعت شخص کے حج کا حکم

سوال (۱) زید پیروں سے معذور ہے، تھوڑی دور بھی مشکل سے چل سکتا ہے، استطاعت ہے اس لئے حج کا ارادہ رکھتا ہے، ایک آدمی ساتھ رکھنا ہوگا، جس کا صرفہ زید کو دینا ہوگا، اتنی استطاعت ہے کہ آدمی کے خرچ کو برداشت کرلے گا، ایسی معذوری میں بھی زید پر حج فرض ہے یا کیا؟

الجواب: قال فی العالمگیریۃ ومنھا سلامۃ البدن حتی ان المقعد والزمن والمفلوج ومقطوع الرجلین لا یجب علیھم حتی لا یجب علیھم الاحجاج وان ملکوا الزاد والراحلۃ ولا الایصاء فی المرض ھذا ظاھر المذھب عن ابی حنیفۃ وھو روایۃ عنھما وظاھر الروایۃ عنھما انہ یجب علیھم فان احجوا اجزاھم مادام العجز مستمرا فان زال فعلیھم الاعادۃ بانفسھم وظاھر ما فی التحفۃ اختیارہ فانہ اقتصر علیہ وکذا الاسبیجابی وقواہ المحقق فی فتح القدیر والاعمی اذا ملک الزاد والراحلۃ ان لم یجد قائدا لا یلزمہ الحج بنفسہ

فی قولھم وھل یجب الاحجاج بالمال فعند ابی حنیفۃؒ لا یجب وعندھما یجب وان وجد قائدا عند ابی حنیفۃؒ لا یجب الحج بنفسہ وعن صاحبیہ فیہ روایتان ولو ملک الزاد والراحلۃ وھو صحیح البدن ولم یحج حتی صار زمنا او مفلوجا لزمہ الاحجاج بالمال بلا خلاف اھ ملخصا، ص ۱۴۱ ج ۱، صورت مذکورہ میں زید پر خود حج کرنا تو فرض نہیں، لیکن حج بدل کرا دینا ضروری ہے، لیکن بعد میں اگر تندرست ہوگیا تو دوبارہ خود حج کرنا پڑے گا، اور اگر خود حج کو چلا جاوے یہ بہت ہی بہتر ہے، واللہ اعلم۔

جس پر جائیداد زیادہ ہو اور نقد روپیہ نہ ہو اس پر وجوبِ حج کا حکم

سوال (۲) جس شخص کے پاس زمین زیادہ ہے، اور روپیہ نقد موجود نہیں، اس کے ذمہ حج فرض ہے یا نہیں، یعنی اس شخص کو زمین فروخت کرکے حج کرنا فرض ہے یا نہیں، مثلاً ایک شخص ہو کہ اس کے پاس پانچ ہزار روپیہ نقد موجود ہو اور دوسرے کے پاس زمین دس ہزار روپیہ کی ہے اور نقد موجود نہیں ہے، اب فرمائیے کہ ان میں کس کے ذمہ حج فرض ہے، یا دونوں کے ذمہ حج کرنا فرض ہے؟

(۲) ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپیہ کا سامان دکان میں موجود ہے، اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

(۳) ایک شخص کے پاس چار ہزار روپیہ کے مویشی ہیں اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

(۴) ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپیہ کا غلہ موجود ہو اس پر حج کرنا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: جس شخص کے پاس اتنی زیادہ زمین ہو کہ اس کا ایک ٹکڑا مصارفِ حج کے لئے فروخت کرنے کے بعد بھی اتنی زمین باقی رہے جو اس کے اور اہل وعیال کے تعیش کے لئے کافی ہے، تو ایسے شخص کے ذمہ اپنی زمین کا کچھ حصہ حج کے لئے فروخت کرنا لازم ہے، اور اس پر حج فرض ہے، اور اگر مصارفِ حج کے واسطے ایک ٹکڑا بیع کرنے کے بعد باقی زمین اس کے اور اس کے اہل وعیال کے گذارہ کو کافی نہیں رہتی، تو اس حالت میں اس پر حج فرض نہیں، اور نہ زمین کا فروخت کرنا فرض ہے، قال فی غنیۃ الناسک وان کان لہ من الضیاع مالو باع مقدار ما یکفی الزاد والراحلۃ یبقی بعد رجوعہ من ضیعتہ قدر ما یعیش بغلۃ الباقی یفترض علیہ الحج والا فلا کذا فی الخانیۃ اھ (ص ۷) ۲۱ر صفر ۴۵ھ

جواب سوال دوم سوم وچہارم: قال فی غنیۃ الناسک السادس الاستطاعۃ وھی القدرۃ علی زاد یلیق بحالہ فاضلا عن الحوائج الاصلیۃ المذکورۃ فی الزکوٰۃ کمسکنہ وعبید خدمتہ وفرسہ المحتاج الی رکوبہ ولو احیانا ومرمۃ مسکنہ

وراس مال حرفته ان احتاجت لذلك والات حرفته من البقر ونحو ذلك ان کان حراثا اکارا اورأس مال التجارة ان کان تاجرا یعیش بالتجارة والمراد ما یمکنه الاکتساب به قدر کفایة عیاله لا اکثر لانه لانهایة له رد المحتار ص ۱) وفیه ایضا وان کان له مسکن فاضل لا یسکنه اوعبد لایستخدمه اومتاع لایستهنه اوکتب لا یحتاج الی استعمالها اوکرم زائد علی قدر التفکه بها ونحو ذلك مما لایحتاج الیها یجب بیعها ان کان به وفاء بالحج اھ (ص ۱)

پس جس شخص کے پاس بانجزار کا سامان دوکان میں ہے، اگر اس میں سے بقدر مصارف حج کے فروخت کرکے اتنا سرمایہ باقی رہے کہ اس میں تجارت کرکے یہ شخص مع اہل وعیال کے متوسط حال سے گذر کرسکے تو بقدر مصارف حج کے سامان کا بیع کرنا لازم ہے، اور اس پر حج فرض ہے، اور اگر باقی میں تجارت کرکے گذر نہ ہو سکے تو واجب نہیں، بشرطیکہ اس شخص کا گذر تجارت ہی پر ہو اور جس شخص کے پاس چار ہزار کے مویشی ہیں تو اگر یہ شخص کاشتکار یا زمیندار ہے اور یہ مواشی سب کے سب کھیتی کے کام میں مشغول ہیں، یا یہ جانور سواری کے ہیں اور گاہے گاہے سواری کے کام میں آتے ہیں تو اس حالت میں اس پر حج فرض نہیں، نہ اُن مواشی کا بیچنا لازم ہے اور اگر یہ جانور دودھ پینے کے ہیں، اور اس کے اہل وعیال کا گذر انکے دودھ ہی پر ہے، اس کے سوا اور کوئی صورت معاش کی نہیں، نہ زمین کا غلہ ہے، اور نہ کچھ تب بھی اُس پر اُن کا بیچنا لازم نہیں بشرطیکہ اگر مصارفِ حج کے لئے بعض کو فروخت کیا جائے تو باقی مواشی سے گذارہ نہ ہوسکے، اور نہ حج فرض ہے، اور اگر اس کی معاش ان جانوروں کے دودھ پر موقوف نہیں، یا موقوف ہے لیکن اُن میں سے بقدر مصارفِ حج کے ایک دو یا زیادہ جانوروں کے فروخت کرنے کے بعد باقی ماندہ مواشی گذارہ کو کافی ہیں، یا یہ جانور تجارتی ہیں اور ان کی تجارت پر اس کا گذر موقوف نہیں، یا موقوف ہے، مگر مصارفِ حج کے لئے ایک دو یا زیادہ کو بیع کرنے کے باقی ماندہ کی تجارت اس کے گذر کو کافی ہے، تو بقدرِ حج کے ایک دو یا زیادہ جانور کو بیع کرکے اس پر حج کرنا فرض ہوگا رہا غلہ جو بانجزار کا ہے تو اگر یہ سارا غلہ صرف کھانے ہی کے صَرف میں آتا ہے تب تو حج فرض نہیں، اور اگر کچھ کھایا جاتا ہے باقی بیچا جاتا ہے تو جتنا ضرورت سے زائد ہو اس کو بیع کرکے حج کرنا فرض ہوگا، اگر وہ زائد غلہ فروخت ہونے کے بعد زاد وراحلہ ومصارفِ حج کو کافی ہو، واللہ اعلم،

از تھانہ بھون، ۲۱ صفر سنہ ۴۵ھ

تعمیر مکان سے حج فرض مقدم ہے

سوال (۳) زید کو جائز طور سے اس قدر رقم نقد ملی کہ فقط حج بیت اللہ کرسکتا ہے، مگر حال یہ ہے کہ اس کا گھر بھی کھنڈر پڑا ہے، تو زید پر اول حج بیت اللہ ادا کرنا فرض ہے یا گھر بنانا۔

الجواب؛ قال فی العالمگیریة وان لم یکن مسکن وعنده دراهم یبلغ به الحج ویبلغ ثمن مسکن وخادم وطعام وقوت فعلیه الحج فان جعلها فی غیر الحج اثم کذا فی الخلاصة (ص ۱۴۰ ج ۱) صورت مسئولہ میں اس شخص پر حج فرض ہے اس رقم کو مکان میں لگانا جائز نہیں بشرطیکہ یہ رقم مکہ کی آمد ورفت کے لئے کافی ہو اور اس مدت کے لئے اہل وعیال کو نفقہ بھی دے سکے۔ واللہ اعلم

۱۳ رمضان سنہ ۴۴ھ از تھانہ بھون

اگر کسی کے پاس مقدار فرضیت حج مال نہ ہو مگر صاحبِ جائداد ہو اور جائداد فروخت کرکے حج کرسکتا ہو تو اس پر حج فرض ہے یا نہیں

سوال (۴) یہ ہے کہ میری اہلیہ اپنا حج فرض پہلے ادا کرچکی ہے اب اس مرتبہ اگر وہ اپنے مرحوم لڑکے کی طرف سے حج بدل کی نیت کرلیں تو کچھ کراہت تو نہیں ہے، میرے لڑکے مرحوم کی بائیس سال کی عمر تھی اور کچھ جائداد بھی اُس کے نام اس کی نانی صاحبہ نے کردی تھی جس کی آمدنی اُس کے خورد ونوش واخراجات ضروری کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی مگر قیمت اُس کی اس قدر ضرور تھی اس کو فروخت کرکے وہ بآسانی حج کرسکتا تھا ایسی صورت میں اُس کے ذمہ حج فرض ہوگیا یا نہیں؟

الجواب؛ فی العالمگیریة (ص ۱۴۰ ج ۱) وان کان صاحب ضیعة ان کان له من الضیاع مالوباع مقدار مایکفی الزاد والراحلة ذاهباً وجائیاً ونفقة عیاله واولاده ویبقی له من الضیعة قدر ما یعیش بغلة الباقی یفترض علیه الحج والا فلا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں اگر اُس کے پاس اس جائداد کے علاوہ مقدار فرضیت حج مال نہ تھا تو حج فرض نہوا تھا۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۸ شعبان سنہ ۴۴ھ۔

الجواب صحیح۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون۔

۲۸ شعبان سنہ ۴۴ھ۔

ایضاً | **سوال** (۵) ایک عورت جس کے نان ونفقہ کا متکفل اس کا شوہر ہے اور اس عورت کے پاس ایک مکان ہے جس کا کرایہ بھی گھر کے اخراجات میں صرف ہوجاتا ہے اور کچھ بچتا نہیں ہے ایسی صورت میں عورت کو اپنا مکان بیچ کر حج کرنا فرض ہے یا نہیں؟ اور مکان کی حیثیت آٹھ یا دس ہزار روپیہ ہے۔

الجواب؛ اور جب عورت کا نفقہ شوہر دیتا ہے اور دوسرے کسی شخص کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں۔ تو یہ مکان حاجت اصلیہ سے زائد ہے اس لئے حج کرنا اس کے ذمہ فرض ہے۔

وفی العالمگیریۃ (ص۱۴۰ ج۱) وفی التجاید ان کان لہ دار لا یسکنہا وعبد لا یستخدمہ فعلیہ ان یبیعہ ویحج بہ وفیہ ایضا بعد اسطر: وان کان صاحب ضیعۃ ان کان لہ من الضیاع مالو باع مقدار ما یکفی الزاد والراحلۃ ذاھبا وجائیا ونفقۃ عیالہ واولادہ یبقی لہ من الضیعۃ قدر ما یعیش بغلۃ الباقی یفترض علیہ الحج والا فلا وفیہ ایضا والعیال من یلزمہ نفقتہ کذا فی البحر الرائق۔

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ۔ الجواب صحیح۔

احقر ظفر احمد عفا عنہ، ۲ محرم ۴۵ھ۔

اولاد ادائے قرض کا وعدہ کرے تو مدیون باپ کو حج پر جانا جائز ہے | **سوال** (۶) میں کاروبار بزازہ کا کرتا ہوں میرے ذمہ قرضہ بارہ سو روپیہ ہے اور مال دو ہزار کا ہے۔ علاوہ مکانات زائد رہائشی کے میری اولاد میرے فریضہ حج کو اس طرح پر منظور کرتی ہے کہ تم حج کو چلے جاؤ ہم قرضہ ادا کردیں گے کیا اس طرح پر شریعت مجھے اجازت ادائے فریضہ کی دے سکتی ہے؟ دعا فرمائیے کہ وقت روانگی تک قرضہ ادا ہوجائے۔

میری زوجہ عمر رسیدہ اور دائم المریض ہے اس کا بھی اصرار ہے کہ مجھے بھی لیکر چلو ورنہ میں اجازت نہیں دیتی اس حال میں کہ خرچ آمد ورفت ایک ہی کا کافی ہے دوسری عورت کا خرچ بہ نسبت مرد کے زیادہ ہوتا ہے پس کیا عورت کی اجازت کا مرد شرعی طور پر ادائے فریضہ حج کے لئے پابند ہے؟

الجواب؛ ہاں اس صورت میں سائل کو حج کے لئے چلا جانا چاہئے اور قرضخواہوں کا اطمینان کرجائے کہ میری اولاد تمہارے قرض کا انتظام کرے گی اگر اولاد کا وعدہ سچی ہو لگے۔ مرد حج کے بارہ میں بیوی کی اجازت کا پابند نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے واپسی تک نفقہ

کا انتظام کرجائے۔ واللہ اعلم۔

۲۵ رجب ۱۳۴۵ھ از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ۔

مہر مؤجل مانع وجوب حج نہیں ہے | **سوال** (۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں یہ لکھدیا کہ تم اپنے میکہ سے ایک ہفتہ کے اندر نہ آئی یا میرا زیور نہ بھیجا تو تم پر ایک طلاق ہے چنانچہ وہ ہنوز نہیں آئی۔ اور نہ زیور بھیجا اور معتبر ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو خط نہیں ملا تو کیا اس پر ایک طلاق دینے سے طلاق ہوگئی اور کیا ایک طلاق سے نکاح فسخ ہوجاتا ہے ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

کیا موجودہ صورت میں مرد حج کو جاسکتا ہے بغیر رضا مند کئے ہوئے عورت کے اور رضامند کردے اور مہر نہ دے سکے کیونکہ اس کے پاس صرف اتنا روپیہ ہے کہ حج کرسکے مہر ادا نہیں کرسکتا اس کی دو لڑکی بھی ہیں تو کتنا حصہ مہر میں سے اس کو دیا جاوے گا۔

الجواب؛ -

حج کو جانے کے لئے عورت کا راضی کرنا یا اس کا راضی ہونا شرط نہیں ہے۔ اگر حج فرض ہو ورنہ مہر ادا کرکے جانا ضروری ہے۔ جبکہ نکاح باقی ہو اور مہر مؤجل ہو بلکہ عورت کو واپسی تک نان ونفقہ دیکر جانا واجب ہے۔ ہاں نکاح ٹوٹ چکا ہو اور عورت مہر کا مطالبہ کرے تو حج سے دین مہر ادا کرنا مقدم ہے۔ اور یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ دین مہر کو دوسرے قرضوں کی برابر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی طرف سے بے التفاتی ہو جیسا کہ عام اہل ہند کی یہی حالت ہے تو ایسا دین مہر وجوب زکوٰۃ وحج کے منافی نہیں الا بوقت طلاق اور مطالبہ زن، اور جو شخص دین مہر کو بھی دیون الناس کی طرح سمجھتا ہو اور اس کی ادا کی فکر میں ہو اور حسب ہمت قلیل وکثیر ادا کرتا ہو اس پر حج اس وقت تک فرض نہ ہوگا جبتک دین مہر ادا نہ ہوجائے یا اتنی رقم اس کے پاس جمع ہوجائے جو ادائے دین مہر کے بعد مصارف حج ونفقہ اہل وعیال کو تا واپسی کافی ہو۔ واللہ اعلم۔

۱۹ رمضان شریف۔

نابالغ لڑکے اور محلہ کی عورتوں کے ساتھ سفر حج پر جانا جائز نہیں | **سوال** (۸) ایک عورت حج کو جانا چاہتی ہے مگر کوئی اس کا محرم نہیں ہے شوہر اور سب محرم مرگئے صرف اکیلی عورت ہے، اور ایک لڑکا لے پالک ہے لڑکے کا سن ۱۵ برس کا ہے عورت کی عمر بھی ۵۰ برس کی ہے عورت پر حج فرض بھی ہے کیونکہ خدا نے حج بھر کا روپیہ بھی دیا ہے پالے ہوئے لڑکے کے ساتھ حج کو جاسکتی

ہے یا محلہ کی عورت اپنے محرم کے ساتھ جاتی ہو تو یہ عورت بھی اُس عورت کے ساتھ جا سکتی ہے یا نہیں یا کہ حج بدل کرا دے کیونکہ اگر عورت مرگئی تو اس کا حج بدل کوئی نہیں کرائے گا تینوں مسئلوں کا جواب برائے مہربانی بہت جلد روانہ فرمائیں آپ ہی کے مسئلہ پر اُس عورت کا بہت اعتقاد ہے۔

الجواب: صورت مسئولہ میں اس مسماۃ کو اپنی طرف سے حج بدل کرا دینا چاہئے، اپنے لے پالک کے ساتھ یا ہمسایہ عورتوں کے ساتھ جانا جائز نہیں لیکن اس وقت کا حج بدل کرایا ہوا اس شرط کے ساتھ معتبر ہوگا کہ عمر بھر کوئی محرم نہ ملے اور اگر کسی وقت محرم مل گیا مثلاً نکاح کر لیا اور شوہر ساتھ چلنے پر راضی ہوا اور اس وقت بھی روپیہ بقدر حج عورت و محرم موجود ہوا یا بعد کو جمع ہو گیا تو حج دوبارہ کرنا پڑے گا قال فی الشامیة تحت قول الدر هذا اذا کان العجز کالحبس والمرض یرجی زواله وان لم یکن کذلك کالعمی والزمانة سقط الفرض بحج الغیر عنه فلا اعادة مطلقاً سواء استمر به ذلك العذر ام لا اھ مانصه ومن العذر الذی یرجی زواله عدم وجود المرأة .... محرما ان دام عدم المحرم الی ان ماتت فیجوز کالمریض اذا احج ودام المرض الی ان مات اھ (ص ۳۹۰ ج ۲)

تھانہ بھون خانقاہِ امدادیہ، ۸ رمضان ۴۶ھ۔

مسئلہ وجوب حج علی الفور اور یہ کہ حج واجب ہونے کے بعد رقم حوائج ضروریہ میں صرف کرنا جائز نہیں ہے

سوال (۹) شامت اعمال سے فی الحال فریضۂ حج کی ادائیگی سے بوجہ مالی حالت اس قابل نہ ہونے کے معذور ہوں حالات اس قسم کے ہیں جن کی تفصیل دشوار طویل ہونے کی وجہ سے عرض نہیں کی گئی کہ مجھ کو ایک مختصر اور قابل گذر مکان بنانے کی شدید ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔ لہذا عرض یہ ہے کہ اگر ضرورت سے مجبور ہو کر مکان بنا لوں اور اس کے بعد جس وقت بھی مالی حالت اس قابل ہو جائے حج کروں تو شرعاً جائز ہے یا نہیں، حضور والا مطلع فرما کر مطمئن فرما دیں؟ فقط والسلام و رحمۃ اللہ۔

الجواب: حج میں مختار قول یہ ہے کہ واجب ہونے کے بعد علی الفور واجب ہے پس اگر آپ پر حج واجب ہو چکا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سال گذشتہ میں یا اس سے پہلے کسی سال میں حج[ع] کے وقت آپ کے پاس حج کرنے کے لئے کافی رقم موجود تھی تو اب اس رقم کو مکان میں صرف

ع حج کا وقت ہندوستان میں شوال کے مہینہ سے شروع ہوتا ہے فانه هو وقت خروج الحاج منه ۱۲ ظ

کرنا جائز نہیں اور اگر حج کے وقت میں کسی سال کے اندر رقم جمع نہ تھی بلکہ اس سال رقم وقت حج کے بعد جمع ہوئی ہے یا ہمیشہ حج کے وقت سے پہلے جمع ہوئی اور وقت سے پہلے ہی صرف ہو جاتی تھی تو اس صورت میں اس رقم کو مکان میں لگا دینا جائز ہے قال فی الغنیة ومن لا مسکن له ولا خادم وهو محتاج الیهما وله مال یکفیه لقوت عیاله من ذهابه الی ایابه وله مال یبلغه فلیس له صرفه الیهما ان حضر وقت خروج اهل بلده بخلاف من له مسکن یسکنه وخادم یخدمه لا یلزمه بیعهما لانه لا یتضرر بترك شراء المسکن والخادم بخلاف بیع المسکن والخادم فانه یتضرر به لباب وغیره وفیه ایضا فان ملك المال قبل الوقت فله صرفه حیث شاء لکن ان صرفه علی قصد الحیلة لاسقاط الحج یکره عند محمد ولا باس به عند ابی یوسف وان ملکه فی الوقت فلیس له صرفه الی غیر الحج علی القول بالفور فلو صرفه لا یسقط عنه الوجوب علی القولین وان ملك فی الوقت لا یقدر علی اداء الحج قال الفارسی فی منسکه والاظهر انه لا یجب وعلیه الفتوی کبیر اھ ص وفیه ایضا علی الفور فی اول سنی الوجوب وهو اول سنی الامکان علی القول الاصح عندنا وهو قول ابی یوسف واصح الروایتین عن ابی حنیفة فیقدم علی الحوائج الاصلیة کمسکنه وخادمه والتزوج الی ان قال فان اخره الی العام الثانی بلا عذر (ای معتبر شرعاً ولیس المسکن منه) یاثم لترك الواجب. فقط۔

۱۹ جمادی الثانی ۴۷ھ

ادا حج سے قبل زیارتِ روضۂ اقدس کا حکم

سوال (۱۰) سفر حرمین شریفین کے وقت حاجی لوگ ایک تو حج میں آگے یعنی پہلے حج سے مدینہ منورہ کی زیارت کر کے پیچھے حج کر کے وطن واپس جاتے ہیں اور ایک حاجی تو اول حج ادا کر کے پیچھے مدینہ شریف کی زیارت کو چلتے ہیں اس میں سوال کا مطلب یہ ہے کہ حج سے پہلے مدینہ طیبہ یا حج سے پیچھے مدینہ عالی کے جانے میں کچھ فرق ہے یا نہ یا ایک سی بات ہے سو اس کی حقیقت سے مطلع فرما دیں؟

الجواب: جس نے ابھی تک حج فرض ادا نہ کیا ہو اس کے لئے اَولیٰ یہ ہے کہ پہلے حج کرے پھر مدینہ جائے اور جس نے حج فرض ادا کر لیا ہو اس کے لئے دونوں صورتیں برابر ہیں بجز

راستہ میں مدینہ واقع نہ ہو ورنہ زیارت ہی پہلے کرنا چاہئے ووجہ الاول کون الفرض اہم واقدم قال فی الغنیۃ ویبدأ بالحج لو فرضًا فھو الاحسن فلو بدأ بالزیارۃ جاز وغیرلو نفلاً مالم یمر بہ فیبدأ بزیارتہ لامحالۃ لان ترکھا مع قربھا یعد من القساوۃ والشقاوۃ اھ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۴ جمادی الثانیہ ۴۷ھ

اس کی کیا اصل ہے کہ ہندو سے روپیہ قرض لیکر حج کرنا بہتر ہے

سوال (۱۱) مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے ہندو سے قرض لیکر حج کو جانا بہتر ہے اس کی کیا اصل ہے؟

الجواب؛ اس کی اصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالفروع نہیں اس لئے ہندو سے جو قرض لیا جائے گا وہ شبہات سے خالی ہوگا۔ دوسرے اگر حج کو جانے والے کے پاس مشتبہ رقم ہو تو اس مشتبہ رقم سے حج کرنا بہتر نہیں اس کو چاہئے کہ قرض لیکر حج کو جائے مگر مسلمان سے قرض لیکر اس کے قرض کو مشتبہ مال سے ادا کرنا اشد ہے اور ہندو کے قرض کو اس سے ادا کرنا اشد نہیں گو شدید ہے۔

جس شخص پر حج فرض نہ ہو اور کسی نے تبرعاً حج کرا دیا تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا یا نہیں

سوال (۱۲) اگر کوئی شخص اپنے ہمراہ خدمت کے واسطے یا ویسے ہی تبرعاً ایسے شخص کو حج کو لے جاوئے جس پر فی الحال حج فرض نہیں تو اس کا وہ فرض جو آئندہ ہونے والا ہے ادا ہو جاوے گا یا نہیں۔ اور نیز شخص مذکور کو یہیں اس قدر روپیہ دیکر قبضہ کرا دیا جائے جس سے فرضیت عائد ہو جائے تو بھی فرض ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب؛ ہاں دونوں صورتوں میں اس شخص کے ذمہ سے حج فرض ادا ہو جائے گا

حجام سفر حج میں اپنا پیشہ اختیار کر سکتا ہے یا مکروہ ہے

سوال (۱۳) ایک شخص قوم حجام کا حج کو جاتا ہے اگر وہ آنے جانے کے راستہ میں یا مکہ میں رہ کر اپنے پیشہ کو اختیار کر کے کمالے تو اس کے حج میں کسی قسم کی کراہت وغیرہ کا سُقم عارض ہوگا یا نہیں، یا اولویت کے خلاف ہوگا یا نہیں؟ فقط۔ بینوا توجروا۔

الجواب؛ جائز ہے۔ رہا یہ کہ ثواب تو کم نہ ہوگا تو اگر اصل مقصود کمائی ہے تو بیشک ثواب کم ہو جائے گا اور اگر اصل مقصود حج ہے اور کمائی تابع ہے تو ثواب کم نہ ہوگا، مگر شُبہ عدم اخلاص کا ہے۔ اور اگر کمائی سے مقصود سفر حج کی سہولت ہے تاکہ وہاں تنگی نہ پیش

آئے تو کچھ شُبہ نہیں بے غبار جائز بلکہ افضل ہے، واللہ اعلم۔ ۱۸ رجب ۴۷ھ

بارھویں کی رمی زوال سے پہلے جائز ہے یا نہیں

سوال (۱۴) بارھویں کی رمی قبل از زوال ادا ہو جاتی ہے یا نہیں۔

الجواب؛ نہیں بارھویں کی رمی زوال سے پہلے جائز نہیں۔

بارھویں کو بعد مغرب طواف زیارت ہو سکتا ہے یا نہیں

سوال (۱۵) طواف زیارت بارھویں تاریخ کو بعد مغرب ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ادا ہو جائے گا مگر دم واجب ہوگا، طواف زیارت کا وقت واجب ۱۲ بارھویں تاریخ کے غروب شمس سے پہلے تک ہے اور وقت صحت و ادا تمام عمر ہے، غنیہ ص ۹۵۔

حج فرض ہونے کے بعد کسی مصلحت سے اس میں تاخیر جائز نہیں ہے

سوال (۱۶) حضرت مولانا! السلام علیکم اس عاجز نے پانچ چھ ماہ ہوئے اس سال حج کرنے کا ارادہ کیا تھا چنانچہ اسکے سامان اور انتظام کی کوشش میں رہا ایک مکان کی تعمیر میرے ذمہ تھی اور امید تھی کہ ایام حج سے پہلے مکمل ہو جائے گی صورتیں ایسی وقوع میں آئیں کہ کسی طرح بھی عمارت مذکور کی تکمیل ایام حج تک ہونی ناممکن ہے مصلحت کہتی ہے کہ اس سال ارادہ ملتوی کر کے آئندہ سال اس فریضہ کا انجام دوں کیونکہ حج اب مجھ پر فرض ہے لیکن مصلحت سے مقدم شریعت ہے اس لئے جناب سے استفسار کرتا ہوں کہ آیا اس سال حج کا التوا آئندہ سال کے لئے گناہ تو نہ ہوگا اور آیا کوئی صورت ایسی ہے کہ اس التوا کی اجازت ہوگی اپنے فہم میں قرآن شریف کی آیت " الحج اشھر معلومات " سے حج کی نیت اشہر حج سے پہلے معتبر نہ ہونی چاہئے مگر میں اس لائق نہیں ہوں کہ اپنے فہم کو معتبر سمجھوں اس لئے جناب کو تکلیف دیتا ہوں کہ مجھے صحیح راہ بتائیں

الجواب؛ قال فی الغنیۃ یجب (الحج) علی الفور فی اول سنی الوجوب وھو اول سنی الامکان علی القول الاصح عندنا وھو قول ابی یوسف واصح الروایتین عن ابی حنیفۃ رضی اللہ عنھما فیقدم علی الحوائج الاصلیۃ کمسکنہ وخادمہ والتزوج وان لم یجب بھا کما سیأتی اھ (ص ۱) وقال محمد والشافعی فرض علی التراخی وفیہ ایضاً ومن لا مسکن لہ ولا خادم وھو محتاج الیھما ولہ مال یکفیہ لقوت عیالہ من وقت ذھابہ الی حین ایابہ ولہ مال یبلغہ فلیس لہ صرفہ الیھما ان حضر وقت

خروج اهل بلده اه (ص۷) صورت مسئولہ میں آپ پر اسی سال حج کرنا واجب ہے، مصلحت مکان کا انتظام کردیا جائے یا تعمیر کو درمیان میں روک دیا جائے۔ الحج اشھر معلومات کا مطلب یہ ہے کہ اشہر حج سے پہلے حج کا احرام نہ باندھا جائے یہ مطلب نہیں کہ ان مہینوں میں نیت کی جائے تو حج واجب ہوگا ورنہ نہیں وجوب حج کا مدار نیت پر نہیں ہے بلکہ وقت حج میں وجود زاد و راحلہ و استطاعت پر ہے جس شخص کے پاس ہندوستان میں مثلاً شوال کے مہینہ میں آمدورفت سفر حج کا کرایہ وغیرہ اور اہل وعیال کا نفقہ واپسی تک موجود ہو اور دَین و حوائج اصلیہ سے فاضل ہو اس پر اسی سال حج فرض ہو جائے گا خواہ نیت کرے یا نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

۲۷ رمضان ۴۷ھ

صاحب نصاب راستہ کے مخدوش ہونے کے سبب حج نہ کرسکے اور پھر اس کے پاس سے مال خرچ ہو جائے تو اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں

سوال (۱۷) جنگ یورپ کے زمانہ میں ایک شخص کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ حج ادا کرسکے لیکن علماء کرام کے ارشاد پر کہ راستہ کی حالت ازحد مخدوش ہے وہ حج ادا نہ کرسکا اور اسی حالت جنگ میں وہ رقم اس کے پاس سے صرف ہوگئی اب گذارش ہے کہ اس کے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: محض علماء کا کہنا کافی نہ تھا کیونکہ راستہ کا مخدوش ہونا یا نہ ہونا علمی مسئلہ تھوڑا ہی ہے بلکہ یہ تو تحقیق اخبار سے متعلق تھا پس اگر تحقیق سے اس وقت بھی ثابت ہوا تھا کہ راستہ مخدوش ہے جب تو سائل کے ذمہ اب حج فرض نہیں اور اگر تحقیق نہیں کی تو اس کے ذمہ حج فرض ہے رقم جمع کرکے حج ادا کرنے کی کوشش کرے اور یہ جواب اس صورت میں ہے جبکہ کسی سال ماہ شوال یا ذیقعدہ میں اس کے پاس بقدر حج کے رقم فاضل عن الحوائج الضروریہ جمع رہی ہو اور اگر ان مہینوں میں کبھی رقم جمع نہیں رہی تو سوال دوبارہ کیا جاوے۔ فقط

۲ ذیقعدہ ۴۷ھ

جس روپیہ سے زکوٰۃ نہیں نکالی ہو اس روپیہ سے اور قرض روپیہ سے حج کرنا

سوال (۱۸) گذارش یہ ہے کہ جس روپیہ میں زکوٰۃ نہ نکالی جاوے اس روپیہ سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں جواز و عدم جواز سے مفصل مطلع فرمایا جاوے۔ اور قرض لیکر جانا ہے یا نہیں حج ہو جائے گا یا نہیں یعنی کچھ روپیہ تو اس کے پاس ہے جو حج کو جاتا ہے اور کچھ روپیہ قرض لیکر جاتا ہے، اس کا بالغ لڑکا ہے وہ قرض ادا کردے گا تو اس روپیہ سے حج ادا ہوگا یا نہیں اور اگر وہ بالغ

لڑکا کہے کہ میں خود تنگدست ہوں بال بچوں کو کیا کھلاؤں گا میں قرض نہ دوں گا تو اس کا کیا حکم ہے جو والد کا کہنا نہیں مانتا۔

۱۲

الجواب: جس روپیہ سے زکوٰۃ نہیں نکالی گئی اس سے اگر حج کیا جاوے تو حج تو جائز ہو جائے گا مگر زکوٰۃ کی تاخیر کا گناہ بھی رہے گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ اول زکوٰۃ ادا کی جائے اس کے بعد جو رقم بچے اس سے حج کیا جاوے اگر وہ رقم کافی نہ ہو تو قرض لیکر حج کرنا اس شرط سے جائز ہے کہ ادائے قرض کے واسطے کچھ سرمایہ پیچھے چھوڑ جائے مثلاً جائداد و مکانات وغیرہ۔ اگر سرمایہ کچھ نہ ہو تو قرض لیکر اولاد کے ذمہ ڈالنا جائز نہیں اور جو لڑکا قرض کے ادا کرنے سے انکار کرتا ہے اس کا کچھ قصور نہیں اولاد کے ذمہ ماں باپ کی اطاعت و خدمت لازم ہے قرض ادا کرنا ان کے ذمہ نہیں۔ فقط۔

۲۹ ربیع الثانی ۴۸ھ

بارہ تاریخ کو زوال سے قبل رمی کرنا اور بدون عذر رمی میں نیابت کا حکم

سوال (۱۹) زید نے رمی جمرات ثلاثہ بارہ تاریخ کی بکر یا ہندہ یا چند عورتوں کی طرف سے بحالت صحت وکالۃً کرلی اور رمی قبل زوال ہوئی۔ آیا یہ رمی صحیح ہوئی یا نہیں درصورت عدم صحت دم وغیرہ اس پر واجب ہے یا کیا۔ اگر واجب ہے تو یہاں دے سکتا ہے یا وہیں کسی سے کرادیا جائے؟

الجواب: بارہ تاریخ کو زوال سے قبل رمی کرنا صحیح نہیں ہے اور رمی میں بدون عذر نیابت بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے نہ خود زید کی رمی صحیح ہوئی اور نہ بکر و ہندہ وغیرہ کی اور سب پر دم واجب ہے اس لئے ہر ایک کی طرف سے ایک ایک بکری حرم میں ذبح کرائی جاوے یہاں ذبح کرنا کافی نہیں ہے۔ قال فی غنیۃ الناسک واما وقت الجواز فی الیوم الثانی والثالث من ایام النحر فمن الزوال الی طلوع الفجر من الغد فلا یجوز قبل الزوال فی ظاهر الروایۃ وعلیہ الجمهور من اصحاب المتون والشروح والفتاوی قال فی الفیض وهو الصواب (ص۹۷) وفی (ص۱۰) السادس ان یرمی بنفسه فلا یجوز النیابۃ فیه عند القدرۃ ویجوز عند العذر وفی ص۱۲۹ ولو ترک رمی الجمار الثلث فی یوم واحد او یومین او فی الایام کلها فعلیه دم واحد لاتحاد الجنس اھ وفی ص۱۲۸ وحیث ما اطلق الدم فالمراد الشاۃ وتجزئ فی کل موضع الا اذا جامع بعد الوقوف بعرفۃ او طاف للزیارۃ جنباً او حائضاً او نفساء ففیهما تجب بدنۃ الخ وفی ص۱۴۰ الثامن ذبحه فی الحرم فلو ذبح

فی غیرہ لا یجزیہ عن الذبح ۔

کتبہٗ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۲۲ جمادی الاخریٰ ۴۵ھ ۔

بچے کو حج پر ساتھ لیجانے سے اس پر حج فرض ہوجاتا ہے

سوال (۲۰) بچہ کو حج کے لئے لیجانا مناسب نہیں کیونکہ اس پر بیت اللہ شریف دیکھنے سے فرض ہوجائیگا اور اگر وہ بڑھکر مالدار نہ ہوا اور مرگیا تو گنہگار مرے گا بوجہ متعلق ہوجانے فرضیت حج کے بسبب دیکھنے بیت اللہ شریف کے ۔

الجواب : بچہ اگر حج کرکے چلا آوے تو بالغ ہونے کے بعد اس پر حج فرض نہیں ہوتا۔ ہاں اگر بلوغ کے بعد مالدار بھی ہوجائے تو فرض ہوگا بوجہ مالداری کے نہ بوجہ اس زیارت سابقہ کے ۔ فقط ۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۱ر شوال ۴۸ھ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ر شوال ۴۸ھ ۔

ملازمت ختم ہونے کے خوف سے حج میں تاخیر کرنا

سوال (۲۱) میری عمر اس وقت ۲۹ سال کی ہے اور میں نے ابھی تک فرض حج بھی ادا نہیں کیا ہے وجہ یہ ہے کہ اب تک کا زمانہ میرا مختلف پریشانیوں میں کٹا ہے مثلاً والد صاحب کا انتقال ہوا اور گھر بار سب میرے سر پڑا اور اپنی تعلیم کی فکر تھی ۔ وہ الگ اب وقت یہ ہے کہ میری ملازمت ایک سرکاری یعنی انگریزی دفتر میں ابھی تک غیر مستقل ہے اور غیر مستقل ہونے کی وجہ سے میرے حکام کو بالکل اختیار ہے کہ چاہے جس روز اور جس وقت مجھے (خواہ کوئی قصور ہو یا نہ ہو) برخواست کردیں چونکہ حج کے واسطے مجھے طویل رخصت کی درخواست دینا ہوگی لہذا بجائے رخصت کی درخواست منظور کرنے کے مجھے غالب اندیشہ ہے کہ وہ یہی حکم دیں گے کہ جائیے ہم نے ہمیشہ کے واسطے آپ کو برخاست کردیا۔ دوم میں ایک سادہ لوح اور ناتجربہ کار سا آدمی ہوں، لہذا اس انتظار میں ہوں کہ میرے اعزا میں سے ایک عزیز چند سال کے بعد حج کو جانیوالے ہیں انشاء اللہ ان کے ہمراہ میں بھی جاؤں گا اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ جو میں اب تک فرض حج کو ادا کرنے نہیں گیا اور ابھی چند سال تک بوجہ مندرجہ بالا مجبوریوں کے میرا جانا ملتوی رہے گا تو میں از روئے شرع شریف تو گنہگار نہ ہونگا ؟

الجواب : السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تاخیر حج بلا عذر سے گناہ ہوتا ہے اور جو تاخیر بعذر ہو اس سے گناہ نہیں ہوتا . یہ تو قاعدہ کلیہ ہے . اب رہا یہ کہ جو عذر آپ نے بیان کیا ہے وہ عذر ہے یا نہیں مجھے

اس میں تردد ہے دیگر علماء سے رجوع کیا جاوے . واللہ اعلم .

ظفر احمد عفا عنہ ۱۴ر شوال ۴۸ھ

حضرت حکیم الامۃ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میرے نزدیک پریشانی روزگار عذر ہے ، حکاہ عنہ المولوی عبدالکریم سلمہ .

جس کی ملک میں وسیع زرعی زمینیں ہوں مگر نقد روپیہ نہ ہو تو ہندو سے سود پر قرض لیکر اس کو حج کرنا جائز ہے یا نہیں اور اس سودی معاملہ سے وہ گنہگار ہوگا یا نہیں

سوال (۲۲) ۱ شخصے است دولتمند نزد او زمینات زرعی بسیار موجود اند لیکن فی الحال نزد او روپیہ نقد موجود نہ اند آن کس می خواہد کہ روپیہ مثلاً یک ہزار بقرض بر سود از ہندو بگیرم و حج کنم بعدہٗ آن قرض مع سود ادا خواہم نمود پس زید فتویٰ می دہد کہ آن کس را گرفتن قرض بر سود جائز نیست و ازین عقد ناجائز آن مال مستقرض ہم حرام گشت پس حج کردن آن را ازین مال حرام جائز نیست و عمر فتویٰ می دہد کہ این مال حرام نیست چرا کہ زیادتی ربوا حرام است و حرمت عقد ازین مال مستقرض اثر نمی کند پس حج کردن آن شخص ازین مال جائز است کہ ازین عقد ناجائز آن مال مستقرض حرام می شود یا نہ ؟

۲ ثانیاً در صورت مذکورہ کہ نزد آن شخص نقدیات موجود نہ اند و بر او حج اسلام ہم فرض است و ایام حج بر سر آمدہ اند اگر ہمان شخص قدرے از زمینات خود می فروشد پس ایام حج می گذرند و می داند کہ اگر درین سال بمیرم پس مرتکب کبیرہ خواہم شد اکنون درین صورت اگر چند مبالغ بر سود بگیرد بہ سبب ہمیں ضرورت جائز است یا نہ و ہمیں ضرورت شرعی است یا نہ جواب ہر دو سوال بحوالہ کتب مرحمت فرمانید کہ اطمینان قلبی حاصل گردد ۔

الجواب ؛ (۱) قول زید کہ گرفتن قرض بر سود جائز نیست صحیح است واما قول او کہ ازین عقد ناجائز آن مال مستقرض ہم حرام گشت پس حج کردن ازین مال حرام جائز

لہ اس فتویٰ کے متعلق خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے مفتی حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے " امداد الاحکام " کے رجسٹر ۹ کے شروع میں تحریر فرمایا ہے کہ اس میں " مجھے تردد ہے " افسوس کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اس مسئلہ میں معلوم نہیں ہوسکی . احقر ناکارہ محمد رفیع عثمانی خادم طلبہ و دار الافتاء دار العلوم کراچی ۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ

نیست الم صحیح نیست زیراکہ عقد استقراض بشرط فاسد فاسد نمی شود قال فی الدر القرض بالشرط حرام والشرط لغو اھ ص ۲۶۶/۲۲ ، بلکہ شرط فاسد خود لغو می گردد پس مال مستقرض حرام نگشت بلکہ شرط ربوا باطل گردید ۔ وچون مال ربوا بمال او مخلوط نگردید بلکہ بمال مقرض مخلوط شدہ لہذا مالِ مستقرض حلال باشد وحج ادا کردن باد ہم صحیح باشد اگرچہ گناہ عقد ربوا ودادن ربوا ہم بذمۂ او باشد ۔

(۲) تا وقتیکہ زمین مذکور فروخت شود ونزد مرد رقم نقد بوقت خروج حجاج بدست نیاید بروحج فرض نیست پس بدین ضرورت کہ امسال حج ادا کردہ شود قرض بر سود گرفتن جائز نباشد واللہ تعالیٰ اعلم ۔

۱۵ ذیقعدہ ۴۹ھ

اشہر حج میں عمرہ کے بعد حج سے قبل مدینہ جانا جائز ہے

سوال (۲۳) معلم الحجاج ص ۲۳۵ پر ہے جس پر حج فرض ہے اگر وہ مکہ میں حج کے مہینوں سے پہلے آجائے تو حج کے مہینے شروع ہونے سے پہلے اس کو مدینہ جانا جائز ہے اور حج کے مہینے شروع ہونے کے بعد جانا جائز نہیں، اس کا ماخذ غنیہ اور شرح لباب باب زیارت ہے والظاہر ان لہ ان یذہب قبل دخول اشہر الحج واما بعدہ فلا ص ۲۰۱ اس سے صریح معلوم ہوا کہ متمتع کو بھی نہ جانا بہتر ہے ۔

الجواب : مصنف معلم الحجاج سے فہم مسئلہ میں سہو ہوا ہے یہاں کلام افضلیت و غیر افضلیت میں ہے جواز میں کلام نہیں اوپر سے دیکھا جائے قد روی الحسن عن ابی حنیفۃ انہ اذا کان الحج فرضا فالاحسن للحاج ان یبدأ بالحج ثم یثنی بالزیارۃ وان بدأ بالزیارۃ جاز وھو الظاہر اذ یجوز تقدیم النفل علی الفرض اذ لم یخش الفوت بالاجماع اھ عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں جبکہ خوف فوت حج نہ ہو فقد ذکر السرخسی فی المبسوط عن زید التنقی رضی اللہ عنہ انہ سأل ابن عباس رضی اللہ عنہما فقال اتینا عمارا فقضیناھا ثم زرنا القبر ثم حججنا فقال انتم متمتعون ص ۱۸۴/۴۲ واحتج بہ لابی حنیفۃ علی ان الخروج من المیقات لیس بالمام وانما الالمام ان یصل الی اھلہ ، بہرحال اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بعد بھی مدینہ جا سکتا ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

۹ شعبان ۵۶ھ

فصل فی الاحرام وما ھو محظور فیہ او مباح

احرام میں شکار اور غیر محرم کا حدودِ حرم کے اندر شکار لانے کا حکم اور اس کے متعلق غنیہ اور زبدہ کی عبارتوں میں تعارض کی تحقیق

سوال (۱) ذیل کے مسئلہ کی تحقیق کی ضرورت ہے اس لئے تحقیق کرکے ارقام فرماویں . . . .

زبدۃ المناسک غیر جیبی کے صفحہ ۴۸ میں لکھا ہے کہ جو حل میں احرام باندھے اور اس کی مٹھی میں صید ہو تو واجب ہے کہ اس شکار کو چھوڑ دے اس طرح کہ ضائع نہ ہو یا قفس میں رکھے الخ اور کچھ آگے لکھتے ہیں کہ محرم یا حلال جب حرم میں داخل ہو اور اس کے پاس شکار ہو اگرچہ قفس میں ہو تو واجب ہے کہ اس کو چھوڑ دے کہ وہ اب حرم کا شکار ہو گیا الخ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حل میں احرام باندھنے کی صورت میں شکار کا اصل چھوڑ دینا واجب نہیں ہے بلکہ کسی پنجرے میں ہو رکھ دینا چاہئے اور حرم میں داخل ہونے کی صورت میں اگرچہ پنجرے میں ہو اصلاً چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ یہ شکار اب حرم کا ہو گیا اب سوال یہ ہے کہ حل میں حلال نے شکار پکڑا پھر جب حرم میں داخل ہوا تو یہ شکار اس کی ملک سے خارج ہوا یا فقط اس کو حرم میں ہلاک نہ کرے یعنی مامون رکھے اور پھر حرم سے باہر نکل کر کام میں لا سکتا ہے ۔ زبدۃ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی ملک سے بھی خارج ہو گیا اصل حرم کا ہو گیا اور غنیۃ الناسک صفحہ ۱۶۱، اور دیگر کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چھوڑ دینا واجب نہیں ۔ یعنی حل وحرم میں فرق نہیں ہے ولو ادخل محرم او حلال صید الحل الحرم صار حکمہ حکم صید الحرم ومن دخل الحرم بصید فعلیہ ان یرسلہ فیہ اذا کان فی یدہ حقیقۃ حتی اذا کان فی رحلہ او فی قفصہ لا یجب ارسالہ کذا فی الھدایۃ والکفایۃ وغیرھما ۔ غنیۃ الناسک صفحۃ ۱۵۷ سطر ۷، ولو اخذہ فی الحل وھو حلال ثم احرم او دخل بہ الحرم ملکہ ملکا محترما فان کان الصید فی یدہ حقیقۃ وجب ارسالہ لکن لا بان یسیبہ لان تسییب الدابۃ حرام لانہ تضییع للملک بل یطلقہ علی وجہ لا یضیع بان یخلیہ فی بیتہ او یودعہ عند حلال او یرسلہ فی قفص معہ الخ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اگر حرم میں حل کا شکار

داخل کیا جاوے تو اطارۃ واجب نہیں ہے بلکہ چھوڑ دینا تضییع مال ہے اور پنجرے میں ساتھ لئے رہنا بھی حرم میں جائز ہے اب زبدہ اور غنیہ کی عبارات کا تعارض دفعہ فرمادیں یا ایک کو ترجیح دیں اس بارہ میں شامی کو بھی دیکھا اس میں شاید لکھا ہے کہ حل میں شکار پکڑ کر باندھے اور حرم میں محرم و حلال اگر شکار داخل کرے اور شکار پنجرے میں ہو یعنی فی ید حکمی ہو تو چھوڑنا واجب نہیں، اور اگر فی ید حقیقی ہو تو حرم میں اصل چھوڑ دینا واجب ہے اور حل میں اصل چھوڑنا واجب نہیں یہ فرق بیان کیا ہے اور غنیہ نے دونوں میں فرق نہیں کیا یہ تعارض بھی دفعہ فرمادیں شامی ص۲۰۳ وھی من احرم فی الحل وفی یدہ صید واما الاولی وھی لو دخل الحرم وفی یدہ صید فالواجب علیہ الارسال بمعنی الاطارۃ لقولہ فی الھدایۃ.

الجواب : (اقول وباللہ التوفیق ، اخذ صید کی صورتیں چند ہیں ہر ایک کا حکم الگ الگ معلوم کرنا چاہئے (۱) احرام کے بعد شکار پکڑے خواہ حل کا ہی شکار ہو یا حرم کا شکار پکڑے خواہ یہ حلال ہی ہو محرم نہو یہ تو ملک ہی میں داخل نہ ہوگا (۲) یہ کہ احرام حل میں باندھنا چاہتا ہے اور احرام سے پہلے اس کے ہاتھ میں حقیقۃً صید حل ہے (۳) حل میں احرام باندھنا چاہتا ہے اور اس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ قفص میں صید حل ہے (۴) حرم میں داخل ہوا اور اس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ قفص میں صید حل ہے اور قفص اس کے ہاتھ میں ہے یہ چار صورتیں جن میں دو صورتیں اخیر کی محل نزاع ہیں۔ ودلیل الاول ما فی غنیۃ الناسک ولو اخذ الصید فی الحل وھو محرم او فی الحرم وھو حلال لم یملکہ ووجب ارسالہ سواء کان فی یدہ او فی قفص معہ او فی بیتہ اھ (ص ۱۵۶) اور صورت ثانیہ کا حکم یہ ہے کہ یہ شکار محرم کی ملک ہے اور اس کے ذمہ اس کا چھوڑ دینا واجب ہے مگر اس طرح کہ ضائع نہ ہو مثلاً گھر میں بند کرکے چھوڑ دے یا کسی حلال خارج حرم کے پاس امانت رکھ دے یا قفص میں چھوڑ دے قال فی اللباب وشرحہ ولو اخذ صیداً فی الحل وھو حلال ثم احرم ملکہ ای ملکا مستمراً حیث لم یخرج بالاحرام من ملکہ ثم ان کان الصید فی یدہ لزمہ ارسالہ علی وجہ لا یضیع ملکہ ای ان شاء بقاءہ فی ملکہ بان یخلیہ فی بیتہ مغلقاً علیہ فان الاستدامۃ علی اخذ الصید (بیدہ) فی حکم ابتداء صیدہ وان لم یرسلہ حتی مات فی یدہ لزمہ الجزاء اھ (ص ۲۰۲) اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس طرح چھوڑے

کہ جانور ضائع نہو یہ اس وقت واجب ہے جبکہ اس کو اپنی ملک میں باقی رکھنا چاہے اور اگر بطور اباحت کے چھوڑ دے کہ جو پکڑے وہی مالک ہے اور اپنی ملک میں باقی نہ رکھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے قال فی الدر وفی کراھۃ جامع الفتاوی شری عصافیر واعتقھا جاز الی ان قال من اخذھا فھی لہ قلت وحینئذ فتقیید الاطارۃ بالاباحۃ قبل فتامل اھ قال الشامی لکن ظاھر ما قدمناہ عن القھستانی من حکایۃ القولین فی تفسیر الارسال ان من فسرہ بالاطارۃ لم یقید بالاباحۃ لانہ یقول ان الارسال واجب فلم یکن فی معنی التسیب المحظور من فسر الارسال بالودیعۃ فکانہ یقول حیث امکنہ دفع التعرض للصید بھا فلا حاجۃ الی الاطارۃ المضیعۃ للملک لاندفاع الضرورۃ بدونھا اھ (۲ج۳۶۱) شامی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات پر اطلاق و اطارۃ مطلقاً جائز ہے اباحت کی قید کی ضرورت نہیں لیکن قواعد سے ترجیح اس کو معلوم ہوتی ہے کہ اگر قوم حاضر کو اباحت کر دے تب تو اطارۃ جائز ہے اور اگر اباحت نکرے تو جب تک ایداع وغیرہ کے ساتھ تضییع سے احتراز ہو سکے تو ایداع وغیرہ لازم ہے البتہ اگر ایداع وغیرہ بھی نہو سکے اور نہ اس کے سامنے ایسے آدمی حلال موجود ہوں جن کو اباحت کر سکے تو پھر اطارۃ مطلقاً جائز ہے قال فی غنیۃ الناسک فان کان الصید فی یدہ حقیقۃ وجب ارسالہ لکن لا بان یسیبہ لان تسیب الدابۃ حرام لانہ تضییع للملک بل یطلقہ علی وجہ لا یضیع بان یخلیہ فی بیتہ او یودعہ عند حلال او یرسلہ فی قفص معہ فان لم یتیسر یسیبہ للضرورۃ لان ارسالہ مامور بہ اھ (ص۱۵۶) اور صورۃ ثالثہ کا حکم یہ ہے کہ جب صید ہاتھ میں نہیں بلکہ قفص میں ہے تو صحیح قول میں اس کے ذمہ اس کا چھوڑنا واجب نہیں اور اگر قفص وغیرہ میں مرجائے تو اس کے ذمہ ضمان نہ ہوگا اور ایک ضعیف قول یہ ہے کہ اس وقت بھی ارسال لازم ہے قال فی اللباب وشرحہ وان کان الصید فی بیتہ وکذا اذا کان فی قفصہ حال احرامہ لا فی یدہ لا یجب ارسالہ حتی لو لم یرسلہ فمات لا یضمن ای علی الصحیح وقیل لو کان القفص فی یدہ یجب ارسالہ اھ (ص ۲۰۲) وکذا فی الدر مع الشامیۃ وزاد الشامی وقیل ان کان القفص فی یدہ یلزمہ ارسالہ لکن علی وجہ لا یضیع ھدایۃ

وھو ضعیف کما فی النھر قال ح والظاھر ان مثلہ ما اذا کان الحبل المشدود فی رقبۃ الصید فی یدہ اور صورت رابعہ وخامسہ کا حکم یہ ہے کہ شکار تو ان دونوں صورتوں میں بھی صاحب ید کی ملک ہے۔ لیکن صورت رابعہ میں جبکہ شکار حقیقۃً اس کے ہاتھ میں ہو حرم میں اُس کو چھوڑ دینا واجب ہے۔ اور صورت خامسہ میں جبکہ شکار کو قفص میں لیکر داخل حرم ہوا اس کا ارسال واجب نہیں قال فی البحر تحت قول الکنز ومن دخل الحرم بصید ارسلہ ای فعلیہ ان یطلقہ لانہ لما حصل فی الحرم وجب ترک التعرض لحرمۃ الحرم اذ ھو صار من صید الحرم فاستحق الامن اراد بہ ما اذا دخل وھو ممسک لہ بیدہ الجارحۃ لانہ سیصرح بانہ اذا احرم وفی بیتہ او فی قفصہ صید لا یرسلہ فکذلک اذا دخل الحرم ومعہ صید فی قفصہ لا فی یدہ لا یرسلہ لانہ لا فرق بینھما فالحاصل ان من احرم وفی یدہ صید حقیقۃً او دخل الحرم کذلک وجب ارسالہ وان کان فی بیتہ او قفصہ لا یجب ارسالہ فیھما فتنبہ بمسئلۃ دخول الحرم صاحل مسئلۃ الرم وبمسئلۃ المحرم آتیۃ علی مسئلۃ الحرم ولیس المراد من ارسالہ تسییبہ لان تسییب الدابۃ حرام بل یطلقہ علی وجہ لا یضیع ولا یخرج عن ملکہ بھذا الارسال حتی لو خرج الی الحل فلہ ان یمسکہ ولو اخذہ انسان یستردہ اھ (ص ۴۱ ج ۳)

اس سے معلوم ہوا جو حکم محرم کے ہاتھ میں حقیقۃً شکار کے ہونے کا ہے وہی حکم داخل حرم کے ہاتھ میں ہونے کا ہے اور جو حکم محرم کے ہاتھ میں حکماً یعنی قفص میں شکار ہونے کا ہے وہی حکم داخل حرم کے پاس قفص میں شکار کے ہونے کا ہے۔

پس غنیہ کی عبارت تحقیق بحر کے موافق ہے اور حضرت گنگوہی قدس سرہ نے زبدہ میں جو فرق کیا ہے کہ حرم میں داخل ہونے والے کے ذمہ مطلقاً ارسال کو لازم فرمایا ہے خواہ حقیقۃً اس کے ہاتھ میں ہو یا قفص میں ہو عبارت بحر اس کی نفی کر رہی ہے اور غالباً مولانا کے اس قول کا منشأ لباب وشرح لباب وغیرہ کا اطلاق ہے لباب میں ہے ولو ادخل محرم او حلال

[1] اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا منشا وہ روایت ضعیف ہے جس کو شامی نے ہدایہ سے نقل کیا (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

صید الحل الحرم صار حکمہ حکم صید الحرم ای فعلیہ ارسالہ اھ اور شرح لباب ہے واما ان دخل الصید فی الحرم من الحل صار حکمہ حکم صید الحرم سواءً کان مملوکاً ام لا وسواءً دخل بنفسہ او ادخلہ غیرہ حلال او محرم ولا یدخل منہ شیئ فی الحرم حیاً الا وجب ارسالہ اھ (ص ۲۰۶ و ۲۰۷) لیکن جب بحر سے ان اطلاقات کا اُس صورت کے ساتھ مقید ہونا[1] معلوم ہو گیا جب صید حقیقۃً داخل کرنے والے کے ہاتھ میں ہو تو اس تصریح کے بعد اطلاق پر عمل نہ ہوگا اور شامی نے حاشیہ بحر میں اس مقام پر کچھ کلام نہیں کیا نہ رد المحتار میں اس کے خلاف کچھ کہا البتہ رد المحتار کی بعض عبارات سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ داخل حرم کے ذمہ مطلقاً ارسال لازم ہے کیونکہ اس میں محرم کے متعلق تفصیل کر کے لکھا ہے وقد علمت مما قدمناہ ان ھذا کلہ فیما لو اخذ صیدا ثم احرم اما لو دخل بہ الحرم فانہ یلزمہ ارسالہ بمعنی اطارتہ وانہ لیس لہ ایداعہ لانہ صار من صید الحرم اھ (ص ۳۶۱ ج ۲) لیکن رد المحتار ہی کی دوسری عبارت سے اس حکم کا اُس صورت کے ساتھ متقید ہونا معلوم ہوتا ہے جبکہ شکار حقیقۃً ہاتھ میں ہو ونصہ ثم اعلم الذی یظھر من کلامھم ان ھذین القولین (فی تفسیر الارسال) فی المسئلۃ الثانیۃ فقط وھی من احرم فی الحل وفی یدہ صید اما الاولیٰ وھی لو دخل الحرم وفی یدہ صید فالواجب علیہ الارسال بمعنی الاطارۃ (ای لا بمعنی الایداع) لقولہ فی الھدایۃ علیہ ان یرسلہ فیہ ای فی الحرم وتعلیلہ لہ بانہ لما حصل فی الحرم وجب ترک التعرض لہ لحرمۃ الحرم وصار من صید الحرم اھ (ص ۳۶۰ ج ۲) اس میں صاف تصریح ہے کہ داخل حرم پر

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ سے) ہے کیونکہ وہ روایت محرم کے بارہ میں ہے اگر اس کی وجہ سے دخول حرم کی صورت میں ارسال کو مطلقاً واجب کہا جائے گا تو محرم کے مسئلہ میں بھی اطلاق ارسال ماننا پڑے گا۔ حالانکہ مولانا محرم اور داخل حرم کے حکم میں فرق کر رہے ہیں۔ ۱۲ منہ

[1] ویؤیدہ ما فی الادب المفرد للبخاری ان الصحابۃ کانوا یدخلون مکۃ بصید فی اقفاصھا۔

ارسال جب واجب ہے کہ شکار اس کے ہاتھ میں ہو وصرح بہ فی الغرر شرح الدر حیث قال حلال دخل الحرم بصید فی یدہ ای یدہ الحقیقیۃ التی ھی الجارحۃ حتی اذا کان فی رحلہ او قفصہ لایجب علیہ الارسال ذکرہ تاج الشریعۃ ارسلہ ای علیہ ان یرسلہ اھ (ص ۲۵۲ ج ۱) وھذا عین ما صرح بہ صاحب البحر واما ما فی التحریر المختار علی قول الدر ولو القفص فی یدہ بدلیل اخذ المصحف الخ نازع الشیخ محمد طاہر بان قیاس القفص علی الغلاف قیاس مع الفارق لان المامور بہ فی المصحف عدم المس فاذا اخذہ بغلافہ لایکون ماسًا والمامور بہ فی الصید عدم التعرض ومن اخذہ بیدہ حال کونہ فی القفص فھو متعرض للصید لامحالۃ واعتمد ان من دخل الحرم حلالاً او محرمًا وفی یدہ او قفص معہ او فی ید خادم معہ صید الآن وجب ارسالہ الصید بعد دخولہ فی الحرم بای وجہ کان لانہ صار صید الحرم واستند لذلک بکثیر من عبارات المؤلفین فانظرہ اھ (ص ۶۷ ج ۱) ففیہ اوّلاً انہ کلام علی الدلیل ولو تم للزم کون المحرم متعرضًا للصید ایضًا حال کونہ فی القفص فیجب علیہ ارسالہ والمتون قاطبۃً علی خلافہ فی مسئلۃ المحرم فان قال الشیخ طاہر بالفرق فی المحرم وفی من دخل الحرم فعلیہ البیان وان سوی بینھما فقد مر عن النھر تضعیف القول بوجوب الارسال علی المحرم اذا کان الصید معہ فی القفص مع ان الکلام فی الدلیل لایستلزم الکلام فی المسئلۃ لاحتمال بناءھا علی دلیل اٰخر فلنا ان نقول ان القفص مثل البیت فکما یجوز المشی علی بیت فیہ المصحف ولیس ذلک کالمشی فوقہ بعینہ فکذلک الصید فی القفص لیس اٰخذہ متعرضًا بل ھو قابض علی بیتہ کما اذا دخل الحرم وفی بیتہ صید۔ ہاں ایک فرق البتہ ہے کہ محرم کے ہاتھ میں شکار ہو تو اس کے لئے بعد احرام کے ارسال دونوں طرح جائز ہے خواہ بطریق اطارۃ خواہ بطریق ایداع اور داخل حرم کے ہاتھ میں حقیقۃً ہو تو اس کو ایداع جائز نہیں بلکہ ارسال بطریق اطارۃ واجب ہے پس غنیہ کا یہ قول ھذا اذا احرم واما اذا دخل بہ الحرم فیرسلہ فی تفص معہ فان لم یتیہ یسیبہ فی الحرم اھ (ص ۱۵۷)

تحقیق شامی کے خلاف ہے اور قواعد کے بھی خلاف ہے کیونکہ جب وہ ہاتھ میں لیکر داخل حرم ہو تو وہ صید صید حرم ہوگیا جس سے عدم تعرض واجب ہے اور اس کو قفص میں بند کرنا بھی تعرض ہے ہاں اسکا یہ مطلب لیا جائے کہ دخول حرم سے پہلے اُس کو قفص میں بند کردے اور قفص میں لیکر داخل حرم ہو اور دخل بہ الحرم کو ارادہ دخول پر محمول کیا جائے تو یہ کلام صحیح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت احرام میں اعذار متعددہ کی وجہ سے مختلف سِلے ہوئے کپڑے پہننے سے کفارہ واحدہ واجب ہوگا یا متعددہ

تنبیہ :۔ ایک سوال وجواب طویل الذیل مولوی خیر محمد صاحب ساکن گھوٹکی ضلع سکھر ملک سندھ نے یہاں بھیجا جس میں جنایت فی الحج کے ایک مسئلہ میں بعض اہل فتاویٰ سے ان کو اختلاف تھا یہاں سے انہوں نے محاکمہ چاہا اس لئے صورت مسئولہ کو منقح کرکے اور طرفین کے دلائل بیان کرکے اخیر میں محاکمہ لکھا جائے گا فقط

تحریر محل النزاع

محل نزاع یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو ایک وقت میں دو یا زیادہ اعضاء میں لُبس مخیط کی ضرورت لاحق ہو اور نوع ضرورت مختلف ہو مثلاً عمامہ درد سر کی وجہ سے باندھے اور قمیص بوجہ سردی کے پہنے تو اس صورت میں کفارہ مخیرہ واحد ہوگا یا متعدد ایک صاحب اتحاد کفارہ کے قائل ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ تعدد سبب جو فقہاء کے نزدیک موجب تعدد کفارہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تعدد ضرورت وعدم ضرورت کی وجہ سے ہو یا ایک ضرورت زائل ہوجانے کے بعد دوسری ضرورت پیدا ہو اور اگر تعدد ضرورت وعدم ضرورت سے ناشی نہ ہو بلکہ ضرورت ہی سے تعدد ہو گو نوع ضرورت ہر فرد میں جدا ہو تو یہ سب فعل واحد شمار ہوگا اور جزا واحد لازم ہوگی لما فی المناسک فان تعدد السبب کما اذا اضطر الی لبس ثوب فلبس ثوبین فان لبسھما علی موضع الضرورۃ ای بعینھا او ان یحتاج الی قمیص فلبس قمیصین او قمیصًا وجُبّۃً او یحتاج الی قلنسوۃ فلبسھا مع العمامۃ فعلیہ کفارۃ واحدۃ لان محل الجنایۃ متحد فلا نظر الی فعل المتعدد (یتخیر فیھا (ای فی الکفارۃ) لوقوع اثر الجنایۃ للضرورۃ ما صرح بہ فی المحیط وکذا اذا لبسھما علی موضعین لضرورۃ بھما فی مجلس واحد بان لبس عمامۃ وخفًا بعذر

فیہما فعلیہ کفارۃ واحدۃ وھی کفارۃ الضرورۃ لان اللبس علی وجہ واحد فیجب کفارۃ واحدۃ وان لبسہما علی موضعین مختلفین موضع الضرورۃ وغیر الضرورۃ کما اذا اضطر الی لبس العمامۃ فلبسہا مع قمیص مثلاً او لبس قمیصا للضرورۃ وخفین من غیر ضرورۃ فعلیہ کفارتان کفارۃ الضرورۃ یتخیر فیہا وکفارۃ الاختیار لا یتخیر فیہا ای بل یتحتم الکفارۃ فیہا اھ الی ان قال ناقلا عن الکرمانی لان ھذا اللبس غیر اللبس الاول ای لاختلاف الوصفین کونہما بعذر وبغیرہ فکانا کشیئین متغایرین سواء فی مجلس او مجلسین اھ (ص ۱۶۵) ویؤیدہ ایضاً ما فی البدائع اذا کان بہ جرح او قرح اضطر الی مداواتہ بالطیب انہ مادام باقیا فعلیہ کفارۃ واحدۃ فان تکرر علیہ الدواء لان الضرورۃ باقیۃ فوقع الکل علی وجہ واحد ولو برأ ذلک القرح او الجرح وحدث قرح آخر او جراحۃ اخری ندا واھا بالطیب یلزمہ کفارۃ اخری لان الضرورۃ قد زالت فوقع الثانی علی غیر الوجہ الاول ولو جرح لہ جرح او اصابہ قرح وھو یداویہ بالطیب فخرجت قرحۃ اخری او اصابہ جرح آخر والاول علی حالہ لم یبرأ فداوی الثانی فعلیہ کفارۃ واحدۃ لان الاول لم یبرأ فالضرورۃ باقیۃ فالمداواۃ الثانیۃ حصلت علی الجہۃ التی حصلت علیہ الاولیٰ فیکفیہ کفارۃ واحدۃ اھ (ص ۱۸۸ و ۱۸۹ ج ۲)

اس میں ایک زخم کے اچھا ہونے کے بعد دوسرا زخم یا دمل ہونے کو تو سبب آخر شمار کیا ہے اور ایک زخم یا دمل کے ساتھ دوسرا زخم یا دمل دوسرے موقع پر ہو جائے تو اس کو سبب آخر شمار نہیں کیا بلکہ سب کو جہت واحد میں داخل کیا ہے اور علت یہ بیان کی ہے۔ لان الاول لم یبرأ فالضرورۃ باقیۃ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بقاء عذر اول کے ساتھ دوسرے اعضاء میں عذر کا پیدا ہونا اور اس کی وجہ سے عضو ثانی میں محظور کا ارتکاب کرنا جنایت اُخریٰ نہیں بلکہ جنایت اولیٰ ہی میں متداخل ہے لبقاء الضرورۃ ہاں عضو ثانی میں ارتکاب محظور بلا ضرورت ہو یا بعد زوال ضرورۃ اولیٰ ہو تو کفارہ ثانیہ لازم ہوگا۔

یہ تو ایک فریق کے دلائل تھے دوسرا فریق صورت مذکورہ میں تعدد کفارہ کا قائل ہے

اور وہ مناسک کی اس عبارت سے استدلال کرتے ہیں قد یتعدد الجزاء ای کفارۃ المحظور فی لبس واحد بامور ای خمسۃ: الاول التکفیر بین اللبسین والثانی تعدد السبب ای بان لبس فی موضعین احدہما العذر والآخر لغیر عذر اولعذر آخر[عہ] اھ (ص ۱۶۷)

فریق اول کہتا ہے کہ اس عبارت میں اولعذر آخر کا مطلب اولحدوث عذر آخر بعد زوال الاول ہے نہ یہ کہ وقت واحد میں دو موضع میں الگ الگ عذر ہو تو ہر عضو میں لبس مخیط سے کفارہ متعدد ہو کیونکہ یہ خلاف تصریحات سابقہ ہے اور دلیل اس تاویل کی یہ ہے کہ صاحب لُباب نے جو آگے چل کر کہا ہے والرابع حدوث عذر آخر تو شارح نے اس کی شرح میں کہا ہے قد شملہ ما تقدم فتدبر اور ما تقدم اگر اس کو شامل ہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ سبب ثانی میں اولعذر آخر کو حدوث عذر آخر بعد زوال اول پر محمول کیا جاوے۔

احقر کہتا ہے کہ میرے نزدیک فریق اول کے دلائل قوی ہیں اور وہی قول صحیح ہے، واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ۲۶ رمضان ۴۴ھ۔

ھذا التحقیق کاف شاف۔ اشرف علی ۲۷ رمضان ۴۴ھ

رفض احرام حج سے ایک دم اور ایک حج لازم ہوگا یا دو دم اور دو حج

سوال (۳) یلملم سے احرام حج کا باندھا پھر جب جدہ میں آیا تو احرام توڑ کر کپڑے وغیرہ پہنکر مدینہ طیبہ چلا گیا پھر جب مدینہ طیبہ سے واپس ہوا تو پھر ذوالحلیفہ سے دوبارہ حج کا احرام باندھا تو آیا اس صورت میں کَے حج اور کَے دم لازم آتے ہیں یہاں کے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس پر ۲ حج اور ۲ دم اور ایک عمرہ لازم ہوگا دو دم لازم ہونے میں وہ فرماتے ہیں کہ ایک دم تو اس وقت لازم ہوا جب اس نے رفض کر کے کپڑے پہنے اور دوسرا دم اس وقت لازم ہوا جب دوسرے حج کا احرام باندھ کر اس کے افعال شروع کئے کیونکہ پہلے رفض کے وقت فقط کپڑے پہننے سے وہ اچھی طرح احرام سے باہر نہیں آیا تھا اب جب اس ثانی احرام سے حج کے افعال شروع کئے تو اب اس کا رفض متحقق ہوا دوسرا

[عہ] عطف علی قولہ فی موضعین تحت قولہ لبس ومعناہ بان لبس فی موضعین اولبس لعذر آخر بعد زوال الاول) سواء کان اللبس فی موضع واحد او موضعین ۱۲ ظ

دم اب لازم ہوا۔ اس میں جو تحقیق ہو ارقام فرمادیں ؟

الجواب : اقول و باللہ التوفیق ۔ صورت مسئولہ میں اس شخص پر جس نے جدہ میں رفض احرام حج کیا اور مدینہ چلا گیا اور واپسی میں پھر احرام حج باندھا دو حج اور دو دم لازم نہ آئیں گے بلکہ احرام ثانی عین احرام اول ہے کیونکہ اس شخص نے احرام ثانی سے حج آخر کی نیت نہیں کی بلکہ اسی حج کی نیت کر رہا ہے جو احرام اول سے اس پر لازم ہوا تھا اس لئے احرام ثانی سے اس پر دم آخر بھی لازم نہ آئے گا بلکہ صرف ایک دم لازم آئے گا۔ قال فی اللباب مع شرحہ للقاری۔ ولو اھل الفائتُ بحجۃ اُخریٰ قبل الفراغ من الاولیٰ فان کان ینوی بہ قضاء الفائتۃ فھی بعینھا ولا یلزم بھذا الاھلال شیٔ ای سوی التی ھو فیھا فیتحلل بالطواف والسعی کما لو لم یھل بہ ونیتہٗ بالثانیۃ لغو لا اعتبار لھا وعلیہ قضاء الاولیٰ لا غیر لکون الثانیۃ لغواً وان نویٰ بہ ای باھلالہ حجۃ اخریٰ ای نفسھا ای الحجہ ویحل بافعال العمرۃ لما تقدم مع ما فیہ من الخلاف[1] وعلیہ قضاء حجتین وعمرۃ ودمٌ ای عند ابی حنیفۃ خلافا لھما لما تقدم عنھما اھ (۲۴۵) اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ احرام ثانی سے اگر قضاء اولیٰ یا عود الی الاولیٰ کی نیت ہو تو اس سے بالاتفاق حج ثانی لازم نہیں آتا۔ بلکہ حج ثانی صرف امام صاحب کے نزدیک جب لازم آتا ہے کہ احرام اول کو باقی سمجھ کر اس کے علاوہ حج آخر کی نیت سے احرام باندھے۔ اور صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ جو

---

[1] ای بین الشیخین ومحمدٍ فانہٗ اذا اھل بحجتین معاً او بحجۃٍ ثم حجۃ مقترنتین لزمہ جمیع ذلک غیر انہ یرتفض احدھما فی المعیۃ والثانیۃ فی التعاقب عندھما وعند محمدٍ یلزمہ احدھما فی المعیۃ والاولیٰ فقط فی التعاقب وثمرۃ الخلاف تظھر فیما اذا جنی قبل السیر او الشروع فی الاعمال فعلیہ دمان عند ابی حنیفۃ للجنایۃ علی الاحرامین ودمٌ واحدٌ عند محمدٍ لعدم انعقاد احدھما وکذا عند ابی یوسف لان الثانی وان انعقد ولکنہ ارتفض بلا مکث کما فرغ من قولہ لبیک بحجتین کما فی المناسک ایضاً (ص ۱۵۸) مؤلف

⁂⁂⁂

جاہل جدہ سے رفض احرام کر کے واپسی از مدینہ کے وقت احرام ثانی کی نیت کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ احرام اول رفض سے مرتفض ہو گیا پھر اسی کی قضا کی نیت سے دوسرا احرام باندھتا ہے کما ھو ظاھر پس اس پر دو حج کا لازم کرنا صحیح نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ احرام ثانی عین احرام اول ہے۔ رہا دم سو ہمارے نزدیک اس پر ایک دم لازم آئے گا قال الشامی عن اللباب واعلم ان المحرم اذا نویٰ رفض الاحرام فجعل یصنع ما یصنعہ الحلال من لبس الثیاب والطیب والحلق والجماع وقتل الصید فانہ لا یخرج بذلک من الاحرام وعلیہ ان یعود کما کان محرما ویجب دمٌ واحدٌ لجمیع ما ارتکب ولو کل المحظورات وانما یتعدد الجزاء بتعدد الجنایات اذا لم ینو الرفض اھ جلد ثانی باب الجنایات ص ۲۰۲ دھلی

اور بعض علماء نے جو وجوب دمین کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ احرام ثانی سے رفض متحقق ہو گیا لہٰذا دوسرا دم تحقق رفض کی وجہ سے لازم آئے گا الخ یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے یہاں احرام ثانی سے تحقق رفض ہی نہیں ہوا کما تقدم بلکہ ثانی عین اول ہے۔ دوسرے تحقق رفض سے دم ثانی کا واجب کرنا یہ نہ معلوم کہاں سے لکھا گیا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ نیت رفض سے ایک دم ہوا اور تحقق رفض سے دم آخر فان قام دلیلٌ صریح ووجہٌ صحیح فلا م مسلم والا فلا۔ ہاں اگر یہاں تحقق رفض ہو جاتا تو وجوب دمین کی یہ علت ہو سکتی تھی کہ ایک دم رفض کی وجہ سے ہو دوسرا جمع بین النسکین کی وجہ سے کما صرح بہ فی اللباب مع شرحہ عن البحر (ص ۱۱۲) وفیہ اختلاف الروایتین کما فصلہ فیہ ھذا۔ واللہ اعلم ۔ ۱۰ شوال سنہ ۴۴ھ

احرام میں ازار بدلنا جائز ہے

سوال ( ) زید کو عارضہ فتق کا ہے کلوخ لینے سے مجبور رہتا ہے اور اکثر خون بواسیر کا کپڑے میں ٹپک جاتا ہے اور وہار پیشاب کی بعد طہارت کے کپڑے پر گر جاتا ہے جس سے وہ کپڑا ہمیشہ نجس ہو جاتا ہے چنانچہ اس کے دفعیہ و رفع شک کے لئے اس نے ہمیشہ یہ بات اختیار کی ہے کہ نماز کے وقت دوسرا تہمند باندھ کر نماز پڑھتا ہے اور بعد نماز اس تہمند کو اتار کر سابق تہمند پہن لیتا ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب کہ احرام حج کا تہمند باندھ چکا ہو ایسی حالت میں بوقت نماز دوسرے اس تہمند کو باندھ سکتا ہے یا نہیں یعنی تبدیل کر سکتا ہے یا اسی نجس تہمند سے نماز پڑھتا رہے۔

الجواب : احرام میں یہ ضرور نہیں کہ ایک ہی چادر اور ایک ہی لنگی اول سے آخر

تک بدن پر رہے بلکہ چادر اور لنگی کو بدلتے رہنا جائز ہے پس صورت مسؤلہ میں سائل لنگی کو بدل سکتا ہے۔

احرام میں ہمیانی باندھنے کا حکم

سوال (۵) ڈوریا یعنی تھیلے سلے ہوئے جو بغرض حفاظت نوٹ روپیہ وغیرہ کمر میں باندھا جاتا ہے آیا کمر میں باندھ سکتے ہیں یا نہیں علاوہ اس کے فتق کی کمانی جو عموماً چمڑہ اور تاگے سے بنی ہوتی ہے حالت احرام میں کمر میں باندھ سکتے ہیں ؟ کیونکہ عارضہ موجود ہے۔

الجواب ؛ نوٹ اور روپیہ کی حفاظت کے لئے کمر سے تھیلی باندھنا اور عارضہ فتق کی وجہ سے پیٹی باندھنا بھی جائز ہے۔ یہ اس مخیط میں داخل نہیں جس کی احرام میں ممانعت ہے۔ احرام میں وہ مخیط ممنوع ہے جو جسم کی وضع و تراش پر سلا ہوا ہو، فقط - ۱۲ شعبان ۴۵ھ

محظورات احرام کا ارتکاب بلا عذر کرے اور دم و صدقہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو روزے رکھنا کافی ہے یا نہیں

سوال (۶) محرم اگر محظوراتِ احرام کا ارتکاب بلا عذر عمداً کرے اور دم و صدقہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو اس کو دم کے عوض روزہ رکھنا کافی ہے یا نہیں ؟

الجواب ؛ روزہ رکھنا بھی اس حالت میں کافی ہے جب کہ وہ اراقہ دم و ادا صدقہ سے عاجز ہو وقد ذکر العلامة زین الدین ابن نجیم فی البحر والملا رحمة اللہ السندی فی منسکہ ان المحرم اذا ارتکب المحظور علی وجہ الکمال من غیر عذر وضرورة فعلیہ الدم ولایجزئہ الصوم عند عجزہ عن الدم قلت بل المقرر المنصوص علیہ فی کثیر من کتب المذہب المعتبرة اجزاء الصوم عند العجز عن الدم قال فی الاسرار للشیخ الاجل الامام القاضی ابی زید الدبوسی قال علماءنا فی کفارة الحلق واللبس والتطیب والقص اذا وجبت عن عذر کان المکفر فیہا بالخیار بین النسک والصدقة والصیام و اذا وجبت عن عمدٍ وجبت علی ترتیب الھدی اولا فان لم یجد فالصدقة فان لم یجد فالصیام وقال یتخیر المکفر عن الحلق فی الحالین . ویترتب علیہ الوجوب عن اللبس والطیب فی الحالین انتہی وفی المحیط للبرہانی فی نوع اللبس من الفصل الخامس وان لبس ما لا یحل لبسہ من غیر

عہ نقل لنا ھذہ العبارات الفقھیہ صدیقنا المولوی شیر محمد السندی عن رسالة المخدوم ھاشم السندی فی المناسک فجزاہ اللہ خیر الجزاء ۔ ۱۲ ظف

۱۳

ضرورة اراق لذلک دماً وان لم یجد صام ثلثة ایام ثم ذکر بعدہ فی نوع الحلق وفی الاصل حلق المحرم رأسہ بغیر عذر اراق دما وان لم یجد صام ثلثة ایام وان فعل ذلک بعذر یتخیر بین الکفارات الثلثة علی ما مر انتہی وذکر فی الذخیرة ایضاً مثل ما ذکرہ فی نوع اللبس وذکر فی الظھیریة ومنسک الفارسی مثلہ وفی المبتغی ویلبس ما لا یحل لبسہ بغیر ضرورة یلزمہ دم و بفقدہ صوم ثلثة ایام انتہی . فھذہ نصوص صریحة فی اجزاء الصوم عند العجز عن الدم واما تضعیف ابن نجیم کلام الظھیریة بما نقلہ عن الامام الاسبیجابی فلیس بصحیح اذ لیس فی کلامہ صریحاً ما یخالفہ ما فی الظھیریة بل ھو موافق لھا علی ما نبینہ قال الاسبیجابی فی شرح المختصر للطحاوی فی باب ما یجتنبہ المحرم فان لبس المخیط یوماً کاملاً من غیر ضرورة فعلیہ لذلک دم لا یجزئہ غیرہ الی ان قال وان فعل ذلک لعلة او ضرورة فعلیہ ای الکفارات شاء ذکر مثلہ فی الحلق ایضاً . فنقول مثل ھذہ العبارات موجودة فی غیرھا کالکافی للحاکم الشھید والمبسوط للسرخسی وغایة البیان شرح الھدایة والبدائع والتجرید لابی الفضل الکرمانی حیث قالوا واما اذا فعل ذلک من غیر ضرورة یتعین فیہ الدم ولا یجزئہ الصوم انتہی . فقول الاسبیجابی وغیرہ فعلیہ لذلک دم لا یجزئہ غیرہ کلام مطلق قابل للتقیید بما اذا کان قادراً وما فی الظھیریة والاسرار والمحیط وغیرھا صریح فی جواز الصوم عند العجز وقد تقرر فی کتب الاصول ان المطلق یحمل علی المقید فی الادلة فیما اذا اتحد الحکم والحادثة فکیف فی الروایات ومما یدل ایضاً علی ان الکلام للامام الاسبیجابی ومن وافقہ فی الاطلاق محمول علی ما اذا کان قادراً انھم قالوا واذا فعل ذلک بعذر فعلیہ ای الکفارات الثلاث شاء ولا شبھة فی ان التخییر بین الکفارات الثلاثة انما یتصور من الغنی القادر اما الفقیر العاجز فیتعین فی حقہ الصوم لانہ لا قدرة لہ علی غیرہ وجھد المقل دموعہ فان قلت قدمت عن الاسرار ان الکفارات اذا وجبت عن عمدٍ وجبت علی ترتیب الھدی ثم الصدقة

ثم الصیام والذی تقدم عن المحیط والظهیریة وغیرها وجوب الدم اولا فان لم یجد فصیام ولم یذکر والصدقة فکیف التوفیق بین الکلامین قلتُ: الظاهر ان الغالب ان من لم یجد الدم لا یجد الصدقة فقالوا بجواز الصوم عند عدم الدم بناء علی الغالب والذی فی الاسرار بناء علی الامکان وحقیقة الامر فلا تدافع اھ نقلتها من رسالة السید محمد امین بن حسن میرغنی الحسینی المکی الحنفی من عینه . قاله المخدوم هاشم السندی الفقیه فی باضه معاصری العلامة ابن عابدین الشامی وله باع طویل ونظر واسع فی الفقه هذا وقال العلامة ابن عابدین فی حاشیة البحر علی قوله وبهذا اظهر ضعف ما قدمناه عن الظهیریة من انه ان لم یقدر علی الدم صام ثلثة ایام ولم ارہ لغیرها اھ مانصه وفی حاشیة المدنی بعد ذکرہ کلام المؤلف ونقل المنلا رحمة الله فی منسکه الکبیر نحوه ونقل عن الفارسی والبحر العمیق نحو ما ذکرہ فی الظهیریة علی وجه الاعتراض علیهما قال شیخنا مولانا السید محمد امین میرغنی بعد نقل عبارتهما فی رسالة له قلت بل المقرر المنصوص علیه فی کثیر من کتب المذهب المعتبرة اجزاء الصوم عند العجز عن الدم کما نملیه علیك وسرد الاقوال المویدة لکلامه فراجعها ان شئت اھ (ص $\frac{۱۳}{۲۶}$) ۷ر شوال ۱۳۴۶ھ

سوال (۷) عورت حالت احرام میں چہرہ کس چیز سے ڈھانپے؟ بمبئی میں جو کھجور کا پنکھا چہرہ ڈھانپنے کے لئے فروخت ہوتا ہے اس کو مولانا موصوف نے ناکافی لکھا ہے۔

عورت حالت احرام میں چہرہ کس چیز سے ڈھانپے

الجواب: ہاں وہ پنکھا تو ناکافی ہے بہتر صورت یہ ہے کہ چھجے دار ٹوپی سر پر رکھ کر اوپر سے برقعہ اوڑھ لے اس صورت میں چہرہ پر کپڑا نہ پڑے گا۔

سوال (۸) سفر حج کے زمانہ میں عورت کو جہاز پر چڑھنے اترنے کی حالت میں اس اندیشہ سے کہ زنانہ جوتا ازدحام کی وجہ سے کسی کے پیر سے دب کر عورت گر جائے گی مردانہ جوتا پہننا جائز ہے یا نہیں؟

بحالت احرام عورت کو مردانہ جوتا پہننا کیسا ہے

الجواب: یہ اندیشہ محض وہم ہے ہزارہا مستورات زنانہ جوتا پہن کر حج کر چکی ہیں کوئی بھی نہیں گری۔

سوال (۹) زید بارادۂ حج جا رہا ہے اور قصد اس کا یہ ہے کہ میں اول جدہ سے مدینہ شریف جاؤں تو اس حالت میں اس کو میقات یلملم پر احرام باندھنا لازم ہوگا یا نہیں؟

میقات سے مکہ جانیکا ارادہ نہ ہو تو میقات سے احرام باندھنا ضروری نہیں

الجواب: نہیں۔ میقات سے احرام باندھنا جب واجب ہے کہ میقات سے مکہ جانیکا ارادہ ہو۔

سوال (۱۰) محرم چشمہ لگا سکتا ہے یا نہیں؟

محرم عینک لگا سکتا ہے یا نہیں

الجواب: لگا سکتا ہے۔

فصل فی القران والتمتع

سوال (۱) بخدمت جناب مولانا الحاج مولوی محمد ظفر احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اب ذیل مسئلہ کثرت الوقوع درپیش ہے ان کو اچھی طرح واضح کر کے ارقام فرمادیں تو درج کیا جاوے۔ مسئلہ آفاقی اپنے وطن سے اس سال کے حج کرنے کی غرض سے اشہر الحج میں نکلا اور وطن سے چلتے وقت یا میقات سے یہ قصد کیا کہ حد حرم سے باہر باہر مثلاً جدہ سے رابغ یا ینبوع سے ہوتے ہوئے پہلے مدینہ طیبہ کی زیارۃ سے مشرف ہو کر بعد میں آکر حج کریں گے اس لئے میقات سے احرام نہ باندھا پس جب حل میں پہنچا جیسے جدہ میں آیا تو وہاں سے مدینہ طیبہ کا راستہ بند ہو گیا اس لئے مکہ مکرمہ کو جانا پڑا۔ اب جدہ سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ میں عمرہ بجا لایا گیا پھر مدینہ چلا گیا اب جو مدینہ سے واپسی ہوگی تو یہ شخص ذوالحلیفہ سے قران کر سکتا ہے یا نہ کیونکہ جب یہ جدہ یعنی حِل سے اشہر حج میں عمرہ کا احرام باندھ کر آیا تو یہ حلی کے حکم میں ہے گویا اب یہ مکی ہے اب اشہر حج میں باہر میقات سے گیا تو اب وہ قران نہیں کر سکتا اگر کرے گا تو دم اسارت لازم ہوگا۔ اور اگر وہاں سے فقط حج کرے تو متمتع بھی نہ ہوگا کیونکہ عمرہ اس کا آفاقی نہیں ہے اور وہاں سے پھر تمتع کرے یعنی عمرہ کا احرام باندھے تو بھی منع ہے کیونکہ مکی کے حکم میں ہے اس مسئلہ کو میں تو یہی سمجھا ہوں مناسک متوسط اور غنیۃ الناسک میں یہ قواعد ہیں یہ مسئلہ تو غنیۃ الناسک میں صریح ہے کہ جو حاجی آفاقی اشہر الحج میں آکر عمرہ بجا لاوے پھر مدینہ طیبہ کو گیا اور وہاں سے قران کر کے آوے تو دم اسارت لازم ہے سابق صورت بھی ایسی ہی ہے تحقیق

آفاقی جدہ سے احرام باندھ کر مکہ جا کر عمرہ کر کے مدینہ چلا جائے تو واپسی میں قران یا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں

سے جواب عنایت ہو اکثر حاجی ایسا کرتے ہیں۔

الجواب: اقول وباللہ التوفیق قال فی شرح اللباب فی باب المواقیت وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر اھ (ص ۳۰) وفی غنیۃ الناسک فشرائط صحتہ (ای التمتع) ان یکون من اھل الآفاق والعبرۃ للتوطن (ص ۱۱۳) وفیہ ایضاً ولا یشترط ان یکون احرام العمرۃ من المیقات ولا احرام الحج من الحرم بل ھو من الواجبات اھ وفیہ ایضاً الخامس عدم الالمام الصحیح وھو ان یرجع الی اھلہ بعد العمرۃ حلالاً ولو عاد الی غیر اھلہ الی موضع لاھلہ التمتع والقران اتخذھا داراً اولا توطن لھا اولا ثم حج من عامہ یکون متمتعاً عندہ لا عندھما ولو خرج من الحرم ولم یجاوز المیقات وحج من عامہ یکون متمتعاً بالاتفاق اھ ص ۱۱۴ وفیہ ایضاً وھو متمتع ان حج من عامہ وکذا لو خرج الی الآفاق لحاجۃ فقرن لا یکون قارناً عند ابی حنیفۃ وعلیہ رفض احدھما ولا یبطل تمتعہ لان الاصل عندہ ان الخروج فی اشھر الحج الی غیر اھلہ کالاقامۃ بمکۃ فکانہ لم یخرج وقرن من مکۃ واما عندھما فکالرجوع الی اھلہ فاذا خرج بطل تمتعہ ثم اذا قرن من المیقات کان قارناً اھ (ص ۱۱۵)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صورت مذکورہ میں صاحبین کے نزدیک جب یہ شخص مکہ سے مدینہ چلا گیا اور میقات سے تجاوز کر گیا اب یہ آفاقی ہوگیا اور واپسی میں اس کو قران و تمتع دونوں جائز ہیں کیونکہ خروج الی الآفاق وتجاوز عن المیقات سے تمتع اول باطل ہوگیا اور امام صاحب کے نزدیک تمتع باطل نہیں ہوا اس لئے اس کو مدینہ سے واپسی میں قران و تمتع نہ کرنا چاہئے اور امام صاحب کے قول پر عمرۂ اولیٰ کی وجہ سے تمتع اس طرح صحیح ہوگیا کہ تمتع کے لئے عمرہ کا آفاقیہ ہونا شرط صحت نہیں بلکہ واجبات سے ہے بدون عمرۂ آفاقیہ کے بھی تمتع ہو سکتا ہے گو دم اساءت لازم آئے گا۔

مگر میرے نزدیک صورت مسئولہ میں دم اساءت بھی لازم نہیں کیونکہ آفاقی ہندی کا جدہ سے احرام باندھنا بھی احرام من المیقات ہی ہے کیونکہ میقات اور محاذات میقات کا جہاز میں ہم کو علم نہیں ہو سکتا سوائے قول کافر پر اعتماد کرنے کے اور وہ معتبر نہیں پس جہاز میں احرام باندھنا صرف افضل ہے واجب نہیں بلکہ جدہ سے احرام واجب ہے اور وہی آفاقی ہندی کی اصل میقات ہے

پس عمرہ آفاقیہ ہوا اور دم اساءت لازم نہ ہوا نہ قول امام میں نہ قول صاحبین میں اور اگر قول امام پر اسقاط دم اساءت میں تکلف ہو تو قول صاحبین پر اس کا سقوط ظاہر ہے اور جب ابتلاء عام ہے تو اس مسئلہ میں قول صاحبین پر فتویٰ دینا چاہئے۔ واللہ اعلم۔ ۱۳ محرم ۴۶ھ

فصل فی الوصیۃ بالحج والحج عن الغیر

حج بدل کرنے والے کے لئے تمتع کا حکم

سوال (۱) آج کل رمضان کے بعد چونکہ سمندر میں طغیانی کا موسم ہوتا ہے اس لئے اکثر حجاج اس کی کوشش کرتے ہیں کہ رمضان میں یا اس سے پہلے حج کے لئے ہندوستان سے روانہ ہو جائیں مگر اس صورت میں حج بدل کرنے والوں کو سخت پریشانی پیش آتی ہے کہ اگر وہ حج کا احرام میقات سے باندھیں تو احرام بہت طویل ہو جاتا ہے جو باعث تکلیف ہے اور اگر تمتع کریں تو بعض علما فرماتے ہیں کہ حج بدل والے کو تمتع جائز نہیں امید ہے کہ اس صورت میں حکم شرعی سے مفصل و مدلل اطلاع دی جاوے تاکہ حج بدل والے اس پریشانی و حیرانی سے نجات پاویں۔ والسلام۔

الجواب: قال فی الشامیۃ تحت قول الدر (وھو الحیلۃ لمرید ذلک الا لمامور بالحج للمخالفۃ) ذکرہ فی البحر بحثاً بقولہ وینبغی ان لا یجوز ھذہ الحیلۃ للمامور بالحج لانہ حینئذ لم یکن سفرہ للحج ولانہ مامور بحجۃ آفاقیۃ واذا دخل مکۃ بغیر احرام صارت حجتہ مکیۃ فکان مخالفاً و ھذہ المسئلۃ یکثر وقوعھا فیمن یسافر فی البحر الملح وھو مامور بالحج ویکون ذلک فی وسط السنۃ فھل لہ ان یقصد البندر المعروف بجدۃ لیدخل مکۃ بغیر احرام حتی لا یطول الاحرام علیہ لو احرم بالحج فان المامور لیس لہ ان یحرم بالعمرۃ اھ ای لانہ اذا اعتمر ثم احرم بالحج من مکۃ یصیر مخالفاً فی قولھم کما فی التتارخانیۃ عن المحیط وھل مخالفتہ لکونہ جعل سفرہ لغیر الحج المامور بہ او لکونہ لم یجعل حجتہ آفاقیۃ وعلی الثانی لو اعتمر او فعل الحیلۃ بان قصد البندر ثم دخل مکۃ ثم خرج وقت الحج الی المیقات فاحرم منہ لم یکن مخالفاً لان حجتہ صارت آفاقیۃ۔ اما علی الاول فھو مخالف ویحتمل ان المخالفۃ لکل من العلتین کما یفید اول عبارۃ

البحر المذکورة فتحقق المخالفة بالعلة الاولی لکن ذکر العلامة القاری فی
بعض رسائله مسئلة اضطرب فیها فقهاء عصره وهی ان الآفاقی الحاج عن
الغیر اذا جاوز المیقات بلا احرام للحج ثم عاد الی المیقات واحرم هل یصح عن
الآمر قیل لا وقیل نعم ومال هو الی الثانی قال وافتی به الشیخ قطب الدین
وشیخنا سنان الرومی فی منسکه والشیخ علی المقدسی. قلت وهذا یفید
جواز الحیلة المذکورة له عاد الی المیقات واحرم. والجواب عن قوله لان سفره
حینئذ لم یکن للحج انه اذا قصد البندر عند المجاوزة لیقیم به ایاما
لبیع او شراء مثلاً ثم یدخل مکة لم یخرج عن ان یکون سفره للحج کما
لو قصد مکانا آخر فی طریقه ثم النقلة عنه واللہ تعالیٰ اعلم فافهم ص۲۵۰ ج۲

اس عبارت سے چند باتیں معلوم ہوئیں (۱) مامور بالحج کو میقات سے بلا احرام تجاوز کرنا یا
احرام عمرہ باندھ کر جانا اس وجہ سے ممنوع ہے کہ اس صورت میں مخالفت آمر لازم آتی ہے (۲) وجہ
مخالفت دو ہیں ایک یہ کہ اس صورت میں یہ سفر حج کے لئے نہ ہوا جس کا وہ مامور ہے۔ دوسرے یہ کہ
اس صورت میں حج میقاتی نہ ہوگا جس کا وہ مامور ہے۔ پہلے اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اثناء
سفر میں کسی جگہ چند روز کے لئے قیام کرنا جبکہ وہاں سے مکہ ہی کا جانے کی نیت ہے قاطع سفر نہیں بلکہ
یہ تمام سفر حج ہی کے لئے شمار ہوگا۔ دوسرے اشکال کا جواب دیا گیا کہ اگر وہ میقات سے بدون
حج کا احرام باندھے گذر جائے اور پھر حج کے وقت میقات سے احرام باندھ لے تو اس صورت
میں حج میقاتی ہو جائے گا۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ میقات خود فی نفسہ اصل حج کے لئے بھی شرط نہیں بلکہ واجبات حج
میں سے ہے پھر نیابت کے لئے اس کو شرط کیونکر مانا جا سکتا ہے اگر کوئی دلیل صریح ونقل صحیح اس
پر دلالت کرتی ہو فبہا ورنہ یہ شرط باطل ہے قال العلی القاری فی مناسکه وفیه انه ان
اراد بالمیقاتیة المواقیت الآفاقیة ففی اطلاقه نظر ظاهر اذ تقدم ان المکی
اذا اوصی بالحج ان یحج عنه من مکة وکذا سبق ان من اوصی ان
یحج عنه من غیر بلده یحج کما اوصی قرب من مکة او بعد وایضاً فیه اشکال
آخر حیث ان المیقات من اصله لیس شرطا لمطلق الحج واصالته بل انه من واجباته
فکیف یکون شرطا وقت نیابته فان وجد نقل صریح ودلیل صحیح فالامر مسلم و

الا فلا. واللہ سبحانه اعلم اھ ص۲۵۲

مگر یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ مامور کو افراد کا حکم کیا گیا ہو تمتع یا تجاوز بلا احرام کی اجازت
نہ دی گئی ہو کیونکہ مخالفت کا اطلاق اسی صورت میں صادق ہو سکتا ہے۔ اور اگر آمر نے صراحۃً یا بعموم
الفاظ مامور کو اجازت تمتع وغیرہ کی دے دی ہو تو اس صورت میں چونکہ مخالفت لازم نہیں آتی اس
لئے اس کو تمتع کر لینا جائز ہوگا۔

فی المناسك للقاری. الثالث عشر عدم المخالفة فلو امره بالافراد ای للحج او
للعمرة فقرن او تمتع ای بان نوی العمرة عن المیت ثم حج عنه فانه یصیر
مخالفا اجماعا علی ما فی البحر الی آخر ولعل وجهه انه مامور بتجرید
السفر للحج عن المیت فانه الفرض علیه وینصرف مطلق الامر الیه الا انه
یشکل اذا امره بافراد العمرة ثم اتیان الحج بعده او صرح بالتمتع فی
سفره او بتفویض الامر الیه الخ ص۲۵۳ وقال الملا رحمة اللہ السندی فی
رسالته لباب المناسك مع الشرح ص۲۶۰ وینبغی للآمر ان یفوض الامر الی المامور
فیقول حج عنی کیف شئت مفردا او قارنا او متمتعا اھ وقال فی الدر المختار
ودم القران والتمتع والجنایة علی الحاج ان اذن له الآمر بالقران والتمتع
والا کان مخالفا فیضمن الخ. قال فی الشامیة (قوله علی الحاج) ای المامور
اما الاول عه فلانه وجب شکراً علی الجمع بین النسکین وحقیقة الفعل منه وان
کان الحج یقع عن الآمر لانه وقوع شرعی لا حقیقی. واما الثانی فباعتبار انه
تعلق بجنایته. افاده فی البحر ص۳ ج۳ قلت قال فی البحر تحت قول الکنز (ودم القران
والجنایة علی المامور) واراد بالقران دم الجمع بین النسکین قرانا کان او تمتعا
کما صرح به فی غایة البیان لکن بالاذن المقدم الخ ص۶۶ وفی لباب المناسك
حتی لو امره بالقران او التمتع فالدم علی المامور الخ ص۲۶۱ فعبارة لباب
المناسك والدر المختار والشامیة والبحر مصرحة بان المامور بالحج له
ان یتمتع اذا اذن له الآمر وان علیه اذا تمتع دم التمتع فقط لا ضمان النفقة

عه المراد بالاول دم القران والتمتع معاً کما صرح به فی البحر ۱۲

وانما یضمن اذا لم یأذن له الأمر فی ذلک فخالف امرہ لایقال لزوم دم
التمتع علی المامور لایستلزم وقوع الحج عن الأمر بل یحتمل ان یقع الحج عن
المامور دون الأمر ولاضمان علیه لکونه متمتعاً بالاذن قلت لوکان الحج
واقعاً عن المامور لم یکن لذکر التمتع هناک معنیً لانه لااشکال ح فی لزوم الدم
علی المامور لانقطاع وصلته عن الأمر علی ان الشامی قد صرح بکون الدم دم شکر
وان الحج یقع عن الأمر وکذا صرح فی البحر کما تقدم ۔ واما ما اوردہ العلامة
القاری علی عبارة اللباب حج عنی کیف شئت مفرداً او قارناً او متمتعاً الخ بان
هذا القید (یعنی قوله متمتعاً) سهو ظاهر اذ التفویض المذکور فی کلام المشائخ
مقید بالافراد والقران لاغیر الخ فقد اجاب عنه فی حاشیة عدة ارباب الفتوٰی
بجواب حسن ونصه هذا ۔ اعلم ان المامور بالحج لو اذنه الأمر بالتمتع
فتمتع یقع الحج عن الأمر کما صرح به فی رد المحتار ولایکون مخالفاً کما فی
الدر المختار وعبارته (ودم القران) والتمتع (والجنایة علی الحاج) ان اذن
له الأمر بالقران والتمتع والا یصیر مخالفا انتهی وعلی هذا یقال اذا صح
اذن الأمر للمامور بالتمتع صح ان یخیرہ فیه کما ذکرہ صاحب المنسک الوسط
فحینئذ یجوز التمتع فی الصورة المشروحة ویکون ما ذکرہ علی القاری من
التقیید فی عبارة المشائخ اتفاقیا لا احترازیا وما ذکرہ من اشتراط ان تکون
الحجة آفاقیة لیس علی عمومه بدلیل تجویزهم التمتع عند الاذن به مع انه
لیس فیه حجة آفاقیة قطعاً فلیتامل منه ۔ قلت ویؤیدہ ما فی البرهان
وخفی خلافه فی بالافراد یخالف با وان نواہ للأمر عند ابی حنیفة
کالتمتع له ای للأمر بالافراد وانما یصیر مخالفا لانه مامور بان یحج
عنه من المیقات والمتمتع یحج من جوف مکة فکان هذا غیر ما امر به اھ
ص ۲۰۴ جلد اول قلمی ۔ قلت فقوله کالتمتع له ای للأمر بالافراد دلیل
علی ان المتمتع انما یصیر مخالفا بالتمتع اذا تمتع لمن امرہ بالافراد
واما لو امرہ بالتمتع فتمتع فلا مخالفة فافهم ۔
خلاصہ یہ کہ مامور بالحج کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آمر اس کو صراحۃً افراد بالحج کا حکم کرے

اور تمتع سے صراحۃً منع کردے یا ممانعت پر قرینہ قائم ہو اس صورت میں مامور بالحج کے لئے طول احرام
سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے روانہ ہوتے ہوئے چند روز جدہ میں قیام کرنے کی نیت
کرے اور اس سفر کو جدہ کا سفر قرار دے اور راستہ میں نہ عمرہ کا احرام باندھے نہ حج کا نہ اپنی طرف
سے نہ آمر کی طرف سے اور بدون احرام کے چند روز کے بعد جدہ کے قیام سے فارغ ہو کر مکہ میں
چلا جاوے اور عمرہ وغیرہ کچھ نہ کرے صرف طواف وغیرہ بدون احرام کے کرتا رہے اور وقت
حج پر جدہ آکر احرام حج باندھکر حج ادا کرے قال فی حاشیة البحر فینبغی التفصیل وهو
انه ان جاوز المیقات بلا احرام قاصد البستان ثم دخل مکة ثم خرج
الی الحل وقت الاحرام فاحرم من المیقات عن الآمر یجوز لانه صار آفاقیا
کما یاتی وان فعل نسکا غیر ما امر به قبل احرامه عن الآمر یکون مخالفا
وان عاد الی المیقات واحرم عنه من المیقات فتامل اھ ص۳۱۸ ۔
اور دوسری صورت یہ ہے کہ آمر صراحۃً تمتع کی اجازت دیدے یا یہ کہدے کہ پہلے عمرہ میری
طرف سے کرنا اور پھر حج کرنا یا مامور کو اختیار عام دیدے کہ تم جس طرح چاہو کرلینا اس صورت میں
مامور کو تمتع جائز مگر تمتع کے لئے شرط یہ ہے کہ عمرہ کے لئے شوال سے پہلے نہ کئے جاویں لہٰذا
اگر ہندوستان سے ایسے وقت میں روانگی ہو کہ مکہ میں شوال سے پہلے پہونچ جاوے تو اس صورت
میں اگر تمتع کی نیت کی جاوے گی تو شوال کی یکم تک محرم رہنا ضروری ہوگا یکم شوال کو عمرہ کے
افعال ادا کرکے حلق کردیا جاوے اور بہتر یہ ہے کہ آمر سے تمتع کی بھی اور عمرہ مفردہ کرنے کی بھی صراحۃً الگ الگ
اجازت لے لی جاوے یا عام اختیار لے لیا جاوے کہ مامور جس طرح چاہے گا حج کرے گا خواہ افراد سے
یا قران وتمتع سے یا پہلے عمرہ مفردہ کرکے پھر حج کردے گا ۔ ان سب صورتوں میں مامور کو حج کا احرام مکہ
ہی سے باندھنا جائز ہوگا میقات کی طرف عود لازم نہ ہوگا بس عمرہ کرکے احرام کھول دے پھر وقت پر حج کرلے
واللہ اعلم حررہ احقر الطلبہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۸ محرم ۴۰ھ

الجواب صواب

اشرف علی ثامن محرم الحرام ۴۰ھ

تنبیہ :- اس مسئلہ میں شافعیہ کے قول پر بھی مامور بالحج کو تمتع کرنا باذن الآمر جائز ہے بلکہ ان کے
نزدیک اگر تمتع کی اجازت بھی نہ ہو اور تمتع کرلے تب بھی حج ہو جائے گا صرف اُجرت میں کسی قدر کمی کردی
جائے گی قال فی الوجیز ص۱۲۷ (الثانیة اذا خالف فی المیقات فاحرم بعمرة عن نفسه

ثم احرم بحج المستاجر فی مکۃ ففی قول لاتحسب المسافۃ لہ لانہ صرفہ الی نفسہ فیحط من اجرتہ بمقدار التفاوت بین حجہ من بلدہ وبین حجہ من مکۃ فیکثر المحطوط وعلی قول تحسب المسافۃ فلایحط الامقدار التفاوت بین حج من المیقات وحج من مکۃ فیقل المحطوط اھ وفیہ ایضاً وان امر بالقران فتمتع کان کالقران علی وجہ وفی وجہ جعل مخالفاً لہ وعلیہ الدم ویعود الخلاف فی حط شیئ من الاجرۃ اھ ص ۶۸۔

ظفر احمد عفا عنہ ۲۶ / رمضان ۴۰ھ

ایصال الخیر فی مسائل الحج عن الغیر (یعنی حج بدل کے ضروری مسائل)

حج بدل کے صحیح ہونے کی چند شرطیں ہیں (۱) اُجرت کی شرط نہ ہو (۲) بھیجنے والے کے مال ہی سے حج کیا جاوے لیکن اگر زیادہ تر خرچ میت کے مال سے کرے اور کچھ اپنا بھی خرچ ہو جائے تو جائز ہے۔ (۳) اگر حج بدل والا میت کی رقم کو اپنی رقم سے علیحدہ رکھے تب تو وہ امانت ہے اگر باوجود احتیاط کے ضائع ہو جائے تو ضامن نہ ہوگا اور اگر اپنی رقم کے ساتھ خلط کر دے گا تو ضامن ہوگا۔ (۴) اگر ثلث مال میں وسعت ہو تو حج سوار ہو کر کرنا چاہئے اگر پیادہ حج کرے گا اور کرایہ کی رقم اپنے لئے بچاوے گا تو ضمان دینا واجب ہوگا اگر بھیجنے والے نے پیادہ حج کرنے کی اجازت بھی دے دی ہو اور سوار ہونا مکہ سے عرفات تک اور وہاں سے مکہ کی واپسی تک واجب ہے باقی سفر میں اگر بھیجنے والے کی اجازت سے پیادہ چلے تو جائز ہے۔ (۵) حج میت کے وطن سے کرنا چاہئے۔ (۶) میت کی طرف سے احرام کے وقت حج کی نیت کرنا چاہئے یعنی زبان سے یوں کہے کہ میں فلاں شخص کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں اور اگر نام بھول جائے تو یوں کہہ لے کہ جس شخص کی طرف سے مجھ کو حج کے واسطے بھیجا گیا ہے میں اس کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں (۷) احرام میقات سے باندھنا چاہئے بدون اجازت بھیجنے والے کے عمرہ کا احرام میقات سے نہ باندھے نہ تمتع کرے ہاں اگر وہ اجازت دیدے یا یوں کہدے کہ جس طرح چاہو حج ادا کر دینا تو تمتع بھی جائز ہے ھذا ھو الحق عندنا مگر اختلاف سے بچنا چاہئے اس لئے میقات سے احرام حج ہی کا باندھے (۸) حج بدل والے کو جو روپیہ دیا جائے اس میں نہایت احتیاط لازم ہے ورنہ حق العباد کا مواخذہ سر پر ہوگا سفر کے بعد جو کچھ رقم اور سامان رقم سے خریدا ہوا باقی بچے حبہ حبہ واپس کر دے اور بہتر یہ ہے کہ بھیجنے والا پہلے ہی یہ کہدے کہ اگر خرچ میں کوئی بے عنوانی اتفاقاً ہو جائے تو میری طرف سے معاف ہے۔

٭٭٭

والدین کی طرف سے حج بدل کرنا جبکہ انہوں نے وصیت نہ کی ہو

سوال (۳) اگر والدین حج بدل کے واسطے وصیت نہ کر گئے ہوں تو کوئی شخص اپنی خوشی حج بدل کرے یا کروائے تو حج بدل ہو جائے گا؟

الجواب: قال العلامۃ القاری فی مناسکہ فی شرائط الحج عن الغیر الرابع الامر ای بالحج فلایجوز حج غیرہ عنہ بغیر امرہ ان اوصی بہ ای بالحج عنہ۔ فان اوصی بان یحج عنہ فتطوع عنہ اجنبی او وارث لم یجز وان لم یوص بہ ای بالاحجاج فتبرع عنہ الوارث وکذا من ھم اھل التبرع ونحوہ فحج ای الوارث ونحوہ بنفسہ ای عنہ او احج عنہ غیرہ جاز ای ذلک التبرع او الحج او الاحجاج او ماذکر جمیعہ والمعنی جاز عن حجۃ الاسلام ان شاء اللہ تعالیٰ کما قالہ فی الکبیر اھ ص ۲۴۹۔

صورت مسئولہ میں اگر کوئی شخص مرحومین کی طرف سے تبرعاً حج کر دے خواہ وارث ہو یا غیر وارث ہو تو امید ہے کہ انشاء اللہ حج فرض اس کے ذمہ سے ادا ہو جائے گا۔

حج بدل میں اگر مامور کے پاس خرچ نہ ہو اور وہ قرض لیکر خرچ کرے تو کیا حکم ہے

سوال (۴) ایک عرض بندہ کی یہ ہے کہ حج بدل کرنے والے پر اگر خرچ نہ ہو اور اپنے پاس سے یا کسی سے قرض لیکر چلا آوے اور قرض اپنے ذمہ لیوے یا کوئی اپنا ملنے والا دیدے تو کچھ حرج تو نہیں یعنی حج میں کچھ نقص نہیں ہوا؟ اس کا جواب بھی عنایت ہو۔ فقط

الجواب: حج بدل کے مسئلہ میں جب حج بدل کرنے والے کے پاس خرچ نہ ہو اور وہ اپنے پاس سے یا کسی سے قرض لیکر چلا آوے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ سفر حج میں زیادہ خرچ آمر کے مال سے ہوا ہے یا حج بدل کرنے والے کی رقم سے صورت اول میں تو حج بدل صحیح ہوگیا اور دوسری صورت میں صحیح نہیں ہوا بلکہ وہ حج خود کرنے والے کی طرف سے ہوگیا۔ اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ آمر (یعنی بھیجنے والے) نے اس کو اپنے پاس سے یا قرض کر کے خرچ کرنے کی اجازت نہ دی ہو اور اگر اجازت دے دی ہو کہ خرچ کم ہو جائے تو تم اپنے پاس سے یا قرض لیکر خرچ کر لینا تو ہم تم کو دیدیں گے پھر ہر حالت میں حج بدل درست ہے خواہ آمر کی دی ہوئی رقم کم ہو یا زیادہ ہو قال فی شرح اللباب ففی قاضی خان اذا لم یکفہ مال المیت فانفق من مال نفسہ فان کان اکثر النفقۃ من مال المیت فھو جائز والا فھو ضامن وفی الکرمانی ان انتقص المال عن نفقۃ الطریق فاستدان او انفق من مال نفسہ ان

کان معظم النفقة فهو جائز والا فهو ضامن اھ (ص ۲۵۰) قلت والصورة الثانیة ظاهرة فان جمیع ماینفقه من مال نفسه او بالاستدانة بالاذن فهو من مال الآمر حکماً واللہ اعلم۔ ۷ رجب ۴۲ھ

اجنبی کے مال سے بغیر وصیت واذن ورثہ حج بدل کی ایک صورت کا حکم

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص اپنا حج فرض ادا کرنے کو کعبہ شریف روانہ ہوکر راستہ میں، قبل میقات انتقال کرگیا اور دوسرے نے اپنے رفیقوں میں سے اس کی نیت سے اس کا حج فرض کیا مگر میت نے وصیت نہیں کی تھی اس کا روپیہ بقایا بھی اس نے باقی راستہ میں خرچ کیا اب میت کے وارث اس سے روپیہ طلب کرتے ہیں تو اس صورت مذکورہ پر میت کا حج فرض ادا ہوگیا یا نہیں اور میت کے وارث روپیہ مانگنے کے مستحق ہیں یا نہیں اگر اس میں میت سے حج فرض ادا ہوگیا جیسا کہ عبارت کتب سے معلوم ہوتا ہے تو پھر وارث میت اس سے روپیہ واپس لینے کے حقدار کیونکر ہوسکتے ہیں اس کی وجہ اچھی طرح سے تحریر کرنے کی ضرورت ہے تسلی ضرور فرمادیں زبدۃ المناسک باب الحج عن الغیر صفحہ ۱۶۷ میں لکھتے ہیں دوسری یہ پس اگر کوئی زندہ کی طرف سے بدون امر کے حج کردیوے گا تو فرض زندہ کا ساقط نہ ہوگا اور مردہ بھی اگر وصیت کرمرا ہے تو بغیر امر وارث کے حج مردہ کا ادا نہیں ہوسکتا مگر جو مردہ بدون وصیت حج کے مرگیا تو اگر کسی نے وارث ہو یا اجنبی تبرعاً اس کا حج فرض ادا کردیا تو حج فرض مردہ کا ادا ہوجائے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور شامی باب الحج عن الغیر صفحہ ۲۵۹ فان لم یوص وتبرع عنه الوارث یہ سب عبارت اس کو شامل ہے یا نہیں اگر شامل نہیں تو وجہ کیا ہے بالتفصیل تحریر کیجئے اور یہ روایت قابل حجۃ ہے یا ضعیف مکین؟ فقط۔ ۲۷ ربیع الاول ۴۳ھ

الجواب: جب میت نے وصیت نہیں کی تھی تو اس کا متروکہ سب کا سب ملک ورثہ ہے میت کا اس میں کچھ حق نہیں رہا میت کا حق ثلث ترکہ میں بھی وصیت سے ہوتا ہے بدون وصیت کے نہیں ہوتا۔ پس جب رفیق نے میت کی طرف سے حج کرنے میں یہ رقم صرف کی ہے اس نے ورثہ کا مال مملوک بدون ان کے اذن کے صرف کیا ہے لہذا اس حج بدل کرنے والے کے ذمہ اس رقم کا ضمان واجب ہے وہ یہ رقم ورثہ کو ادا کرے اور جس عبارت سے سائل نے احتجاج کیا ہے اس میں تو خود لکھا ہے کہ اگر مردہ وصیت کرتا ہے تو بدون امر وارث کے حج مردہ کا ادا نہیں ہوسکتا۔ الخ۔ پس رفیق کا حج مال میت سے بدون امر وارث یا اذن وارث کے صحیح نہیں ہوسکتا۔

اور اجنبی کے جس حج کو بدون وصیت کے بھی میت کی طرف سے درست مانا گیا ہے وہ وہ ہے جو اجنبی نے تبرعاً کیا ہو چنانچہ عبارت زبدہ میں تبرعاً کی قید مصرح ہے اور اس میں بھی یہ جزم ویقین نہیں کہ میت کی طرف سے حج ہو بھی جائے گا بلکہ امید کا لفظ ہے بہر حال صورت مسئولہ میں چونکہ اس رفیق نے میت کی طرف سے تبرعاً حج نہیں بلکہ ورثہ کے مال میں حج کیا ہے اور ورثہ کے بدون اجازت کیا ہے اس لئے یہ حج میت کی طرف نہیں ہوا بلکہ خود اس رفیق ہی کا حج ہوا اس پر ورثہ کو ضمان دینا واجب ولازم ہے فقط۔ ۲۲ ربیع الثانی ۴۳ھ

متعلق حج بدل

سوال (۶) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کی نسبت از روئے شرع شریف کے۔

اگر کسی غنی متوفی کی طرف سے زید ایسے مفلس نے حج بدل ادا کیا جس نے ابھی اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہے تو مرحوم کا حج ادا ہوجاتا ہے یا نہیں۔ اور ایسے زید حج بدل کرنے والے کے ذمے سے بھی فرضیت حج عمر بھر کو ساقط ہوجاتی ہے یا نہیں اگر ایسے زید حج بدل کرنے والے سے عمر بھر کو فرضیت حج ساقط نہیں ہوتی تو اپنے تمام کام وآرام اہل وعیال وغیرہ چھوڑ کر حج کے سفر وغیرہ کی سخت جانکاہ تکالیف وصعوبتیں اٹھا کر حج بدل کو جانے سے کیا فائدہ ہے۔ پس اس لئے اگر حج بدل کرنے والا حج بدل کرانے والے سے ضروری مصارف حج کے سوائے اپنے نقصانات معاش کا کچھ معاوضہ نقد وغیرہ بھی لے لے تو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جس مفلس نے اپنا حج نہیں کیا ہے وہ دوسرے کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہو۔ باقی اس مفلس کے ذمہ سے جس نے بدوں اپنا حج کئے دوسرے کا حج فرض بدلاً کیا ہے عمر بھر کیلئے فرض حج ساقط نہیں ہوا بلکہ اگر کسی وقت اس کے پاس مال زیادہ ہوگیا جس میں حج بشرائطہ ہوسکے تو اس کو اپنی طرف سے دوبارہ حج کرنا فرض ہوگا کیونکہ حج بدل تو دوسرے کا تھا اس کی طرف سے تھوڑا ہی تھا۔ نعم لو حج عن الغیر تطوعاً یقع عن المامور قال القاری فی مناسکه وفی حج النفل یقع عن المامور اتفاقاً ای باتفاق مشائخنا وللآمر الثواب ای ثواب النفقة لان الحدیث ورد فی الفرض دون النفل اھ (ص ۲۶۲) ولکنه لایسقط الفرض عن الفاعل بحال وقال فی الدر وقیل عن المامور نفلاً وللآمر ثواب النفقة کالنفل اھ قال الشامی مقتضاه ان النفل یقع عن المامور اتفاقاً وللآمر ثواب

النفقة وبه صرح بعض الشراح ومشى عليه فی اللباب ورده الاتقانی فی غاية البيان بانه خلاف الرواية لما قاله الحاكم الشهيد فی الكافی الحج التطوع عن الصحيح جائز ثم قال وفی الاصل يقع الحج عن المحجوج اھ (ص ۳۹۲ ج ۲)

رہا یہ کہ جب اس کے ذمہ سے حج فرض ساقط نہیں ہوتا تو اپنے کاروبار وآرام کو چھوڑ کر سفر حج کی صعوبت اٹھانے میں کیا فائدہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو اس کو بے فائدہ سمجھے اس کو واقعی کچھ فائدہ نہ ہوگا وہ ہرگز نہ جائے بلکہ ایسے شخص کو بھیجنا چاہیے جو ایک بار اپنا حج کر کے بیت اللہ اور بیت رسول اللہ کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کر چکا ہو وہ بتلائے گا کہ اس سفر کی صعوبت برداشت کرنے میں کیا فائدہ ہے یہ تو نفع عاجل ہے جس کا علم ایک بار حج کرنے والے کو دنیا ہی میں ہو جاتا ہے اور جو ثواب مرنے کے بعد سامنے آئیگا اس کا علم قبر میں پہونچکر ہو جائے گا۔ اور دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا ثواب بعض وجوہ سے اپنے حج کے ثواب سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

رہا یہ کہ حج بدل کرنے والا حج بدل کرانے والے سے اپنے نقصان معاش کا معاوضہ لے تو جائز ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معاوضہ لینا جائز نہیں کیونکہ اگر یہ معاوضہ نقصان معاش وکاروبار کا ہے تو نقصان کاروبار کوئی عین متقوم نہیں جس کا معاوضہ جائز ہو اور اگر یہ معاوضہ اپنی مشقت و محنت کا ہے جو سفر میں لاحق ہوگی تو اس صورت میں اجارہ ہوگیا اور حج بدل اجارہ کے ساتھ ناجائز ہے بعض اقوال پر وہ حج ہی نہ ہوگا اور راجح یہ ہے کہ اجارہ فاسد ہے اور حج ہو جائے گا۔ البتہ اگر معاوضہ کے طور پر نہ ہو بلکہ آمر اپنی خوشی سے اجازت دیدے کہ میں تم کو یہ رقم حج کے لئے دیتا ہوں اور حج کے بعد جو بچے اس کے متعلق تم کو وکیل کرتا ہوں کہ یہ فاضل رقم اپنے کو میری طرف سے ہبہ کر لینا تو اس صورت میں وہ فاضل رقم اور سامان وثیاب ومتاع جو حج کے بعد باقی رہے مامور اپنی ملک میں لا سکتا ہے اسی طرح اگر کسی شخص کے ذمہ اہل وعیال کا نفقہ واجب ہے اور دوسرا شخص اس کو حج بدل میں بھیجنا چاہتا ہے اور یہ صاحب عیال یوں کہے کہ مدت حج کے لئے میں نفقۂ عیال اس وقت نہیں دے سکتا تم اگر مجھی کو بھیجنا چاہتے ہو تو میرے اہل وعیال کا نفقہ بھی اس قدر ادا کر دو اور یہ گفتگو بطور معاوضہ اور معاملہ کے نہ ہو بلکہ دوستانہ طور پر ہو اور اس کے بعد بھیجنے والا خوشی سے اس کے اہل وعیال کا نفقہ بھی ادا کر دے تو جائز ہے بشرطیکہ حج بدل کرانیوالا خود زندہ ہو اور اگر وصیت کر کے مر گیا ہے تو اس کے حج بدل میں نفقہ سفر حج متعارف سے زیادہ دینے کا اختیار ورثہ بالغین کو ہے نابالغوں کے حصہ میں سے جائز نہیں اگر ورثہ نابالغ بھی ہوں تو بقدر کفایت معروفہ حج تو ثلث الکل میں سے دیا جائے اور تبرع فاضل یا

نفقہ اہل وعیال کے لئے بالغین اپنے حصہ میں سے رقم دیں اور نفقہ اہل وعیال مامور میں تفصیل ہے کہ نفقہ معروفہ ضروریہ پر بھی جانیوالے دستیاب ہوں یعنی ایسے مجرد لوگ بھی حج بدل کو تیار ہوں جن کے ساتھ اہل وعیال کا خرچ لگا ہوا نہیں اور وہ صرف سفر حج کا خرچ لیکر جا سکتے ہیں اور اگر بجز صاحب عیال شخص کے اور کوئی معتبر باقاعدہ حج کو صحیح ادا کرنے والا نہ ملتا ہو تو اس صورت میں ثلث الکل سے بھی مامور کی اہل وعیال کا نفقہ دینا جائز ہے۔ بلکہ ورثہ پر لازم ہے کہ جبکہ مورث نے وصیت حج کی ہو اگر ثلث الکل میں وسعت ہو لان نفقة الحج تختلف باختلاف الاشخاص قال القاری فی شرح المناسك ولا ينفق المامور من مال الميت على من يخدمه اى خدمة يقدر عليه بنفسه الا اذا كان ممن لا يخدم نفسه اى لكبره او عظمته اھ (ص ۲۵۹) قلت فكذا يختلف الحكم لكون المامور اعزب او صاحب العيال فيعطى الاول نفقة اقل من الثانى لاختلاف احوالهما شرعا وعرفا ولا يعطى صاحب العيال تلك الزيادة عوضا عن شیء بل اعانة له فی اداء الواجب كما زيدت نفقة صاحب العظمة اعانة له فی حفظ حرمته والله اعلم ولعل هذا ظاهر غير خفی والعبارة المحررة ما فی كافی الحاكم وله نفقة مثله و زاد ايضاحها فی المبسوط فقال وهذه النفقة ليس يستحقها بطريق العوض بل بطريق الكفاية لانه فرغ نفسه لعمل ينتفع به (الآمر) هذا (شامی ص ۳۹۲ ج ۲) قلت فكان نفقة المامور بالحج كنفقة القاضی والعامل و نفقة عيالهما تدخل فی نفقتهما حتما فتقدر بما يسعهما وعيالهما فكذا ههنا اذا لم يوجد الاعزب وكانت الوصية بالحج لا على التعيين و اما لو عين الموصی رجلا ذا عيال ان يحج عنه فلا شك فی دخول نفقة عياله فی نفقة الحج وتوخذ من ثلث الكل وفی الدر يشترط اهلية المامور لصحة الافعال فجاز حج الضرورة (وهو من لم يحج) والمرأة ولو أمة و العبد وغيره كالمراهق وغيرهم اولى لعدم الخلاف اھ قال الشامی لا يخفى ان التعليل يفيد ان الكراهة تنزيهية لان مراعاة الخلاف مستحبة اھ (ص ۳۹۲ ج ۲) وفيه ايضا وعليه رد ما فضل من النفقة وان شرطه فالشرط باطل الا ان يوكله بهبة الفضل من نفسه او يوصی الميت به لمعين اھ (ص ۳۰ ج ۲)

ماموراپنی جائے قیام سے حج کرے تو حج آمر کا صحیح ہوجائیگا یا نہیں،

سوال (۷) حج بدل میں اگر مامور بجائے وطن آمر کے اپنی جائے قیام سے خواہ اقرب خواہ ابعد اپنی رضا سے حج کرنا چاہے تو شرع شریف کی رُو سے آمر کے ذمہ سے حج فرض ساقط ہوگا یا نہیں اور ہر دونوں (اقرب اور ابعد) صورتوں میں کس جگہ سے نفقہ کا مستحق ہوگا؟

الجواب؛ صورت مسئولہ میں اگر ثُلث مال آمر میت میں بلد آمر میت سے حج کرنے کی گنجائش تھی اور پھر وہاں سے نہیں کیا گیا تو یہ حج آمر کی طرف سے صحیح نہیں ہوا بلکہ مامور کا حج ہوا اور وہ نفقہ کا ضامن ہوگا یعنی کل نفقہ کا البتہ اگر وہ جگہ جہاں سے مامور گیا ہے وطن آمر سے اتنی قریب ہو کہ دن میں چل کر رات کو وطن آمر میں سیر وسط کے ساتھ پہونچ سکیں تو ضمان نہیں ہوگا اور حج بھی آمر کی طرف سے ہوجائے گا یا محجوج عنہ زندہ ہو اور اس نے غیر وطن سے حج بدل کی اجازت دے دی ہو۔ یا میت ہو اور غیر وطن سے حج کرنے کی وصیت کرگیا ہو تب بھی حج آمر اور میت کی طرف سے صحیح ہوجائے گا اور مامور پر نفقہ کا ضمان نہ ہوگا[عہ] قال فی اللباب الثامن ان یحج عنہ من وطنہ ان اتسع الثلث ای ثلث مال المیت وان لم یتسع یحج عنہ من حیث یبلغ ای استحسانا الی ان قال اذا وجب الحج من بلدہ فاحج الوصی من غیر بلدہ یضمن ای و یکون الحج لہ ویحج عن المیت ثانیا الا انہ خالف الا ان یکون ذلک المکان الذی احج عنہ قریبا منہ ای من وطنہ بحیث یبلغ الیہ ویرجع الی الوطن قبل اللیل ای فحینئذ لا یکون مخالفا ولا ضامنا اھ وفیہ ایضا ولو اوصی من لہ وطن ان یحج عنہ من غیر بلدہ یحج عنہ کما اوصی ای علی وفق ما اوصی بہ قرب

عہ اور اگر آمر اپنے وطن میں نہیں مرا بلکہ کسی دوسری جگہ مرا ہے جب بھی مامور اُس کے وطن ہی سے حج کرے قال فی الغنیۃ سواء مات فیہ ای فی وطنہ او مات فی سفر التجارۃ ونحوھا لان الواجب علیہ الحج من البلد الذی یسکنہ الی ان قال ولو اوصی خراسانی بمکۃ او مکی بالری واطلقا یحج عنہما من وطنہما اھ (ص۲۵۱) وفیہ ایضا قال الشارح اقول ھذا اذا کانا غنیین فی بلادھما واما اذا صار المکی غنیا بالری والخراسانی بمکۃ واوصیا فینبغی ان یحج عنہما من موضع فرض الحج علیہما اھ قلت وھذا واللہ ھو الفقہ بعینہ فللہ در العلماء الحنفیۃ ما اعمق نظرھم فی دقائق الشریعۃ۔

۱۴

ای ذلک المکان الموصی بہ من مکۃ او بعد اھ (ص ۲۵۱) قلت وکذا الحی اذا اذن للمامور ان یحج عنہ من غیر وطنہ فلا فرق فی الحی والمیت فی ذلک حتی یکون لاحدھما اسقاط ھذا الشرط وتغییرہ ولا یکون للآخر، واللہ اعلم۔

قال فی اللباب العاشر ان یحرم من المیقات ای من میقات الآمر یشمل المکی وغیرہ قال الشارح وفیہ انہ ان اراد بالمیقات المواقیت الآفاقیۃ ففی الطلاقہ نظر ظاہر اذ تقدم ان المکی اذا اوصی بالری ان یحج عنہ من مکۃ وکذا سبق ان من اوصی ان یحج عنہ من غیر بلدہ یحج کما اوصی قرب من مکۃ او بعد وایضًا فیہ اشکال آخر حیث ان المیقات من اصلہ لیس شرطًا لمطلق الحج واصالتہ بل انہ من واجباتہ فکیف یکون شرطا وقت نیابتہ فان وجد نقل صریح ودلیل صحیح فالامر مسلّم والا فلا اھ (ص ۲۵۲) قلت والذی ظہر لی ان شرط المیقات یسقط باذن الآمر والمیت ولا یسقط اذا اطلق الامر بالحج لانہ لا یرید الا ان یحج المامور کما یحج الآمر لو وقع عنہ والآفاقی انما یحج عن المیقات فیشترط للنائب مراعاتہ والا یکون مخالفًا، واللہ اعلم۔

۲۸ رمضان ۴۴ھ

حج بدل میں واپسی شرط نہیں ہے

سوال (۸) حج بدل میں واپسی شرط ہے یا نہیں؟

الجواب؛ حج بدل میں وطن میت سے جانا تو شرط ہے بشرطیکہ ثُلث میں گنجائش ہو باقی عود شرط نہیں۔ قال فی العالمگیریۃ۔ ولو احج رجلاً یؤدی الحج ویقیم بمکۃ جاز والافضل ان یحج ویرجع ص۱۶۷ جلد ۱

۱۴ شوال ۴۴ھ

ایضاً

سوال (۹) عرض ہے کہ میں کاندھلہ سے حج بدل کرنے گیا حج کرنے کے بعد وہیں قیام کیا اگلا حج کرنے کے بعد میں کاندھلہ آگیا پھر گھر آگیا جن کی طرف سے حج کرنے گیا وہ فرماتے ہیں کہ حج بدل نہیں ہوا اس کی بابت فرمائیے کہ حج بدل ہوا یا نہیں؟ فقط والسلام۔

الجواب؛ صورت مسئولہ میں حج بدل جائز ہوگیا فی العالمگیریۃ (ص ۱۶۷ ج ۱) ولو احج رجلاً یؤدی الحج ویقیم بمکۃ جاز والافضل ان یحج ویرجع واذا فرغ المامور بالحج ونوی الاقامۃ خمسۃ عشر یومًا فصاعدًا انفق من مال نفسہ ولو انفق من مال الآمر یضمن الی ان قال فان نوی الاقامۃ خمسۃ عشر یومًا

فقاعداً حتی سقطت نفقتہ من مال الآمر ثم رجع بعد ذلک ھل یعود نفقتہ فی مال الآمر ذکر القدوری فی شرح مختصر الطحاوی ان علی قول محمد یعود وھو ظاہر الروایۃ وعند ابی یوسف رح لا یعود اھ اس سے معلوم ہوا کہ واپسی کا خرچ تو بھیجنے والے کے ذمہ ہوگا لیکن قیام مکہ کا خرچ خود حج کرنے والا اپنے پاس سے کرے فقط والسلام۔ کتبہٗ الاحقر عبدالکریم گمتھلوی۔ ١٠ صفر ۴۴ھ

الجواب صحیح ، ظفر احمد عفی عنہ۔

معذور کے حج بدل کرانے کی ایک صورت کا حکم

سوال (١٠) جناب محمد سلیم اللہ خان صاحب رئیس بوڑہ گاؤں ضلع علی گڈھ عرصہ سے مشتاق زیارت حرمین شریفین و حج شریف ہیں۔ اور اس وقت جناب خان صاحب موصوف کی عمر تقریباً ٧٠ سال کی ہے علاوہ ضعف پیری چند امراض جسمانی میں مبتلا ہیں جن کی وجہ سے چلنے پھرنے اور سفر سے معذور ہیں خصوصاً مرض فتق کی بھی تکلیف ہے اکثر کم و بیش پندرہ بیس روز بعد دورہ نزول آنت کا ہوجاتا ہے ایسی حالت میں ایک قدم چلنا بھی دشوار ہوجاتا ہے لہٰذا صورت مجبوری اور حالت معذوری میں اگر خان صاحب موصوف کسی ایسے شخص کو جس نے حج پہلے کرلیا ہے جملہ روپیہ خرچ آمد و رفت و خوراک وغیرہ دیکر اپنا حج بدل کرادیں تو شرعاً ادائیگی حج فرض ہوسکتی ہے یا نہیں اور اگر ہوسکتی ہے تو حاجی صاحب کی اور کن کن شرائط سے مشروط ہونے کی ضرورت ہے براہِ کرم مسئلہ اصول فقہ سے مطلع فرما کر ممنون و مشکور فرماویں ؟

الجواب : بیشک صورت مسئولہ میں رئیس صاحب کو اگر خود حج کے لئے جانا دشوار ہے تو ان کو اس حالت میں جائز ہے کہ اپنی طرف سے حج بدل کرادیں لیکن اس کو دیکھ لیا جاوے کہ کیا وہ اس پیٹی کا استعمال کرکے ساتھ بھی سفر حج نہیں کرسکتے جو مرض فتق میں ڈاکٹر تجویز کیا کرتے ہیں غالباً اس پیٹی کے استعمال کے ساتھ آنت اترنے کی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی اور جب اترے فوراً اس کو چڑھا کر کام ہوسکتا ہے اگر اس کے بعد بھی تکلیف کم نہ ہوتی ہو اور سفر دشوار ہی ہو تو حج بدل کرادینا جائز ہے پھر اگر یہ عذر جو اس وقت ہے عمر بھر رہا جب تو یہ حج بدل عمر بھر معتبر رہے گا اور اگر کسی وقت عذر موجود زائل ہوگیا تو ان کو حج فرض دوبارہ خود ادا کرنا ہوگا ویصیر البدل نفلاً قال فی الدر وھذا ای اشتراط دوام العجز الی الموت اذا کان العجز کالحبس والمرض یرجی زوالہ ای یمکن وان لم یکن کذلک کالعمی والزمانۃ سقط الفرض بحج الغیر عنہ فلا اعادۃ مطلقا سواء استمر بہ العذر ام لا اھ (ص ٣٨٩ ج ٢) قلت ونزول

المعالیں کالزمانۃ بل المشاھد قدرۃ المبتلی بہ علی السفر قصیرہ وطویلہ بعد شدہ الحزام الذی قد اوجد لہ، واللہ اعلم۔ ١٨ رمضان ۴٦ھ

حج بدل اور ضمان مامور کی ایک صورت کا حکم

سوال (١١) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید غریب نے ایک امیر حاجی حج بیت اللہ شریف کے جانے والے کو مبلغ ؏ دئے اور کہا کہ مکہ معظمہ پہونچکر میری والدہ کی طرف سے کسی سے حج کرادینا۔ مکہ معظمہ پہونچکر یہ حوادث پیش آئے کہ آٹھویں کی شام تک مکہ سے عرفات جانیوالے کو سواری نہ مل سکی جو شخص حج کرنے کو راضی تھا وہ بلا سواری حج کو نہ گیا اور یہ امیر اور ان کے ہمراہی حج کو چلے گئے اور عرفات وغیرہ میں ارکان حج ادا کرکے مدینہ ہوکر اپنے وطن میں آگئے لیکن یہ امیر حاجی مکہ معظمہ ہی سے دستوں کے مرض میں مبتلا ہوا اور گھر آکر دو مہینہ تک سخت بیمار رہ کر انتقال کرگیا۔ بہت کچھ نقد اور جائداد چھوڑ مرا۔ اسی اثناء مرض میں زید غریب کو دو مرتبہ حاجی امیر سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن امیر حاجی کی سخت علالت کی وجہ سے زید غریب نے دریافت کیا کہ میری والدہ کی طرف سے حج کرایا یا نہیں اور نہ خود امیر حاجی نے بیان کیا کہ حج کرادیا یا نہیں حتی کہ امیر حاجی کا انتقال ہوگیا تب غریب زید نے امیر حاجی کے ورثاء سے اپنے روپیہ دئے ہوئے طلب کئے۔ کیونکہ امیر حاجی اور ہمراہی حاجیوں سے معلوم ہوا کہ امسال تین سو پینتیس روپیہ سے کم میں مکہ والوں میں سے کوئی حج بدل نہیں کرسکا مصارف مزید تھے تو اگر امیر حاجی غریب زید کی والدہ کی طرف سے حج کراتا تو غریب زید سے ضرور اپنا مطالبہ زاید وصول کرتا۔ یا اپنے ورثاء سے کہہ مرتا کہ فلاں زید غریب سے اتنا روپیہ لے لینا سو اب امیر حاجی کے وارث زید غریب کو اس کے مبلغ ؏ دئے ہوئے واپس نہیں دیتے۔ سو اب سوال یہ ہے کہ شرعاً امیر حاجی مرحوم کے ورثاء پر امیر حاجی کے متروکہ میں سے غریب زید کو اس کے ؏ دئے ہوئے واجب ہے یا نہیں؟ فقط۔

الجواب : زید غریب کو امیر حاجی کے ورثاء سے اس رقم کے طلب کرنے کا حق نہیں کیونکہ اس کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ امیر حاجی نے اس کی والدہ کی طرف سے حج نہیں کرایا اور جتنی باتیں سوال میں درج ہیں یہ صرف قرائن و احتمالات ہیں ان سے ثبوت نہیں ہوسکتا اور اگر امیر حاجی مرحوم کے ہمراہی اس وقت گواہی دیں تو ان کی گواہی لغو ہے کیونکہ مدعی علیہ مرچکا ہے۔ دوسرے یہ گواہی نفی پر ہوگی اور شہادت علی النفی قبول نہیں علاوہ ازیں یہ بھی تو احتمال ہے کہ امیر حاجی نے کسی شخص کو حج بدل کے واسطے وہ رقم دی ہو اور اس نے نہ حج کیا ہو نہ رقم واپس دی ہو۔ یہ بھی

احتمال ہے کہ امیر حاجی نے وہ رقم مکہ میں کسی دیندار معتبر آدمی کو دے دی ہو کہ سال آئندہ اس سے حج بدل کرا دینا۔ غرض اس معاملہ میں زید غریب کے پاس اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ اس کی رقم امیر حاجی کے ذمہ قرض ہو گئی کیونکہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ امانت کہیں ضائع ہو گئی ہو اور امین کے اوپر ضیاع امانت کا ضمان نہیں ہوتا۔ البتہ اگر امیر حاجی کے ورثہ کے دل کو یہ بات لگ جائے کہ زید غریب کی رقم حاجی امیر مرحوم ہی کے پاس رہی ہوگی تو بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ زید کی رقم ادا کر کے اپنے مورث کا ذمہ احتمال سے بھی بری کر دیں مگر ایسا کرنا واجب نہیں اسی لئے اگر ورثہ ایسا کریں تو صرف بالغ ورثہ اپنے اپنے حصوں میں سے یہ رقم ادا کریں نابالغوں کے حصوں میں سے ادا نہ کریں فقط واللہ اعلم۔

۷ رمضان ۴۶ھ

جس نے اپنا حج نہ کیا ہو اس کے حج بدل کرنے کا حکم

سوال (۱۲) کیا حکم ہے علماء حنفیہ کا اس مسئلہ میں کہ زید ایک غریب شخص ہے جس نے حج نہیں کیا اس کو ہندہ بدل حج کرنے کے واسطے بھیجنا چاہتی ہے اگر زید ہندہ کا روپیہ لیکر حج کو جاوے تو حج ہندہ کا ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جس شخص نے اپنا حج نہیں کیا وہ اگر حج بدل کرے تو حج بدل صحیح ہو جاتا ہے لیکن یہ مکروہ تنزیہی ہے اور افضل یہ ہے کہ ایسے شخص کو حج بدل کے لئے بھیجا جاوے جو اپنا حج کر چکا ہو اور جو شخص اپنا حج کئے بدون حج بدل کو جاوے اگر وہ اتنا مالدار ہے کہ اس پر حج فرض ہے تو اس کو حج بدل کرنا مکروہ تحریمی ہے کما فی بغیۃ الناسک ص ۱۸۱ قال فی الفتح[1] والبحر[2] والحق انہا تنزیہیۃ علی الآمر تحریمیۃ علی الصرورۃ[3] المامور ان کان بعد تحقق الوجوب علیہ بملک الزاد والراحلۃ والصحۃ لانہ یتضیق علیہ والحالۃ ہذہ فی اول سنی الامکان فیأثم بترکہ وکذا لو تنفل لنفسہ اھ ملخصاً اور اگر اس بدل کے لئے جانے والے پر حج فرض نہیں ہے تو کراہت تحریمیہ نہ ہوگی مگر کراہت تنزیہیہ سے خالی نہیں للاختلاف فی ان الحج بوصولہ الی المیقات یفترض علیہ ام لا واللہ اعلم۔

نوٹ: سوال میں یہ نہیں لکھا کہ ہندہ کو خود جانے سے کیا عذر ہے اس لئے دوبارہ سوال کرلیں کہ اس کا عذر ایسا ہے کہ حج بدل کو بھیج سکتی ہے یا نہیں۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۰ ربیع الاول ۴۵ھ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

[1] قبیل باب الہدی ۲: ۹۷ [2] ۳: ۷۰ [3] قولہ الصرورۃ وھو الذی لم یحج اولاً عن نفسہ ۱۰۷۰ وحسن عفا اللہ تعالیٰ عنہ ولو الدیۃ۔

سفر حج سے عاجز ہونے کی صورت میں حج بدل کرانے کا حکم

سوال (۱۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے اوپر حج بیت اللہ شریف فرض ہے اور اس کی صحت اس قدر خراب ہے کہ اس کو اپنی حیات کی بھی امید نہیں ہے اور اس کے وارثوں میں سے ایک لڑکا ہے جو آوارہ ہے اور اس سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد حسب وصیت باپ کے اس فرض کو باپ کی طرف سے ادا کرے ایسی حالت میں جو حکم شریعت کا ہو اس سے بہت جلد مطلع فرما دیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے گا فقط۔

الجواب: جب ایسی تکلیف ہو کہ سفر حج سے بالکل عاجز ہو جاوے تو حج بدل کے لئے کسی کو اپنی زندگی میں بھیج دینا جائز ہے پھر اگر اس عجز ہی کی حالت میں انتقال ہو جاوے تب تو یہ حج کافی ہو جاوے گا اور اگر یہ عجز زائل ہو جاوے تو حج ذمہ رہے گا (اور اگر حج بدل کی وصیت کرنے میں لڑکے پر اطمینان نہیں کہ وہ پورا کرے گا تو اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کسی دوسرے معتمد کو حج بدل کے لئے وصیت کر دے اور اس کو روپیہ خود سپرد کر دے) کما فی العالمگیریۃ (ص ۱۶۶ ج ۱) ومنہا استدامۃ العجز من وقت الاحجاج الی وقت الموت ہکذا فی البدائع حتی لو احج عن نفسہ وھو مریض یکون مراعی فان مات اجزاہ وان تعافی بطل وکذا لو احج عن نفسہ وھو محبوس کذا فی التبیین۔

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا عنہ
۲۱ ربیع ۲ ۴۵ھ

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ
تھانہ بھون ۲۱ ربیع الثانی ۴۵ھ

حج بدل کی ایک صورت کا حکم

سوال (۱۴) کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بزمانہ ناواقفی حج بدل کے لئے گیا اور میقات سے قبل اشہر حج کا احرام بہ نیت آمر باندھا مکہ معظمہ پہنچکر عمرہ کر کے احرام کھول ڈالا پھر موسم حج میں احرام باندھکر حج ادا کیا بعد کو معلوم ہوا کہ حج آمر کا ادا نہ ہوا سال آئندہ تک وہاں اقامت کر کے اپنا حج ادا کر کے واپس ہو گیا اور تیسرے سال پھر اس نیت سے روپیہ فراہم کر کے حج آمر جو اپنے ذمہ باقی ہے اس سے سبکدوشی ہو جاوے اشہر حج میں عازم بیت اللہ ہو کر اور میقات سے بہ نیت آمر احرام باندھ کر باحتیاط تمام حج ادا کر دیا لیکن جاتے وقت نہ آمر سے تذکرہ کیا نہ اس سے اجازت لی ہاں ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ پہلا حج فاسد ہو گیا ہے اسی کی قضا کے لئے دوبارہ جانے کا قصد ہے

دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس صورت میں فریضۂ آمر سے سبکدوشی ہوگئی یا نہیں اگر نہیں ہوئی تو سبکدوشی کی کیا صورت اختیار کی جاوے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فی غنیۃ الناسک (ص ۱۸۰ فی فوات الحج عن المامور) فلو حج عن المیت بمال نفسہ اجزاہ وبرئ من الضمان۔ پس اگر حج اول آمر کی طرف سے ادا نہوا ہو تو حج ثالث اس کی جانب سے ادا ہوگیا اور اگر حج اول آمر کی طرف سے ادا ہونے نہونے کی تحقیق مطلوب ہے تو یہ لکھا جاوے کہ میقات سے احرام حج کے بعد عمرہ کا احرام باندھا تھا یا بدون احرام عمرہ محض افعالِ عمرہ کرکے حلال ہوگیا تھا۔ اور یہ جو لکھا ہے کہ اُن لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ پہلا حج فاسد ہوگیا ہے الخ اس میں فساد سے کیا مراد ہے آیا یہی عمرہ کرلینا یا اور کوئی بات مفسد حج پائی گئی تھی صاف صاف لکھیں۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۱ر جمادی الاخریٰ ۴۵ھ

جس نے اپنا حج نہ کیا ہو اس کے حج بدل کا حکم

سوال (۱۵) سُنا جاتا ہے کہ اس شخص کو جو خود حاجی نہو۔ حج بدل کے لئے جانا جائز نہیں اس لئے کہ کعبہ شریف کو دیکھنے سے حج فرض ہوجاتا ہے۔ جب خود ان پر فرض ہوگیا تو وہ دوسرے کی جانب سے ادا نہیں کرسکتا۔

الجواب: جس نے اپنا حج نہ کیا ہو اس کو حج بدل کرنا مکروہ ہے۔ اور جب وہ کعبہ شریف پہنچتا ہے تو وہ دوسرے کا احرام باندھے ہوئے ہوتا ہے اس واسطے اس پر اس زیارت کعبہ سے حج فرض نہیں ہوتا کما ھو مصرح فی کتب الفقہ البتہ اگر اس کو آئندہ حج تک مکہ معظمہ میں قیام دشوار نہ ہو اور اس کے اہل وعیال کو بھی تنگی نہ پیش آوے تو بعض فقہاء نے اس پر وہاں قیام کرکے آئندہ سال حج کرنے کو واجب کہا ہے، واللہ اعلم۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۱ر شوال ۴۸ھ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ر شوال ۴۸ھ

بحری اور ہوائی جہازوں پر سفر اور متعلقہ احکام

ہوائی جہازوں میں وقوف عرفہ اور طواف کعبہ کا حکم

رہا جواب اُن مسائل کا جن کو میں نے پہلے پرچہ میں زیرِ غور کہا تھا اور وہ دو مسئلے ہیں ایک ہوائی جہاز میں طواف کرنے کا۔ دوسرے ہوائی جہاز میں وقوف عرفہ کرنے کا سو اس کے متعلق جو مجھ کو مطالعۂ کتب فقہ سے ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ

مرکب ہوائی میں سوار ہوکر طواف کرنے سے طواف تو صحیح ہوجائے گا بشرطیکہ مرکب ہوائی داخل حد مسجد رہے لیکن بلا عذر ایسا کرنے سے دم واجب ہوگا جیسا کہ مرکب غیر ہوائی میں بھی بلا عذر سوار ہوکر طواف کرنے کا یہی حکم ہے اور مرکب ہوائی میں سوار ہوکر عرفات کے مرور سے وقوف عرفہ ادا نہوگا قال فی البدائع واما مکان الطواف فمکانہ حول البیت اھ (ص ۱۳۱) وفی غنیۃ الناسک الطواف ھو الدوران حول الکعبۃ کیف ما حصل اھ اما ارکانہ فثلاثۃ اتیان اکثرہ وکونہ بالبیت لا فیہ وکونہ بفعل نفسہ ولو محمولا او راکب بعیر واما شرائطہ فستۃ ثلثۃ منھا لا یفوتہ الحج وھی الوقت وتقدیم الاحرام وتقدیم الوقوف والباقی للکل وھی الاسلام وداخل المسجد ولو علی سطحہ فلو طاف علی سطح المسجد جاز ولو مرتفعا عن البیت لو طاف خارج المسجد مع وجود الحیطان لا یصح اجماعاً ولو کان الحیطان منھدمۃ لا یصح عند عامۃ العلماء لانہ طاف بالمسجد لا بالبیت اھ (ص ۸۵) چونکہ طواف کی حقیقت دوران حول البیت ہے اور مکان طواف حول البیت ہے اور بیت کے متعلق یہ تصریح موجود ہے کہ ہوا کعبہ عنان سماء تک بیت ہے اور اسی لئے طواف بیت سے مرتفع ہوکر بھی جائز ہے اس لئے مرکب ہوائی میں بشرائط مذکورہ طواف صحیح ہوجائے گا۔ لیکن وقوف عرفہ کے متعلق کہیں یہ تصریح نہیں ملی کہ ہواء ارض عرفہ عنان سماء تک بحکم عرفہ ہے بلکہ اکثر کتب میں وقوف کو ارض کے ساتھ مقید کیا ہے قال فی البحر وشرطہ اى الوقوف شیئان احدھما کونہ فی ارض عرفات اھ (ص ۳۳۹ ج ۲) وفی العالمگیریۃ ایضا الوقوف شرطہ شیئان احدھما کونہ فی ارض عرفات والثانی ان یکون فی وقتہ اھ (ص ۱۴۸ ج ۱) وفی الدر والقیام والنیۃ فیہ ای الوقوف لیست بشرط ولا واجب فلو کان جالسا جاز حجہ وذلک لان الشرط الکینونۃ فیہ اھ قال الشامی ای فی محل الوقوف المعلوم من المقام وفی شرح اللباب والظاھر ان ھذا الرکن لعدم تصور الوقوف بدونہ نعم الوقت شرطہ اھ قلت والمعلوم لیس الا ارض عرفۃ (ص ۲۸۴ ج ۲) اور ظاہر ہے کہ وقوف بارض عرفۃ یا کینونۃ بعرفۃ راکبا علی الدابۃ یا محمولا علی الایدی میں بواسطہ متحقق ہے بلا واسطہ متحقق نہیں اور مرکب ہوائی میں راکب کو وقوف بارض عرفہ کسی طرح حاصل نہیں نہ بواسطہ نہ بلا واسطہ ہاں مرور بہواء عرفہ متحقق

ہے پس اگر کسی دلیل سے ہوائے عرفہ کا بحکم ارض عرفہ ہونا ثابت ہو جائے تو یہ مرور قائم مقام وقوف بارض عرفہ کے ہو سکتا ہے مگر ہنوز کہیں اس کی تصریح نہیں ملی ہے لہذا افتاء بصحت وقوف فی ہذہ الصورۃ مشکل ہے واللہ اعلم حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۳ صفر ۴۵ھ

احقر اشرف علی قیاساً علی کون ہواء الکعبۃ فی حکمہا وکون ہواء المسجد فی حکمہ صحت کو راجح سمجھتا ہے لیکن جزم نہیں کرتا ۱۲

کتاب النکاح

دولہانے وقت نکاح "قبول کیا" کے بجائے اگر "الحمد للہ" کہا تو کیا حکم ہے

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں اگر نکاح خوانی کے وقت دولہا سے نکاح خواں نے یوں کہا مثلاً مریم بنت زید کو دو سو روپیہ مہرانہ کے عوض تمہارے عقد میں دیا وہ صرف الحمد للہ کہا اب نکاح ہوا یا نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ "قبول کیا میں نے" کی جگہ میں اگر صرف الحمد للہ کہدیا تو نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟

(**تنقیح**) اس موقعہ پر الحمد للہ کہنے سے شہود اور حاضرین کیا سمجھتے ہیں تبلایا جائے۔ کیونکہ الحمد للہ ہمارے عرف میں صیغہ قبول کا نہیں ہے تو کیا بنگالہ کی کوئی خاص اصطلاح ہے۔

قال فی الخلاصۃ وفی مجموع النوازل قال زوجنی نفسک منی فقالت بالسمع والطاعۃ صح النکاح ولو قالت سپاس دادم لا ینعقد اھ (ص ۳ ج ۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ الحمد للہ کہنے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

منگنی کے وقت کا ایجاب وقبول ایک قسم کا وعدہ ہے

سوال (۲) جناب مولانا صاحب مولوی ومفتی اشرف علی صاحب! دام فیوضکم السلام علیکم عرض ہے کہ کمترین کو واپسی خط ملا آنجناب نے تحریر فرمایا ہے کہ لفظ کس طرح کہے گئے تھے۔ اب اس طرح لکھتا ہوں پہلے بھی آنجناب کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ اس منگنی کے سال دو سال بعد پھر نکاح وشادی کرتے ہیں اس کو منگنالے مشہور کرتے ہیں گویا اس کو اصلی نکاح تصور ومشہور نہیں کرتے یہ رسمی معاملہ ہے۔ لڑکی کا والد لڑکے کے والد کو کہتا ہے کہ میں نے اپنی لڑکی فاطمہ تمہارے لڑکے نور محمد کو بخشی، لڑکے کے والد نے کہا میں نے قبول کی تین دفعہ اس طرح کہا۔ اور جیسے نکاح کے وقت گواہ

مقرر کئے جاتے ہیں گواہ کوئی مقرر نہیں کئے۔ ہمارے اس ملک میں اس کا نام منگنا وشرح ایجاب رکھا ہے۔ کیونکہ اس رسم کے بعد دوبارہ دن شادی کے مقرر کرکے پھر نکاح پڑھایا جاتا ہے۔ اب لڑکی کا والد دوسری جگہ نسبت کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مجلس خطبہ میں یہ الفاظ وعدہ پر محمول ہوں گے لہذا نکاح نہیں ہوا اور لڑکی کا والد دوسری جگہ نسبت کر سکتا ہے۔ قال فی الدر او ہل اعطیتنیہا ان المجلس للنکاح وان للوعد فوعد قال الشامی قولہ ان المجلس للنکاح ای لانشاء عقدہ لانہ یفہم منہ التحقیق فی الحال فاذا قال الآخر اعطیتکہا او فعلت لزم ولیس للاول ان لا یقبل اھ (ص ۴۳۳ ج ۲) قلت ہذا اذا کان المجلس للنکاح واما اذا کان للوعد فقول الآخر اعطیتکہا محمول علی الوعد، فافہم، واللہ اعلم حررہ الاحقر ظفر احمد ۲۳ صفر ۴۱ھ۔

منگنی کے وقت اولیاء طرفین کا ایجاب وقبول ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے

سوال (٦) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اس ملک پنجاب میں رواج ہے کہ منگنی کے وقت لڑکی کا ولی لڑکے کے ولی کو کہتا ہے کہ میں نے فلانی لڑکی تیرے فلانے لڑکے کو دی وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے لڑکے کے واسطے قبول کی اور بعدہ شادی کرتے ہیں اور نکاح وغیرہ بعد میں ہوتا ہے۔ اسی صورت سے جس لڑکی کی منگنی ہوئی ہو تو اس کا نکاح دوسری جگہ ہو سکتا ہے یا نہیں بینوا بالتفصیل توجروا بالاجر الجزیل اس لئے کہ ملک پنجاب میں تمام علماء کرام اختلاف ڈالتے ہیں آپ اسے صحیح لفظوں کے ساتھ بیان فرماویں؟

الجواب: قال فی الدر او ہل اعطیتنیہا ان المجلس للنکاح ان للوعد فوعد اھ قال الشامی ان المجلس للنکاح ای لانشاء عقدہ لانہ یفہم منہ التحقیق فی الحال الخ ص ۴۳۳ ج ۲۔ اس سے معلوم ہوا کہ منگنی کے وقت لڑکی کے ولی کا یہ کہنا کہ میں نے فلانی لڑکی تیرے لڑکے کو دی الخ یہ لفظ وعدہ پر محمول ہوگا نہ عقد نکاح پر کیونکہ مجلس وعدہ کی ہے نکاح کی مجلس نہیں ہے لہذا ان الفاظ سے نکاح نہ ہوگا اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ ہو سکتا ہے۔

نکاح بیوہ کا حکم

سوال (۴) بیوہ کا نکاح افضل ہے یا یوں ہی بحالت شباب بیٹھ رہنا بہتر ہے۔

الجواب: اگر بیوہ صاحب اولاد نہ ہو تو اس کو نکاح کر لینا افضل ہے اور دوسرے نکاح کو عیب سمجھنا تو سخت گناہ ہے اور اگر صاحب اولاد ہے اور دوسرے نکاح سے ان بچوں کے

ضائع ہونے کا اندیشہ ہے کہ شوہر کی خدمت وغیرہ کی وجہ سے ان بچوں کی پرورش بخوبی نہ کرسکے گی تو نکاح نہ کرنا بہتر ہے اور اگر بچوں کی پرورش سے نکاح ثانی مانع نہ ہو تو اس صورت میں بھی نکاح ہی افضل ہے اور یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ بیوہ کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں اپنے نفس پر پورا قابو ہو اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو ورنہ بہر صورت نکاح کرنا لازم ہے۔

زنا سے حاملہ عورت کے نکاح کا حکم اور اس کے حمل کا اسقاط جائز نہیں

سوال (۵) ایک مسلمان نوجوان کنواری عورت کو زنا سے حمل ہوگیا چھ سات مہینہ بعد حالت حمل میں ہی ایک مسلمان مرد نے باوجود علم ہونے کے ایک نا کم نکاح خوان قاضی کے ذریعہ اس سے نکاح پڑھ کر اپنے گھر میں ڈال لیا اس پر گاؤں کے باقی مسلمانوں میں اس بات کا چرچا ہوا مرد مذکور نے اپنی رسوائی چھپانے کے واسطے عورت کا حمل ساقط کردیا۔ کیا یہ نکاح صحیح ہوا اگر نہیں ہوا تو اس کے لئے کیا تعزیر ہونی چاہئے اور حمل ساقط کرنا جائز تھا یا ناجائز اس کے لئے کونسی تعزیر ہے عورت کو کیا تعزیر ہونی چاہئے نکاح خوان اور مرد مذکور کے معاون لوگوں سے کیسا سلوک ہو اور مرد مذکور نے حمل فاحش عورت مذکور کا ساقط کرنے کے بعد دوبارہ پھر نکاح پڑھا ہے۔ والسلام بیّنوا توجروا۔

الجواب: حاملہ من الزنا کا نکاح درست ہے خواہ زانی سے ہو یا غیر زانی سے البتہ اگر زانی سے ہو تو اس کو قبل وضع حمل وطی بھی جائز ہے اور غیر زانی کو وطی جائز نہیں جب تک وضع حمل نہ ہو لہذا صورت موجودہ میں نکاح اول درست ہوگیا تھا نکاح ثانی کی ضرورت نہ تھی لیکن چھ سات ماہ کا حمل ساقط کرنا ایک روایت پر موجب گناہ ہوا جسکا کفارہ توبہ و استغفار ہے اور ایک روایت پر گناہ نہیں ہوا فی العالمگیریۃ والعلاج لاسقاط الولد اذا استبان خلقه لایجوز وان کان غیر مستبین الخلق یجوز واما فی زماننا یجوز علی کل حال وعلیه الفتوی[مه] اھ (ص ۲۳۷ ج ۵)۔ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۴۱ھ۔

شیعہ رافضی کا سنّی عورت کے ساتھ نکاح کا حکم

سوال (۶) چہ فرمائید علماء ملت اہل سنت والجماعت دریں مسئلہ کہ نکاح بستن درمیان زن سنّیہ و مرد رافضی تفضیلی باشد یا سبی یا نکاح کردن مابین مرد سنّی و زن رافضیہ فی زماننا کہ در روافض سب بسیار است و تفضیلی کم اند خصوصاً در بلوچستان کہ رافضی تفضیلی یافتہ نمی شود در مذہب اہل سنت والجماعت

مه قلت ولم یظهر لی وجه الفتوی علی الجواز مطلقا ۱۲ ظفر

ونیز در مذہب اہل شیعہ جائز است یا نہ اگر کسے بطمع دنیا یا بوجہ ناواقفیت مسئلہ ایں چنیں نکاح کرد ایں طور نکاح فسخ میگردد یا باقی می ماند و اگر در صورت اول بوقت فیصلہ نزد حاکم مرد رافضی خود را تفضیلی سازد دریں تقدیر نکاح باقی می ماند یا نہ۔ چونکہ در بلوچستان عالم شریعت نبوی کم اند بسیار تنازع برخاستہ است حق ظاہر نمی شود آں کس کہ ایں نکاح را جائز میدارد حوالۂ فتاویٰ مولوی عبدالحئی مرحوم می دہد و آں فریقیکہ جائز نمی دارد فتاوی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی را پیش می آرد غرض قول مفتیٰ بہ معلوم نمی شود آنچہ کہ دریں مسئلہ حکم مفتی بہ باشد بحوالہ کتاب مع صفحہ ارقام فرمائید۔ بیّنوا توجروا۔

الجواب: ھو المصوب؛ جواب محقق نزد ما ایں است کہ رافضی کہ قذف حضرت سیّدہ عائشہ را جائز شمارد و قائل تحریف در قرآن کریم باشد یا قائل بجزو نفاق حضرت صدیق بود کافر است و اگر بجز تبرا و سب شیخین ہیچ از امور کفریہ ظاہر نماید فاسق است پس در صورت اولیٰ نکاح سنّیہ با ایں چنیں روافض ہرگز صحیح نشود بلکہ حکم زنا دارد و ایں سنّیہ را جدائی از او لازم است و اگر حاملہ نباشد معاً نکاح و دخول از مرد سنّی جائز است والّا بعد از وضع حمل۔ و در صورت ثانیہ تفصیل است اگر زن نابالغہ است و ولی آں را علم بفسق آں نبود بلکہ رافضی را صالح و عادل گمان کردہ باو نکاح کرد بعد ازاں فسق آں معلوم شد و زن سنّیہ بعد از بلوغ اظہار ناراضگی ازیں نکاح کرد پس ایں نکاح ہم باطل است و اگر فسق ایں جماعت از اول معلوم بود و دیدہ و دانستہ ولی شرعی زن نابالغہ یا بالغہ سنّیہ بنکاح رافضی داد ایں نکاح درست شد و بدون طلاق مرتفع نگردد و اگر زن سنّیہ بدون اجازت ولی از خود نکاح با ایں چنیں رافضی کند ہم باطل شود و حاجت بطلاق نیفتد بدون طلاق بمرد دیگر از اہل سنت نکاح می تواند کرد اما بعد از تفریق عدت گزاردن لازم است اگر دخول شدہ باشد و عدت آں سہ حیض بود۔ قال العلامۃ الشامی فی ردّ المحتار علی ان الحکم علیه بالکفر مشکل لما فی الاختیار اتفق الائمة علی تضلیل اهل البدع اجمع وتخطیتهم وسب احد من الصحابة وبغضه لایکون کفراً لکن یضلل الخ۔ الی ان قال نعم لاشک فی تکفیر من قذف السیدة عائشة رضی الله عنها او انکر صحبة الصدیق او اعتقد الالوهیة فی علی رضی او ان جبریل غلط فی الوحی، او نحو ذلک من الکفر الصریح المخالف

للقرآن اھ ص ۲۵۳ ج ۳ ۔ قلت علی ھذا فمن نسب الصدیق رضی اللہ عنہ
الی الکفر والنفاق فھو کافر لانہ منکر صحبتہ وھی ثابتۃ بالنص اذ یقول
لصاحبہ لاتحزن ان اللہ معنا الآیۃ وفی العالمگیریۃ رجل زوج ابنتہ
الصغیرۃ من رجل علی ظن انہ صالح لایشرب الخمر (مثلاً) فوجدہ الاب
شریبا مدمنا وکبرت الابنۃ فقالت لاارضی بالنکاح ان لم یعرف ابوھا
بشرب الخمر وغلبۃ اھل بیتہ الصالحون فالنکاح باطل ای یبطل وھذہ
المسئلۃ بالاتفاق (ای بین الامام وصاحبیہ ۱۲) وکذا فی الذخیرۃ وفیھا
ایضا ثم المرأۃ ان زوجت نفسھا من غیر کفو صح النکاح فی ظاھر الروایۃ وروی
الحسن عن ابی حنیفۃ رح ان النکاح لاینعقد وبہ اخذ کثیر من مشائخنا کذا
فی المحیط والمختار فی زماننا للفتوی روایۃ الحسن وقال الشیخ الامام
شمس الائمۃ السرخسی رح روایۃ الحسن اقرب الی الاحتیاط اھ ص ۱۶ ج ۲ ۔
واللہ اعلم وقد صرح العلماء بوجوب العدۃ فی النکاح الفاسد بعد
الدخول کما لایخفی علی من لہ ادنی نظر فی الفقہ ۔ ۲۱ شوال ۱۳۴۱ھ ۔

اس شرط کے ساتھ نکاح کرنا کہ بیوی شوہر کے وطن سے باہر نہیں جائیگی

سوال (۷) السلام علیکم ۔ عرض یہ ہے کہ خادم نے اس جگہ نکاح کیا مگر میری زوجہ نے یہ شرط کرلی ہے کہ وہ میرے ہمراہ ہندوستان نہ جائے گی اب چند شخصوں نے یہ شبہ ڈال دیا ہے کہ چونکہ اس نکاح میں شرط ہوگئی ہے اس لئے یہ متعہ ہے مہربانی فرماکر متشرع حکم بتلادیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مغالطہ میں گنہگار رہوں اگر حقیقۃً یہ متعہ ہوا تو زوجہ کو طلاق دے دوں گا ورنہ خیر، والسلام ۔

الجواب : یہ نکاح بالکل درست اور بہمہ وجوہ صحیح ہے متعہ ہرگز نہیں جس نے متعہ کا شبہ ڈالا ہے وہ مسائل شرعیہ سے محض ناواقف ہے متعہ اس کو نہیں کہتے کہ نکاح کے ساتھ کوئی شرط کرلی جائے بلکہ متعہ یہ ہے کہ نکاح خاص مدت کے لئے کیا جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ میں دو سال کے لئے نکاح کرتا ہوں یا یوں کہا جائے کہ جب تک میرا قیام بغداد میں ہے اس وقت تک کے لئے نکاح کرتا ہوں اور اگر یوں نہ کہا جائے بلکہ صرف یہ کہا جائے کہ میں تجھ سے نکاح کرتا ہوں اس پر عورت یوں کہے کہ میں اس شرط سے نکاح منظور کرتی ہوں کہ مجھ کو بغداد سے باہر نہ لے جایا جائے بلکہ یہیں رکھا جائے اور شوہر اس شرط کو منظور کرلے تو یہ ہرگز متعہ نہیں بلکہ نکاح صحیح شرعی ہے

خزانۃ الروایات مینویسد فی الغیاثیۃ سئل نجم الدین النسفی عمن قال دختر خویش فلانۃ بمن دادی گفت دادم وی گفت پذیرفتم ھل ینعقد النکاح فیہ اختلاف المشائخ عند بعض لاینعقد حتی یقول بزنی دادم وعند بعض یکون نکاحا بدون ذکر ذلک وھو الاصح، پس بنابریں روایت اصح درصورت سوال نکاح صغیر وصغیرہ منعقد شد وپدر پسر را بجدامی طرح جائز نیست کہ آں مخطوبہ ومنکوحۂ پسر را درنکاح خود آرد ۔

اور اسی طرح اسی فتاویٰ کے اندر دوسری جگہ اسی طرح کے استفتاء کے جواب میں دوسری عبارت یہ نقل فرمائی ہے :

ودر جامع مضمرات شرح مختصر قدوری می آرد فی النسفیۃ سئل عمن قال لامرأۃ بحضرۃ الشھود دختر خویش بمن دادی فقالت دادم ھل ینعقد النکاح فقال نعم لان الناس تعارفوا التزویج بھذا اللفظ وان لم یتلفظوا بلفظ النکاح، لان النکاح ینعقد عندنا بلفظ الھبۃ خلافا للشافعی رح ۔

یا کہ صورت مسئولہ اس عبارت شامی ودر مختار میں داخل ہوکر منعقد نہ ہوگا اور منگنی پر محمول ہوگا اور وہ عبارت شامی کی تو یہ ہے قال فی شرح الطحاوی لو قال ھل اعطیتنیھا فقال اعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح اور در مختار کی عبارت یہ ہے ھل اعطیتنیھا ان المجلس للنکاح وان للوعد فوعد' اور یہی فرمایا ہے کہ اگر نکاح منعقد ہوتا ہے تو شامی ودر مختار کی غرض و توجیہ کیا ہے اور فرق درمیان صورت مسئولہ میں اور مذکورہ در مختار میں کیا ہے اور اگر نکاح نہیں ہوتا بموجب ان عبارتوں کے تو پھر مولانا عبدالحی رح کی عبارت کی توجیہ وغرض کیا ہے بالتفصیل تحریر فرماویں بیّنوا توجروا؟

الجواب : لفظ دادم وپذیرفتم اگر مجلس خطبہ (منگنی) میں استعمال کیا جاوے تو اس سے نکاح منعقد نہ ہوگا بلکہ محض وعدہ پر محمول ہوگا ۔ اور مولانا عبدالحی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجلس نکاح میں دادم وپذیرفتم استعمال کیا گیا تو نکاح ہوجائے گا جس کا قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عبارت میں یہ اختلاف بھی نقل فرمایا ہے "عند البعض لاینعقد حتی یقول بزنی دادم وعند البعض یکون نکاحا بدون ذکر ذلک" اھ اور یہ اختلاف مشائخ مبنی اس پر ہے کہ لفظ "دادم" مطلقاً معنی نکاح کی تعبیر کرسکتا ہے یا کہ "بزنی" زیادہ کرنے کی بھی ضرورت ہے ۔ یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ مولانا عبدالحی صاحب اس صورت کو بیان فرما رہے ہیں جب کہ

اور مرد کے ذمہ عورت کی اس شرط کا ایفاء لازم ہے وہ اس کو ہندوستان لانے کا مجاز نہیں البتہ اگر وہ اپنی اس شرط کو واپس لے لے تو پھر ہندوستان لا سکتا ہے۔

قال فی الھدایۃ (ص ۳۰۹ ج ۲) ولو تزوج علی الف ان اقام بھا وعلی الفین ان اخرجھا فان اقام بھا فلھا الالف وان اخرجھا فلھا مھر المثل لا یزاد علی الفین ولا ینقص عن الف وھذا عند ابی حنیفۃ رح وقالا: الشرطان جائزان جمیعاً حتی کان لھا الالف ان اقام بھا والالفان ان اخرجھا اھ وفیہ ایضاً (ص ۳۱۴ ج ۲) واذا اوفاھا مھرھا نقلھا حیث شاء لقولہ تعالیٰ: اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ وقیل لا یخرجھا الی بلد غیر بلدھا لان الغربۃ تؤذی اھ قلت وعلیہ الفتوی حتی یمنع الزوج من نقلھا الی غیر بلدھا بغیر رضاھا صرح بہ فی الشامیۃ وفی الدر المختار ولیس منہ (ای من نکاح المتعۃ) ما لو نکحھا علی ان یطلقھا بعد شھر الخ وفیہ ایضاً لو عقد معہ شرط فاسد لم یبطل النکاح بل الشرط اھ (ص ۴۸۳ مع الشامی)۔

قلت: ولو عقد مع شرط صحیح لم یبطل شیئ منھا کما ھو ظاھر۔ واللہ اعلم۔ ۷ جمادی الثانی سنہ ۴۲ھ۔

حلالہ کے بعد نکاح کا حکم جبکہ زوج ثانی منکر وطی ہو اور عورت مدعی دخول

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو طلاق ثلاثہ سے فارغ کر دیا بعد عدت کے عمر کے پاس حیلہ کیا یعنی عمر سے نکاح دیا بعد چند روز کے زید نے کسی طرح پھر طلاق دلوا کے بعد عدت کے پھر اپنے نکاح میں لایا مگر نکاح کرتے وقت اس کی زوجہ سے یہ بات نہیں پوچھا کہ عمر نے اس کے ساتھ صحبت کیا ہے یا نہیں مگر یہ بات مشہور ہے کہ عمر نے طلاق دینے کے وقت جو لوگ حاضر تھے وہ لوگ کہتے ہیں کہ عمر نے طلاق دینے کے وقت صاف صاف کہدیا کہ زید نے اپنی بیوی کو جیسا امانت رکھا ہے ابھی ویسا ہی میرے پاس امانت ہے کسی طرح خیانت نہیں ہوئی یعنی میرے ساتھ فقط نکاح ہوا ہے صحبت نہیں ہوئی زید کے نکاح جدید کے دو یا تین مہینہ کے بعد جب مشہور ہوا کہ زید نے جو نکاح کیا ہے وہ فاسد ہے تب زید کی بیوی نے قسم کھا کر کہا کہ عمر نے میرے ساتھ صحبت کیا ہے حالانکہ عمر نے پہلے طلاق کے اور بعد طلاق کے بھی لوگوں کے پاس ظاہر کیا ہے کہ میں نے زید کی بیوی کو صحبت سے پہلے ہی طلاق دیا ہے موافق شرع شریف کے

عمر کا قول معتبر ہے یا زید کی بیوی کا معتبر ہے اور کس کے قول کے موافق فیصلہ ہوگا۔ اور زید نے جو نکاح جدید کیا ہے اگر فاسد ہو اور وہ توبہ کرکے باز نہ آوے تو اس سے اختلاط یعنی زید کے ساتھ اکل وشرب درست ہے یا نہیں کس کے قول پر ترجیح ہے کتب کی کوئی عبارت برائے مہربانی نقل کرکے دینا تاکہ ہر طرح اطمینان ہو۔ بینوا توجروا۔ فقط۔

الجواب: قال فی الدر قال الزوج الثانی کان النکاح فاسداً او لم یدخل بھا وکذبتہ فالقول لھا اھ قال فی الشامیۃ کذا فی البحر وعبارۃ البزازیۃ ادعت ان الثانی جامعھا وانکر الجماع حلت للاول وعلی القلب لا اھ (ص ۸۶۲ ج ۲) اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں عورت کا قول معتبر ہے اور زید کا نکاح جدید اس عورت سے درست ہے۔ واللہ اعلم۔

وفی العالمگیریۃ لو اخبرت المرأۃ ان زوجھا الثانی جامعھا وانکر الزوج الجماع حلت للاول ولو کان علی القلب بان انکرت واقر الزوج الثانی لا تحل اھ (ص ۱۲۹ ج ۲) وقولہ لو اخبرت الخ یدل علی انہ لا احتیاج الی قضاء القاضی فی المسئلۃ فافھم۔ ۱۰ شعبان سنہ ۴۲ھ۔

منگنی کے وقت ایجاب وقبول کا حکم

سوال (۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ زید نے مجلس عام منگنی میں روبرو گواہان کے کہا کہ میں نے اپنی لڑکی عمرو کے لڑکے کو دی اور عمرو نے اوسی وقت ایک ہی مجلس میں کہا کہ میں نے قبول کی اور زید کی لڑکی اور عمرو کا لڑکا دونوں صغیر ہیں اب فرمائیے کہ اس صورت میں زید کی لڑکی کا عمرو کے لڑکے کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاوے گا جیسا کہ مولانا مولوی عبد الحی رح کے فتاوی میں تصریح ہے کہ اصح روایت پر صورت مذکورہ میں نکاح ہو جاتا ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

استفتاء: چہ فرمایند علمای دین کثرہم اللہ تعالیٰ درصورت مسئولہ کہ یک شخص جماعت خود را دعوت خطبہ داد و مردمان جماعت بدعوت خطبہ جمع شدند ودر مجلس خطبہ درمیان ولی دختر صغیرہ وولی پسر صغیر ایجاب وقبول بالفاظ دادم وپذیرفتم جاری شد پس بایں ایجاب وقبول کہ بالفاظ مذکورہ در مجلس خطبہ جاری شدہ است دختر منکوحہ پسر شد یا نہ بینوا توجروا؟

جواب: ھو المصوب در انعقاد نکاح بلفظ دادم وپذیرفتم اختلاف مشائخ حنفیہ ست بعض حکم بانعقاد می سازند وبعض نہ ودر کتب معتبرہ قول اول را اصح گفتہ اند ودر

یہ دادم وزیر یرفتم مجلس نکاح میں استعمال کیا جائے۔ یا ایسی مجلس میں استعمال کیا جائے جو نہ مجلس خطبہ ہے نہ مجلس نکاح ہے۔ باقی اگر مجلس خطبہ میں ان کو استعمال کیا گیا تو حسب تصریح درمختار محض وعدہ پر محمول کیا جائے گا، واللہ اعلم۔ ۱۸ رمضان ۴۲ھ۔

مشرک عورت کو جبراً مسلمان کرکے اس سے نکاح کرنے کا حکم

سوال (۱۰) ماقولکم رحمکم اللہ تعالیٰ اس صورت میں کہ ایک عورت مشرکہ اپنے گھر میں تھی اس کی اور اس کی ساس میں باہم لڑائی ہوگئی ساس نے اس کو مارا اور کہا کہ نکل جا ہمارے گھر سے تو اس کو اس کہنے پر غصہ آیا اور اپنے میکہ کو نکل چلی کہیں راستہ میں ایک جگہ کوئی ایسا آدمی رہتا تھا کہ وہ اکثر ایسی عورتوں کو بہکا کر ادھر ادھر کر دیا کرتا تھا اس مشرکہ مذکورہ کو بھی اس نے اپنے پاس ٹھہرا کر ایک دو روز کے بعد کسی شخص کو بلا کر اور اس سے کچھ روپیہ وصول کر کے عورت مذکورہ کو اس کے ہمراہ کر کے گاڑی میں بٹھا دیا اور کہا کہ ان کے ساتھ جا یہ تجھ کو تیرے باپ کے یہاں پہونچا دیں گے وہاں سے چل کر کچھ مسافت کے بعد گاڑی سے اترے تو اس عورت نے کہا یہ تو میرے میکہ کا راستہ نہیں لانے والے نے دھمکایا اور کہا کہ ہمارے ساتھ چل اور خاموش رہ ورنہ ہم تجھ کو مار ڈالیں گے اور پھر اپنے مکان میں لا کر چند روز رکھا اور دھمکیاں دیتے رہے کہ تو مسلمان ہوجا ورنہ ہم تجھ کو مار ڈالیں گے بالآخر چار ناچار وہ راضی ہوگئی چند روز کے بعد ایک آدمی کو بلا کر چند آدمیوں کے سامنے اس کو مسلمان کیا اس عورت نے بخوبی کلمہ شریف پڑھا اور اپنے پہلے دین سے بریت اور اسلام سے اپنی رغبت ظاہر کردی اور اقرار کیا کہ احکام اسلامی کو بجا لایا کروں گی اور اسی کو اپنا دین سمجھا کروں گی تو یہ عورت شریعت محمدیہ کی رو سے مسلمان ہوگئی یا نہیں ہوئی؟ بینوا توجروا۔

تنقیح: فی رد المختار فاذا قال انا مسلم طائعاً فھو دلیل اسلامہ وفیہ فاذا اتی بھما (ای بالشھادتین) طائعاً یجب الحکم باسلامہ ج ۳ ص ۴۲۵ بنابراں روایات کے دیکھنا چاہئے کہ اظہار رضا و رغبت طائعاً ہے یا اب بھی اس کو وہی خوف ہے کہ اگر ایسا نہ کروں گی تو مجھ کو مار ڈالیں گے اور اس کے گمان میں یہ ہے کہ یہ ایسا کرسکتے ہیں جواب اس کی تحقیق پر موقوف ہے

جواب تنقیح: اس عورت مذکورہ بالا سے جو دریافت کیا گیا کہ مسلمان ہوگئی ہے تو (۱) نے نہایت خوشی سے مسلمان ہونے کا اظہار کیا اور جب جدا گانہ پوچھا گیا ہے کہ تجھ کو پھر اسی پہلے دین کی طرف رغبت محبت ہے (۲) دین میں جانا چاہتی ہے؟ تو اس سے بالکل انکار کرتی ہے،

اور اسلام لانے پر خوش ہے اور کسی قسم کا خوف نہیں ظاہر کرتی ہے اور جانتی ہے کہ میں ذی اختیار ہوں اگر پہلے دین کو اختیار کروں تو مجھ کو کوئی شے مانع نہیں ہے بینوا بالجواب توجروا۔

۱۵

الجواب: قال قاضیخان فی فتاواہ (ص ۴۱۶ ج ۴) من باب الاکراہ: واذا اجبر الکافر علی الاسلام فاسلم صح اسلامہ فان ارتد بعد ذلک یجبر علی الاسلام ولا یقتل اھ۔

صورت مسئولہ میں اس عورت مشرکہ کا اسلام معتبر ہوگیا اب اس کو مسلمان ہی سمجھنا چاہئے اگر اس کا شوہر کافر زندہ ہے تو وقت اسلام سے تین حیض گذر جانے کے بعد اس کا نکاح مسلمان مرد سے ہوسکتا ہے تین حیض گذرنے سے پہلے نکاح درست نہ ہوگا، واللہ اعلم۔ ۱۹ ذیقعدہ ۴۲ھ

مشرک سے اس کی نابالغ لڑکی خریدنے سے اس کا مالک نہ ہونا۔ اور بحالت نابالغی اس سے نکاح کا حکم

سوال (۱۱) اگر کسی نے مشرکہ لڑکی کو اس کے ماں باپ سے جو مشرک ہیں خرید لیا اور وہ لڑکی نابالغہ ہے اگر اس نے اس کو مسلمان کرلیا اور بعض ضرورتوں کی وجہ سے دو گواہوں کے سامنے اس سے نکاح اس طرح کیا کہ دو گواہ جانتے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا تو یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ نکاح لڑکی کے عدم بلوغ میں ہوا ہے۔

الجواب: قال الشامی فی النھر عن منیۃ المفتی اذا باع الحربی ھناک ولدہ عن مسلم عن الامام انہ لایجوز ولا یجبر علی الرد وعن ابی یوسف یجبر علی الرد اذا خاصم الحربی اھ (ص ۳۷۶ ج ۳)۔

صورت مسئولہ میں یہ نکاح درست نہیں ہوا کیونکہ یہ شخص اس لڑکی کے خریدنے سے اس کا مالک نہیں ہوا اور یہ اس کا ولی بھی نہیں جو نابالغی کی حالت میں اس کا نکاح کرسکے پس بعد بلوغ کے اس لڑکی کی رضا سے نکاح کرنا چاہئے قلت وفی بعض الروایات انہ یملک لو کان اھل الحرب یرون جوازھذا البیع فعلی ھذا ایضا لم یصح النکاح لکونہ من سیدھا ونکاح الامۃ من سیدھا لایجوز والروایۃ المشار الیھا ذکرھا العلامۃ عبدالحی فی فتاواہ عن البزازیۃ بلفظ والصحیح ان کان البائع یری جواز بیعہ ملکہ مطلقا وان کان لا یری ان اشتراہ ذھب بہ مکرھا ملکہ بالقھر اھ (ص ۱۰۲ ج ۱) والظاھر من حال الکناسین ...... والکافرین من اھل الھند انھم یرون ذلک جائز الشیوعۃ

فیما بینهم من غیر نکیر ولکن لا افتی بجواز الاستمتاع بهذا الملك لاختلاف الروایات فی الباب، واللہ اعلم۔ ۲۰ محرم سنہ ۴۵ھ۔

حکم نکاح سنیہ با رافضی

سوال (۱۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس معاملہ میں جس کی کیفیت ذیل میں درج ہے :۔

زید کا آبائی مذہب شیعہ تھا اس کے بہن کی شادی ایک سنت جماعت سے ہوئی کچھ عرصہ کے بعد زید مع اپنے باپ کے اس مقام پر چلا آیا جہاں اس کی بہن تھی اور علیحدہ رہ کر کاروبار کرنے لگا زید کا باپ فوت ہو گیا اور اس نے کچھ عرصہ کے بعد بخوشی خود مذہب اہل سنت وجماعت اختیار کر لیا وہ بے پڑھا اور نہایت سادہ لوح آدمی تھا کسی قسم کا مذہبی تعصب نہ تھا نہ کوئی مذہبی واقفیت تھی البتہ جب سے وہ شریک اہلسنت وجماعت ہوا نماز عیدین میں برابر سنت جماعتوں میں شریک ہوتا تھا اور جملہ رسومات اہل سنت وجماعت ادا کرتا تھا اس کی شادی بھی سنت جماعتوں میں ہوئی اور اس کی زوجہ کا مذہب سنت جماعت ہے زید کی ایک لڑکی ہوئی جس کی شادی ایک درمیانی شخص نے یہ خیال کر کے کہ اس کا گھرانہ شیعہ رہا ہے ایک شیعہ گھرانے میں طے کی جس کو زید نے اپنی بے تعصبی سے منظور کر لیا لڑکی کی عمر اس وقت آٹھ یا نو سال کی تھی اور وہ اپنی ماں باپ کے موجودہ مذہب پر یعنی سنت جماعت پر تھی نکاح کے وقت کسی قاضی عالم نے نکاح نہیں پڑھایا نہ ایجاب وقبول کرایا گیا نہ کوئی گواہ نہ وکیل لڑکی کی طرف کا ہے (یہ بات یقینی ہے کہ زید نے اجازت دے دی ہوگی ورنہ ازدواج ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن اجازت دینے کا بھی کوئی گواہ لڑکی کی طرف والوں میں نہیں پایا جاتا جس کے لڑکے کے ساتھ نسبت ہوئی سُنا جاتا ہے کہ اس کے چچا نے اپنی طریقہ پر صیغہ پڑھ لیا تھا اور یہ ازدواج کی رسم ختم ہو کر کھانے کے بعد بارات رخصت ہو گئی لڑکی کی رخصت بوجہ نابالغی نہیں ہوئی چار سال بعد لڑکی کی رخصت ہوئی اور وہ پندرہ روز اپنے سُسرال میں رہ کر واپس آئی اس وقت کوئی بات خلاف نہیں ہوئی آٹھ ماہ کے بعد وہ پھر سُسرال گئی اور چار ماہ وہاں رہی اسی عرصہ میں عشرہ محرم پڑا اس گھرانے کی عورتوں نے اپنی رسم کے موافق چوڑیاں توڑیں اور سینہ کوٹ کوٹ کر ماتم کیا اس کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم کیا گیا چونکہ یہ سنت جماعت تھی اور بچپن سے اس کی عادتیں تھیں نہیں اس نے انکار کیا انکار پر اسے اس کو مار پڑی اور زبردستی چوڑیاں توڑ دی گئیں اور ماتم کرنے اور رونے پر مجبور کی گئی اور بھی رسوم ان لوگوں نے کیں جس کو اعمال کہتے ہیں جو بنا ء فساد درمیان شیعہ وسنت جماعتوں کے ہے اس کے علاوہ بھی معمولی روزمرہ کے برتاؤ میں طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں

لڑکی کو یہ باتیں شاق گذریں مگر مجبور تھی چار ماہ بعد وہ لوگ رخصت نہیں کرتے تھے لیکن کسی طرح بہزار کوشش رخصت کرائی جا کر اپنے ماں باپ کے گھر آئی اور سب حال بیان کیا اور کہا کہ میں اب اُس گھر جانا نہیں چاہتی کسی طرح میرا وہاں سے پیچھا چھوڑایا جاوے مجھے سخت تکلیف دی جاتی ہے اور مجھے یہاں تک خیال ہے کہ اگر اب میں وہاں گئی تو پھر واپس نہ آؤں گی اس پر زید نے قصد کر لیا کہ وہ لڑکی کو وہاں نہ بھیجے گا اور خلع کرالے گا لیکن چند روز بعد زید بقضاء الٰہی فوت ہو گیا اس کی زوجہ لڑکی کو رخصت نہیں کرتی اور نہ وہ لڑکی کسی طرح جانے کو راضی ہے اب لڑکی کے سُسرال والوں نے عدالت سے رخصت کرا دئیے جانے کا دعویٰ کیا۔ لڑکی کہتی ہے کہ میں نابالغ تھی مجھے خبر نہیں کہ میرا نکاح کیسے ہو گیا مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا نہ تعداد مہر کی معلوم ہے کہ کیا باندھا گیا چونکہ اب میں بالغ ہوں میں ایسے جگہ ہرگز جانا نہیں چاہتی جہاں مجھ سے وہ رسوم کرائی جائیں جو میں نے کبھی نہیں کیں اور ہر طرح کی تکلیف دی جاوے اور بزرگان دین کو بُرا بھلا خود کہا جاوے اور مجھ سے کہلوایا جاوے۔ میں اب اگر وہاں جاؤں گی تو پھر واپس نہیں آسکتی میرا خلع کرا لیا جاوے، اب شرع شریف اس بارہ میں کیا حکم دیتی ہے کہ آیا باوجود اس کے کہ لڑکی کا صیغہ نابالغی میں پڑھا گیا ایجاب وقبول نہیں کرایا گیا تعداد مہر معلوم نہیں۔ نکاح اہل سنت وجماعت کے طریق پر نہیں ہوا جو کہ لڑکی اور اوس کے والدین کا مذہب ہے اس کو ہر طرح تکلیف دی جاتی ہے اپنے مرضی اور عقائد کے خلاف باتیں کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی کیا اوس کو خلع نہیں مل سکتا اور وہ جبراً سُسرال بھیجے جانے پر مجبور کی جا سکتی ہے اگر وہ وہاں گئی تو پھر اون لوگوں کے اختیار میں ہوگی وہ جیسا چاہیں اس کے ساتھ برتاؤ کریں کوئی اس کی طرف سے فریاد کرنے والا نہیں۔ اس کی ماں بیوہ اور لڑکی کے سُسرال علاقہ انگریزی میں ہے اور اس کی ماں ریاست میں رہتی ہے جواب تحریر فرما کر عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں فقط؟

الجواب : روافض کے متعلق علماء سنت وجماعت کے دو قول ہیں بعض محققین کے نزدیک رافضی کافر ہیں پس اُن کے قول پر کسی سنی عورت کا نکاح رافضی مرد سے درست نہیں ہو سکتا نعم یجوز نکاح الرافضة بالرجل السنی لکونها کتابیة قال فی التحریر المختار وجعل الرحلی فی حاشیة المنح المعتزلة والرافضی بمنزلة اهل الکتاب حیث قال تحت قوله وصح نکاح کتابیة، اقول یدخل فی هذا الرافضة بانواعها والمعتزلة فلا یجوز ان تتزوج المسلمة السنیة

من الرافضی لانہا مسلمۃ وھو کافر فدخل تحت قولھم لا یصح تزوج مسلمۃ
بکافر اھ وقال الرستغفنی لا تجوز مناکحۃ بین اھل السنۃ والاعتزال اھ
فالرافضۃ مثلھم او اقبح والرملی جعلھم من قبیل اھل الکتاب فیجوز
نکاح نساءھم ولا یزوجون ولعلہ اعدل الاقوال لانہ لا شک فی کفر
الرافضۃ اھ سندی (ص ۱۸۳ ج ۱) اس قول کی بنا پر دختر زید کا نکاح رافضی
مرد سے درست ہی نہیں ہوا اور وہ بدون طلاق و نکاح کے دوسرے مرد سنی سے نکاح کر سکتی
ہے لیکن وطی بالشبہ کی وجہ سے اس کے ذمہ عدت ہوگی اور دخول کی وجہ مہر مثل کبھی بطور عقر
کے مستحق ہوگی۔ اور محققین حنفیہ کی ایک جماعت رافضیوں کو اطلاق کے ساتھ کافر نہیں کہتی بلکہ
وہ تفصیل کرتے ہیں کہ اگر رافضی قاذف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہو یعنی نعوذ باللہ ان پر
تہمت زنا لگاتا ہو یا قرآن میں تحریف و کمی بیشی کا قائل ہو تو کافر ہے اس کے ساتھ سنیہ کا
نکاح باطل ہے اور دخول کے بعد عدت و مہر کا وہی حکم ہے جو اوپر گذرا اور اگر قاذف عائشہ رض
نہیں۔ اور نہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور اس کے علاوہ اور بھی کوئی عقیدہ کفریہ نہیں رکھتا
تو کافر نہیں بلکہ فاسق ہے اس کے ساتھ سنیہ کا نکاح بعض صورتوں میں درست ہو جاتا
ہے مثلاً جب باپ دادا نے اپنی لڑکی سنیہ کا نکاح بلوغ سے پہلے کر دیا ہو مگر جس طرح ہو سکے
سنیہ کو طلاق یا خلع کر کے اس مرد سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے کیونکہ اس کے پاس رہنے
میں اس کے دین اور مذہب پر اندیشہ ہے پس صورت مسئولہ میں اگر دختر زید کا رافضی شوہر حضرت
عائشہ رض کو متہم کرتا ہے اور قرآن میں تحریف کا یا کسی اور عقیدہ کفریہ کا قائل ہے تو وہ کافر ہے
اور اس سے دختر زید کا نکاح صحیح نہیں ہوا اور اگر وہ اس عقیدہ کا نہیں۔ تو نکاح صحیح ہو گیا۔
لیکن حاکم کو چاہئے کہ خلع وغیرہ کرا کر اس عورت کو رافضی مرد سے طلاق دلا کر الگ کر دے ورنہ
عورت کو چاہئے کہ جہاں تک قدرت ہو اس سے اپنے کو بچائے قال الشامی نعم لا شک
فی تکفیر من قذف السیدۃ عائشۃ او انکر صحبۃ الصدیق او اعتقد
الالوھیۃ فی علی او ان جبرئیل غلط فی الوحی او نحو ذلک اھ (ص ۴۵۳ ج ۳)۔

۲۵ محرم ۴۵ھ۔

اس عورت سے جواز نکاح کا حکم جو زوج اول سے اپنا مطلقہ ہونا بیان کرتی ہو

سوال (۱۳) جناب در بارہ مسئلہ ذیل کیا فرماتے ہیں۔
ایک عورت میرے یہاں دو سال سے ملازم ہے جو کہ جوان ہے

اور میں اپنے ایک ملازم سے اس کا نکاح کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ بد چلن نہ ہو جاوے
لیکن اس میں صورتیں یہ پیدا ہو گئی ہیں اول یہ کہ مسماۃ کہتی ہے کہ اس کا طلاق ہو چکا ہے اور اس کے
شوہر نے بذریعہ خط کلکتہ سے اپنے ماں باپ کو لکھا ہے کہ اس کو گھر سے نکال دو ہم سے اور اس سے
اب کوئی واسطہ نہیں مگر اس خط کے جواب پر اس کے باپ نے یہ لکھا کہ ہم کس طرح سے نکال دیں
کیا تم اس کو طلاق دیتے ہو؟ اس دوسرے خط کے جواب میں اس نے یہ لکھا کہ ہم اس کو طلاق دیتے
ہیں تم گھر سے نکال دو اور اس گاؤں میں اس کو کہیں مت رہنے دو بڑی بدنامی ہوگی اور وہ
دوسری عورت کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گیا میں نے اس طلاق کی تحقیق میں بیحد کوشش کی جس کا نتیجہ
حسب ذیل ہے:

(۱) جو عورت اس کو اپنے ہمراہ اس کے سسرال سے لائی اس کا بیان یہ ہے کہ اگر اس کا
نکاح زید سے نہ ہوا اور کہیں دوسرے سے ہو تو میں کہہ سکتی ہوں کہ طلاق ہو گیا ہے۔

(۲) اس کا جیٹھ میرے پاس خود بغرض ملازمت آیا تھا اس سے میں نے طلاق کے متعلق
دریافت کیا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ کسی مہاجن کا کچھ روپیہ قرضہ ہے۔ اگر مسماۃ اس کو ادا کر دے
تو میں لکھ دوں گا کہ طلاق ہو گیا ہے۔

(۳) ایک مسلمان مسماۃ مذکورہ کے گاؤں کا رشتہ دار کہا جاتا ہے اس نے میرے روبرو
بدریافت حال طلاق بیان کیا کہ طلاق ہو گیا ہے۔ میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اس سے
اس طریقہ سے سوال کیا تھا کہ یہ شرع کا معاملہ ہے سچ سچ بتانا جھوٹ نہ بولنا اور نہ کسی کی طرفداری
کرنا ورنہ تم پر گناہ ہوگا تب اس پر اس نے کہا کہ طلاق ہو گیا ہے۔

(۴) میں نے ایک شخص خاص کو (اور وہ میرا دوست ہے) بدریافت طلاق مسماۃ کی سسرال اپنے خرچ سے
بھیجا کہ وہ اس کے ماں باپ اور خاص قرابت داروں سے دریافت کرے کہ آیا مسماۃ مذکورہ
کو اس کے شوہر نے (جو اب تک سنا جاتا ہے کہ کلکتہ میں ہے اور دوسری عورت اس کے پاس
ہے) طلاق دیا ہے یا نہیں اس نے آکر یہ بیان کیا کہ اس کا جیٹھ یہ کہتا ہے کہ مسماۃ یہاں آکر
رہے ہم اس کا نکاح اس کے شوہر سے طلاق دلا کر جس کو وہ پسند کرے کر دیں گے۔ لیکن اس
کے خسر نے یہ کہا کہ ہم اس کو نہیں رکھیں گے تم اگر خرچ دے سکتے ہو تو بلا کر رکھو۔

(۵) میں نے ایک خط اس موضع کے تھانہ دار کو اپنی جانب سے بہ دریافت حال طلاق لکھا
تھا۔ جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ میری جانچ سے یہ معلوم ہوا کہ طلاق نہیں ہوا ہے اور یہ

بھی لکھا ہے کہ اس کے شوہر کا پتہ ٹھیک معلوم نہیں ہے کہیں کلکتہ میں رہتا ہے احمد خان خسر مسماۃ اپنے ساتھ رکھنے کے لئے راضی نہیں ہے لیکن اس کا جیٹھ اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی سے اس کا نکاح کرادے ایسی صورت میں طلاق ہوگیا کہ نہیں ؟ اگر طلاق نہیں ہوا تو کونسی صورت اختیار کی جاوے اس سے زیادہ جانچ میرے امکان سے باہر ہے۔ اگر مسماۃ کو قسم دی جائے اور وہ حلفیہ بیان کرے کہ طلاق ہوگیا ذریعہ تحریر کے تو وہ طلاق از روئے شرع درست ہے یا نہیں ؟ ایسی صورت میں مرد کی قسم کا اعتبار کیا جائے گا یا عورت کی؟ بینوا توجروا

تنقیح :۔ یہ عورت دینداری میں کیسی ہے پابند نماز وغیرہ ہے یا نہیں ۔ اس کا چال چلن کیسا ہے جھوٹ سچ بولنے میں اس کے متعلق تجربہ کیا ہے ان تنقیحات کے جواب کے بعد حکم بتلایا جائے گا ۔ یہ پرچہ بھی واپس کیا جاوے ، فقط ۔

جواب تنقیح :۔ (۱) عورت نومسلمہ ہے ۔ نماز اکثر پڑھتی ہے ۔ پوری نماز اس کو نہیں آتی ۔ سکھایا جاتا ہے ۔ گذشتہ رمضان المبارک کے روزے رکھے تھے ۔

(۲) چال بظاہر اچھا ہے ۔

(۳) تجربے سے میں اس کو دروغ گو نہیں کہہ سکتا ممکن ہے کہ خانہ داری کے معاملات میں بحیثیت ایک ملازمہ کے کبھی جھوٹ بول دیا ہو (قیاساً) ۔

(۴) عورت پردہ نشین نہیں ہے کام کاج کے لئے بازار وغیرہ جایا کرتی ہے ۔ فقط ۔

(۵) اگر عورت کے ہاتھ میں قرآن شریف دیکر قسم کھلائی جاوئے گی تو وہ ہرگز جھوٹی قسم نہ کھائیگی ۔

الجواب : اگر یہ عورت قسم کھا کر کہے کہ مجھ کو میرے شوہر نے طلاق دے دی ہے اور عدت گذر چکی اور قلب اس کی بات کو قبول کرے تو اس کا دوسرے شخص سے نکاح کر دینا اور دوسرے شخص کو اس سے نکاح کر لینا جائز ہے جبکہ اس کا دل بھی عورت کی بات کو قبول کرے ،

قال فی العالمگیریۃ (ص ۲۱۰ ج ۶) ولو ان امرأۃ قالت لرجل ان زوجی طلقنی ثلاثا وانقضت عدتی فان کانت عدلۃ وسعہ ان یتزوجہا وان کانت فاسقۃ تحری ، وعمل بما وقع تحریہ علیہ کذا فی الذخیرۃ اھ قلت : وانما قیدت بشہادۃ القلب لہا لکون عدالتہا فی الصورۃ المسئولۃ مشتبہۃ عندی ، واللہ اعلم ۔

۲۷ صفر ۴۵ھ ۔

اس شرط پر نکاح کا حکم کہ پانچ سال یہاں رہنا ہوگا

سوال (۱۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین بلبلانِ شرع گلزار متین اس مسئلہ میں زید بحالت تجارت اپنے وطن کو چھوڑ کر ایک قصبہ میں مقیم ہوا اور عائشہ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ میں یہاں پہ پانچ سال کامل رہوں گا اور ایک مرتبہ زید عائشہ کو اپنے وطن اصلی کو بھی لے گیا تھا پھر زید نے شرط جو پانچ سال اقرار کی تھی پوری کرنے کا انکار کیا اور پھر وہ عائشہ کو اس کے میکے چھوڑ کر اپنے وطن اصلی چلا گیا پھر آکر زید نے عدالت میں عائشہ کو قبضہ لینے کا دعویٰ کیا یہ نکاح ثابت رہا یا نہیں جو شرط سے انکار ہے تو ضرور آپ مفصل طور سے کتبہائے معتبرہ سے جواب تحریر فرمادیں؟ عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں ۔

الجواب : قال فی الدر والنکاح لایصح تعلیقہ بالشرط کتزوجتک ان رضی ابی لم ینعقد النکاح لتعلیقہ بالخطر کما فی العمادیۃ

قال الشامی حیث قال لایصح تعلیق النکاح بالشرط مثل ان یقول لبنتہ ان دخلت الدار زوجتک فلانا وقال فلان قبلت فان التعلیق لایصح و ان صح النکاح ولعلہ اشتبہ علیہ النکاح المعلق علی شرط بالنکاح المشروط معہ شرط فاسد وبینہما فرق واضح شرنبلالیۃ ای فان الاول یبطل راساً واساساً والثانی یصح ویلغو الشرط ۔

صورت مسئولہ میں اگر ایجاب وقبول کے ساتھ یوں کہا گیا تھا کہ اگر تو پانچ سال یہاں رہے تو فلاں عورت کا تجھ سے نکاح ہے ورنہ نہیں اس کا حکم اور ہے اور اگر ایجاب وقبول کے ساتھ یوں نہیں کہا گیا بلکہ پانچ سال رہنے کی شرط ایجاب وقبول سے پہلے طے کر لی گئی یا بعد میں کہا گیا تو حکم اور ہے سائل کو بتلانا چاہئے کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت واقع ہوئی ہے ۔ فقط ۔ ۸ رجب ۴۳ھ ۔

طلاق مغلظہ کے بعد بغیر حلالہ نکاح ثانی اور ان ایام میں عورت کے نفقہ کا حکم

سوال (۱۵) (۸۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو طلاق دی معہ تین طلاق کے جس کے گواہ موجود ہیں پھر دوبار ؟ بزور نکاح ثانی کرنے پر زید سے کہا گیا زید نکاح ثانی پر راضی نہ ہوا لیکن زید کہا گیا اور سمجھایا گیا کہ نکاح ثانی ہو سکتا ہے از روئے فتویٰ کے ان کہنے پر زید نے نکاح ثانی کر لیا بعد نکاح ثانی کے زید نے فتویٰ دریافت کیا فتویٰ ناجائز ٹھہرا جب ثبوت فتویٰ ناجائز کا ٹھہرا تو زید نے اپنے زوجہ ہندہ کو چھوڑ دیا اب والدہ ہندہ

نے زید پر مقدمہ دائر کیا ہے کہ میری لڑکی ہندہ کو دس ماہ سے خرچ خانہ داری نہیں دیتا ہے اور اس مقدمہ میں ایک طرفہ ڈگری حاصل کرلیا ہے نمبروار جواب ارسال فرمادیں طلاق کہ طلاق ہوئی یا نہیں نکاح ثانی جائز ہوا یا نہیں خرچ خانہ داری عائد ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں چونکہ نکاح ثانی بدون حلالہ ہوا ہے اس لئے درست نہیں ہوا ہندہ پر تین طلاق ہوچکی ہیں جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زید نے اپنی زوجہ کو طلاق دیا مع تین طلاق کے ۔ اور جب نکاح ثانی درست نہیں ہوا تو زید پر ایام نکاح ثانی کا نفقہ بھی لازم نہیں ہوا البتہ عورت پر زید سے علیحدگی کے بعد اس نکاح ثانی کی وجہ سے بھی عدت لازم ہوگئی اگر ہمبستری ہوئی ہو، لکون الوطی فیہ بشبھۃ ۔ قال فی الدر فتجب للزوجۃ بنکاح صحیح فلو بان فساد او بطلانہ رجع بما اخذتہ من النفقۃ بحر اھ قال الشامی فلا نفقۃ علی مسلم فی نکاح فاسد لانعدام سبب الوجوب وھو حق الحبس الثابت للزوج علیھا بالنکاح وکذا فی عدتہ لان حق الحبس وان ثبت لکنہ لم یثبت بالنکاح بل لتحصین الماء اھ (ص ۱۰۶۰ ج ۲) اس سے معلوم ہوا مدت نکاح ثانی کا نفقہ زید پر تو واجب ہے ہی نہیں بلکہ اگر اس نے اس مدت میں ہندہ کو کچھ نفقہ دیا ہو تو اس کو ہندہ سے واپس لے سکتا ہے، واللہ اعلم ۔

۸ رجمادی الاخری سنہ ۴۳ھ ۔

نکاح نومسلمہ جو اسلامی ریاست میں بردہ ہوکر آئے تو یہ تباین دارین موجب بینونت ہے یا نہیں

سوال (۱۶) کافرہ عورت کے متعلق مسئلہ ہے کہ کافرہ عورت ہو اور کافر کے ملک میں مسلمان ہوکر نکاح کرے تو چھ ماہ تک اس کو مسلمان ہونے کے بعد نکاح کرنا چاہیئے جب جائز ہوگا اگر اس عورت کو مسلمان کرنے پر تین ماہ کے بعد کسی اسلامی سلطنت میں لے جاکر نکاح کیا جاوے تو درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: کافرہ عورت اگر خاوند والی ہو تو اس کے لئے حکم یہ ہے کہ دار الحرب میں جب تک اس کو تین حیض نہ آئیں گے اس وقت تک اس کا نکاح کافر شوہر سے نہیں ٹوٹتا تین حیض آنے کے بعد دونوں میں فرقت ہوگی چھ مہینے کی قید نہیں بلکہ تین حیض کا آنا ضروری ہے چاہے تین ماہ میں آئیں یا سال بھر میں قال فی الدر ولو اسلم احدھما ثمہ ای فی دار الحرب لم تبن حتی تحیض ثلاثا او تمضی ثلاثۃ اشھر (ای ان کانت لاتحیض لصغر او کبر کما فی البحر اھ ش) (ص ۶۴۰ ج ۲) رہا یہ کہ اس کو اسلامی

سلطنت میں لے جاکر نکاح کیا جاوے سو اس کی چند صورتیں ہیں :-

۱ یہ کہ اسلامی سلطنت میں اُس کو اسلام لانے سے پہلے جبراً لے جایا جائے اُس کی خوشی کے ساتھ نہ لے جایا جائے اس صورت میں اسلامی سلطنت میں پہونچتے ہی اس کے ساتھ نکاح درست ہے بشرطیکہ حاملہ نہ ہو ۔ لکونھا فی ھذہ الصورۃ کالاسیرۃ اخرجت من دار الحرب الی دار الاسلام فبطل النکاح بینھما لتباین الدارین ۔

۲ دوسری صورت یہ ہے کہ اُس کو اسلام کے بعد یا اسلام سے پہلے اسلامی سلطنت میں خوشی کے ساتھ لے جایا جائے مگر ارادہ یہ ہو کہ اسلامی سلطنت ہی میں رہیں گے یعنی وہاں توطن کا ارادہ ہو جس کے لئے کم از کم ایک سال کے قیام کا ارادہ شرط ہے اس صورت میں بھی وہاں پہونچکر فوراً نکاح درست ہے بشرطیکہ حاملہ نہ ہو لان التوطن یبطل الوطن الاول فتتباین الداران فبطل النکاح، والحربی لایمکن ان یقیم بدار الاسلام سنۃ کاملۃ واذا تم الحول ضرب علیہ الجزیۃ وصار ذمیا ۔ باقی محض دو چار روز کے واسطے اسلامی سلطنت میں لے جانا مفید نہیں اور اس سے نکاح بالکافر باطل نہ ہوگا لکونھا مستأمنۃ وبالاستیمان لا یبطل الدار فلم یوجد تباین الدارین قال فی الدر: والمرأۃ تبین بتباین الدارین حقیقۃ وحکما (المراد بتباین الدارین حقیقۃ تباعدھما شخصا وبالحکم ان لایکون فی الدار التی دخلھا علی سبیل الرجوع بل علی سبیل القرار والسکنیٰ حتی لودخل الحربی دارنا بامان لم تبن زوجتہ لانہ فی دارہ حکما الا اذا قبل الذمۃ اھ ش) قال فی الدر ومن ھاجرت الینا مسلمۃ او ذمیۃ حاملا بانت بلاعدۃ فیحل تزوجھا (قال الشامی المھاجرۃ التارکۃ دار الحرب الی دار الاسلام علی عزم عدم العود وذلک بان تخرج مسلمۃ او ذمیۃ او صارت کذلک اھ) قال فی الدر او اخرج مسبیا وادخل فی دارنا (افاد انہ لا یتحقق التباین بمجرد السبی بل لابد من الاحراز بدارنا بدائع ۱۲ ش) اھ (ص ۶۴۱ و ۶۴۲ ج ۲) وبالجملۃ فالدخول بدار الاسلام بالامان لایکفی للتباین بل لابد من الادخال مسبیۃ او دخولھا مھاجرۃ، واللہ اعلم ۔

۲۵ ذیحجہ سنہ ۴۳ھ ۔

زنا سے نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال (۱۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ زید کی منکوحہ ہندہ نااتفاقی سے یا اور کسی وجہ سے بکر کے پاس چلی گئی دو چار سال بکر کے گھر میں بطور عورت کے رہی بلکہ ایک بچہ بھی بکر کے نطفہ حرام سے پیدا ہوا مگر زید نے طلاق نہیں دیا بعد مدت مذکورہ بالا کے زید نے سرکار کے ذریعہ سے یا اور کسی وجہ سے اپنی منکوحہ ہندہ کو اپنے گھر لایا اس صورت میں زید و ہندہ کا باہم پہلا نکاح کافی ہے یا کہ نکاح ثانی کرنا ہوگا یا طلاق ہو گئی؟

الجواب؛ زید کا نکاح باقی ہے دوبارہ نکاح کی حاجت نہیں البتہ زید کے لئے مستحب ہے کہ جب سے ہندہ نے بکر سے علیحدگی کی ہے اس وقت کے بعد حیض آنے کا انتظار کرے حیض کے قبل صحبت نہ کرے لما فی رد المختار (قوله والمزنی بها لاتحرم علی زوجها) فله وطیٔها بلا استبراء عندهما وقال محمد لا احب له ان یطأها مالم یستبرأها کما مر فی فصل المحرمات وقال الشامی تحت قول الدر (لا یقرب بها زوجها) ای یحرم علیه وطیها حتی تحیض وتطهر کما صرح به شارح الوهبانیة و هذا یمنع من حمله علی قول محمد لانه یقول بالاستحباب کذا قاله المصنف فی المنح فی فصل المحرمات، اور بچہ زید کو ملے گا خواہ زید اس کے نسب کا انکار کرے خواہ اقرار کرے، قال الشامی تحت (قوله علی اربع مراتب) قوی و هو فراش المنکوحة ومعتدة الرجعی فانه فیه لاینتفی الا باللعان (ص۱۳۷ ج۲)۔ وفی البدائع (شرط وجوب اللعان وجوازه) والثانی عفتها عن الزنا فان لم تکن عفیفة لایجب اللعان بقذفها الخ (ص۲۴۱ ج۳) وفیه ایضا ص۲۴۶ وعلی هذا قلنا ان القذف اذا لم ینعقد موجبا للعان او سقط بعد الوجوب اوجب الحد او لم یجب او لم یسقط لکنهما لم یتلاعنا بعد لا ینقطع نسب الولد وکذا اذا نفی نسب ولد حرة فصدقته لا ینقطع نسبه لتعذر اللعان اھ۔ عبدالکریم عفی عنہ۔ ۵ ذیقعدہ ۴۳ھ۔

اجوبۃ صحیحۃ۔

ظفر احمد عفا عنہ۔ ۵ ذی القعدہ ۴۳ھ۔

مطلقہ ثلاث نے مرتد ہو کر کافر سے نکاح کر لیا بعد دخول کے زوج ثانی نے طلاق دی تو کیا مسلمان ہونے کے بعد وہ زوج اول کیلئے حلال ہوگی یا نہ؟ حلالہ کی ضرورت ہوگی

سوال (۱۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کافرہ مسلمہ ہو کر کسی مسلم سے نکاح کیا دس برس تک اس کے ساتھ رہی بعد اس کے اس کے زوج نے تین طلاق دے دی پھر وہ عورت مرتد ہو گئی اور کسی کافر سے نکاح کر لیا اور اس نے دخول بھی کیا بعد ازاں اس نے بھی طلاق دیکر جدا کر دیا اب وہ عورت مسلمان ہو گئی اور زوج اول سے نکاح کرنا چاہتی ہے کیا یہ نکاح درست ہے یا کسی مسلم سے حلالہ کرنے کی ضرورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب؛ قال فی الدر لاینکح مطلقة بها ای بالثلث لو حرة و ثنتین لو امة حتی یطأها غیرها ولو الغیر مراهقا یجامع مثله او خصیا او مجنونا او ذمیا لذمیة (ای ولو کان التحلیل لاجل زوجها المسلم کما فی البحر ۱۲ شامی) بنکاح نافذ خرج الفاسد والموقوف اھ۔

اگر اس عورت نے بعد ارتداد کے کسی کافر سے باقاعدہ نکاح کر لیا تھا (گو قاعدہ کفار ہی کے موافق ہو) اور کافر زوج نے اس سے دخول کر لیا تھا تو بعد اسلام عورت کا زوج اول اس سے نکاح کر سکتا ہے اور اب تحلیل کی ضرورت نہیں زوج کافر کی تحلیل کافی ہو گئی، لکونه کذمی لذمیة، واللہ اعلم۔ ۲۸ رجب ۴۵ھ

حکم نکاح بالکتابت

سوال (۱۹) اگر مرد عورت سے برضامندی یہ تحریر لکھوائے کہ تو میرا خاوند ہے یا مجھ کو تجھ سے نکاح منظور ہے پھر مرد اس تحریر کو دو آدمیوں کو دکھلادے تو کیا نکاح ہو جائے گا جبکہ دونوں آپس میں رضامند ہوں اور رضامندی سے تحریر لکھوائی گئی ہو اور اس صورت میں کیا عورت کو اپنا نام یا پورا پتہ تحریر مذکورہ میں لکھنا چاہئے یا یونہی فقط خالی دستخطی تحریر سے نکاح ہو جائے گا جو کچھ شرع شریف میں حکم ہو بہت جلد جواب دیں؟

الجواب؛ اس صورت میں نکاح درست نہ ہوگا اور اگر نام اور پورا پتہ بھی لکھا ہوا ہو جب بھی محض تحریر دکھانے سے نکاح درست نہ ہوگا جب تک مرد یہ بیان نہ کرے کہ فلاں عورت نے جو فلاں کی بیٹی ہے میرے پاس یہ خط لکھا ہے جس میں وہ مجھ سے نکاح کو منظور کرتی ہے میں بھی اس نکاح کو قبول کرتا ہوں اور یہ بیان دو گواہوں کے سامنے ہو اور ان کے سامنے عورت کا پتہ اس طرح بیان کیا جائے جس سے وہ ممتاز ہو جائے صرح به فی الدر و الشامی (ص ۵۴۵ ج ۲) والخلاصہ ص ۲۴۸ ج ۲ واللہ اعلم - ۱۷ شعبان ۴۵ھ -

رافضی مرد کے ساتھ سنی لڑکی کا نکاح اور اس کی بعض صورتوں کی تفصیل

سوال (۳۰) کیا فرماتے ہیں علماء دین متین اس لڑکی کے بارے میں جس کا خاوند تبرائی شیعہ ہو گیا اور اصحاب کبار کو برائی اور بد زبانی سے یاد کرتا ہے۔ حتی کہ جانوروں کے نام انہی کے نام پر رکھ کر ان کو مارنا پیٹنا ثواب سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ تمام افعال شنیعہ رسمیں تبرائی شیعوں کے پائے جاتے ہیں لڑکی حنفی مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ جس کی وجہ سے اس کا خاوند اس کو ایذا پہنچاتا ہے اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کیا وہ لڑکی از روئے مذہب حنفیہ بغیر طلاق نکاح ثانی کر سکتی ہے یا کہ نہیں تو کیا سبیل اختیار کرے بینوا توجروا۔

جواب کے لئے لفافہ ہمراہ ہے جواب باصواب بمعہ حوالجات تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

نمبر۲ تبرائی شیعہ مرد اور تبرائی شیعہ عورت ہر دو میاں بیوی مذہب شیعہ سے تائب ہو کر مذہب حنفی میں داخل ہوئے۔ کیا ان کا عقد از سر نو پڑھا جاوے گا یا وہی پہلا نکاح کافی ہے؟

نمبر۳ تبرائی شیعہ عورت جو کہ تبرائی شیعہ مرد کے نکاح میں تھی مذہب شیعہ سے تائب ہوئی اب وہ تمام کام بموجب مذہب حنفی ادا کر سکتی ہے اس کا خاوند اس کو منع نہیں کرتا ہے لیکن وہ مرد خود تبرائی شیعہ ہی ہے کیا ان کا نکاح فسخ ہو گیا اور وہ عورت دوسری جگہ نکاح کرے یا اسی مرد کے پاس رہے اور گنہگار نہ ہو گی؟

الجواب: نکاح روافض کے متعلق یہ آخری تحقیق ہے اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے منسوخ ہے ۱۲ ظفر

شیعوں کے متعلق عدالت کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولوی عبد الشکور صاحب رسالہ النجم نمبر۱ ج ۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ص۱۲ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن میں تحریف ہو گئی یعنی لوگوں نے قرآن سے کچھ آیتیں نکال ڈالیں اور کچھ بڑھا دیں جن میں کفر کی باتیں شامل کر دیں کچھ الفاظ و حروف بدلائے اس کے ثبوت میں حسب ذیل کتب ملاحظہ ہوں:

کتاب۱ احتجاج طبرسی از ص۱۱۹ تا ص۱۳۰، اصول کافی از ص۲۶۱ تا ص۲۷۵، تفسیر قمی ص۷ اھ۔

پھر ص۱۴ میں تحریر فرماتے ہیں ہمارے علماء سابقین کو مذہب شیعہ سے پوری واقفیت نہیں ہو سکی جس کا اصلی سبب یہ تھا کہ شیعہ اپنا مذہب چھپانے کی بیحد کوشش کرتے تھے اسی سبب سے شیعوں کے کفر میں اختلاف رہا لیکن اب جب شیعوں کا عقیدہ قرآن شریف کے متعلق معلوم ہو گیا جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں کر سکتا شیعوں کا خارج از اسلام ہونا قطعی ہے اھ وفی

الدر عن شرح الوهبانية للشرنبلالي ما يكون كفراً اتفاقاً يبطل العمل و النكاح و اولاده اولاد الزنا وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجديد النكاح اھ (ص ۳۶۲ و ۳۶۳ ج ۳) قال الشامي واولاده اولاد زنا كذا في فصول العمادي لكن ذكر في نور العين ويجدد بينهما النكاح ان رضيت زوجته بالعود اليه والا فلا تجبر والمولود بينهما قبل تجديد النكاح بالوطئ بعد الردة يثبت نسبه منه لكن يكون زنا اھ قلت ولعل ثبوت النسب لشبهة الخلاف فانها عند الشافعي لا تبين منه تامل اھ ص ۳۶۳ ج ۳ قلت وكل وطأ يوجب ثبوت النسب لشبهة ما يوجب العدة احتياطاً لاسيما اذا وطيها الزوج ومكنته من نفسها ظانين بقاء النكاح بعد الردة كما هو مشاهد من حال الجهلة في الهند فانهم يتكلمون بالكفريات ولا يرون انفساخ النكاح لاسيما اذا كان الكفر بالرفض فانه مما يخفى على كثير من العلماء و قد خفي علينا مدة ثم رأيته صريحاً قال في الدر اخبرت بارتداد زوجها فلها التزوج بآخر بعد العدة استحساناً اھ ص ۳۶۹ ج ۳، قلت و الاستحسان انما هو في الاخبار فقط واما اذا علمت منه الردة بنفسها فلها التزوج بآخر بعد العدة قياساً واستحساناً معاً لان القياس في الاخبار ان لا يجوز لها النكاح بآخر ما لم يشهد على ردته رجلان او رجل و امرأتان لكون ردة الرجل يتعلق بها استحقاق القتل ولكن الاصح رواية الاستحسان لان المقصود الاخبار بوقوع الفرقة وهو امر ديني كالاخبار بالطلاق ثلثاً لا اثبات الردة اھ شامي هذا هو حكم النكاح المنعقد قبل الردة اما المنعقد بعدها فيما بين الروافض الغير القديم رفضهم فحكمه ما في الدر ويبطل منه اتفاقاً ما يعتمد الملة وهي خمس: النكاح والذبيحة والصيد والشهادة والارث اھ قال الشامي ما يعتمد الملة اي ما يكون الاعتماد في صحته على كونه فاعله معتقداً ملة من الملل الخ اي والمرتد لا ملة له اصلاً لانه لا يقر على ما انتقل اليه وليس المراد ملة سماوية لئلا يرد النكاح فان نكاح المجوسي والوثني صحيح ولا ملة لهما سماوية بل

المراد الاعم اھ ص ۳۶۵ ج ۳ قلت ومفاد ھذہ العلة صحة نکاح المرتد بالمرتدة منه او بکافرة بعد لحوقه بدار الحرب او اذا کان قد ارتد هناك لا فی دار الاسلام فانه یقر ھناك علی ما انتقل الیه ولا یقتل. اللھم الا ان یقال انه میت فی حکم الشرع فلا یجوز النکاح لکونه لا ملة له کما اذا لم یقتله الحاکم فی دار الاسلام تھاونًا بالاحکام معاذ اللہ منه قال فی الدر ولا یترك المرتد علی ردته باعطاء الجزیة ولا بامان موقت و لا مؤبد ولا یجوز استرقاقه بعد اللحاق بخلاف المرتدة اھ قال الشامی ای فانها تسترق بعد اللحاق بدار الحرب وتجبر علی الاسلام بالضرب والحبس ولا تقتل اھ ص ۳۶۳ ج ۳ قال فی الدر وعن الامام تسترق ولو فی دار الاسلام ولو افتی به حسما لقصدها السیئ لا بأس به وتکون قنة للزوج بالاستیلاء مجتبی وفی الفتح انها فیئ للمسلمین فیشتریها من الامام او یھبها له لو مصرفا اھ قال الشامی وفی الفتح قیل وفی البلاد التی استولی علیها التتر واجروا احکامھم فیها ونفوا المسلمین کما وقع فی خوارزم وغیرھا اذا استولی علیها الزوج بعد الردة ملکها لانها صارت دار حرب فی الظاھر من غیر حاجة الی ان یشتریها من الامام اھ قال الشامی وھذا لیس مبنیًا علی روایة النوادر لان الاسترقاق وقع فی دار الحرب لا فی دار الاسلام اھ ص ۳۷۰ ج ۳، ای والمبنی علی روایة النوادر انما ھو الاسترقاق فی دار الاسلام وأما النکاح المنعقد بین الروافض القدیم رفضھم فحکمه یستفاد مما فی الدر ایضاً زوجان ارتدا او لحقا فولدت المرتدة ولداً وولد له ای لذلك المولود ولد فظھر علیھم جمیعا فالولدان فیئ کاصلھا والولد الاول یجبر بالضرب علی الاسلام (ای لا بالقتل بخلاف ابویه فانهما یجبران بالقتل ۱۲) وان حبلت به ثمه (ای وبالاولی لو حبلت به فی دار الاسلام ووضعته فی دار الحرب ۱۲) لتبعیته لابویه (فی الاسلام والردة وھما یجبران فکذا ھو وان اختلفت کیفیة الجبر) لا الثانی لعدم تبعیة الجد علی الظاھر (ای ظاھر الروایة)

فحکمه کحربی۔ (فی انه یسترق او توضع علیه الجزیة او یقتل واما الجد فیقتل لا محالة لانه المرتد بالاصالة او یسلم بحر عن الفتح ۱۲ شامی) ص ۳۷۳ ج ۳ ولما کان ولد الولد کالحربی فمفادہ جواز نکاحه بمثله واللہ اعلم ۔

بقی الاشکال فی استرقاق المرأة الرافضة اذا کانت من نسل العرب فان مشرکی العرب لا یسترقون لکن قال فی الدر فی فصل الجزیة لا علی وثنی عربی ومرتد فلا یقبل منهما الا الاسلام او السیف لو ظهرنا علیهم فنساءهم وصبیانهم فیئ اھ لان ابابکر رضی اللہ تعالیٰ عنه استرق نساء بنی حنیفة وصبیانهم لما ارتدوا وقسمهم بین الغانمین ھدایة اھ ص ۴۱۲ ج ۳ فارتفع الاشکال ثم عاد الاشکال بما فی الشامیة عن القہستانی ولا توضع علی المبتدع ولا یسترق وان کان کافراً لکن یباح قتله اذا اظھر بدعته ولم یرجع عن ذلك وتقبل توبته اھ ص ۴۱۵ ج ۳ ۔ فالجواب عنه ان المرتد نفسه لا یسترق وانما یسترق المرتدة واولاد المرتد کما مر فلا اشکال، واللہ تعالیٰ اعلم ۔

وفی تحریر المختار وجعل الرملی فی حاشیة المنح: المعتزلی والرافضی بمنزلة اھل الکتاب حیث قال قوله صح نکاح کتابیة اقول یدخل فی ھذہ الرافضة بانواعها والمعتزلة فلا یجوز ان تتزوج المسلمة السنیة من الرافضی لانها مسلمة وھو کافر فدخل تحت قولهم لا یصح تزوج مسلمة بکافرٍ اھ قال الرستغفنی: لا تصح المناکحة بین اھل السنة والاعتزال اھ فالرافضة مثلهم او اقبح والرملی جعلهم من قبیل اھل الکتاب فیجوز نکاح نساءھم ولاینزوجون ولعله اعدل الاقوال لانه لا یشك فی کفر الرافضة اھ، سندی ص ۱۸۳ ج ۱ ۔

پس خلاصہ اقوال یہ ہوا کہ رافضی سے سنیہ مسلمہ کا نکاح درست نہیں ہوتا خواہ وہ قبل نکاح ہی رافضی ہو تو نکاح اول ہی سے منعقد نہ ہوگا یا بعد نکاح کے رافضی ہوگیا ہو تو نکاح فسخ ہوجائے گا ۔ اور دونوں صورتوں میں اگر ہمبستری ہوچکی ہے تو زوجہ پر عدت لازم

ہے اور بعد عدت کے جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے اور ہمبستری نہوچکی ہو تو عدت کی حاجت نہیں۔ لکون الردۃ من الزوج طلاقاً حکماً۔ البتہ اگر ان دونوں سے اولاد پیدا ہوئی ہو تو وہ اولاد حرامی نہ کہلائے گی بلکہ ثابت النسب ہوگی اور وہ اولاد الوین سے وارث ہوگی لیکن زوجین میں باہم توارث نہوگا لعدم التوارث فی نکاح فاسد نفیما اذا کان الوطیٔ زنا بالاولیٰ البتہ اگر شوہر رافضی بنا اور عورت کی عدت پوری نہوئی تھی کہ وہ مرگیا تو ایک روایت میں عورت وارث ہوگی شامی ص ۴۰۷ ج ۳۔

جواب سوال ۲ :- اگر یہ دونوں مرد و عورت قدیم سے کئی پُشت کے رافضی تھے تب تو سُنّی ہونے کے بعد دوبارہ ان کا نکاح کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ معلوم ہوچکا ہے کہ ان کا حکم اہل کتاب کا سا ہے اور کتابی مرد و عورت ساتھ مسلمان ہوجائیں تو تجدید نکاح کی ضرورت نہیں بشرطیکہ دونوں ساتھ مسلمان ہوں آگے پیچھے نہوں ورنہ اگر اتنا فاصلہ ہوا کہ عورت عدت سے فارغ ہوگئی تو تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی اور اگر عدت گذرنے سے پہلے دوسرا بھی مسلمان ہوگیا تو نکاح اول باقی ہے شامی ص ۶۴۰ ج ۲ اور اگر یہ دونوں سُنّی تھے پھر رافضی ہوگئے اب پھر سُنّی ہوتے ہیں تو اس کا یہ حکم ہے کہ اگر ساتھ ہی مرتد ہوئے ساتھ ہی مسلمان ہوئے تو نکاح اول باقی ہے اور اگر آگے پیچھے ہوئے تو نکاح کی تجدید لازم ہے گو عدت کے اندر اندر دونوں مسلمان ہوجائیں وبقی النکاح ان ارتدا معاً بان لم یعلم السبق ثم اسلما کذلک فان المعیۃ الحقیقیۃ متعذرۃ ۱۲ شامی وفسد ان اسلم احدھما قبل الآخر اھ ص ۶۴۶ ج ۲ - ای بان علم السبق۔

جواب سوال سوم :- جب رافضی عورت سُنّی ہوجائے اور مرد رافضی رہے تو دونوں کا نکاح فسخ ہوگیا اور یہ عورت بعد عدت کے سُنّی سے نکاح کرسکتی ہے رافضی سے علیحدہ ہوجانا اس پر واجب ہے۔

اب ایک صورت یہ باقی رہی کہ مرد سُنّی ہو اور وہ عورت رافضیہ سے نکاح کرے جس کا رفض جدید نہیں بلکہ آبا و اجداد سے قدیم ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ نکاح صحیح ہے اور وہ رافضیہ مثل کتابیہ کے اس کی زوجہ اور اس کی اولاد اس کی وارث ہوگی۔ اور زوجین میں توارث نہوگا غرض سُنّی مرد کا نکاح تو رافضیہ سے صحیح ہے گو مکروہ ہے مگر سُنّیہ عورت کا نکاح رافضی مرد سے نہ ابتداءً صحیح ہے نہ بقاءً

ایک صورت یہ رہی کہ مرد و عورت دونوں سُنّی تھے پھر مرد تو سُنّی ہی رہا اور عورت رافضی ہوگئی.

اس صورت میں نکاح فسخ ہوگیا لیکن اس عورت پر ملک یمین کے ساتھ شوہر قبضہ رکھ سکتا ہے دارالاسلام میں ہو تو امام سے خرید کر یا ہبہ کے طور پر لیکر اور دارالحرب میں ہو تو بدون امام سے پوچھے خود ہی اس پر قبضہ مالکانہ کرسکتا ہے ویجوز لہ الوطی بہا لکونہا کامۃ کتابیۃ کما ھو المفہوم من ما ذکرنا۔

۱۶

اور اگر سُنّی مرد رافضی ہوگیا اور اس کے ساتھ بیوی بھی رافضی ہوگئی اور رافضی ہی رہے سُنّی نہوئے تو یہ دونوں مرد و عورت تو مرتد ہیں ان کو جبراً سُنّی بنایا جائے گا والا فالسیف ان قدرنا اور ان کی صُلبی اولاد کو بھی ولکنہم لا یقتلون البتہ اولاد کی اولاد الی آخرہا پر جبر نہوگا بلکہ وہ سب مثل حربی کے ہیں۔ اور فیٔ ہیں اور یہی احکام فرقۂ قادیانیہ کے ہیں کہ وہ بھی مرتد ہیں اذا استولی احد من المسلمین علی احد منہم کان رقیقاً فی یدہ، واللہ تعالےٰ اعلم۔

۲۵ صفر سنہ ۴۶ھ۔

بوقت نکاح غلطی سے دوسری لڑکی کا نام بتا کر نکاح پڑھایا گیا تو الخ

سوال (۲) سوال یہ ہے کہ ایک شخص کے دو لڑکی تھیں ایک کا نام خدیجہ دوسری کا نام زینب۔ اُن دونوں کے باپنے خدیجہ جو بڑی لڑکی ہے اس کے نکاح کے وقت بھول کر کے زینب جو چھوٹی بیٹی ہے اس کا نام لیکر نکاح پڑھا دیا اور بڑی بیٹی کو نوشہ کے سپرد کردیا اور دولہا اس کو اپنے گھر لے جاکر بود و باش یعنی زن و شوی کر رہا ہے اب مسئول یہ ہے کہ یہ نکاح ازروئے شرع شریف جائز ہوگا یا نہ جواب عنایت فرمادیں؟

الجواب ؛ قال فی الدر غلط وکیلہا بالنکاح فی اسم ابیہا بغیر حضورہا لم یصح للجہالۃ۔ وکذا لو غلط فی اسم ابنتہ الا اذا کانت حاضرۃ واشار الیہا فیصح ولو لہ بنتان ارادتزویج الکبریٰ فغلط فسماہا باسم الصغریٰ صح للصغریٰ، خانیہ اھ ص ۲۵۰ ج ۲ کتاب النکاح۔

صورت مسئولہ میں اگر مسماۃ خدیجہ مجلس نکاح میں حاضر تھی اور اس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا کہ اس کا نکاح کرتا ہوں تو مسماۃ خدیجہ سے نکاح منعقد نہیں ہوا بلکہ اس مرد کا نکاح مسماۃ زینب سے منعقد ہوگیا ہے پس اب مرد سے مسماۃ زینب کو طلاق دلوادی جائے اور خدیجہ سے اس کا نکاح دوبارہ کردیا جائے اگر ایسا نہوا تو عمر بھر خدیجہ سے زنا ہوگا اور زوجین و اولیائے زوجین سب گنہگار ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

۲۷ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۶ھ۔

بیوہ یا مطلقہ کو اپنے والد کے حکم سے نکاح ثانی فرض ہوجاتا ہے یا نہیں جبکہ عورت نکاح ثانی کو معیوب جانتی ہو

سوال (۲۲) بیوہ یا مطلقہ کو اپنے والد کے حکم سے نکاح ثانی کرنا فرض ہوجاتا ہے یا نہیں، دراں صورت کہ وہ کسی وجہ سے شرعی معذور بھی نہیں اور ایسی صورت میں وہ انکار کرنے سے کافر ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی عرض ہے کہ وہ ایسی قوم کی عورت ہے جو رسماً و رواجاً نکاح ثانی کو معیوب اور بُرا جانتی ہے۔ والسلام۔

الجواب : ماں باپ کے حکم سے ہر کام واجب نہیں ہوجاتا بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کے لئے رسالہ "تعدیل حقوق الوالدین" کا مطالعہ مفید ہوگا جو "بہشتی گوہر" کے اخیر میں طبع جدید میں ملحق کیا گیا ہے۔

پس صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اگر بیوہ یا مطلقہ نکاح ثانی کو معیوب سمجھتی ہے تو یہ عقیدہ کفر ہے اس سے اس کو توبہ کرنا اور ایمان کی تجدید فرض ہے اور اگر معیوب نہیں سمجھتی بلکہ پہلے شوہر کی محبت غالب ہے اور وہ اس سے مانع ہے یا بچوں کے ضائع ہونے کا خوف ہے یا اور کوئی وجہ مخفی نکاح سے مانع ہے مثلاً مجامعت سے تکلیف ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس میں تفصیل ہے اگر اس کو اپنی عفت پر خطرہ نہ ہو خواہش نفسانی غالب نہ ہو صبر سے بیٹھ سکے اور والدین پر اپنے نفقہ کا بار نہ ڈالے یا اُن پر بار ڈالے اور وہ خوشی سے برداشت کریں تو اس کو نکاح کرنا واجب نہیں ورنہ واجب ہے بشرطیکہ حقوق نکاح کو ادا کرے ورنہ روزہ رکھکر خواہش کو مغلوب کرے اور محنت و مزدوری سے پیٹ پالے اگر والدین اس کا خرچ برداشت نہ کرسکیں وھذہ خلاصۃ الدلائل الحدیثیۃ والفقھیۃ التی ذکرھا الشیخ فی رسالتہ المذکورۃ. واللہ اعلم۔

۱۱ ذیقعدہ سنہ ۴۶ھ۔

جواز نکاح بالکتابت کی ایک صورت

سوال (۲۳) بعد از نیاز و آداب والسلام علیکم کے عرض ہے کہ اگر کوئی عورت بالغہ بیوہ ایجاب اپنے ہاتھ سے اس طرح لکھ کر مرد کو دیدے۔ کہ مسماۃ فلانہ یعنی کاتبہ آپ کا نکاح مسمیٰ فلان یعنی مکتوب الیہ سے کیا باین قدر مہر۔ پھر مکتوب الیہ وہ ایجاب دو گواہوں کو پڑھ کر سنا وے۔ اور اپنا قبول بھی ان کو سنا دے تو یہ نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہ۔ حضرت! بندہ نے علماء سے سُنا ہے یا کسی میں دیکھا ہے کہ کتابت بمنزلہ کلام کے ہے جب ایسا ہے تو سامعین کلامہما معاً جو کہ شرط انعقاد نکاح کا ہے متحقق ہوگیا تو چاہئے کہ نکاح بھی متحقق ہوجاوے۔

الجواب : ہاں اس طرح نکاح صحیح ہوجاتا ہے جبکہ خط سُنا کر اپنا قبول شاہدین کے سامنے بیان کردے۔ وسماع الشاھدین کلام المتعاقدین شرط انعقاد النکاح فلو قرأت الکتاب علی الشھود وقالت ان فلانا کتب الیّ یخطبنی فاشھدوا انی قد زوجت نفسی منہ صح النکاح اھ وان لم تقرأ الکتاب وقالت قد زوجت نفسی منہ بمحضر من الشھود لاینعقد النکاح فان الشھود لم یسمعوا کلام الزوج کذا فی الخلاصۃ (ص ۴۸ و ۴۹ ج ۳)۔ ۲۲ محرم سنہ ۴۷ھ۔

احکام وطی زوجہ صغیرہ

سوال (۲۴) ۱ خاوند کو اپنی نابالغہ منکوحہ کے ساتھ جس کو جماع سے تکلیف ہوتی ہو صحبت کرنا درست ہے یا نہیں؟

۲ اگر کسی کی منکوحہ اس قدر کمسن ہو کہ صحبت سے کوئی سخت تکلیف ہوجانے یا جان جانے کا اندیشہ ہو تو خاوند کا اس سے صحبت کرنا جُرم ہے یا نہیں اور اگر جرم ہے تو شرعاً اس کے لئے کیا سزا ہے؟

۳ اگر عورت کمسن ہو اور صحبت کرنے سے اس کے بیمار ہوجانے یا مرجانے کا اندیشہ ہو تو نابالغہ خود یا اس کا ولی شوہر کو صحبت سے روک سکتے ہیں یا نہیں؟

۴ بعد نکاح کے کسی نابالغہ عورت کا ولی اس خیال سے کہ اگر وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہیگی اور اس سے صحبت کی جائے گی تو اس کو نقصان پہونچے گا خاوند کے گھر بھیجنے سے مانع ہو تو شوہر کوئی مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں اور اس روک رکھنے کی میعاد کیا ہے؟

۵ اگر شوہر جبراً اپنی کمسن منکوحہ کے ساتھ ہم بستر ہو اور وہ لڑکی مرجائے یا کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوجائے تو شرعاً اس کے شوہر کو کیا سزا دی جائے گی؟

الجواب : قال فی الدر المختار وللزوج المطالبۃ بتسلیمھا ان تحملت الرجل قال البزازی ولا یعتبر السن اھ قال الشامی عبارتہ ولا یجبر الاب علی دفع الصغیرۃ الی الزوج ولکن یجبر الزوج علی ایفاء المعجل فان زعم الزوج انھا تتحمل الرجال وانکر الاب فالقاضی یریھا النساء ولا یعتبر السن اھ قلت بل فی التتارخانیۃ البالغۃ اذا لم تکن تتحمل لاتؤمر بدفعھا الی الزوج اھ (ص ۹۰۶ ج ۲) وفی الحامدیۃ قد اجاب الخیر الرملی عن ھذا السوال بقولہ ان کانت ضخمۃ سمینۃ تطیق الرجال وسلم المھر

المشروط تعجیله یجبر الاب علی تسلیمها للزوج علی الاصح من الاقوال فینظر القاضی ان کانت ممن تخرج اخرجها ونظر الیها ان صلحت للرجال امر اباها بدفعها للزوج والا فلا وان کانت ممن لاتخرج امر بمن یثق بهن من النساء فان قلن انها تطیق الرجال وتتحمل الجماع امر الاب بدفعها الی الزوج وان قلن لاتتحمل لایامر بذلك والله اعلم اھ (ص۲۸)، وفیه ایضاً وقیل ان طلبها الزوج للمؤانسة دون الملامسة یجاب کذا فی الذخیرة والقنیة اھ (ص۲۹)۔

وفی العالمگیریة (ص ۱۹ ج ۶) رجل جامع صغیرةً لایجامع مثلها فماتت ان کانت اجنبیة تجب الدیة علی العاقلة وان کانت منکوحة فالدیة علی العاقلة والمهر علی الزوج کذا فی الخلاصة۔ عن ابن رستم عن محمد رح رجل جامع امرأته ومثلها تجامع فماتت عن ذلك فلا شیئ علیه اھ۔

(عبارات فقه کے بعد جوابات معروض هیں)

(۱) نابالغہ اگر بدن اور اٹھان کی اچھی ہو کہ جماع سے اس کو ناقابل برداشت تکلیف نہ ہو تو اس سے جماع جائز ہے اور اگر ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہو تو جائز نہیں۔

(۲) ہاں جرم ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ اگر عورت مرجائے تو شوہر کے خاندان پر دیت لازم ہے (جو ایک ہزار دینار ہے) اور شوہر کے ذمہ مہر لازم ہے اور اگر عورت کو سخت تکلیف پہونچی ہو مری نہیں تو شوہر کے ذمہ اس کا علاج معالجہ واجب ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے کہ جبکہ زوجہ اتنی کمسن و کمزور ہو کہ جماع کا تحمل کرنے کی اہل نہ ہو اور اگر اٹھان ایسا ہو کہ جماع کا تحمل کرسکے تو شوہر پر کچھ ضمان نہیں نہ دیت نہ کچھ تعزیر۔

(۳) ہاں روک سکتے ہیں لیکن اگر شوہر یہ دعویٰ کرے کہ منکوحہ تحمل جماع کی اہل ہے اور ولی نابالغہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ متحمل جماع نہیں تو اس اختلاف کا فیصلہ حاکم شرعی کرے گا وہ معتبر عورتوں سے کہے کہ اس لڑکی کو دیکھ کر بتلائیں وہ متحمل جماع ہے یا نہیں۔

(۴) اس کا جواب ۳ سے معلوم ہوچکا اور لڑکی کو روکنے کی میعاد یہی ہے کہ قاضی کو ثقات عورتوں سے معلوم ہوجائے کہ لڑکی متحمل جماع کی ہوگئی ہے۔

(۵) اس کا جواب ۲ سے معلوم ہوچکا ہے، واللہ اعلم۔

۱۲ صفر ۴۷ھ۔

بصیغۂ حال قبول کافی ہے یا نہیں

سوال (۲۵) زید کا نکاح ہونے لگا وکیل بالنکاح نے کہا کہ مجھے فلاں شخص نے اپنی فلاں لڑکی کے نکاح کا وکیل بنا کر بھیجا ہے۔ اور اس کے یہ دو گواہ ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو بعوض ایک سکۂ رائج الوقت آپ کی زوجیت میں دیا۔ زید بجائے اس کے کہ قبول کیا کہے قبول ہے کہہ دیا تو نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟ بظاہر فقہاء کی عبارت النکاح ینعقد بالایجاب ولفظهما ماض اومستقبل وماض مقتضی ہے کہ نکاح انعقاد نہ ہو کیونکہ قبول ہے نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل۔

الجواب: صیغۂ حال بھی قبول میں کافی ہے صرح به فی الدر (صفحہ ۲۲۳ ج ۲)۔

بوقت نکاح لڑکی کے وکیل کو نام میں اشتباہ ہوگیا مگر شوہر اور گواہ جانتے تھے کہ فلاں لڑکی سے نکاح ہوگا الخ

سوال (۲۶) وکیل بالنکاح کچھ ناک سے بولا کرتے تھے اس لئے عورت کے نام میں اشتباہ ہوگیا مرد نے اپنے دل میں یہ سمجھ کر کہ یہ شخص جس عورت کا وکیل بن کر آیا ہے وہ اور دوسرے ذرائع سے تو متعین ہے۔ نام سے کیا کام نام کچھ بھی ہو یہ شخص جس عورت کے وکیل بن کر آئے ہیں وہ عورت مجھے قبول ہے اور مجمع عام میں بغیر نام کی لفظی تصحیح کئے ہوئے قبول کرلیا۔ تو کیا نکاح ہوا یا نہیں۔ یا نام کی تصحیح لفظی بھی ضروری ہے؟

تنقیح سوال: کیا شوہر کو پہلے سے علم تھا کہ اس کا نکاح کس لڑکی سے ہوگا یا معلوم نہ تھا۔ اور ان کے خسر کے ایک ہی لڑکی ہے یا دو اور گواہوں کو بھی علم تھا یا نہیں اور گواہوں کو بھی نام میں اشتباہ ہوا یا نہیں؟ سوال دوبارہ کیا جائے جس میں اس تنقیح کا جواب بھی ہو اس کے بعد حکم بتلایا جائے گا، واللہ اعلم۔

جواب تنقیح: شوہر کو پہلے سے علم تھا کہ میرا نکاح فلاں لڑکی سے ہوگا۔ اس کے خسر کی لڑکیاں چار ہیں دو شادی شدہ اور دو کنواری۔ نہ گواہوں کو نام میں اشتباہ ہوا اور نہ وکیل بالنکاح کو گواہوں کو پہلے معلوم تھا کہ فلاں لڑکی سے نکاح ہوگا۔

الجواب: صورت مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا فانه لو قال زوجتك بنتی او بموليتی والرجل یعرفها صح النكاح عند الخصاف وان لم یعرفها الشهود فی ظاهر الرواية لایصح وعلیها الفتوی واما اذا امرت المقدمات علی

معینة وتمیزت عند الخاطب العاقد وعند الشهود ایضاً یصح العقد وهی واقعة الفتوی لان المقصود نفی الجهالة وذلك حاصل بتعینها عند العاقدین والشهود وان لم یصرح باسمها ذکرہ فی الشامیة (ص ۳۷ ج ۲) وقول الخصاف فی (ص ۴۴۵ ج ۲)، واللہ تعالیٰ اعلم - ۱۷ر شعبان ۱۳۴۷ھ -

نکاح کو مخفی رکھنا گناہ ہے

سوال (۲۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک امام صاحب نے ایک بیوہ عورت سے خفیہ نکاح پڑھالیا دو گواہ پردیسی ایک سوالی ایک واعظ آئے ہوئے تھے ان دونوں کے سامنے ایجاب وقبول ہوا اور کسی سے ظاہر نہ کیا جب حمل چار یا پانچ ماہ کا ہوگیا جب عورتوں نے کہا سچ بتلا تجھ کو حمل ہے ؟ حاملہ عورت نے کہا فلاں کا حمل ہے۔ پھر دوبارہ عورتوں نے اور حاملہ مذکورہ کے دیور وغیرہ نے دریافت کیا سچ بتلا حمل کس کا ہے تب عورت مذکورہ نے کہا فلاں امام صاحب کا ہے ہمارا نکاح فلاں گاؤں میں ہوا ہے۔ اب امام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کا اس حاملہ عورت سے نکاح ہوچکا ہے امام صاحب نے کہا کہ ہوچکا ہے یہیں ہوا ہے باہر کے دو مسافر ٹھہرے ہوئے تھے ان کے سامنے ایجاب وقبول ہوا ہے لوگوں کو یقین نہ آیا امام صاحب مسجد میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے اُن سے ایک پرہیزگار متقی نے دریافت کیا کہ آپ کا اس حاملہ مذکورہ سے نکاح ہوچکا ہے؟ امام صاحب نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھکر کہا میرا نکاح ہوچکا ہے۔ آیا اس طرح خفیہ نکاح ہوجاتا ہے اور ایسے امام صاحب کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں فقط، جواب سے جلد مطلع فرمادیں؟

الجواب : اس طرح خفیہ نکاح منعقد تو ہوجاتا ہے اور ایسی عورت سے جس کا نکاح خفیہ ہوا ہو شوہر کو مجامعت بھی جائز ہے اور اس کی اولاد بھی حلالی ہوگی۔ مگر خفیہ نکاح کرنے کے بعد عرصہ تک اس کو مخفی رکھنا گناہ ہے بلکہ اس کو جلدی ہی ظاہر کردینا چاہیئے تھا کیونکہ جب عرصہ دراز تک نکاح کو مخفی رکھا جائے گا تو حمل قرار پانے کے وقت لوگوں کو عورت پر اور مرد پر زنا کا گمان ہوگا اور اس وقت لوگ اس دعوی کو کہ نکاح ہوچکا ہے بات بنانے پر محمول کریں گے۔

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: اتقوا مواضع التہم الحدیث فالاتقاء من التہمة واجب۔ لہذا اس امام کو جب تک وہ اس گناہ سے (یعنی اخفاء نکاح سے) توبہ نکرے امامت سے الگ کردیا جائے اور توبہ اس کی یہ ہے کہ مجمع عام میں اپنی خطا کا اقرار کرے کہ میں نے جو نکاح کو عرصہ تک مخفی رکھا جس سے لوگوں کو تہمت اور بدگمانی میں مبتلا کیا۔

مجھ سے گناہ ہوا میں اللہ تعالیٰ کی جناب میں بھی اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں اور جن لوگوں کو میں نے بدگمانی میں (اس فعل سے) مبتلا کیا ہے اُن سے بھی معافی چاہتا ہوں فان التوبة علی قدر المعصیة واللہ اعلم - ۲۴ر شوال ۱۳۴۷ھ -

زنا سے نکاح فاسد نہیں ہوتا۔ اور ایسی عورت کا بدون طلاق زوج اول دوسرے سے نکاح کرنیوالوں کا حکم

سوال (۲۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین مبین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسلمان کی بی بی نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر بازار میں گھر کرکے چند برس تک پیشہ کسبی (یعنی پیشہ زنا) کو اختیار کرکے اپنی اوقات بسر کی بعد اس کے ایک بھڑوا مرد نے اس کو وہاں سے لاکر عالموں سے دریافت کیا کہ اس کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے یا نہیں۔ اکثر عالموں نے کہا اس عورت زانیہ سے نکاح کرنا درست نہیں کیونکہ اس کے شوہر نے طلاق نہیں دی ہے اور پیشہ زنا سے طلاق واقع نہیں ہوتی اور بعض بعض عالم نے کہا کہ اس عورت سے نکاح کرنا حلال ودرست ہے اور وجہ حلال ہونے کی یہ بیان کرتے ہیں کہ جو عورت اپنے شوہر سے چھ ماہ کی مدت تک علیحدہ رہے وہ مطلقہ ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس عورت نے پیشہ زنا کو اختیار کرکے مدت تک زنا کیا ہے اس سبب سے نکاح ٹوٹ گیا اس کو نکاح کرنا بلا خطر درست وحلال ہے یہ کہکر چندر وپیہ لیکر وکیل وگواہ کے سامنے اسکا نکاح اجنبی مرد سے پڑھادیا۔ اب یہ نکاح مذہب حنفی کے موافق درست وحلال ہے یا نادرست وحرام؟ اور اگر حرام ہو تو جس عالم نے یہ حکم دیکر نکاح پڑھایا اور جو شخص وکیل وگواہ ہوکر نکاح کرایا یہ سب کافر ہیں یا مسلمان اور ان کی بی بی ان پر حرام ہوئی یا حلال؟ بر تقدیر حرمت کے تجدید نکاح واجب ہے یا نہیں اور جب تک یہ لوگ توبہ کرکے نکاح ثانی نہ کریں تو ان سب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور ان کو مسلمان جان کر سلام وکلام کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل۔

الجواب : قال فی الدر وصح نکاح موطوءة بزنا ای جاز نکاح من رآها تزنی وله وطؤها بلا استبراء[1] وفی آخر حظر المجتبی لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرة ولا علیها تسریح الفاجر الا اذا خافا ان لا یقیما

---

[1] بشرط ان لا تکون حاملاً قبل النکاح من غیر الزوج واما لو ظهر بها حمل بعد النکاح من الزنا فهو من حیث الحکم للزوج لان الفراش له وتمامه فی رد المحتار ۱۲

حدود اللہ فلا بأس ان یتفی قاہ قال ابن عابدین عن البحر بدلیل الحدیث ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ ان امرأتی لاترد ید لامس فقال صلی اللہ علیہ وسلم طلقها فقال انی احبها وھی جمیلة فقال صلی اللہ علیہ وسلم استمتع بها قال فی البحر لوتزوج بامرأة الغیر عالما بذلك ودخل بها لاتجب العدة علیها حتی لا یحرم علی الزوج وطؤها وبه یفتی لانه زنا والمزنی بها لا تحرم علی زوجها (ص ۴۷۹ و ۴۸۰ ج ۲)۔

ان عبارات فقہیہ سے ظاہر ہے کہ عورت کے زنا سے اس کا نکاح فاسد نہیں ہوتا اور وہ بدستور اپنے شوہر کے نکاح میں باقی رہتی ہے پس اس کا نکاح دوسرے مرد سے بدون طلاق شوہر اول اور بدون عدت طلاق گذرنے کے ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا پس صحیح قول اس مسئلہ میں فریق اول علماء کا ہے اور فریق ثانی کا قول بالکل غلط ہے ان کو اپنی خطاسے علی الاعلان توبہ کرنا چاہئے اور جب تک وہ توبہ کا اعلان نہ کریں اس وقت تک ان سے سلام وکلام تعلقات و موالات ترک کردیئے جائیں لیکن ان کو کافر نہ سمجھا جائے اور نہ ان کے نکاح فاسد ہوئے البتہ قبل اعلان توبہ ان کی اقتداء نہ کی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۷ محرم سنہ ۴۸ھ۔

ایک مرد اور عورت یہ اقرار کریں کہ ہمارے نکاح میں کوئی شرعی امر مانع نہیں لیکن اہل شہر اجنبی ہونے کے سبب اس کی تصدیق نہیں کرسکتے۔ تو قاضی دونوں کا حلفیہ بیان لیکر نکاح کرسکتا ہے یا نہیں

سوال (۲۹) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین در بارۂ نکاح محمود وفریدہ۔ کہ محمود وفریدہ دونوں غریب الوطن ہیں اپنے وطن سے دور دراز فرار ہوتے ہوئے کسی شہر میں وارد ہوکر اہل شہر سے اپنا وطن اصلی کچھ بتائیں اور ارادہ ظاہر کریں کہ باہم عقد مناکحت کرلیں۔ دونوں کا اقرار کہ ہمارے مابین کوئی رشتہ حرمت نہیں اہل شہر کے عندیہ میں یہ دونوں اجانب متصور ہیں گو کہ محمود کو کسی سے تعرف ہو مگر فریدہ اجنبیہ ہے جس سے اہل شہر احتمال کرسکتے ہیں کہ فریدہ کسی کی منکوحہ ہوگی اور محمود کی فریب دہی سے زوجیت سے دست بردار ہوکر آئی ہوگی کسی کو کچھ خبر نہیں کہ دونوں اپنے اقرار میں سچے ہیں یا جھوٹے۔ مگر دونوں کا حلفیہ اقرار ہے کہ ہمارے مابین تزویج کے لئے کوئی شرعی امر مانع نہیں۔ تصدیق وتحقیق کے لئے یہ دونوں اہل شہر سے بھی نہیں بلکہ ابناء سبیل مانے جاتے ہیں اور ان کا وطن اصلی بھی قریب نہیں بلکہ پانچ سو میل کی مسافت سے بھی متجاوز ہے

لہٰذا عرض خدمت ہے کہ محمود مذکور اور فریدہ مذکورۃ بالغہ جو چودہ سالہ عمر رکھتی ہے ان دونوں کے انعقاد نکاح کی کیا صورت ہے آیا جس شہر میں کہ یہ دونوں وارد ہیں اور استدعائے تزویج کررہے ہیں کیا باعتبار حلفی اقرار قاضی شہر مجاز ہے کہ اہل شہر سے کوئی دو شاہد مقرر کرکے حسب استدعاء محمود وفریدہ سردست بلا تحقیق وتنقیح ان دونوں کا نکاح کردے یا باوجود ان دونوں کے حلفی اقرار کے مزید تحقیق ضروری ہے کہ نکاح ملتوی یا رد کردے اگر باعتبار حلفی اقرار اُن دونوں کے قاضی نکاح کردے تو اُس نکاح کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا رحمکما اللہ تعالیٰ۔

الجواب: اگر قاضی شہر کا قلب اس مرد وعورت کی صدق کی شہادت دے اور اُن کے حلفیہ بیان پر اُس کا قلب مطمئن ہوجائے تو اُس کو اُن دونوں کا نکاح کردینا جائز ہے مگر نکاح مجمع عام میں کرے صرف دو گواہوں کے سامنے نہ کرے کیونکہ اگر وہ جھوٹے ہوں گے تو غالب یہ ہے کہ مجمع عام میں نکاح پر راضی نہ ہوں گے، وایضاً ففی نکاح السر من المفاسد مالا یخفی والاصل فی ذلك ماذکرہ الفقهاء فی امرأة قالت لرجل طلقنی زوجی ثلاثا وانقضت عدتی فان شهد بصدقها قلبه جاز له ان یتزوجها، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یکم ربیع ... سنہ ۴۸ھ

استفتاء ضمیمہ سابق

سوال:- ہندہ کا حامد سے خطبہ ہوچکا تھا اتفاقاً زید جو مرد اجنبی ہے باکرۂ مذکور ہندہ کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کئے ہوئے اس کے ابوین واقارب سے جدا کرکے کہیں اور مقام پر فرار ہوا۔ ہندہ کے ابوین واقارب اس واقعۂ جانگزا سے حیران ہوکر اطراف واکناف متلاشی رہے بالآخر کسی مقام پر جو تقریباً یکہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے بعد تفتیش وتلاش بعرصۂ ایک ماہ سراغ پاکر مفرورین کو گرفتار کرکے وطن لے آئے ہندہ تو اپنے والدین کے قبضۂ اختیار میں رہ گئی مگر زید جو غریب الوطن مانا جاتا تھا بعد ملامت وتشنیع اپنے وطن کو روانہ کیا گیا جو تیس میل پر واقع ہے۔ تقریباً عرصہ چھ سات ماہ گذرتا ہے کہ حالاً زید مدعی ہے کہ ہندۂ مذکورہ اپنی منکوحہ ہے۔ حالانکہ ہندۂ مذکورہ کا نکاح حامد مذکور الصدر کہ جس کا قبل از وقوع واقعۂ مذکورہ ہندہ کے ساتھ خطبہ ہوچکا تھا تقرر پایا ہے عنقریب نکاح ہونے والا ہے لہٰذا احقر چند سوالات متعلقۂ امر مذکور بخدمت اقدس مؤدبانہ پیش کرتا ہے:

(۱) زید مذکور کا جو دعوٰے ہے کہ ہندہ اپنی منکوحہ ہے کیا بصورت عدم حضور ولی وارتکاب

منہیات یہ دعویٰ صحیح ہے کیا ہندہ کو منکوحہ قرار دی جاتی ہے ؟

(۲) زید کا یہ دعویٰ کہ میں نے بحالتِ فرار کسی مقام میں ہندہ سے نکاح کیا ہے درآنحالیکہ دونوں اجانب و غریب الوطن متصور تھے ۔ نہ شاہدین کو نہ اوروں کو کچھ خبر ہے کہ ہندہ کے ساتھ زید کو باہمی کیا مناسبت ہے گو کہ فیما بین رشتۂ حرمت ہی کیوں نہ ہو بلا تحقیق شاہدین وغیرہ مجاز ہیں ۔ گو کہ ہندہ زید کہ محرمات ابدیہ سے ہی کیوں نہ ہو بلا تحقیق حسب استدعاء زید انعقاد نکاح میں استعمال شاہدین وغیرہ درست ہے ۔ کیا یہ نکاح اجانب جو بلا تحقیق و تنقیح کیا گیا ہی صحیح ہے ؟

(۳) اگر کسی وجہ سے نکاح زید ہی معتبر ہو تو کیا ہندہ کے اولیاء عصبہ کو حق فسخ حاصل نہیں ؟

(۴) برخلاف دعویٰ زید ہندۂ مذکورہ کا نکاح جو فی الحال حامد کے ساتھ تقرر پایا ہے جن کے مابین کوئی رشتۂ حرمت تو نہیں ہے نفاذ نکاح کے لئے کیا کوئی امر مانع و مزاحم ہے ؟

(۵) کیا ہندہ کو بلا بینہ شرعی صرف بوجہ فرار و ہمراہی زید زانیہ کہہ سکتے ہیں ؟

(۶) بصورت ثبوت زنا کیا ہندہ پر جو غیر محصنہ ہے حد جاری کی جاوے ؟

(۷) یہاں رسم ہے کہ زانی و زانیہ محصن خواہ غیر محصن رومال لپیٹ کر سو درے لگائے جاتے ہیں نہیں معلوم کہ رجم کا حکم کس کے لئے ہے آیا یہ حکم ہی منسوخ ہے ؟

(۸) در بارۂ اجراء حدود گورنمنٹ کی سخت ممانعت ہے دریں صورت مجبوری رجم ترک کر کے مجرم و مجرمہ پر صرف کوڑے ہی لگائے جاویں ؟

(۹) کیا بصورت مجبوری کوڑے لگانا رجم کے قائم مقام ہوگا کیا اس طریق سے حد ساقط ہو جاتی ہے ؟

(۱۰) صرف رومال لپیٹ کر درے لگائے جاویں یا دیگر آلات سے اور درہ اصطلاح شرع میں کس کو کہتے ہیں ؟

الحاصل احقر بخدمت اقدس ملتجی ہے کہ ازراہِ کرم کل سوالات کا جواب بالاستیعاب از روئے اصول ثلاثہ معہ حوالۂ کتب و دستخطی مہر جناب وغیرہم زیب رقم فرماویں کہ جملہ شبہات کا مطلب ذہن نشین ہو جاوے اور خلجان کلی رفع ہو اور کسی کو مجال دم زنی نہ ہو اگرچہ جرأت احقر موجب تضیع اوقات عزیز آنجناب ہے معہذا بندہ عرض پرداز ہے کہ ازراہِ بندہ نوازی ہمہ امور تمام تر قوی سند کے ساتھ کہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہو قلمبند فرما کر ممنون فرما دیں ۔ امید کہ آنجناب اپنی سعی بلیغ مبذول فرما کر بمجرد جوابات سے سرفراز و ممتاز فرمائیں گے ۔

الجواب ؛ درے لگانے کا حق عوام کو نہیں بلکہ امام کو ہے اور ہندوستان میں

امام نہیں البتہ اگر پنچایت کو گورنمنٹ کی طرف سے سزائے بید کا اختیار حاصل ہو تو جرائم پیشہ لوگوں کو سزائے بید دے سکتے ہیں جس کے لئے شرط یہ ہے کہ ۳۹ بید سے زیادہ نہ مارے جائیں باقی اس نکاح کے متعلق چند امور تنقیح طلب ہیں ان کا جواب دیا جائے ۔

(۱) ہندہ زید کے دعوے کو صحیح کہتی ہے یا غلط بتلاتی ہے ؟

(۲) زید ہندہ کا ہم کفو ہے یا نہیں یعنی نسباً دونوں میں کفاءت ہے یا نہیں ؟

(۳) زید اور ہندہ نکاح کے شاہد جن لوگوں کو ظاہر کرتے ہیں وہ شاہدین ان کے دعوے نکاح کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں ، ہندہ بالغہ ہے یا نہیں ، عمر کیا ہے ؟ ان تنقیحات کے جواب کے بعد سوال کیا جائے تو جواب ملے گا یہ پرچہ پھر واپس کیا جائے فقط ۔

۱۵ رصفر ۴۵ھ ۔

مولانا ! السلام علیکم : امابعد ہر چہار امور تنقیح طلب کا جواب حتی الامکان عرض کیا جاتا ہے ۔

امر اول ۔ ہندہ دعوی زید کی تکذیب کرتی اور غلط بتلاتی ہے ۔

امر دوم ۔ ہندہ تو اہل سادات سے ہے مگر زید کا نسب نامعلوم ۔ سادات سے تو نہیں مگر شیخ یا پٹھان خاندان سے ہو گا نیز باعتبار حرفت زید میں کوئی رذالت پائی نہیں جاتی غالباً زید ہندہ کا ہم کفو ہو گا ۔

امر سوم ۔ شاہدین کا پتہ نہیں ، نہیں معلوم کہ شاہدین نکاح کون ہیں زید کا جو دعویٰ ہے عدالتی نہیں ۔ چونکہ زید نے اپنا دعویٰ عدالت میں دائر نہیں کیا ہے صرف تخویفاً لوگوں میں ظاہر کر رہا ہے کہ ہندہ میری منکوحہ ہے حامد کے ساتھ نکاح ہونے کے بعد دعویٰ دائر کروں گا ، نہیں معلوم کہ یہ دعویٰ کہاں تک راست و درست ہے اور کہاں تک دروغ ۔ چونکہ معاملہ سراسر تصدیق طلب ہے ۔ غرض زید کا دعویٰ ہے کہ جس مقام میں نکاح کیا ہوں وہاں پر شاہدین موجود ہیں بعد نکاح حامد بعدالت دعویٰ دائر کروں گا ۔

امر چہارم ۔ ہندہ بالغہ ہے اور عمر میں چودہ سالہ ہے ۔
امید کہ آنجناب جملہ سوالات کا جواب مفصل زیب رقم فرما کر ممنون فرمائیں گے ۔

الجواب ؛ جب ہندہ نکاح سے منکر ہے اور زید کے پاس وہ گواہ نہیں جو نکاح کی شہادت دیں تو محض اس کی افواہ اور تخویف سے نکاح کا ثبوت نہیں ہو سکتا ورنہ ہر شخص

دعویٰ کردیا کرے گا کہ میرا نکاح فلاں عورت سے ہوچکا ہے، دعویٰ بلا دلیل و بلا بینہ ردہے۔

البتہ اگر زید کے دعوے سے ولی ہندہ کو تردد ہوگیا ہو تو وہ ہندہ سے قسم وغیرہ لیکر اپنا اطمینان قلب کرکے ہندہ کا نکاح حامد سے کرے بدون اطمینان قلب کے ایسا نہ کرے۔ رہا یہ کہ زید بعد میں عدالتی دعوے کی دھمکی دے رہا ہے تو اس دھمکی کا قانونی بچاؤ قانون دان لوگوں سے معلوم کرے۔

نوٹ: سائل نے زید کی نسبی حالت کو بالکل گول مول ظاہر کیا ہے کہ شیخ ہوگا یا پٹھان اُس کو لازم ہے کہ ایک بات تحقیق کے ساتھ معین کرکے لکھے فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

یکم ربیع الاول سنہ ۴۸ھ۔

نکاح سری کی تعریف اور اس کا حکم

سوال (۳۰) تعریف نکاح سری چیست وحکم آن چیست اگر شخصے نزد دو گواہان معتبر در خلوت بازنے ایجاب وقبول ساخت آیا حکم ایں نکاح سری شد یا جہری؟

الجواب: نکاح سر کہ ممنوع وباطل است آن است کہ در و شاہدین علاوہ ناکح ومنکوحہ نباشند واگر شاہدین یا شہود حاضر باشند ایں چنیں نکاح نکاحِ سر باطل نباشد، اما خالی از کراہت نباشد لان السنۃ فی النکاح الاعلان ولذا شرع لہ الدف ونحوہ وفی الحدیث الفرق بین الحلال والحرام الدف ولان فیہ القاء نفسہ فی التہمۃ ویتہمہ بالزنا من لم یعلم بالنکاح وفی الحدیث اتقوا مواضع التہم، واللہ اعلم۔

۱۸/۱۲/سنہ ۴۸ھ۔

حرہ عورت کو خریدنا اور اپنے ساتھ اس کا نکاح کرنا

سوال (۳۱) کسی عورت کو روپیہ سے خرید کر کے اس کا اپنے ساتھ نکاح کرنا شرع کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟ امید کہ حضور والا اس سوال کے جواب مبارک سے مشرف فرمادیں گے۔

الجواب: آزاد عورت کو روپیہ سے خریدنا حرام ہے جائز نہیں اور اس سے جبراً نکاح کرنا حرام ہے اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح درست ہوسکتا ہے خریدنے کے دباؤ سے ہرگز درست نہ ہوگا اور خریدنے کے گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے، واللہ اعلم۔

۱۸/رجب سنہ ۴۸ھ۔

چار بیویوں میں سے ایک کا انتقال ہوجائے تو دوسری عورت سے بلا کسی مدت کے انتظار کے نکاح جائز ہے

سوال (۳۲) زید کی چار بیبیاں تھیں ان میں سے ایک انتقال کرگئی وہ دوسری ایک عورت سے بلا درنگ نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں کرسکتا ہے کیونکہ مرد کے ذمہ عدت نہیں۔

لونڈی سے کراہت نکاح کی وجہ

سوال (۳۳) لونڈی سے کراہت نکاح کی منجملہ وجوہ کراہت سے ایک یہ بھی مرقوم ہے کہ لونڈی غیر کی مملوک ہے اگر کسی وقت شوہر اس کو اپنے پاس رکھنا چاہے اور اس وقت مالک اس سے خدمت لینا چاہے تو ضرور بے لطفی ہوگی اس خدمت سے صحبت کرنا مراد ہے یا اور کچھ؟

الجواب: خدمت سے مراد علاوہ استمتاع کے ہے فی الدر (ومن عرسہ امتہ الحلال) لہ وطؤہا فخرج المجوسیۃ والمکاتبۃ والمشترکۃ ومنکوحۃ الغیر الخ شامی ص ۳۰۲ ج ۵۔ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔

جب عورت مجلس نکاح میں موجود ہو تو شاہدوں کو نام وغیرہ بتلانا ضروری نہیں ہے

سوال (۳۴) ایک عورت برقعہ پوش تنہا دو مرد گواہوں کے سامنے کھڑی ہے اور گواہوں کو اس کا مطلق علم نہیں ہے کہ یہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے صرف اتنا معلوم ہے کہ کوئی عورت ہے اس صورت میں۔ مرد ثالث جو عورت مذکورہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے یہ کہے کہ کیا مجھ سے تجھے نکاح منظور ہے؟ عورت جواب دیتی ہے مجھے قبول ہے یا قبول کیا تو کیا از روئے شرع نکاح ہوگیا؟

(۲) صورت سابقہ میں اگر مرد گواہوں سے عورت مذکور کا پتہ بالکل نہ دے تو کس طرح ہے؟

(۳) اگر مرد عورت مذکورہ کا پتہ اس طرح جھوٹ بتلائے مثلاً گواہوں سے کہدے کہ یہ عورت اجمیر رہتی ہے اور اجمیر سے آئی ہے اور میں اس سے نکاح کرتا ہوں حالانکہ دراصل وہ عورت جودھپوری کی ہے اس کا جواب بھی لکھیں؟

الجواب: جب عورت سامنے موجود ہے تو شاہدوں کو اس کا نام وغیرہ بتلانا ضروری نہیں پس ہر سہ صورت میں نکاح صحیح ہوجاتا ہے کما فی العالمگیریۃ ص ۲ ج ۲ وان کانت حاضرۃ متنقبۃ ولا یعرفہا الشہود جاز النکاح وھو الصحیح۔ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔

۱۰/رمضان شریف سنہ ۴۵ھ عہ

عہ یہاں تک کے کل جوابات حضرت مولانا صاحب مدظلہم نے بھی التزاماً ملاحظہ فرمائے ہیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

ولی کی طرف اضافت کی ایک صورت کا حکم

سوال (۳۵) ایک نکاح خوان نے مجلس نکاح میں لڑکی کے باپ سے کہا کہ تونے اپنی لڑکی سکینہ اس عبداللہ کے ساتھ نکاح کے لئے دی ہے اس کے لڑکے شریف اللہ کے لئے۔ لڑکی کے باپ نے کہا دی ہے شریف اللہ کے لئے۔ پھر نکاح خوان نے عبداللہ کو کہا تونے قبول کی ہے اپنے لڑکے شریف اللہ کے لئے؟ وہ بولا میں نے قبول کی ہے شریف اللہ کے لئے۔ نکاح خوان نے اضافت نکاح کی عبداللہ کی طرف کی ہے اور لڑکی کے باپ نے نہیں کی تو اعتبار نکاح خوان کے الفاظ کا ہوگا اور لڑکی کے باپ کے الفاظ بھی ان کے ساتھ مقید ہوں گے اور نکاح خود عبداللہ کا منعقد ہو جائے گا نہ اس کے لڑکے شریف اللہ کا کما قال الشامی وبقی ایضا قولھم زوجتک بنتی لابنک فیقول قبلت ویظھرلی انه ینعقد للاب لاسناد التزویج وقول ابی البنت لابنک معناہ لاجل ابنک فلایفید وکذا لوقال الآخر قبلت لابنی لایفید ایضاً۔ یا اعتبار لڑکی کے باپ کے الفاظ کا ہوگا اور نکاح عبداللہ کے لڑکے شریف اللہ کا منعقد ہوگا نہ عبداللہ کا۔ کما قال الشامی نعم لوقال اعطیتک بنتی لابنک فیقول قبلت فالظاھر انه ینعقد للابن لان قوله اعطیتک بنتی لابنک معناہ فی العرف اعطیتک بنتی زوجة لابنک وھذا المعنی وان کان ھو المراد عرفاً من قولھم زوجتک بنتی لابنک لکنه لایساعدہ اللفظ کما علمت والنیة وحدھا لاتنفع کما مر واللہ سبحانه اعلم۔

حاصل سوال یہ ہے کہ نکاح بطریق مذکور عبداللہ کا ہوا ہے یا اس کے لڑکے شریف اللہ کا؟ بینوا الوجه اللہ العظیم فانه یجزی بمغفرة ورزق کریم

الجواب: صورت مسئولہ میں شریف اللہ کا نکاح صحیح ہوگیا ہے اور نکاح خوان کے کلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس سے آگے حضرت والا نے فرصت نہ ہونے کے باعث التزام ترک فرما دیا صرف استاذی المکرم جناب مولوی ظفر احمد صاحب التزاماً ملاحظہ کرنے لگے۔ ۱۲ منہ

البتہ کوئی جواب مولانا مدظلہ کی تحقیق کے خلاف نہیں لکھا جاتا بلکہ جو نیا سوال ہو اس کو زبانی دریافت کرکے لکھا جاتا ہے اور کہیں کہیں ملاحظہ کی نوبت آتی ہے تو وہاں تصریحاً اس کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی حضرت والا دستخط ثبت فرما دیتے ہیں۔ ۱۲ احقر عبدالکریم عفی عنہ۔

۲۶ رمضان ۴۸ھ۔

میں جو ساتھ نکاح کے واقع ہے وہ شریف اللہ سے متعلق کہا جاوے گا پس زوجتک بنتی لابنک پر اس کا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کما لایخفی ونیز اس استفہام کو تو ایجاب نہیں کہہ سکتے بلکہ ایجاب وہ ہے جو ولی نے کہا ہے اور ولی کے قول میں عبداللہ کے نکاح کا احتمال نہیں اور رہا یہ شبہ وکذا لوقال الآخر قبلت لابنی لایفید ایضاً معلوم ہوتا ہے کہ قول اول کا اعتبار ہوتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قول اول سے مراد ایجاب ہے قبول ایجاب کے تابع ہوگا قول ولی کو قول نکاح خوان کے تابع کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ۔

الجواب صحیح۔

ظفر احمد عفا عنہ، ۲۱ ذی الحجہ ۴۸ھ۔

مسئلہ نکاح

سوال (۳۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی بارات مسماۃ ہندہ سے نکاح کرنے کے لئے گئی عقد کے وقت زید کے ولی سے دریافت کیا گیا کہ زید بالغ ہے یا نابالغ تو زید کے ولی نے کہا کہ نابالغ ہے اس کے بعد پوچھا گیا کہ زید کا باپ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ زید کا باپ نہیں آیا ہے بلکہ اس نے ایک شخص کو یعنی بکر کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا ہے تب بکر سے دریافت کیا گیا کہ تم کو زید کے باپ نے اپنا قائم مقام بنایا ہے تو بکر نے کہا کہ ہاں ہم کو اس کے باپ نے اپنا قائم مقام بنایا ہے اس کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے دین مہر مبلغ پانچسو روپیہ کہا گیا تو لڑکے کے ولی نے انکار کیا آخر کار بضد ہو کر مبلغ ۵۰ روپیہ دین مہر سے کم کرا دیا غرضیکہ مبلغ چار سو پچاس روپیہ دین مہر قرار پایا چونکہ لڑکے کو نابالغ کہا گیا تھا اس لئے لڑکے سے ایجاب وقبول نہیں کرایا گیا بلکہ اس کے باپ کے کیل یعنی بکر سے کرایا گیا بکر نے کہا کہ ہاں ہم اس لڑکے کے لئے قبول کرتے ہیں۔ زید جس کا عقد ہو رہا تھا اسی مجلس میں موجود تھا اور سب باتوں کو سن رہا تھا سب باتیں اس کے روبرو ہوئیں۔ بعد عقد لڑکی والوں نے باراتیوں کو کھانا وغیرہ کھلا دیا کھانے کے بعد بارات والوں نے بہت اصرار کیا کہ بیاہ کے ناجائز رسومات بھی ادا ہونے چاہئے مگر لڑکی والوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم ناجائز وقبیح رسومات ادا کریں آخر کار بارات والے مجبور ہو کر چپ ہو رہے۔ بعد نماز فجر لڑکی والوں نے بارات والوں کو خبر دیا کہ تم لوگ سواری منگاؤ اور لڑکی رخصت کرالے جاؤ۔ تب بارات والوں نے کہا کہ ہم کو معلوم نہیں تھا کہ صبح کو رخصت ہوں گے اس لئے ہم اس وقت نہیں جا سکتے۔ مگر لڑکے کے ولی نے زید کے روبرو کہا کہ اچھا ہم سواری منگاتے ہیں تو لڑکی رخصت کرا کے ہم لوگ اسی وقت چلے جائیں گے لڑکا یعنی زید یہ سب

باتیں بھی سن رہا تھا کچھ دیر ہوگئی مگر سواری نہیں آئی تو لڑکے کے باپ آئے اور اظہار رنج وافسوس کیا کہ رات کو بیاہ کا رسم کیوں نہیں ادا ہوا اور صبح کو کیوں رخصت کرتے ہیں۔ جب تک سب والوں نے جہیز برتن نقد روپیہ جو کچھ دینا تھا وکیل کے سپرد کردیا۔ لڑکے کے باپ اور بکر جو وکیل باپ کی طرف سے تھا۔ سبھوں نے اس جہیز کو منظور کرکے لے لیا۔ اور بارات واپس لیکر گھر چلے آئے۔ اور چلتے وقت یہ کہا کہ سواری اس وقت کہیں چلی گئی ہے بروقت نہیں مل سکتی ہم شام کے وقت سواری بھیجکر لڑکی رخصت کرالیں گے۔ لڑکی والے نے شام تک انتظار کیا مگر سواری نہیں آئی قریب چار بجے آدمی جاتا ہے کہ جلد سواری بھیجو چنانچہ اوسی وقت لڑکی کے والد سواری والوں کے پاس گئے کہ تم لوگ سواری لے جاؤ مگر اس وقت بھی سواری نہیں ملی اس کی چونکہ طبیعت اور منشاء کے مطابق نہ تو دونوں وقت لڑکی والے نے کھانا کھلایا۔ اور بیاہ کے رسومات ادا کئے اس لئے لڑکے کے گھر والوں کو اسکا افسوس تھا اس لئے یہ کہنے لگے کہ ابھی نکاح نہیں ہوا کیونکہ لڑکا بالغ ہے۔ اور لڑکے سے ایجاب وقبول نہیں کرایا گیا اس لئے ہم لوگ دوبارہ بارات لے جائیں گے۔ اور عقد کریں گے اور رسم ورسومات ادا کریں گے تب لڑکی کو رخصت کرائیں گے زید کے گھر والوں نے یہ سب باتیں اس روز شام تک اور بارات رخصت ہونے سے قبل کچھ نہیں کہا تھا کہ ابھی نکاح نہیں ہوا اس لئے ہم لوگ لڑکی رخصت نہیں کرائیں گے اور نہ لڑکے نے کچھ کہا بعد میں یہ سب تدبیریں رسم ادا کرنے کے لئے سوچی گئیں۔ تو کیا از روئے شرع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلا نکاح معتبر ہوا یا نہیں؟ ابینوا توجروا۔

تنقیحات

(۱) لڑکے کی عمر کیا ہے اور اس کی صورت سے آثار بلوغ ظاہر ہوتے ہیں یا نہیں؟

(۲) لڑکا یعنی زید اپنے کو بالغ کہتا ہے یا نابالغ؟

(۳) نکاح ہوجانے کے بعد زید سے ایسے افعال ظاہر ہوئے یا نہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس کے نزدیک نکاح ہوچکا مثلاً دوستوں نے نکاح کی مبارکباد دی ہو اور اُس نے خوشی کا اظہار کیا ہو یا اور کوئی رسم نکاح کی ایجاب وقبول کے بعد کی گئی ہو اور اُس میں اس نے حصہ لیا ہو؟

جواب تنقیح: (۱) لڑکے کی عمر سترہ اور اٹھارہ کے درمیان ہے۔

(۲) زید اپنے کو بالغ کہتا ہے۔

(۳) نکاح کے بعد زید نے لڑکی کی طرف سے انگوٹھی پہنا نکاح کا رومال کندھے پر رکھا اور نکاحانہ روپیہ لیا۔ جیساکہ دستور ہے کہ نکاح ہوجانے کے بعد اسی مجلس میں دو ایک روپیہ

اور انگوٹھی ورومال دیا جاتا ہے اور نکاح کے بعد دوسرے روز دس بارہ رومال اور پندرہ بیس روپیہ تھا مکر لڑکے کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے ان سب رسم کو زید نے ادا کیا اور ان چیزوں کو منظور کیا۔

الجواب صورت مسئولہ میں چونکہ لڑکا بروقت نکاح بالغ تھا جیسا کہ جواب تنقیح میں اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے درمیان بتلائی گئی ہے اور لڑکے نے نکاح کے بعد ایسے افعال کئے جو اجازت نکاح پر دال تھے مثلاً انگوٹھی پہننا اور نکاحانہ لینا اور سلامی کے روپیہ لینا لہٰذا گو اس نے زبان سے ایجاب وقبول نہیں کیا مگر عملاً نکاح کو نافذ کردیا ہے لہٰذا یہ نکاح نافذ وکامل ہوچکا اب لڑکے والوں کا یہ کہنا کہ نکاح نہیں ہوا ہم دوبارہ بارات لے جائیں گے غلط ہے واللہ اعلم۔

۱۷ محرم ۳۹ھ۔

فصل فی المحرمات

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اہلسنت والجماعت اس امر میں کہ سگی ممانی اور سگی چچی سے نکاح جائز ہے یا کہ ناجائز موافق حکم شرع کے ارشاد فرمادیں؟ | ممانی اور چچی سے نکاح جائز ہے

الجواب: سگی ممانی اور سگی چچی سے نکاح بعد گذرنے عدت کے جائز ہے۔

۳ ذیحجہ ۴۰ھ۔

سوال (۲) زنی بعد از مطلقہ شدن وعدت گذاردن کو حیہ گردشد تعلق ناجائز باچند کسان می داشت ازیں تعلق او را دختری زائید بعد از زائیدنش بیکی از تعلق داران پیشین نکاح کرد اکنون ناکح می خواہد کہ نکاح پسر بالغ خود بہمین مولودہ بالغہ کہ در ایام بدکاری زائیدہ است کند شرعا می توان شد و یا نہ درمختار صفحہ ۲۸۴ حرم علی المتزوج ذکرا کان او انثی نکاح اصلہ وفرعہ علا او نزل وبنت اخیہ واختہ وبنتہا ولو من زنا (ردالمحتار) ای بان یزنی الزانی ببکر ویمسکہا حتی تلد منہ بحر عن الفتح قال الحانوتی ولا یتصور کونہا ابنۃ من الزنا الا بذلک اذ لا یعلم کون الولد منہ الا بہ اھ ای لانہ لو لم یمسکہا یحتمل ان غیرہ زنی بہا لعدم الفراش النافی لذلک الاحتمال۔ ازیں عبارت جواز مفہوم می شود چراکہ در صورت مسئولہ بکارۃ وامساک منتفی است (ردالمحتار ۲۸۷) قال فی البحر اراد بحرمۃ المصاہرۃ الحرمات الاربع حرمۃ المرأۃ علی اصول الزانی وفرعہ | ولد زانی کا مزنیہ کی بیٹی سے نکاح کی ایک صورت

نسباً ورضاعاً وحرمة اصولها وفروعها على الزانى نسباً ورضاعاً كما فى الوطى
الحلال ويحل لاصول الزانى وفروعه اصول المزنى بها وفروعها۔
ازاینجاہم جواز فہمیدہ می شود آنچہ حکم شرع است ازو آگاہ فرمائید؟

الجواب: درصورت مسئولہ مذکورہ نکاح پسر بالغ ناکح بامولودہ منکوحۂ او کہ درایام
بدکاری زائیدہ است جائز نیست کہ خلاف احتیاط است قال الشامی بعد العبارة المذكورة
فى السوال (تنبيه) ذكر فى البحر انه دخل بنت الملاعنة ايضاً فلها حكم البنت
هنا لانه بسبيل من ان يكذب نفسه ويدعيها فيثبت نسبها منه كما فى الفتح
قال وقدمنا فى باب المصرف عن المعراج ان ولد ام الولد الذى نفاه
لايجوز دفع الزكاة اليه ومقتضاه ثبوت البنتية فيما يبنى على الاحتياط فلايجوز
لولده ان يتزوجها لانها اخته احتياطاً وتوقف على نقل اه (ص ۴۵۴ ج ۲)۔
قلت والاحتياط فى باب الفروج لازم فما قاله فى الفتح والمعراج لاتخالفه
القواعد ومقتضاه ماقاله فى البحر[عه] من ثبوت البنتية فيما مبناه على الاحتياط
فيلزم الاخذ به احتياطاً۔

(تنقید) قال الشيخ قياسه على بنت الملاعنة قياس مع الفارق۔
قلت ولم اقس المسئلة على حكم بنت الملاعنة وولد ام الولد الذى
نفاه بل بنيت الجواب على قول البحر بعده ومقتضاه ثبوت البنتية فيما يبنى
على الاحتياط (معناه فى امور مبناها على الاحتياط كباب الفروج حيث
فرع عليه بقوله) فلايجوز لولده ان يتزوجها لانها اخته احتياطاً الخ
وهذا القول بعمومه يوجب ثبوت البنتية فى الصورة المسئولة احتياطاً
واما قوله وتوقف على نقل فالجواب عنه ان هذا الحكم الكلى بهذا

عہ واستدلال سائل بعبارت بحر مفید نیست فان معنى قوله ويحل لاصول الزانى و
فروعه اصول المزنى بها وفروعها . اى الاصول والفروع التى هى اصول وفروع
للمزنى بها فقط ودليل ذلك قوله كما فى الوطى الحلال بعد ذلك وفى الصورة المسئولة
بنت المزنى بها فيها شبهة كونها بنت الاب ومخلوقة من مائه ايضاً فافترقا ۱۲ ظ

اللفظ وان لم نره منقولاً ولكن احتياط الائمة فى باب الفروج تفيده كيف لا
وظاهر الرواية ان الوطى فى الدبر لايوجب حرمة المصاهرة وكذلك لو
افضاها لعدم تيقن كونه فى الفرج مالم تحبل منه ذكره فى الدر (۴۶۱ ج ۲)
ولكن فى حاشية الاشباه للحموى اقول ذكر شمس الاسلام انه يفتى بالحرمة
احتياطاً اخذاً بقول بعض المشائخ انتهى وهو لطيف حسن اذ لايكون الوطى
فى الدبر ادنى حالاً من مسه وهو تثبت به الحرمة فلان تثبت به اولى
اذ فيه مس وزيادة اه (ص ۳۵۷) واما فى الافضاء فقد ذكر فى الفتح عن
ابى يوسف رح قال اكره له الام والبنت وقال محمد التنزه احب الى اه (ص ۱۲۶ ج ۳)
وفى كل ذلك دليل على غاية الاحتياط فى هذا الباب ولا يخفى ان بنت
المزنية التى لم يمسكها الزانى عن غيره وان لم يتيقن بكونها مخلوقة
من مائه ولكن فيها شبهة ذلك حتماً فثبت مزنية الرجل فى صورة السوال
اخت ولده احتياطاً والله تعالى اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ۔
۲۱ محرم ۴۵ھ۔

(خلاصہ) کلام این ست کہ بمقتضائے کلام آن مشائخ کہ قید امساک مزنیہ افزو
دواند بدون امساک ثبوت بنتیتِ دخترش از زانی بعید است و مقتضائے تنبیہ شامی
آنست کہ بدون امساک ہم ثبوت بنتیت بعید نیست بلکہ بنا بر احتیاط این احتمال ہم قریب
است و در باب احتیاط احتمالات قریبہ معتبر و احتمالات بعیدہ غیر معتبر است پس کسیکہ
بدون امساک ہم ثبوت بنتیت را بعید شمارد فتویٰ بعدم جواز خواہد داد و رجحان احقر
کاتب حروف ہمین جانب ست۔ اما رجحان خاطر حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم بسوئے جواز
نکاح پسر زانی باین دختر زانیہ است بمقتضائے عبارت مذکورۂ سوال گو بنا بر تنزہ و
احتیاط ازین نکاح احتراز نزد ایشان ہم اولی ست فقط۔ ۲۲ محرم ۴۵ھ۔

بھتیجے کی بیوہ سے نکاح جائز ہے

سوال (۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص
کے بھتیجے کا انتقال ہوگیا اس نے زوجہ چھوڑی اس شخص کی عورت بیوہ یعنی بھتیجے کی زوجہ سے عقد
جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر بھتیجے کی بیوہ سے اس شخص کی اور کوئی قرابت محرمہ نہو مثلاً وہ بیوہ خود

اس کی بھتیجی اور بھانجی نہو تو محض بھتیجے کی بیوی ہونے سے وہ اس پر حرام نہوگی بلکہ اس سے نکاح درست ہے بشرطیکہ بیوہ دل سے راضی ہو اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جاوے جیساکہ بعض قوموں میں رواج ہے کہ ان کے خاندان میں کوئی عورت بیوہ ہوجائے تو وہ اپنے اختیار سے خود اپنا نکاح نہیں کرسکتی بلکہ خاوند کے خاندان والے جہاں چاہیں نکاح کردیتے ہیں چاہے بیوہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اور اگر یہ بھتیجے کی بیوہ اس شخص کے ساتھ قرابت محرمہ بھی رکھتی ہے یعنی وہ بھی اس کی بھتیجی یا بھانجی ہے تو اس سے نکاح نہیں ہوسکتا واللہ اعلم۔ ۲۴ ج ۲ ۴۵ھ۔

جمع بین الاختین کے متعلق ایک استفسار کا جواب

سوال (۴) خالد نے ایک نکاح کیا زینب بنت بکر کے ساتھ بعد فوت ہونے بکر کے بی بی اس کی نکاح ثانی کیا ساتھ زید کے اور زید سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہندہ نامی لیکن جس روز لڑکی پیدا ہوئی اسی روز مادرِ دختر انتقال کرگئی اور مطلق دودھ اپنی ماں کا پیا نہیں بلکہ غیر کے دودھ سے پرورش پاکر بالغ ہوئی اور نکاح اس کا ساتھ ایک دوسرے شخص کے ہوا تھا لیکن شوہر کے انتقال ہونے کے بعد قریب تین سال تک بیوہ رہی اب وہی خالد مذکور جو شوہر زینب کا ہے اس کے ساتھ نکاح کیا نکاح صحیح ہوگا یا نہیں۔ آیۃ ان تجمعوا بین الاختین سے ثابت ہوتا ہے کہ حرام ہے اور رضاعت کی شرط ہے کہ نہیں اخیافی میں؟ فقط والسلام۔

الجواب: صورت مسئولہ میں ہندہ چونکہ زینب کی اخیافی بہن ہے اس لئے خالد کو زینب کے ساتھ ہندہ کا جمع کرنا جائز نہیں وان تجمعوا بین الاختین میں اخت عینی وعلاتی واخیافی سب مراد ہیں جیساکہ واخواتکم میں۔

اور جب وہ نسب کے اعتبار سے بہن ہے تو رضاع کی کیا ضرورت جیساکہ حقیقی بہن اگر اپنی ماں کا دودھ نہ پئے تب بھی وہ بہن ہے۔ عبدالکریم عفی عنہ۔

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ۔ ۱۰ر شوال ۴۵ھ۔

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے

سوال (۵) بکر کی دو بیٹی ہیں ایک کو زید کے ساتھ بیاہ کردیا بعد دو چار برس کے زید نے دوسری بیٹی کو بھی نکاح کرلیا پس دونوں میں ایک ساتھ نکاح کرنا حرام ہے کیا؟ دونوں حرام ہوگا؟ اور پہلی عورت کے بطن سے جو لڑکی پیدا ہوئی ہے کیا وہ حرامی ہوگی؟

الجواب: زید نے جب اپنی سالی سے نکاح کرلیا تو وہ نکاح تو باطل ہوا لیکن جو بہن

زید کی پہلے سے بیوی ہے اس کا نکاح باقی ہے اور وہ بدستور حلال ہے لیکن اگر زید دوسری منکوحہ سے وطی کرچکا ہے تو پہلی منکوحہ سے بھی وطی حرام ہے یہاں تک کہ دوسری کو جدا کردے اور اس کی عدت گذرجاوے پس ہر حال میں لازم ہے کہ دوسری منکوحہ کو الگ کردے اور اگر اس سے صحبت ہوچکی ہے تو اس کی عدت ختم ہونے تک اپنی بیوی سے بھی ہمبستر نہ ہو کما فی الدر المختار (وان تزوجهما معاً) ای الاختین او من بمعناهما (او بعقدتین ونسی) النکاح الاول فرق القاضی (بینه وبینهما) وقال الشامی تحت قوله (ونسی الاول) فلو علم فهو الصحیح والثانی باطل وله وطئ الاولی الا ان یطأ الثانیة فتحرم الاولی الی انقضاء عدة الثانیة کما لو وطی اخت امرأته بشبهة حیث تحرم امرأته ما لم تنقض عدة ذات الشبهة ح عن البحر (ص ۳۴۸ ج ۲)۔ اور تفریق کی صورت یہ ہے کہ طلاق دیدے یا زبان سے کہدے کہ میں نے تجھ کو الگ کردیا اور اگر ہم بستری نہیں ہوئی تو فقط علیحدہ ہوجانا بھی کافی ہے زبان سے کچھ کہنا ضروری نہیں اور کسی حال میں قضاء قاضی شرط نہیں ہے بلکہ عورت خود بھی علیحدہ ہوسکتی ہے چاہے مرد الگ کرے یا نہ کرے کما فی تنویر الابصار ومبدأها بعد التفریق او اظهار العزم علی ترک وطئها وفی الدر تحته بان یقول بلسانه ترکتك ونحوه ومنه الطلاق وانکار النکاح لو بحضرتها والا لا، لا مجرد العزم لو مدخولة والا فیکفی تفرق الابدان وقال الشامی تحت قول الدر (العزم) من الزوج قال فی البحر ورجحنا فی باب المهر انها تکون من المرأة ایضاً (ص ۱۰۰ ج ۲)

زانی کی اولاد کا نکاح فروع مزنیہ سے جائز ہے

سوال (۶) ایک شخص ایک عورت سے بحالت باکرہ وعروسی زنِ بدفعلی کرتا رہا ہے دونوں کا نکاح غیر مرد وغیر عورت سے ہوگیا ہے اور ان کی اولاد پیدا ہوئی کچھ عرصہ بعد عورت مذکورہ کا خاوند فوت ہوگیا اسی عورت نے اسی مرد مذکور جس کے ساتھ زنا کرتی رہی ہے نکاح کربیٹھی، آیا! اب مرد کی اولاد سے اور اس عورت کی اولاد میں نکاح درست ہوسکتا ہے۔

الجواب: اس مرد کی اولاد کا نکاح اس عورت کی اولاد سے جائز ہے فی الشامی عن البحر ویحل لاصول الزانی وفروعه اصول المزنی بها وفروعها اھ

وقال الشامی مثله ماقدمناه قریبًا عن القهستانی عن النظم وغیره وقوله یحل ای کما یحل ذلک بالوطی الحلال (ص ۴۵۸ ج ۲)

ایضًا

سوال (۷) "ق" نامی ایک مرد دوسرے "ل" مرد کی عورت سے بدکاری کرتا تھا "ق" کے مرنے کے بعد اس کی عورت "ق" کی فرزند کی "ل" کی دختر سے شادی کرادیا ہے یعنی زانی مرد کا بیٹا اور مزنیہ کی بیٹی یہ آپس میں شادی کرائی گئی ہے اب یہ نکاح درست ہے یا نہیں اور وہ آپس میں مرد و عورت ہو کر رہیں یا نہ رہیں؟

الجواب: زانی کے بیٹے کا نکاح مزنیہ کی دختر کے ساتھ جائز ہے کما فی الشامی ص ۴۵۸ ج ۲ ناقلا عن البحر ویحل لاصول الزانی وفروعه اصول المزنی بها وفروعها ومثله ماقدمناه قریبا عن القهستانی عن النظم وغیره وقوله ویحل الخ ای کما یحل ذلک بالوطی الحلال الخ

عبدالکریم عفی عنہ۔　۲۹ ر جمادی الثانی ۴۲ھ۔

سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے یا نہیں یعنی سوتیلی ماں ہو اور اس اپنی سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے مفصل جواب تحریر فرمادیں؟

الجواب: سوتیلی ماں یعنی باپ کی وہ بیوی جو اپنی ماں نہیں ہے اس شخص پر اس لئے حرام ہے کہ وہ موطورة الاب ہے اور سوتیلی ماں کی بہن میں یہ علت نہیں اس لئے سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے۔

۲۲ ر رمضان شریف ۴۵ھ۔

سالی سے بیوی کے انتقال کے فوراً بعد نکاح جائز ہے یا اس کے لئے کسی خاص وقفہ کی ضرورت ہے

سوال (۹) یہاں علماء دین ایک مسئلہ میں مختلف جھگڑ رہے ہیں مسئلہ یہ ہے کہ زوجہ مرنے کے بعد زوجہ کی بہن نکاح کرنے میں مرد کو عدت پالنا ہوگا یا نہیں اور عدت کے اندر یا بعد ایک دن کے زوجہ کی بہن کے ساتھ نکاح جائز ہے یا نہیں اور کتاب شامی میں یہ عبارت تحریر ہے ماتت امرأته له التزوج باختها بعد یوم من موتها کما فی الخلاصة عن الاصل وکذا فی المبسوط لصدر الاسلام والمحیط للسرخسی والبحر والتاتارخانیة، اور اس کے نیچے پھر یہ عبارت لکھا واما ماعزی الی النتف من وجوب العدة لا یعتمد علیه والتفصیل فی کتابنا تنقیح الحامدیة۔

اور دوسری کتاب فتاوی برھنہ میں یہ عبارت لکھا:

امابعد وفاتِ زوجہ نکاح با خواہر او برونے روا نیست ہمچنیں خامسہ بعد از مردن رابعہ۔

پس اس عبارت کے موافق عدت وجوب ہوگا یا نہیں فتویٰ وجوب پر یا غیر وجوب پر مع حوالہ عبارات کتب فیصلہ فرماویں! اجر دارین یابند۔

الجواب: قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة سئل فی رجل ماتت زوجته المدخول بها ولها اخت فهل له تزوج اختها بعد موتها بیوم الجواب، نعم کما فی الخلاصة عن الاصل للامام محمد رح وکما فی المبسوط لصدر الاسلام کما نقله عنه القهستانی والمحیط للامام السرخسی والبحر والتاتارخانیه عن السراجیة وفتاوی الانقروی وقدری افندی و مؤید زاده ومجمع الفتاوی وصرة الفتاوی ومجمع المنتخبات و غیرها من الکتب المعتبرة واما ماعزی الی النتف من وجوب العدة علیه فلا یعتمد علیه وکتب تحت الجواب ماصورته قلت ؎

لعمرک ما کل النقول صحائح　ولا کل خل فی المودة ناصح

علیک باقواها دلیلاً ومأخذا　وما هو فی الکتب الشهیرة راجح

ولا تعتمد الا سدید اقامجیبا　وکن حامدً الله فالامر واضح الخ

(ص ۱۸ ج ۱)

قلت والتقیید بیوم اتفاقی والا فالظاهر الجواز بعد موت زوجته معًا لان العلة انقطاع النکاح بینهما بالموت فلا یکون بذلک جامعًا بین الاختین نکاحًا والله اعلم۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ زوجہ کے مرنے کے بعد عدت کے اندر یا موت کے ایک دن بعد اس کی بہن سے نکاح جائز ہے۔

۷ ر رجب ۴۶ھ

سوتیلی والدہ کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۰) زید کی پہلی اہلیہ سے (جو فوت ہو چکی) ایک بالغ لڑکا بکر موجود ہے۔ کیا زید اپنی موجودہ دوسری منکوحہ کی حقیقی ہمشیرہ سے اپنے فرزند بکر کا عقد کرسکتا ہے؟ یعنی بکر کا نکاح اس کی سوتیلی خالہ سے ہوسکتا ہے یا نہیں

الجواب: ہاں بکر کا نکاح اس کی سوتیلی خالہ سے جو اس کی سوتیلی ماں کی بہن ہے جائز ہے

فان اخت الموطوءة للاب لیس لها ذکر فی المحرمات واللہ اعلم

اپنے بیٹے کی بیوی کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۱) زید کی دو لڑکیاں ہیں۔ بکر نکاح کرنا چاہتا ہے ایک کو اور ایک اپنے فرزند سے کیا باپ بیٹے دونوں زید کے دو لڑکیوں سے نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں مطلع کریں؟

الجواب: یہ صورتِ نکاح جائز ہے۔ اس میں کچھ حرج نہیں کہ باپ اپنے بیٹے کی بیوی کی بہن سے نکاح کرلے فان اخت حلیلة الابن لیست من المحرمات فی شیٔ، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ رشعبان ۴۶؁ھ۔

ماں کے شوہر کی بیٹی سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بکر نے ہمراہ خدیجہ نکاح کیا چند مدت کے بعد بکر نے مسماۃ خدیجہ کو طلاق دے دی بعدہٗ بکر نے ہمراہ فاطمہ نکاح کیا اور خدیجہ نے بعد انقضائے عدت کے ہمراہ عمر نکاح کیا۔ بکر کے بطنِ فاطمہ سے ایک لڑکی عائشہ پیدا ہوئی اور عمر کا بطن خدیجہ سے ایک لڑکا مسمی ولید پیدا ہوا تو کیا صورت متذکرہ بالا میں بروئے شرع محمدی کے ولید کے نکاح میں مسماۃ عائشہ آسکتی ہے یا نہ بینوا بالصفحة والکتاب توجروا عند الوهاب؟

تنقیح:۔ بکر اور عمر اور خدیجہ اور فاطمہ میں باہم کیا قرابت ہے اگر کوئی قرابت نہیں تو اسی کو ظاہر کیا جائے سوال ناتمام ہے اس لئے جواب نہیں دیا جاسکتا فقط۔ ۱۰ رج ۱ ۴۷؁ھ۔

الجواب عن التنقیح:۔ بکر اور عمر اور خدیجہ اور فاطمہ میں کوئی اور قرابت نہیں صرف یہ کہ خدیجہ پہلے بکر کے زوجہ تھی بعدہٗ خدیجہ کو بکر نے طلاق دیدی بعد انقضائے مدت کے خدیجہ نے نکاح ثانی ہمراہ عمر کیا تھا اور بکر نے نکاح ہمراہ فاطمہ کیا دوسرے خاوند کے گھر مسماۃ خدیجہ کے ولید لڑکا پیدا ہوا اور بکر کے دوسری عورت مسماۃ فاطمہ سے عائشہ لڑکی پیدا ہوئی تو عائشہ اور ولید کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے یا نہ؟

الغرض صرف بکر اور خدیجہ کی قرابت سابقہ بطور زوجیت کے تھی اور کوئی قرابت نہیں والسلام مع الاکرام۔

الجواب: صورت مسئولہ میں عائشہ کا نکاح ولید کے ساتھ جائز ہے۔ کیونکہ یہ عائشہ اس ولید کی ماں کے شوہر کی بیٹی ہے اور وہ حرام نہیں، قال فی الدر: واما بنت

زوجة اخته او ابنه فحلال ام وفی رد المحتار: قال الخیر الرملی: ولا تحرم بنت زوج الام ولا امه ولا ام زوجة الاب ولا بنتها ولا ام زوجة الابن ولا بنتها ولا زوجة الربیب ولا زوجة الراب اھ (ص ۴۵۶ ج ۲)۔ ۲۳ رج ۱ ۴۷؁ھ

سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو آپس میں علی الترتیب حقیقی باپ بیٹے ہیں نیز زید کی بیوی یعنی عمرو کی والدہ فوت ہوچکی ہے۔ اب زید اپنا نکاح ہندہ نامی عورت سے کرچکا ہے اور ہندہ کی حقیقی بہن کو اپنے لڑکے کی زوجیت میں دینا چاہتا ہے جو بعد نکاح ہوجانے کے ہندہ اور اس کی حقیقی بہن آپس میں ساس اور بہو ہوجاویں گی ایسی صورت میں شرع شریف کا کیا حکم ہے اس مسئلہ کا جواب باصواب مستند کتب کے حوالہ سے تحریر فرماکر ارسال فرماویں فقط بینوا توجروا۔

الجواب: یہ صورت جائز ہے کیونکہ باپ کی بیوی کی بہن محرمات میں سے نہیں ہے اس سے بیٹے کا نکاح درست ہے وجواز ذلک مما لا یخفی علی من له نظر فی الفقه واللہ اعلم۔

بتاریخ ۲۴ ر شوال ۴۷؁ھ۔

بیوی کے انتقال کے بعد فوراً اس کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۴) ما قولکم رحمکم اللہ ...... زید کی بی بی انتقال کرگئی اس کی بہن کے ساتھ فی الفور اس کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں کرسکتا ہے (مرد کے ذمہ عدت کا انتظار طلاق اخت وطلاق رابعہ میں ہے موت اخت و موت رابعہ میں نہیں)۔

ساس کی سوتیلی ماں محرمات میں داخل نہیں ہے

سوال (۱۵) ساس کی سوتیلی ماں محرمات میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب: محرمات میں سے نہیں ہے جیسا کہ بیوی کی سوتیلی ماں حلال ہے فی العالمگیریة (ص ۸ ج ۲) ویجوز الجمع بین امرأة وبنت زوجها پس بیوی کی ماں اور نانی دادی حرام ہے اور بیوی کے باپ دادا نانا کی منکوحہ حرام نہیں ہے۔ فقط احقر عبدالکریم عفا عنہ۔

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۱۱ رج ۲ ۴۵؁ھ

حکم نکاح دختر پسر اخت عینیہ و علاتیہ و اخیافیہ

سوال (۱۶) دختر پسر اخت عینیہ و علاتیہ و اخیافیہ را نکاح کردن رواست یا نہ، واز بنات الاخت بنات ابن الاخت داخل باشد یا چہ لِلّٰہ ارشاد فرمایند؟

الجواب ؛ بنات الاخت میں بنات ابن الاخت و بنت بنت الاخت سب داخل ہیں ولو سفلن جیسا کہ بنات کمد میں بنت الابن والبنت داخل ہیں، واللہ اعلم حررہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۵ شوال ۴۸ھ

مزنیہ کے لڑکے سے جو زانی کے نطفہ سے ہو زانی کی لڑکی کا نکاح حرام ہے

سوال (۱۷) زید کے ایک حلال زوجہ سے لڑکی ہے زینب، اس کے بعد زید نے ہندہ سے زنا کیا تو ایک لڑکا عمرو پیدا ہوا، سوال یہ کہ عمرو کا نکاح زینب سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب ؛ قال الشامی تحت قول الدر (وبنتها) ولو من زنا واما التحریم علی أباء الزانی وأولادہ فلاعتبار الجزئیة۔ پس معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں عمرو کا زینب سے نکاح حرام ہے۔ کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، مورخہ ۲۹ رج ۱۳۵۰ھ

باپ کی ربیبہ سے نکاح جائز ہے

سوال (۱۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جس کا لڑکا پانچ سالہ موجود تھا ایک عورت حاملہ من الزنا سے حالت حمل میں نکاح کیا مگر حمل کسی اور شخص کا تھا اسی واسطے اس شخص نے حکم شرعی کے موافق اس عورت کے ساتھ تا وضع حمل قربت وغیرہ نہیں کی نکاح کو چھ ماہ نہ گذرے تھے کہ اس حمل سے لڑکی پیدا ہوئی اس کو انہیں دونوں نے پرورش کیا اور لڑکی کو اس کی ماں نے ہی دودھ پلایا اور اس لڑکی کی مدت رضاع تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا اب لڑکی قریب البلوغ ہے کیا یہ شخص اس لڑکی من الزنا کا نکاح اپنے لڑکے کے ساتھ جو دوسری بیوی سے ہے کر سکتے ہے یا نہیں بینوا توجروا۔

الجواب ؛ صورت مسئولہ میں نکاح اس لڑکی کے ساتھ اس شخص کے بیٹے سے ہو سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اس شخص کی صرف ربیبہ ہے نہ اس سے اس کا نسب ثابت ہوا ہے (لانہا ولدت لاقل من ستة اشھر) اور نہ اس شخص کی رضیعہ ہے (لان اللبن لیس منہ) اور صرف ربیبہ ہوتے ہوئے اپنے بیٹے سے نکاح جائز ہے، واللہ اعلم۔ احقر عبد الکریم عفی عنہ۔ یکم ربیع ۲ ۱۳۵۱ھ۔

رضیعہ مزنیہ سے نکاح حرام ہے

سوال (۱۹) زید نے ہندہ سے بعید مدت گذری ہے کہ زنا کیا تھا۔ اب ہندہ کو اپنے مرد سے جو دودھ اترا ہے اپنی سوت یعنی اپنے مرد کی دوسری بیوی کی لڑکی فاطمہ کو مدت رضاع میں دودھ پلایا ہے اب زید کو فاطمہ کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ہے جو کہ زید کی مزنیہ کی رضاعی بیٹی ہے یہ نکاح صحیح ہوگا یا نہ؟

جواب من بعض العلماء

یہ نکاح صحیح ہوگا رد المحتار باب الرضاع میں تحت قول الدر المختار قیل وکذا الزنا والاوجہ لافتح بعد چند سطور کے ہے وذکر الوبری الی قول رد المحتار قلت وذکر فی شرح المنیة انہ لایعدل من الدرایة اذا وافقها روایة وقد علمت ان الوجہ معہ روایة عدم التحریم ص ۴۶۷ ج ۲۔

سوال تتمہ خامسہ امداد الفتاوی جدید مطبوعہ ص ۹ سطر اول

سوال :۔ زید کو ایک ایسی عورت سے ناجائز تعلق ہو گیا جس نے زید کی زوجہ کو دودھ پلایا تھا یعنی زید کو اپنی زوجہ کی رضاعی ماں سے زنا کا تعلق ہو گیا آیا زید کی زوجہ زید پر حلال رہی یا حرام ہو گئی خلاصہ سوال یہ کہ حرمت مصاہرہ مزنیہ کے اصول و فروع رضاعیہ کی طرف متعدی ہوگی یا نہ؟

جواب :۔ فی الدر المختار بیان المحرمات حرم الکل مما مر تحریمه الی آخرہ فی رد المحتار تنبیہ مقتضی قولہ والکل رضاعاً مع قولہ سابقاً تا آخر جلد ۲ ص ۴۵۶ - ۴۵۷ ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں زید کی بی بی زید پر حرام ہو گئی۔

اب براہ نوازش جس روایت کو ترجیح فرمایا جاوے اس کو مستند بحوالجات کتب فرماویں اور بر تقدیر مرجوحیة روایت عدم تحریم کے اب چونکہ زید نے رضیعہ مزنیہ سے نکاح کر لیا ہے طلاق کی ضرورۃ ہے یا ویسے ہی تفریق اور عزم ترک کیا جاوے اور نصف مہر طلاق قبل دخول کی صورت میں واجب ہو یا نہ؟

الجواب من جامع امداد الاحکام ؛ صورت مسئولہ میں روایت تحریم کو ترجیح ہے کیونکہ اصول مذہب کے موافق وہی ہے کیونکہ زنیہ کی رضیعہ مزنیہ کی بیٹی ہے وھو ظاھر اور عورت موطوءہ کی بیٹی واطی پر حرام ہے پس رضیعہ مزنیہ زانی پر حرام ہے قال فی البدائع وکذا یحرم بالوطأ ام الموطوءة وبنتها من الرضاع سواء کان الوطأ حلالا بان کان بملک الیمین او بنکاح فاسد او شبهة نکاح او کان زنا والاصل انہ یحرم بسبب الرضاع ما یحرم بسبب النسب وسبب المصاھرة اھ (ص ۲۶۲ ج ۲) ومثلہ فی المجلد الرابع ص۔

اور صاحب فتح القدیر نے عدم تحریم کی روایت کی ترجیح کی جو وجہ بیان کی ہے اور صاحب رد المحتار نے جو اس کی تقریر کی ہے اس کا جواب صاحب تحریر مختار نے بہت اچھا دیا ہے جو آگے مذکور ہوگا اور صاحب بدائع نے اس مسئلہ میں صرف تحریم ہی کو بیان کیا ہے عدم تحریم کی کوئی روایت نہیں بیان کی پس قہستانی نے جو اس مسئلہ میں دو روایتیں بیان کی ہیں ونصہ لو زنی بامرأة فولدت وارضعت صبیة جاز لہ ان یتزوجها کما فی شرح الطحاوی ولکن

فی الخلاصۃ انہ لایجوز وقد مر ان فیہ روایتین اھ (حاشیۃ البحر لابن عابدین (ص ۲۲٦ ج ۳)۔ یہ دو روایتیں مذہب میں نہیں ہیں بلکہ دوسرے ائمہ کے اقوال کو خلط کر کے صاحب مذہب کی روایت کے ساتھ بیان کر دیا ہے ورنہ صاحب بدائع وغیرہ اس سے ضرور تعرض کرتے اور صاحب بحر نے تصریح کی ہے کہ رضیعہ مزنیہ زانی کے لئے اتفاقاً حرام ہے ونصہ واشار بذکر الزوج الی ان لبن الزنا لیس کالحلال حتی لو ولدت من الزنا وارضعت بہ صبیۃ یجوز لاصول الزانی وفروعہ التزوج بہا ولاتثبت المحرمۃ الامن جانب الام خاصۃ الی ان قال وانما قیدنا محل الخلاف باصول الزانی وفروعہ لانہا لاتحل للزانی اتفاقا لانہا بنت المزنی بہا وقدمنا ان فرع المزنی بہا من الرضاع حرام علی الزانی ولذا قال فی الخلاصۃ بعد ماذکر حرمتہا علی الزانی وکذا الولد تحبل من الزنا وارضعت لابلبن الزنا فانہا تحرم علی الزانی کما تحرم بنتہا من النسب علیہ اھ (ص ۲۲۷ ج ۳) اور صاحب فتح القدیر کے کلام کو صاحب بحر نے تو اصول و فروع زانی پر محمول کیا ہے کہ وہ رضیعۂ مزنیہ کو اصول و فروع زانی کے لئے جائز کہتے ہیں نہ خود زانی کے لئے مگر علامہ شامی نے عموم پر رکھ کر خود زانی کے لئے بھی اس کو جائز کہدیا ہے مگر یہ اصول مذہب کے بالکل خلاف ہے جو ہرگز قابل اعتماد و اعتبار نہیں ہے چنانچہ صاحب تحریر مختار نے علامہ شامی کے اس کلام کو اس طرح رد کیا ہے؟

قولہ یخالف المسطور فی الکتب الخ قد یقال ان عدم تحریم المرضعۃ بلبن غیر الزوج لعدم دخولہ بالزوجۃ اذ ھو المحرم للبنات واثبات الحرمۃ علی الزانی فی مسئلۃ الخلاصۃ لتحقق امومیۃ الزانیۃ للرضیعۃ بارضاعہا لبنہا فتحقق انہا بنتہا والزانی قد دخل بہا فیحرم علیہ فرعہا الرضاعی کالنسبی

عہ قلت قد صرح فی البدائع بمفہوم ھذا القید ای بالتحریم بعد الدخول ونصہ وکذا کل من یحرم بسبب المصاہرۃ من الفرق الاربع الذین وصفناہم فی کتاب النکاح یحرم بسبب الرضاع فیحرم علی الرجل ام زوجتہ وبنتہا من زوج آخر من الرضاع کما فی النسب الا ان الام تحرم بنفس العقد علی البنت اذا کان صحیحا والبنت لاتحرم الا بالدخول بالام کما فی النسب اھ (ص ۴ ج ۴) قلت ورضیعۃ المزنی بہا ھی بنت المزنی بہا وقد دخل بامہا فتحرم علی الزانی حتما ۱۲ منہ

ناثبات الحرمۃ فی مسئلۃ الخلاصۃ لان الرضیعہ لبعضہ بواسطۃ اللبن حتی یقال انہ لیس من منیہ بل لان ھذہ الرضیعہ تحقق انہا بنت موطوءتہ فتحرم علیہ بوطأ امہا الرضاعیۃ کما تحرم علیہ بنتہا النسبیۃ فما ھو مسطور فی الکتب المشہورۃ لایخالف ما فی الخلاصۃ مع ظہور وجہ ما فیہا فان الرضیعۃ وان لم تنسب للزانی لان اللبن لیس من منیہ تنسب للام بواسطۃ اللبن المنسوب الیہا وقد دخل بہا اھ (ص ۲۱۱ ج ۱)۔

اور جن لوگوں کو رضیعہ مزنیہ کے زانی کے لئے حلال ہونے کا وہم ہوا ہے ان کے وہم کا منشا دو امر ہیں، ایک یہ کہ رضیعہ مزنیہ کا تعلق نسب صرف مزنیہ بہا سے ہے نہ زانی سے الخ مگر اس علت کا حاصل یہ ہوگا کہ جہاں سبب حرمت تعلق نسب ہو وہاں اس رضاع سے تحریم نہ ہوگی مثلاً اصول و فروع زانی کے لئے یہ رضیعہ حلال ہوگی مگر زانی کے حق میں ثبوت حرمت کے لئے ثبوت نسب من الزانی ضروری نہیں بلکہ بنت الموطوءہ ہونا کافی ہے اور رضیعۃ المزنیہ کا بنت موطورۃ الزانی ہونا متحقق ہے۔

دوسرا منشاء وہم یہ ہوا کہ کتب مذہب میں یہ مسئلہ مسطور و مشہور ہے کہ مرضعہ بلبن غیر الزوج زوج پر حرام نہیں۔ علامہ شامی نے اس کو مطلق سمجھ کر کلام صاحب خلاصہ کو اس کے خلاف سمجھ لیا حالانکہ یہ مسئلہ اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ زوج نے مرضِعہ (بکسر الضاد) سے دخول نہ کیا ہو اور دخول کے بعد مرضَعہ بلبن غیر الزوج زوج کے لئے حرام ہے اس کو کتب مشہورہ میں حلال نہیں کہا گیا فافہم وکن من الشکرین اور جو نکاح رضیعہ مزنیہ سے کیا گیا ہے وہ نکاح فاسد ہے اور نکاح فاسد میں قبل الدخول مہر واجب نہیں ہوتا نہ نصف نہ کل اور بعد الدخول کے مہر مثل واجب ہوتا ہے صرح بہ فی الدر فی باب المہر، واللہ تعالیٰ اعلم۔ اور صورت مسئولہ میں متارکت بھی کافی ہے طلاق کی حاجت نہیں فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔ ۲۲ ر ذی الحجہ ۴۸ھ۔

حکم نکاح کتابیہ

سوال (۲۰) فی زمانہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ بلا کلمہ عقد جائز ہے یا نہیں بعضے بولتے ہیں حنفی مذہب میں جائز ہے اور بعض بولتے ہیں پہلے زمانہ کے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ عقد بلا کلمہ جائز تھا کیونکہ اس وقت میں وہ سب موحد تھے اور فی زمانہ اہل کتاب مشرک ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ وغیرہ کہتے ہیں۔

الجواب: جو اہل کتاب عیسیٰ علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا دعویٰ کرتے

ہوں خواہ ابن اللہ کہکر یا رسول اللہ کہکر اُن کی عورتوں سے نکاح جائز تو ہے مگر مکروہ ہے اور جو محض دہریہ ہوں جیسا کہ آج کل عموماً انگریز دہریہ ہیں ان کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں ۔

پھوپھی بھتیجی ایک نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں

سوال (۲۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور وہ عورت اپنے خاوند کے پاس ۹ یا ۱۰ برس رہی اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور دو برس کا ہوکر فوت ہوگیا اور وہ عورت اس کی منکوحہ کسی رنج یا تکلیف کے سبب سے اپنے والدین کے مکان پر آگئی اور کچھ عرصہ کے بعد اُس کے شوہر نے اپنی زوجہ کی حقیقی بھتیجی سے نکاح کرلیا اب ایک شخص کے نکاح میں یہ ہر دو پھوپھی بھتیجی جائز ہوسکتی ہیں یا نہیں ۔ اور بعد نکاح بھتیجی کے لوگوں کے کہنے سُننے سے چار پانچ روز کے بعد پہلی زوجہ یعنی پھوپھی کو طلاق دیدیا ۔ اب کون جائز ہوسکتی ہے یا کوئی نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب ؛ پھوپھی اور بھتیجی دونوں ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں اس لئے پھوپھی کی موجودگی نکاح میں جو اس کی بھتیجی سے نکاح کیا گیا ہے وہ فاسد ہے درست نہیں ہوا البتہ پھوپھی کو طلاق دیکر اس کی عدت طلاق تمام ہوجانے کے بعد بھتیجی سے نکاح ہوسکتا ہے ۔

پس صورت مسئولہ میں اس شخص نے اپنی بیوی کی بھتیجی سے پھوپھی کو نکاح میں رکھتے ہوئے جو نکاح کیا ہے یہ بہت بڑا گناہ ہوا اس سے توبہ علانیہ لازم ہے اور بھتیجی سے علیحدگی واجب ہے پھر چونکہ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو جب اس کی عدت طلاق تین حیض پوری ہوجاوے اس کے بعد اسکی بھتیجی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، واللہ اعلم ۔ ۳۰ ذیقعدہ سنہ ۴۹ھ ۔

فصل فی الانکحۃ الفاسدہ

شوہر اگر قید ہو تو زوجہ کا نکاح ثانی کرنا باطل ہے

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کی نانی مسلمان ہوئی اور ہندہ کی والدہ کا ایک مسلمان پردیسی سے نکاح کردیا جب ہندہ پیدا ہوئی اور سات آٹھ سال کی عمر ہوئی ہندہ کے والدین کا انتقال ہوا اور کسی ولی و عصبہ کا کوئی پتہ نہ چلا اور ہندہ اپنی خالہ بد چلن کی پرورش میں چند روز رہی پھر چند خدا ترس لوگوں نے بمشورہ اس کی خالہ کے زید سے ہندہ کا نکاح کردیا جو کہ مسلمان تھا اور حیثیت میں ہندہ کے باپ کی برابر تھا اور قومیت طرفین میں سے کسی کی کسی کو معلوم نہیں ملازم پیشہ لوگ تھے بعد نکاح کے کئی سال تک ہندہ زید کے پاس رہی اتفاق سے کسی بد چلنی کی وجہ سے زید قید ہوگیا زید کے گھر والے ہندہ کو تنگ رکھتے تھے

ہندہ نے اپنی تنگی اپنی خالہ سے بیان کی تو خالہ نے اس کو چکلہ میں بٹھادیا چکلہ والوں نے کسی سے کچھ روپیہ ٹھہرا کر ہندہ کے پاس بھیجا تو ہندہ بھاگ گئی قابو میں نہ آئی اور اسلامی مسائل سے بالکل ناواقف تھی ناٹک والوں میں مسلمان سمجھ کر شامل ہوگئی پھر بعد بلوغ کے بوجہ غلبۂ شہوت ایک غیر مسلم سے تعلق ناجائز ہوگیا اس ناجائز تعلق سے چند اولاد ہوئیں اتفاق سے ایک مسلمان شخص سے ہندہ ملی اور اپنا کل حال بیان کیا اس شخص نے اس کو وعید سنائی اور یہ کہا کہ تو مسلمان ہے اور یہ شخص جس سے تیرا تعلق ہے غیر مسلم ہے ہندہ پر خوف الٰہی پیدا ہوا اور مسائل دریافت کئے اور اولاد کو چھوڑنے پر آمادہ ہوئی تو اس غیر مسلم نے کہا میں تیری خاطر اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہوا اور یہ تیری اولاد ہے ان سب کو چھوڑ کر کہاں جاتی ہے میں بھی مسلمان ہوتا ہوں گھر نہ بگڑنا چاہئے ہندہ نے کہا میرا شوہر اصلی قید میں ہے اور یہ اولاد حرامی ہے تو غیر مسلم ہے میں تیرے پاس نہ رہوں گی پھر ہندہ نے اپنا کل حال عمرو سے بیان کیا عمرو نے کہا تو کسی اور مسلمان سے نکاح کرلے ہندہ نے کہا میرا نکاح ہوچکا تھا اور شوہر قید میں ہے نہ وہ مرا ہے اور نہ طلاق دی ہیں کیسے نکاح کرسکتی ہوں عمرو نے چند مسلمان غیر عالم سے ہندہ کی تسلی کرادی کہ تیرا شوہر قید میں ہے تو نکاح کرلے تیرے کئی اولاد ناجائز تعلق سے پیدا ہوچکی اب نکاح ٹوٹ گیا ہے نکاح رہنا درست نہیں ہندہ نے مسئلہ کا خیال کرکے عمرو سے ہی نکاح کرلیا پھر ایک شخص مسلمان اس کو ملا اس سے تمام حال اپنا سُنایا وہ مسلمان عالم نہ تھا کچھ مسائل سے واقف تھا اس کو دیکھ کر اور زیادہ اسلام سے ہندہ خوش ہوئی اور مفصل حال سنایا تو اس شخص نے کہا کہ دوسرا نکاح نہیں ہوا اب اور زیادہ ہندہ کو تشویش ہوئی لہذا عرض ہے کہ پہلا نکاح درست تھا یا نہ اور بدوں طلاق کے یہ دوسرا نکاح درست ہوا یا نہ ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب[عہ] ؛ ولی عصبہ کے نہ ہونے کی صورت میں ذوی الارحام کو حنفیہ کے نزدیک ولایت نکاح نابالغہ حاصل ہے اسی طرح اگر ولی عصبہ موجود ہو مگر لاپتہ ہو کہ کسی کو اس کا پتہ نہ معلوم ہو جب بھی ولی البعد کو نکاح کی ولایت حاصل ہوتی ہے ۔ قال فی العالمگیریہ (ص ۱۱ ج ۲) وعند عدم العصبۃ کل قریب یرث الصغیر والصغیرۃ من ذوی الارحام یملک تزویجھما فی ظاھر الروایۃ عن ابی حنیفۃ اھ وفیہ (ص ۱۲ ج ۲) وان کان الاقرب غائبا

[عہ] سائل سے دریافت کیا گیا کہ ہندہ کا پہلا نکاح مہر مثل پر ہوا تھا یا نہیں اس نے جواب دیا کہ مہر مثل پر ہوا تھا ۱۲ ظفر

غیبۃ منقطعۃ جاز نکاح الابعد کذا فی المحیط پس صورت مسئولہ میں ہندہ کی خالہ اس کی ولی تھی اور اس کا بدچلن ہونا مُسقط ولایت نہ تھا قال فی العالمگیریۃ (ص ۱۲ ج ۲) والفسق لایمنع الولایۃ کذا فی فتاوی قاضی خان اھ البتہ اگر ولی فاسق اگرچہ باپ ہی ہو کسی نابالغ کا نکاح غیر کفو میں یا مہر مثل سے بہت زیادہ قلیل مہر پر کرے اس صورت میں نکاح نہیں ہوتا قال فی البحر فما فی الجوامع ان الاب اذا کان فاسقاً للقاضی ان یزوج الصغیرۃ من غیر کفؤ غیر معروف نعم اذا کان متھتکا لاینفذ تزویجہ ایاھا بنقص عن مھر المثل ومن غیر کفء وسیاتی ھذا اھ (ص ۱۲۴ ج ۳) اور ولی ابعد اگر ایسا کرے کہ غیر کفو میں یا مہر مثل سے کم پر نکاح کردے وہ تو مطلقاً باطل ہے اگرچہ ولی فاسق بھی نہ ہو صالح ہی ہو قال فی الدر وان کان المزوج غیرھما ای غیر الاب وابیہ ولو الام لایصح النکاح من غیر کفؤ او بغبن فاحش اصلا وما فی صدر الشریعۃ صح ولھما فسخہ وھم وان کان من کفؤ وبمھر المثل صح اھ (ص ۵۰۰ و ۵۰۱ ج ۱) ملخصاً۔

پس صورت مسئولہ میں اگر ہندہ کا پہلا نکاح زید سے مہر مثل پر اور کفو میں ہوا ہے تو چونکہ خالہ ولی تھی اور اس کی اجازت سے نکاح ہوا اس لئے وہ نکاح صحیح ہوگیا اب ہندہ کا کسی دوسرے سے نکاح کرنا بغیر زید شوہر اول سے طلاق حاصل کئے اور بدون عدت طلاق گذرنے کے ہرگز جائز نہیں اگر پہلے شوہر سے طلاق حاصل کئے بغیر اس نے کسی سے نکاح کرلیا ہے تو وہ نکاح باطل ہے ہندہ کو اس سے فوراً الگ ہوجانا چاہئے شوہر اول کے قید ہوجانے یا کسی غیر مسلم سے ہندہ کے ناجائز تعلق کرلینے سے پہلا نکاح باطل نہیں ہوسکتا وہ بدستور باقی ہے البتہ ہندہ نے اس ناجائز تعلق پیدا کرنے میں گناہِ عظیم کا ارتکاب کیا ہے بالخصوص غیر مسلم کے ساتھ فانہ اشد زنیۃ فی الاسلام۔ لہذا ہندہ کو دوسرے خاوند سے فوراً علیحدگی اختیار کرکے ان تمام گناہوں سے بصدق دل توبہ و استغفار کرنا چاہئے اور بارگاہ الٰہی میں رو رو کر دعا کرنی چاہئے کیا عجب ہے کہ مغفرت ہوجائے وہ اپنی رحمت سے شرک و کفر کے علاوہ تمام گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں، واللہ اعلم ولا عاصم من امر اللہ الا من رحم۔ ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۳۰ھ۔

غیر کی منکوحہ سے نکاح کرنا باطل ہے اور جو اولاد ہوئی وہ حرامی ہے

سوال (۲) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب کا منتظر ہوں کیا حکم ارشاد ہوتا ہے۔ پہلے سوال کے باعث بڑی پریشانی ہے کوئی صورت کسی طرح نکلے تو بہتر ہے۔

۱۸

ایک مسلمان صاحب نے ایک مسلمان عورت کو بلا نکاح عرصہ بارہ سال سے رکھے ہے اس کا شوہر زندہ ہے طلاق دینے سے صاف انکار کرتا ہے ہرگز نہ دوں گا کبھی کہتا ہے مجھے معلوم ہی نہیں کہ میری عورت کونسی ہے، پاگل نہیں ملازم سرکاری جنگل میں ہے ہر طرح نصیحت کی کارگر نہ ہوئی گذر اوقات کے لئے شروع سے اب تک ایک کوڑی نہیں دی اس خاوند سے تین بچے بھی ہوگئے اس عورت کی شادی بہت کم عمری میں ہوئی تھی عنقریب سات آٹھ سال کی عمر تھی اور جب ہی سے کچھ دن بعد الگ ہے کیا اس کا نکاح کسی بھی طرح ہوسکتا ہے یا تا عمر جب تک طلاق نہ دے ممکن نہیں یا نابالغی میں شادی ہوجاوے اور بالغی عورت شوہر کو منظور نہ کرے تو دوسرے کے ساتھ نکاح ممکن ہے یا ہو ہی نہیں سکتا یہاں دو مثالیں موجود ہیں جو بلا نکاح اسی طرح زندگی برباد کررہی ہیں اور اولاد ہورہی ہے۔

ایسی حالت میں اس کا عقیقہ جائز ہوگا یا نہیں دوسروں کو اس کے یہاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس صورت میں جب تک پہلا شوہر طلاق نہ دے دوسرے سے کسی طرح نکاح نہیں ہوسکتا اور اگر وہ ابتداء سے زوجہ کو نفقہ نہیں دیتا یا نابالغی میں نکاح ہوا تھا اور بلوغ کے بعد وہ اس کو پسند نہیں کرتی اس صورت میں جبر کرکے اس پہلے شوہر سے طلاق لینا جائز ہے مگر بدون طلاق کے دوسرے سے نکاح ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(۲) ایسی حالت میں جو اولاد ہوئی ہے وہ حرامی ہے ایسے شخص کے گھر کا کھانا وغیرہ نہ کھانا چاہئے جب تک کہ وہ اس حرکت سے توبہ نہ کرے باقی عقیقہ حرامی لڑکے کا بھی جائز ہے۔

زوجہ عنین کا بغیر طلاق کے نکاح ثانی کرنا باطل ہے

سوال (۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکی عمر ۱۴ سالہ کی نابالغہ اور اس کا شوہر عمر ۱۹ سال کا وہ لڑکی شوہر کے یہاں سے باپ کے یہاں بھاگ آئی اس کے پیچھے اس کا شوہر اور شوہر کا بھائی آئے لے جانے کو لڑکی بولی میرا شوہر دیوث اور نامرد ہے ناک کان چھدا اور پیر میں گھونگرو باندھ کر ناچتا گاتا ہے ایک مرتبہ اس نے ایک غیر آدمی کو گھر میں بھیجا اور آپ باہر کھڑا رہا میں نے شور غل کیا تو وہ شخص بھاگ گیا اس نے مجھے ایک لات مارا کہ کیوں شور کی یہ کل باتیں لڑکی نے اپنے شوہر کے روبرو کہیں لڑکی کے باپ نے کہا تم جماعت میں آؤ تصفیہ ہوگا اور تمہارا ملاحظہ کیا جائے گا تب لڑکی بھیجوں گا اس دہشت سے وہ بھاگ گیا اس کو لڑکی کی طرف سے نوٹس دیا گیا تو واپس کیا اور کئی خط دئے مگر جواب نہیں آیا کچھ

دن بعد اس کے باپ بھائی آئے جماعت نے کہا لڑکے کو لاؤ وہ پندرہ روز کا وعدہ کرکے گیا ایک ماہ میں اکیلا آیا اور کہا کہ ایک ہفتہ میں لاؤں گا جس کو ڈیڑھ ماہ ہوا پتہ نہیں ہے نہ کچھ خط ہے اب لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور بارہ ماہ سے باپ کے یہاں بیٹھی ہے اور اس کا باپ بہت غریب شخص ہے عدالت نہیں کرسکتا اور وہ ایسی جگہ ہے کہ کوئی مسلمان وہاں نہیں ہے اب کیا کیا جاوے معروضہ ہے کہ جو حکم شرع میں ہو اطلاع بخشیں؟ ویسا عمل میں لاویں گے فقط۔

الجواب؛ صورت اولیٰ میں جب تک شوہر اپنی بی بی کو طلاق نہ دیدے اور عدت نہ گذر جاوے اس وقت تک اوس کا نکاح دوسرے سے نہیں ہوسکتا۔

زوجہ کی موجودگی میں اس کی بھانجی سے نکاح فاسد ہے اور عقر واجب ہوگا

سوال (۴) زید کا نکاح ہندہ سے ہوا جس کو ایک مدت دراز گذر گئی اور کوئی اولاد اس وقت تک ہندہ کے بطن سے نہیں ہوئی عرصہ تین سال کا ہوا کہ زید نے ہندہ کی حقیقی ہمشیرہ زادی کے ساتھ لبساز یا بعلم ہندہ تعلق ناجائز کرلیا اس درمیان میں ہندہ کی ہمشیرہ زادی کے تعلق ناجائز سے حمل قرار پاگیا جس کا علاج حکماء سے کرایا گیا اور استقرار ظاہر کیا گیا بعد گذرنے نو ماہ کے فروری ۲۲ء کو ہندہ کی ہمشیرہ زادی کے تعلق ناجائز سے دختر پیدا ہوئی کہ جو اب چھ ماہ کی ہے اور موجود ہے بروقت پیدائش دختر کے زید نے یہ ظاہر کیا کہ ہندہ کے ہمشیرہ زادی سے جس سے وہ دختر پیدا ہوئی ہے میں نے نکاح کرلیا ہے جس کا علم زید کو ہوگا اور باقی نکاح کا علم یہاں کسی کو نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہندہ اور اس کی ہمشیرہ زادی دونوں کا اجتماع بموجودگی ہندہ زید کے گھر میں جائز طور سے ہوا اور دونوں خالہ بھانجی زید کے زوجگان جائز قرار دی جاسکتی ہیں اور وہ دختر جو پیدا ہوئی ہے اور موجود ہے اولاد جائز ہے۔ اب زید کا انتقال ہوگیا اب زید نے ہندہ اور اس کی ہمشیرہ زادی مع دختر کے اور تیسری اور زوجہ لاولد نکاح سے چھوڑی ایسی صورت میں تینوں زوجگان میں سے کونسی زوجہ جائز قرار دی جاوے گی اور کون زوجہ ناجائز رہے گی اور مہر تینوں زوجگان میں سے کس کس کا زید پر واجب تھا اور بعد انتقال کس کس کا واجب رہا اور وہ دختر جو ہندہ کے ہمشیرہ زادی سے موجود ہے وہ مستحق ترکہ پدری یعنی زید کا ہے یا نہیں اور زید کے مرنے کے بعد علاوہ ان عورتوں کے ایک بڑا بھائی حقیقی بھی موجود ہے ایسی حالت میں شرع شریف کا کیا حکم ہے مفصل حال سے معزز فرمائیے؟

الجواب؛ صورت مسئولہ میں زید کی دو زوجہ جن سے نکاح صحیح ہوا ہے یعنی ہندہ اور زوجہ لاولد نکاحی وارث ہیں اور ہندہ کی بھانجی جس سے زید نے ہندہ کی موجودگی میں نکاح کرنے کا

دعویٰ کیا ہے وارث نہیں ہے کیونکہ اس سے زید کا نکاح فاسد ہوا ہے البتہ ہندہ کی بھانجی سے جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہ بیشک زید کی وارث ہے یہ حکم تو میراث کا ہے مہر کا حکم یہ ہے کہ زید کی دو زوجہ یعنی ہندہ اور زوجہ لاولد نکاحی کو مہر مسمی کامل ملے گا اور ہندہ کی بھانجی کو مہر مثل بطور عقر کے دیا جائے گا خواہ مہر مثل کتنا ہو لیکن اگر وہ مہر مسمی سے زیادہ ہو تو اس سے زائد نہیں دیا جائے گا اور اگر مہر مسمی مہر مثل سے زیادہ ہو تو مہر مثل دیا جائے گا خلاصہ یہ کہ مہر مسمی اور مہر مثل میں جو کم ہو وہی اس کو ملے گا قال فی الدر و یجب مهر المثل فی نکاح فاسد وهو الذی فقد شرطا من شرائط الصحة کشهود بالوطأ فی القبل لا بغیره کالخلوة لحرمة وطئها ولم یزد مهر المثل علی المسمی لرضاها بالحط ولو کان دون المسمی لزم مهر المثل لفساد التسمية بفساد العقد ولو لم یسم او جهل لزم بالغا ما بلغ (الی ان قال) ویثبت النسب احتیاطا بلا دعوة اه (ص ۴۷۵ لغایت ۴۷۷ ج ۲) وفی رد المحتار قوله کشهود ومثله تزوج الاختین معا ونکاح الاخت فی عدة الاخت ونکاح المعتدة الخ (ص ۴۷۵ ج ۲) وفیه ایضا قوله ویثبت النسب اما الارث فلا یثبت فیه وکذا النکاح الموقوف ط عن ابی السعود اه (ص ۴۷۷ ج ۲)۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زید کا وارث بجز ان لوگوں کے جن کا ذکر سوال میں ہے اور کوئی نہیں تو بعد ادائے دین مہر و قرض وغیرہ کے جو ترکہ بچے اس کے آٹھ سہام کرکے ایک سہم دونوں زوجہ کو اور چار سہام زید کی بیٹی کو جو ہندہ کی بھانجی سے ہوئی ہے اور ۳ سہام زید کے بھائی کو ملیں گے، واللہ اعلم۔ ۸ ر ذیحجہ ۴۰ھ۔

غیر کی منکوحہ سے نکاح باطل ہے اور اگر اس سے اولاد ہوجائے تو اس کا حکم

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مولیٰ اپنی زوجہ نابالغہ عیدو کو اپنے ہمراہ لیکر عبد الغنی کے مکان پر آیا کئی دنوں کے بعد مولیٰ مذکور بیمار ہوگیا اور مولی خرچ وغیرہ سے بہت تنگ دست ہوگیا اس وقت مولی نے عبد الغنی سے کہا کہ میں خرچ سے تنگدست ہوگیا ہو تم میرا علاج معالجہ کرو اور مسماۃ عیدو سے بخوشی اپنا نکاح کرلو اور میں نے مسماۃ مذکور سے صحبت داری نہیں کی۔ عبد الغنی نے مسماۃ عیدو سے نکاح کرلیا۔ تقریباً بارہ گھنٹہ کے بعد مولی مرگیا آیا نکاح جائز رہا یا نہیں؟

جواب از حضرت مولانا مدظلہ: نہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

بقیہ سوال بالا

اور عیدو مذکور عبد الغنی کے یہاں بیس سال تک رہی اور پانچ چھ اولاد بھی عبد الغنی سے

ہوئیں جس سے ایک دختر بندی عبدالغنی کی موجود ہے اور عبدالغنی فوت ہو گیا آیا عبدالغنی کے ترکہ میں سے مسماۃ عیدو و دختر بندی کو حق پہنچتا ہے یا نہیں۔ عبدالغنی کی دو بیوی مسماۃ بخشن زوجۂ اول و مسماۃ عیدو مذکور ایک دختر بندی ایک چچازاد بھائی اسمی بندو چھوڑا اور اپنے ذمہ کچھ قرضہ چھوڑا ایک دوکان اور کچھ روپیہ نقد جو کہ امانت میں ہے اور سامان استعمالی چھوڑا اور عبدالغنی اپنی زندگی میں اپنے بھائی بندو مذکور سے ناراض تھا اور تندرستی کے وقت عبدالغنی کہا کرتا تھا کہ میں دوکان مسجد کے نام کروں گا تاکہ دوکان میرے بھائی بندو مذکور کو نہ ملے اور بیماری کے وقت بھی عبدالغنی نے دو تین مرتبہ دوکان مسجد میں کرنے کو کہا مگر ان دونوں عورتوں مسماۃ بخشن و عیدو نے نہ کرنے دی عبدالغنی فوت ہو گیا مسماۃ بخشن و عیدو نے بعد عدت کے نکاح کر لئے بخشن مذکور نے برادری کے بھائی سے نکاح کیا اور عیدو نے عبدالغنی کے چچازاد بھائی بندو سے نکاح کر لیا اور بندی مذکور اپنی ماں مسماۃ عیدو کے پاس موجود ہے اب ترکہ کس طرح تقسیم ہونا چاہئے اور بندی کا کون ولی ہونا چاہئے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں مولی نے اپنی زوجہ عیدو کو نہ طلاق دی ہے نہ طلاق کا کوئی لفظ استعمال کیا ہے لہذا اس کا نکاح زوجہ مذکورہ سے باقی تھا اس حالت میں عبدالغنی کا اس سے نکاح کرنا بالکل باطل اور حرام ہوا اور اگر مولی نے کوئی لفظ طلاق کا استعمال کیا ہو تو سائل کو لکھنا چاہئے لیکن اس صورت میں بھی اگر مولی اور عیدو میں تنہائی کسی وقت ہو چکی ہے گو صحبت نہ ہوئی ہو تو زوجہ مذکورہ پر عدت کا گذارنا واجب تھا اور عبدالغنی نے عدت میں اس سے نکاح کیا ہے اس لئے بھی یہ نکاح باطل ہے مگر بہر صورت مسماۃ عیدو کو عبدالغنی کے ترکہ میں مہر مثل بطور عقر کے ملے گا بشرطیکہ عبدالغنی نے اپنی حیات میں مہر نہ دیا ہو اور نہ عیدو نے معاف کیا ہو جس کا حکم یہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت کچھ مقدار مہر کی مقرر کی گئی تھی اور وہ مقدار مہر مثل (یعنی خاندانی مہر) سے کم یا اس کی برابر ہے تب تو وہی ملے گا جو مہر نکاح میں مقرر ہوا ہے اور اگر مہر مسمی مہر مثل سے زیادہ ہے تو مہر مسمی نہ ملے گا بلکہ مہر مثل دیا جائے گا اور عیدو کو عبدالغنی کے ترکہ میں سے میراث کچھ نہ ملے گی البتہ مسماۃ بندی جو عبدالغنی کے نکاح کے بعد عیدو سے پیدا ہوئی ہے اس کو عبدالغنی کے ترکہ میں سے میراث ملے گی پس بعد ادائے دین مہر ہر دو زوجگان اور دیگر قرض وغیرہ کے جو عبدالغنی کے ذمہ ہو اس کے باقی ماندہ ترکہ کو اس طرح تقسیم کیا جائے گا:۔

(نقشہ تقسیم بر صفحہ آئندہ)

مسئلہ ٨ — عبدالغنی

زوجۂ اولیٰ	زوجۂ حرام	دختر	برادر عم زاد
بخشن	عیدو	بندی	بندو
۱	م	۴	۳

اور عبدالغنی جو زندگی میں بندو سے ناراض تھا اس سے بندو میراث سے محروم نہ ہوگا اور جس دوکان کو عبدالغنی مسجد میں دینا چاہتا تھا چونکہ تندرستی میں وہ اس کو وقف نہ کر سکا اس لئے وہ دوکان بھی سب وارثوں میں تقسیم ہوگی پس جس قدر سامان بعد ادائے قرض و ادائے دین مہر وغیرہ کے باقی رہے اس کے آٹھ سہام کر کے ایک سہم مسماۃ بخشن زوجۂ اولیٰ کو دیا جائے اور ۴ سہام مسماۃ بندی کو اور ۳ سہام بندو کو دیئے جاویں مسماۃ عیدو کو میراث کچھ نہ ملے گی۔ قال فی الدر ویجب مهر المثل فی نکاح فاسد وهو الذی فقد شرطا من شرائط الصحة کشهود بالوطأ فی القبل لا بغیره کالخلوة لحرمة وطئها ولم یزد مهر المثل علی المسمی لرضاها بالحط ولو کان دون المسمی لزم مهر المثل لفساد التسمیة بفساد العقد ولو لم یسم او جهل لزم بالغا ما بلغ (الی ان قال) ویثبت النسب احتیاطا بلا دعوة اه (۵۷۴ لغایت ۵۷۷ ج ۲) وفی الشامیة قوله کشهود ومثله تزوج الاختین معاً ونکاح الاخت فی عدة الاخت ونکاح المعتدة الخ (۵۷۴ ج ۲) وفیه ایضاً قوله ویثبت النسب اما الارث فلا یثبت فیه کذا النکاح الموقوف ط عن ابی السعود اه (۵۷۷ ج ۲) واللہ اعلم۔

۲۱ ذی الحجہ سنہ ۳۴۰ھ۔

عورت کا عدت وفات میں نکاح کر لینے کا حکم اور شرائط متارکہ

سوال (۶) علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کیا فرماتے ہیں؟

سوال اول: ہندہ کے شوہر نے انتقال کیا اور ہندہ نے قبل تمام ہونے عدت وفات کے زید سے نکاح کیا تو آیا یہ نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

سوال دوم: ہندہ ایک سال تک بعد نکاح مذکور کے زید کے ساتھ رہی جب پنچوں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عدت کے اندر ہندہ کا نکاح ہوا ہے اس لئے پنچوں نے ہندہ کو اس کے باپ کے یہاں بھیج دیا جس کو عرصہ تین ماہ کا ہوا اب اگر ہندہ دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہے

تو اس میں عدت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

سوال سوم: صورت مسئولہ میں اگر عدت واجب ہے تو عدت کی ابتداء کب سے ہوگی اور کونسی عدت واجب ہوگی اور دوسرے مرد سے کب اس کا نکاح جائز ہوگا؟

سوال چہارم: صورت مسئولہ میں پنچوں نے پنچایت کر کے ہندہ کا جہیز زید کے بھائی وغیرہ کے ذریعہ منگا کر ہندہ کو واپس کر دیا لیکن نہ زید پنچایت میں آیا اور نہ اس نے کوئی لفظ بابت انکار نکاح کہا تو اس پر متارکہ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں تو متارکہ کی کیا تعریف ہے؟

سوال پنجم: اگر زید مذکور متارکہ نہ کرے تو اس ملک میں جہاں غیر مسلم کی حکومت ہے اور قاضی شرع مقرر نہیں ہے تفریق کی کیا صورت ہے اور کیا پنچوں کو تفریق کا حق شرعاً حاصل ہے یا نہیں۔

سوالات مذکورہ بالا کا جواب بالتفصیل معہ حوالہ کتب معتبرہ ارقام فرما کر اجر عظیم حاصل فرمائیے؟

ھو الموفق للصواب۔

(جواب بعض علماء)

جواب سوال اول: ہندہ کا نکاح جو عدت کے اندر ہوا ہے صحیح نہیں ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهٗ ط

جواب سوال دوم: ہندہ نے جو عدت کے اندر نکاح کیا ہے یہ نکاح فاسد ہے۔ در المختار میں ہے۔ ویجب مهر المثل فی نکاح فاسد وهو الذی فقد شرطاً من شرائط الصحة کشهود۔ رد المحتار حاشیۃ الدر المختار میں علامہ ابن عابدین تحت قولہ (کشهود) فرماتے ہیں: ومثله تزوج الاختین معاً ونکاح الاخت فی عدة الاخت ونکاح المعتدة والخامسة فی عدة الرابعة الخ اور فتاویٰ عالمگیری باب نکاح فاسد میں ہے۔ لو تزوجت فی عدة الوفات فدخل بها الثانی ففرق بینهما انتهی اور نکاح فاسد میں بعد دخول عدت واجب ہوتی ہے فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ لو کان النکاح فاسداً ففرق القاضی ان فرق قبل الدخول لا یجب العدة وکذا الفرق بعد الخلوة وان فرق بعد الدخول کان علیها الاعتداد من وقت التفریق وکذا لو کانت الفرقة بغیر قضاء کذا فی الظهیریة۔ در المختار میں ہے۔ لکل واحد منهما فسخه دخل بها اولا فی الاصح خروجاً عن المعصیة بل یجب علی القاضی التفریق بینهما وتجب العدة بعد الوطئ لا للخلوة للطلاق لا للموت من وقت التفریق

او متارکة الزوج انتهی رد المحتار حاشیہ در المختار میں ہے۔ وتقدم فی باب المهر ان الدخول فی النکاح الفاسد موجب للعدة اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ لو تزوجت فی عدة الوفات فدخل بها الثانی ففرق بینهما فعلیها بقیة عدتها من الاول لتمام اربعة اشهر وعشراً وعلیها ثلاث حیض من الاخیر ویحتسب بما حاضت بعد التفریق من عدة الوفات کذا فی معراج الدرایة۔ انتهی۔

عبارات مذکورہ سے ثابت اور متحقق ہوا کہ نکاح فاسد میں بعد دخول عدت واجب ہوتی ہے اور چونکہ ہندہ سال بھر تک زید کے ساتھ رہی۔ ہے لہذا اس پر عدت واجب ہے۔

جواب سوال سوم: صورت مسئولہ میں ہندہ پر تفریق قاضی یا متارکہ زوج کے بعد سے عدت کی ابتداء ہوگی در المختار میں ہے۔ وتجب العدة بعد الوطی لا الخلوة للطلاق لا للموت من وقت التفریق او متارکة الزوج۔ انتهی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ و العدة فی النکاح الفاسد عقیب التفریق او عزم الوطی علی ترک وطیها۔ اور یہ عدت عدتِ طلاق کی ہوگی یعنی حائضہ کے لئے تین حیض اور آئسہ کے لئے تین ماہ اور حاملہ کے لئے وضع حمل عدت ہوگی۔ تنویر الابصار میں ہے۔ والمنکوحة نکاحاً فاسداً والموطوءة بشبهة وام الولد غیر الآئسة والحامل الحیض للموت وغیره انتهی۔ در المختار میں ہے۔ ای عدة المذکورات ثلاث حیض ان کن من ذوات الحیض والا فالاشهر او وضع الحمل وهذا اذا کانت المنکوحة نکاحاً فاسداً الخ۔

الحاصل تفریق قاضی یا متارکہ زوج کے بعد سے عدت کی ابتداء ہوگی۔ اور جب تک عدت پوری نہ ہو دوسرے مرد سے ہندہ کا نکاح صحیح نہ ہوگا

جواب سوال چہارم: ہندہ کا اپنے باپ کے یہاں رہنے اور مجہوزہ سامان واپس پانے سے متارکہ صحیح نہ ہوگا۔ متارکہ کے لئے ضروری ہے کہ واطی یعنی مرد ترک وطی کا ارادہ کر کے زبان سے بھی اس کا اظہار کرے کہ میں نے تجھ کو علیحدہ کیا یا میں نے تجھ کو چھوڑ دیا یا میں نے تیری راہ خالی کر دی یا میں نے تجھ کو طلاق دی وغیرہ۔ قال العینی فی شرح الکنز ولا یتحقق المتارکة الا بالقول بان یقول تارکتک او تارکتها او خلیت سبیلک او خلیتها الخ۔ وفی العالمگیریة۔ والمتارکة فی الفاسد بعد الدخول لا یکون الا بالقول کخلیت سبیلک او ترکتک ومجرد انکار النکاح لا یکون متارکة الخ

وبعدم مجی احدھما الی الآخر بعد الدخول لا یحصل متارکۃ ۔ انتھی ۔ فی رد المحتار
فی البزازیۃ المتارکۃ فی الفاسد بعد الدخول لا یکون الا بالقول کخلیت
سبیلک او ترکتک ومجرد انکار النکاح لا یکون متارکۃ اما لو انکر وقال ازھبی
وتزوجی کان متارکۃ والطلاق فیہ متارکۃ لکن لا ینقص بہ عدد الطلاق و
وعدم مجی احدھما الی الآخر بعد الدخول لیس متارکۃ لانھا لا یحصل
الا بالقول ۔ انتھی ۔

جواب سوال پنجم: تفریق کے لئے قاضی کا ہونا ضروری ہے ۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے ۔ لو
کان النکاح فاسداً فرق القاضی بینھما الخ ۔ در المختار میں ہے ۔ بل یجب علی
القاضی تفریق بینھما الخ اور پنچوں کو حق تفریق حاصل نہیں ہے ۔ اور ایسے مسائل جن میں قاضی
شرع کی ضرورت ہوتی ہے ہند کی اسلامی ریاستیں جیسے ریاست بھوپال ریاست رامپور ریاست
حیدرآباد دکن کے قاضی سے تفریق حاصل ہوسکتی ہے ۔ خود وہاں جاکر یا بذریعہ تحریر حکم تفریق
طلب کرنے سے ۔ مجموعہ فتاوی حضرت مولانا عبد الحی میں ہے ۔ در بلاد یکہ زیر حکومت کفار اند
وقضای قاضی در انجا مفقود است اگر ہمچو واقعہ افتد ضرور است کہ صاحب معاملہ بہ بلاد اسلام کہ
دران قضاۃ قاضی موجود مثلاً بلاد حجاز و بلاد روم وغیرہ واز بلاد ہند رامپور و بھوپال وغیرہ رفتہ
انفصال سازد یا بذریعہ تحریر از قضاۃ بلاد اسلام حکم فسخ طلب سازد ۔ انتھی ۔ واللہ اعلم بالصواب
والیہ المرجع والمآب ۔ حررہ الراجی غفور بہ اللطیف ابو الطیب محمد حنیف عفی عنہ ومن والدیہ
المدرس لمدرسۃ انوار العلوم الواقعۃ فی قصبۃ متو آملہ من مضافات الہ آباد ۔

الجواب من جامع امداد الاحکام

(۱) جواب دوم صحیح نہیں کیونکہ علامہ شامی نے اولاً نکاح فاسد کی بہت سی مثالیں بیان کرکے آگے
چل کر مجتبیٰ سے قاعدہ کلیہ نقل کیا ہے ۔ اور تصریح کردی ہے کہ نکاح معتدہ موجب عدۃ نہیں پس نکاح
معتدہ کو فاسد کہنا بمعنی باطل ہے جو اصلاً منعقد نہیں ہوتا ۔ قال الشامی وسیاتی فی باب العدۃ
انہ لا عدۃ فی نکاح باطل وذکر فی البحر ھناک عن المجتبیٰ ان کل نکاح اختلف
العلماء فی جوازہ کالنکاح بلا شھود فالدخول فیہ موجب للعدۃ واما نکاح
منکوحۃ الغیر ومعتدتہ فالدخول فیہ لا یوجب العدۃ ان علم انھا للغیر لانہ

لم یقل احد بجوازہ فلم ینعقد اصلاً قال فعلی ھذا یفرق بین فاسدہ و
باطلہ فی العدۃ لھذا یجب الحد مع العلم بالحرمۃ لانہ زنا کما فی القنیہ وغیرھا
اھ (ص ۵۷۵ ج ۲) پس ہندہ پر نکاح زید کی وجہ سے کوئی عدت نہیں ۔

(۲) جواب سوال سوم بھی صحیح نہیں کیونکہ نکاح فاسد میں زوجین میں سے ہر ایک کو فسخ نکاح
کا حق حاصل ہے ۔ اور متارکت وفسخ میں کچھ فرق نہیں البتہ اگر نکاح اصل سے صحیح ہوا اور فساد بعد عہ
میں طاری ہوا ہو ۔ اس صورت میں متارکت زوج کے ساتھ مخصوص ہے اور صورت موجودہ میں
فساد اصل عقد میں ہے لہذا ہندہ کا بھی فسخ ومتارکت کافی ہے قال علامۃ الشامی وخص
الشارح المتارکۃ بالزوج ۔ کما فعل الزیلعی لان ظاھر کلامھم انھا لا تکون
من المرأۃ اصلا مع ان فسخ ھذا النکاح یصح من کل منھما بمحضر الآخر اتفاقا
والفرق بین المتارکۃ والفسخ بعید کذا فی البحر ۔ وفرق فی النھر بان المتارکۃ
فی معنی الطلاق فیختص بہ الزوج اما الفسخ فرفع العقد فلا یختص بہ وان کان
فی معنی المتارکۃ وردہ الخیر الرملی بان الطلاق لا یتحقق فی الفاسد فکیف یقال
ان المتارکۃ فی معنی الطلاق ۔ فالحق عدم الفرق ولذا جزم بہ المقدسی فی شرح
نظم الکنز الخ وتمامہ فی ما علقناہ علی البحر اھ (ص ۵۷۷ ج ۲) وفی البحر نظاھر
کلامھم ان المتارکۃ لا تکون من المرأۃ اصلا کما قیدہ الزیلعی بالزوج لکن
فی القنیۃ لکل واحد منھما ان یستبد بفسخہ قبل الدخول بالاجماع وبعد
الدخول مختلف فیہ وفی الذخیرۃ ولکل واحد من الزوجین فسخ ھذا النکاح
بغیر محضر من صاحبہ عند بعض المشائخ وعند بعضھم ان لم یدخل بھا فکذلک
فان دخل بھا فلیس لواحد منھما حق الفسخ الا بمحضر من صاحبہ ۔ اھ وھکذا
فی الخلاصۃ وھذا یدل علی ان للمرأۃ فسخہ بمحضر الزوج اتفاقا ولا شک
ان الفسخ متارکۃ الا ان یفرق بینھما وھو بعیدٌ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ۔
اھ (ص ۱۷۲ ج ۳) وفی الدر ویثبت لکل واحدٍ منھما فسخہ ولو بغیر محضر
من صاحبہ دخل بھا اولا فی الاصح خروجاً عن المعصیۃ اھ (ص ۵۷۵ ج ۲) ۔

عہ الفرق بینھما علی رأی سیدی حکیم الامۃ ۱۲ ظ

جب مطلقاً نکاح فاسد میں یہ حکم ہے تو نکاح معتدہ میں جو کہ باطل ہے بدرجہ اولیٰ متارکت کی ضرورت نہیں لانہ لا ینعقد اصلاً۔

(۳) پھر مجیب نے قضاء قاضی کی صورت اہل ہند کے لئے بیان کر کے جو یہ لکھا ہے کہ خود وہاں جا کر یا بذریعہ تحریر حکم تفریق طلب کرنے سے الخ یہ تردید بھی صحیح نہیں کیونکہ جن مسائل میں قضاء شرط ہے ان میں قاضی کی تحریر کافی نہیں ہوتی۔ اگر تحریر مثل کتاب القاضی الی القاضی کے ہو تو معتبر ہو سکتی ہے اور اس کے لئے پھر یہاں قاضی کے ہونے کی ضرورت ہے۔ پس مسائل قضاء میں بجز ریاستوں میں جا کر دعویٰ دائر کرنے کے کوئی صورت نہیں، واللہ اعلم۔ ۲۱ صفر ۴۱ھ۔

مزنیہ کی بیٹی سے نکاح کی عدم صحت اور طریق متارکت

سوال (۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین صورت مسئولہ میں کہ آٹھ سالہ نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی والدہ نے ایسی صورت میں کہ ایک شخص سے اس کا ناجائز تعلق ہو گیا تھا اسی سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا لڑکی اب بعمر ۱۵ سالہ ہے جس کا اب تک خاوند سے کوئی تعلق صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ اس نے اپنی ماں کو ناجائز تعلق کرتے ہوئے یعنی مباشرت فاحشہ میں خاوند کے ساتھ بارہا دیکھا ہے از روئے شرع شریف لڑکی خاوند کے نکاح میں رہ سکتی ہے یا نہیں نیز خاوند سے طلاق لینے کی ضرورت ہے یا بغیر طلاق خاوند سے جدا ہو گئی، بینوا توجروا۔

الجواب: جب لڑکی کی ماں کا ناجائز تعلق اپنے داماد سے قبل نکاح بنت ہی ہو چکا ہے تو اس صورت میں لڑکی کا نکاح اس شخص سے صحیح نہیں ہوا بشرطیکہ لڑکی نے اپنے نکاح سے پہلے ماں کا ناجائز تعلق خود دیکھا ہو یا دو معتبر دیکھنے والوں نے اس سے بیان کیا ہو یہ ضرور نہیں کہ مباشرت فاحشہ کرتے ہوئے ہی دیکھا ہو بلکہ اگر پاس سوتے ہوئے یا تقبیل وغیرہ کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہو تب بھی کافی ہے جب نکاح صحیح نہ ہوا تو لڑکی کو شوہر سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں بلکہ چند آدمیوں کے سامنے اسے اتنا کہہ دینا چاہیئے کہ میں اپنے نکاح کو جو فلاں شخص سے ہوا تھا فسخ کرتی ہوں اور بہتر یہ ہے کہ شوہر کے سامنے بھی یہ بات کہہ دے گو ضرورت نہیں۔ پھر اگر شوہر سے لڑکی کی ہمبستری نہیں ہوئی جیسا کہ سوال سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے تب تو اس پر عدت بھی واجب نہیں بلکہ بدون عدت ہی کے مذکورہ بالا کلمات کہہ کر وہ اپنا نکاح دوسرے شخص سے جو اس کا کفو ہو خاندانی مہر پر کر سکتی ہے اور اگر ہمبستری ہو چکی ہے تو مذکورہ بالا کلمات کہنے کے بعد تین حیض گذرنے پر وہ اپنا نکاح دوسرے سے کر سکتی ہے۔ قال فی الخلاصۃ اما بالخلوۃ الصحیحۃ والفاسد فی النکاح الفاسد

فلا یجب العدۃ وکمال المھر والنکاح الفاسد لاحکم لہ قبل الدخول حتی لو تزوج امرأۃ نکاحاً فاسداً بان مس امھا بشھوۃ ثم تزوجھا ثم ترکھا لہ ان یتزوج الام والمتارکۃ فی النکاح الفاسد بعد الدخول لایکون الا بالقول ترکتک او خلیت سبیلک الیٰ ان قال وفی المحیط لکل واحد فسخ ھذا العقد بغیر محضر من صاحبہ قبل الدخول وبعد الدخول لیس لکل واحد منھما حق الفسخ الا بحضرۃ صاحبہ کالبیع الفاسد، وعند بعض المشائخ لکل واحد حق الفسخ بعد الدخول وقبلہ ام ص ۴۱ ج ۲۔ اور اگر لڑکی کے نکاح سے پہلے اس کی ماں کا ناجائز تعلق داماد سے نہ ہوا ہو بلکہ بعد نکاح کے ناجائز تعلق ہوا ہو تو سوال دوبارہ کریں، واللہ اعلم۔ ۹ رجب۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم۔

باپ نے نابالغہ کا نکاح کیا بعد میں معلوم ہوا شوہر شرابی ہے الخ

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی دختر کا نکاح پنج سال کی عمر میں ایک لڑکے کے ساتھ کر دیا بعد ازیں معلوم ہوا کہ وہ لڑکا جوئے باز اور شارب الخمر ہے اور جب وہ لڑکا اپنی منکوحہ کو لینے کے واسطے اپنے خسر سے آ کر متقاضی ہوا تو اس کے خسر نے کہا کہ جب تک تو جوئے کے کھیلنے اور شراب کے پینے سے باز نہ آئے گا تب تک میں اپنی دختر کو تمہارے ساتھ روانہ نہ کروں گا کیونکہ ہمارے کنبے میں نہ کوئی شرابی ہے اور نہ قمار باز اس شخص نے کہا کہ میں شراب کے پینے اور جوئے کے کھیلنے سے ہرگز تائب نہ ہوں گا تو اس کے خسر نے کہا کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا حاصل کلام وہ شخص مذکور خالی پھر گیا جب اس بات کو پنج سال کا عرصہ گذر گیا تو اس لڑکی کے والد نے بدیں غرض کہ شاید وہ تنگ آ کر بد عادتوں کو چھوڑ دیوے اور میری دختر کو اپنے گھر آباد کر لیوے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا عدالت نے بذریعہ سمنہائے سخت تلاش کی لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گیا بعد ازاں عدالت نے اس کے مہر کی یکطرفہ ڈگری دیدی جب اس فیصلہ کو تخمیناً پنج سال گذر گئے تو اس عورت نے نان و نفقہ سے تنگ آ کر ایک شخص کے ساتھ ناجائز علاقہ پیدا کر لیا اور صاحب اولاد ہو گئی، جب اُسکے گاؤں والوں نے اس کو تنگ کیا الا حقہ پانی اس کا بند کر دیا تو اس نے ناچار آپ کی جناب عالی میں عریضہ بصورت استفتاء پیش کیا کہ میرا نکاح بوجہ مفقودیت زوج ان صورتوں کے جو ذکر کیئے گئے دیگر سے ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو برائے مہربانی تحریر فرما کر مشکور فرما دیں؟

الجواب: قال فی العالمگیریۃ رجل زوج ابنتہ الصغیرۃ من رجل

علی ظن انہ صالح لایشرب الخمر فوجدہ الاب شریبًا مدمنا وکبرت الابنۃ فقالت لا ارضی بالنکاح ان لم یعرف ابوھا بشرب الخمر وغلبۃ اھل بیتہ الصالحون فالنکاح باطل ای یبطل وھذہ المسئلۃ بالاتفاق کذا فی الذخیرۃ اھ ص ۱۶ ج ۲۔ وفی رد المحتار قال فی البزازیۃ زوج بنتہ من رجل ظنہ مصلحا لایشرب مسکرا فاذا ھو مدمن فقالت بعد الکبر لا ارضی بالنکاح ان لم یکن ابوھا یشرب المسکر ولا عرف بہ وغلبۃ اھل بیتھا الصالحون فالنکاح باطل بالاتفاق اھ ص ۵۲۶ ج ۲۔ وفیہ ایضًا فرجع الی ان المعتبر صلاح الاٰباء فقط وانہ لا عبرۃ لفسقھا بعد کونھا من بنات الصالحین اھ۔

صورت مسئولہ میں اگر لڑکے نے بعد جوان ہونے کے اس نکاح سے اپنی ناراضی ظاہر کی تھی تو یہ نکاح باطل ہوگیا اور یہ لڑکی دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے اور اگر جوان ہونے کے بعد اس نے نکاح سے ناراضی ظاہر نہیں کی یا رضامندی ظاہر کی تھی تو سوال دوبارہ کیا جاوے واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد بامر سیدی حکیم الامت، ۲۸ رجب ۱۳۴۶ھ۔

معتدۂ وفات نے عدت کے اندر نکاح کرلیا اور چھ ماہ بعد تجدید نکاح کی تو کیا نکاح جدید صحیح ہوگیا؟

سوال (۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ متوفی زید کی بی بی کو عدۃ وفات کے اندر یعنی چالیس دن رہتے عمر نے نکاح کرکے اس سے وطی کرتا رہا اور نکاح کے بعد ان دونوں کے تفریق نہ ہوئی اور نہ اس عورت نے مابقی عدۃ وفات کو بھی پورا کی اس حالت میں رہتے ہوئے زید کی وفات کی مدت چھ مہینے گذر جانے سے پھر عمر نے اس عورت کو بعض مولوی صاحب کے حکم سے ثانیاً نکاح کرلیا ہے فتاوی عالمگیری میں باب العدۃ میں مرقوم ہے۔ ولو تزوجت فی عدۃ الوفاۃ فدخل بھا الثانی ففرق بینھما فعلیھا بقیۃ عدتھا من الاول تمام اربعۃ اشھر وعشر وعلیھا ثلث حیض من الاٰخر ویحتسب بما حاضت بعد التفریق من عدۃ الوفاۃ کذا فی معراج الدرایۃ وھکذا فی المبسوط وایضًا فیہ المطلقۃ اذا حاضت حیضۃ ثم تزوجت بزوج اٰخر ووطئھا الثانی وفرق بینھما وحاضت حیضتین بعد التفریق کان لھذا الزوج الثانی ان یتزوجھا لانقضاء عدۃ الاول الخ ان عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مابقی عدۃ وفات پورا کرنا اس عورت پر واجب ہے بغیر پورا کرنے عدت وفات کے عمر کا نکاح

اس سے ثانیاً بھی درست نہیں اگرچہ مدت وفات زید کی چھ مہینے سے گذر گئی ہو لیکن بعض مولوی صاحب کا قول ہے کہ جب عمر نے اس عورت کو زید کے مرنے سے چھ مہینے کے بعد پھر ثانیاً نکاح کرلیا ہے تو وہ نکاح درست ہوا ہے اور مابقی عدت وفات بغیر تفریق کے بھی اسی حالت میں پوری ہوگئی ہے چونکہ مسئلہ مذکور کے بارہ میں چول تنازع ہو رہا ہے اور جناب حامی دین متین ووارث سید المرسلین ہیں لہٰذا دفع تنازع اور حقیقت مسئلہ دریافت کے لئے جناب عالی میں عرض پرداز ہوں کہ متوفی زید کی بی بی کو اس وقت عمر سے جدا کرکے مابقی عدۃ وفات پوری کرنا اس پر واجب ہے یا نہیں جناب از روئے مہربانی وشرع پروری کے باادلہ شرعیہ بیان فرمائیں اور نکاح ثانی جائز اور عدتِ وفات پورا نہ ہونے کی تقدیر پر عمر اگر اس عورت کو پھر نکاح کرے تو عالمگیری ومبسوط کے قول ولو تزوجت فی عدۃ الوفاۃ الخ کے رو سے تین حیض پورا گذر جانے یا صرف مابقی عدۃ وفات چالیس دن گذر جانے کے بعد نکاح کرے از روئے شرع ارشاد فرمائیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر معتدۃ الوفاۃ عدۃ کے اندر نکاح کرے تو عدت وفات کا تمام ہونا تفریق پر موقوف نہیں بلکہ جب چار ماہ دس دن گذر جائیں گے (وھی غیر حامل) تو عدت پوری ہوجائے گی اب اگر یہ مدت تفریق سے پہلے ہی گذر گئی تو زوج ثانی کو اس سے ثانیاً نکاح کرلینا معًا درست ہے اور اگر چار ماہ دس دن گذرنے سے پہلے ان دونوں میں تفریق ہوگئی تو عورت کو مابقی عدت کا پورا کرنا ضروری ہے مابقی عدت پورا ہوجانے کے بعد زوج ثانی کو تو معًا اس سے نکاح درست ہے اور دوسروں کو بعد تفریق کے تین حیض گذر جانے کا بھی انتظار کرنا لازم ہوگا عالمگیریہ کی عبارتِ مرقومۃ الصدر کا مطلب یہ ہے کہ عورت نے عدت وفات میں نکاح کرلیا اور عدت ہی میں زوج ثانی نے دخول کیا اور عدۃ ہی کے اندر دونوں میں تفریق کردی گئی تو اس عورت پر زوج اول کی باقی عدۃ کا پورا کرنا ضروری ہے اور چونکہ زوج ثانی کے دخول سے بھی اس کے ذمہ عدۃ وطی بالشبہ لازم ہوگئی ہے تو اگر وہ زوج ثانی کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس پر تین حیض کا بھی تفریق کے بعد سے انتظار کرنا ضروری ہے اور تین حیض کے گذرنے کے ساتھ ساتھ عدۃ وفات بھی گذرتی رہے گی اھ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر عدۃ وفات بحالت نکاح فاسد پوری ہوچکی ہو تب بھی دونوں میں تفریق کی اور تفریق کے بعد عدۃ وفات پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ کلا وحاشا۔ قال فی الدر و مبدأ العدۃ بعد الطلاق وبعد الموت علی الفور وتنقضی العدۃ وان جھلت المرأۃ بھما ای بالطلاق والموت لانھا اجل فلا یشترط العلم بمضیہ اھ ص ۱۰۳ ج ۱۲

وفی البدائع والدلیل علی انها اسم للاجل لا للفعل انها تنقضی من غیر فعل التربص بان لم تجتنب عن محظورات العدة حتی انقضت المدة ولو کانت فعلا لما تصور انقضاءها مع ضدها وھو الترك سلمنا انه کف لکنه لیس برکن فی الباب بل ھو تابع بدلیل انه تنقضی العدة بدونه (ای بدون الکف عن المحظورات) الی ان قال ولما کان الرکن ھو الاجل عندنا وھو معنی الزمان لا یقف وجوبه علی العلم به کمضی سائر الازمنة ثم قد بینا انه لا یقف علی فعلها اصلا وھو الکف فانها لو علمت (بالموت) فلم تکف لم تجتنب ما تجتنبه المعتدة حتی انقضت المدة انقضت عدتها اھ ص ۱۹۰ و ۱۹۱ ج ۳۔ اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ انقضاء عدت عورت کے تربص اور کف عن المحذورات پر موقوف نہیں بلکہ انقضاء عدت کے لئے صرف مدت کا پورا ہو جانا کافی ہے پس صورت مسئولہ میں جب معتدہ ۶ ماہ تک زوج ثانی کے پاس رہی تو اگر وہ غیر حامل ہو اس کی عدت پوری ہو گئی اور عمرو کا نکاح جو پہلے شوہر کی موت کے ۶ ماہ بعد کیا ہے اس کے ساتھ درست ہو گیا اور عدت وفات گذر جانے کے بعد تین حیض کے گذرنے کا انتظار عمرو پر لازم نہیں، ہاں اگر یہ عورت عمرو سے تفریق حاصل کر کے کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہتی تو دوسری کو عدۃ وفات گذرنے کے ساتھ بعد از تفریق عمر تین حیض گذرنے کا بھی انتظار لازم ہوتا قال فی ردالمحتار عن البحر واذا تمت عدۃ الاول حل للثانی ان یتزوجھا لا لغیرہ ما لم تتم عدۃ الثانی بثلاث حیض من حیض التفریق اھ ص ۱۰۰۳ ج ۱۔

(تنبیہ) عدت وفات کا تمام ہونا تو اس پر موقوف نہیں کہ جو نکاح فاسد عدت میں کیا گیا ہے اس سے تفریق ہو تب ہی عدت گذرے عدت وفات بحالت بقاء نکاح فاسد بھی تمام ہو جائے گی البتہ تداخل عدتین تفریق پر موقوف ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ معتدہ وفات پر عدت میں نکاح و دخول بالثانی کرنے سے دوسری عدت وطی بالشبہ کی وجہ سے لازم ہو جاتی ہے جبکہ وہ زوج ثانی کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے اور اگر وہ زوج ثانی ہی سے نکاح کرنا چاہے اس کا حکم اوپر گذر چکا ہے: اب اس کی دو صورتیں ہیں (۱) یہ کہ ان دونوں میں عدت کے اندر ہی تفریق ہو جائے اس صورت میں تین حیض تفریق کے بعد گذرنے کے ساتھ عدت وفات بھی پوری ہوتی رہے گی۔ (۲) یہ کہ ان دونوں میں عدت وفات کے اندر تفریق نہیں ہوئی بلکہ چار ماہ دس دن

کے بعد تفریق ہوئی اور ان چار مہینوں اس کو تین حیض بھی آ چکے اس صورت میں صرف عدت وفات تمام ہوئی عدت وطی بالشبہ باقی ہے اگر یہ عورت کسی تیسرے سے نکاح کرنا چاہے تو اس کو تین حیض تفریق کے بعد اور گذارنا واجب ہے قال فی ردالمحتار فلو کانت وطئت بعد حیضۃ من (العدة) الاولی فعلیھا حیضتان تکملۃ للاولی وتحتسب بھما من عدۃ الثانی فاذا حاضت واحدۃ بعد ذالك تمت الثانیۃ ایضا نہر وھذا اذا کان بعد التفریق بینھما وبین الواطی الثانی اما اذا حاضت حیضۃ قبلہ (ای قبل التفریق) فھی من عدۃ الاولی خاصۃ اھ ص ۱۰۰۲ ج ۲۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ زوج اول کی عدۃ تو بدون تفریق کے تفریق سے پہلے ہی تمام ہو سکتی ہے البتہ تداخل عدت اول و ثانی بدون تفریق کے نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ با مر سیدی حکیم الامۃ ۔ ۱۷ شوال ۱۳۴۱ھ۔

نکاح باطل و فاسد کی تعریف اور مزید چند صورتوں کا حکم

سوال (۱۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ نکاح فاسد اور باطل کسے کہتے ہیں۔ باعتبار تعریف و احکام وغیرہ ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔ فتح القدیر میں ہے کہ ان دونوں میں کچھ فرق نہیں بعض دوسرے فقہاء نے فرق لکھا ہے۔ ایسی صورت میں ترجیح کس قول کو ہو گی؟

ایک عورت کے نکاح ہوتے ہوئے اوس کی بہن سے بھی نکاح کر لینا فاسد ہے یا باطل۔ فتاوی عالمگیری القسم الرابع للمحرمات بالجمع میں ہے وان تزوجھما فی عقدتین فنکاح الاخیرۃ فاسد ویجب علیہ ان یفارقھا ولو علم القاضی بذلك یفرق بینھما فان فارقھا قبل الدخول لا یثبت شئ من الاحکام وان فارقھا بعد الدخول فلھا المھر ویجب الاقل من المسمی ومن مھر المثل وعلیھا العدۃ ویثبت النسب ویعتزل عن امرأتہ حتی تنقضی عدۃ اختھا کذا فی محیط السرخسی اس میں ثانی کو فاسد کہا ہے ردالمحتار اور دیگر کتب میں باطل لکھا ہے ان دونوں میں قول محقق و مفتی بہ کیا ہے؟

اس دوسری عورت سے جو اولاد پیدا ہو گی وہ عبارت عالمگیری کی بناء پر ثابت النسب ہو کر ناکح کی وارث ہو گی یا نہیں؟ جن فقہاء نے نکاح ثانی کو باطل کہا ہے ان کے نزدیک ثبوت نسب اور وراثت کا کیا حکم ہے دونوں کے نزدیک عورت ناکح سے وارث ہو گی یا محروم؟

اس کے اور نیز اولاد کے وارث ہونے کے متعلق بھی محقق اور مفتی بہ قول ارقام فرمائیں؟ ان تمام سوالات کے متعلق ذرا مفصل اور مدلل جواب تحریر فرمایا جائے۔ جس سے طالب علم تردد اور خلجان سے محفوظ رہے والسلام۔

الجواب؛ قال فی الدر ویجب مهر المثل فی نکاح فاسد وهو الذی فقد شرطا من شروط الصحة کشهود اھ وفیه ایضاً ویثبت النسب احتیاطا بلا دعوة اھ قال الشامی ومثله تزوج الاختین معاً ونکاح الاخت فی عدة الاخت ونکاح المعتدة والخامسة فی عدة الرابعة والامة علی الحرة وفی المحیط تزوج مسلمة فرق بینهما لانه وقع فاسداً اھ فظاهره انهما لا یحدان وان النسب یثبت فیه والعدة ان دخل بحر، قلت لکن سیذکر الشارح فی اٰخر فصل فی ثبوت النسب عن مجمع الفتاوی: نکح کافر مسلمة فولدت منه لا یثبت النسب منه ولا تجب العدة لانه نکاح باطل اھ وهذا اصریح فیقدم علی المفهوم فافهم ومقتضاه الفرق بین الفاسد والباطل فی النکاح لکن فی الفتح قبیل التکلم علی نکاح المتعة انه لافرق بینهما فی النکاح بخلاف البیع نعم فی البزازیة حکایة قولین فی ان نکاح المحارم باطل او فاسد والظاهر ان المراد بالباطل ما وجوده کعدمه ولذا لا یثبت النسب ولا العدة فی نکاح المحارم ایضاً کما یعلم مما سیأتی فی الحدود الی ان قال وسیأتی فی باب العدة انه لا عدة فی نکاح باطل وذکر فی البحر هناك عن المجتبیٰ ان کل نکاح اختلف العلماء فی جوازه کالنکاح بلا شهود فالدخول فیه موجب للعدة اما نکاح منکوحة الغیر ومعتدته فالدخول فیه لا یوجب العدة ان علم انها للغیر لانه لم یقل احد بجوازه فلم ینعقد اصلا قال فعلی هذا یفرق بین فاسده وباطله فی العدة ولهذا یجب الحد مع العلم بالحرمة لانه زنا کما فی القنیة وغیرها اھ والحاصل انه لافرق بینهما فی غیر العدة اما فیها فالفرق ثابت وعلی هذا فیقید قول البحر هنا ونکاح المعتدة بما اذا لم یعلم بانها معتدة لکن یرد علی ما فی المجتبیٰ مثل نکاح الاختین معاً فان الظاهر انه لم یقل

۱۹

احد بجوازه ولکن لینظر وجه التقیید بالمعیة والظاهر ان المعیة فی العقد لا فی ملك المتعة اذ لو تأخر احدهما عن الاٰخر فالمتاخر باطل قطعاً اھ (ص ۲۷۵ ج ۲) وفیه ایضاً عن الخانیة لو تزوج محرمه لا حد علیه عند الامام وعلیه مهر مثلها بالغا ما بلغ اھ وصرح فی البحر ان المواضع التی یجب فیها المهر بسبب الوطأ بشبهة فلیس المراد بالمهر فیها مهر المثل المذکور هنا لما فی الخلاصة ان المراد بالمهر العقر وتفسیر العقر انه بکم تستاجر للزنا لو کان حلالا یجب ذلك القدر اھ ملخصا وقال ابن عابدین فی حاشیته ان فی التتارخانیة فی وجوب المهر بلا نکاح ذکر ما هنا معزیا الی المحیط ثم اعقبه بقوله وفی الحجة روی عن ابی حنیفة رح قال تفسیر العقر هو ما یتزوج به مثلها وعلیه الفتوی اھ فظهر ان فی المسئلة خلافا وان المفتی به خلاف ما هنا اھ (ص ۱۷۳ ج ۳) وفی الدر فی باب الحد ولا حد ایضاً بشبهة العقد ای عقد النکاح عنده ای الامام کوطأ محرم نکحها وقالا ان علم الحرمة حد وعلیه الفتوی خلاصة، لکن المرجح فی جمیع الشروح قول الامام فکان الفتوی علیه اولیٰ قاله القاسم فی تصحیحه لکن فی القهستانی عن المضمرات علیٰ قولهما الفتویٰ وحرر فی الفتح انها من شبهة المحل وفیها یثبت النسب اھ قال الشامی وکذلك نقل فی الفتح عن الخلاصة ان الفتوی علیٰ قولهما ثم وجهه بان الشبهة تقتضی تحقق الحل من وجهٍ وهو غیر ثابت والا وجب العدة والنسب ثم دفع ذلك بان من المشائخ من التزم وجوبهما ولو سلم عدم وجوبهما لعدم تحقق الحل من وجهٍ فالشبهة لا تقتضی تحقق الحل من وجهٍ لان الشبهة ما یشبه الثابت ولیس بثابتٍ اھ ملخصاً وحاصله: ان عدم تحقق الحل من وجهٍ فی المحارم لکونه زنا محضا یلزم منه عدم ثبوت النسب والعدة ولا یلزم منه عدم الشبهة الدارئة للحد ولا یخفی ان فی هذا ترجیحاً لقول الامام قوله وحرر فی الفتح الخ صوابه فی النهر قال وهذا انما یتم بناء علی انها شبهة اشتباه قال فی الدرایة وهو

قول بعض المشائخ والصحیح انہا شبھۃ عقد لانہ روی عن محمدؒ انہ قال سقوط الحد بشبھۃ حکمیۃ فیثبت النسب وھکذا ذکر فی المنیۃ اھ وھذا صریح بان الشبھۃ فی المحل وفیہا یثبت النسب علی ما مر اھ کلام النھر قلت وفی ھذا زیادۃ تحقیق لقول الامام لما فیہ من تحقیق الشبھۃ حتی تثبت النسب ویؤیدہ ما ذکرہ الخیر الرملی فی باب المھر عن العینی ومجمع الفتاوی انہ یثبت النسب عندہ لا عندھما اھ (۲۳۷ ج ۳) وفیہ ایضاً تحت قول الدر کوطی محرم نکحہا ای عقد علیہا اطلق فی المحرم فشمل المحرم نسباً ورضاعاً وصھریۃ واشار الی انہ لو عقد علی منکوحۃ الغیر او معتدتہ او مطلقتہ الثلاث او امۃ علی حرۃ او تزوج مجوسیۃ او امۃً بلا اذن سیدھا او تزوج العبد بلا اذن سیدہ او تزوج خمسا فی عقدۃ فوطئھن او جمع بین اختین فی عقدۃ فوطئھما او الاخیرۃ لو کان متعاقباً بعد التزوج فانہ لا حد وھو بالاتفاق علی الاظھر اما عندہ فظاھر واما عندھما فلان الشبھۃ انما تنتفی عندھما اذا کان مجمعا علی تحریمہ وھی محرمۃ علی التابید بحر قلت وھذا ھو الذی حررہ فی فتح القدیر وقال ان الذین یعتمد علی نقلھم کابن المنذر ذکروا انہ انما یحد عندھما فی ذات المحرم لا فی غیر ذلک کمجوسیۃ ومعتدۃ وکذا عبارۃ الحاکم فی الکافی تفیدہ ثم ذکرھا فلیراجع (ص ۲۳۶ ج ۳) وفی الدر فی کتاب الفرائض (ص ۷۴۵ ج ۵) ویستحق الارث باحد ثلاثۃ برحم ونکاح صحیح فلا توارث بفاسد ولا باطل اجماعاً اھ۔

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوتے :

(۱) نکاح میں بھی باطل وفاسد ہے اور فتح القدیر میں جو یہ کہا ہے کہ نکاح میں باطل وفاسد کی تقسیم جاری نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح باطل نکاح ہی نہیں ہے پس اس کو نکاح سے موصوف کرکے باطل کہنا فضول ہے صرح بہ الشامی فی حاشیۃ البحر بقولہ والذی ظھر لی ان المراد بالباطل فی کلام البزازیۃ فی قولہ نکاح المحارم فاسد ام باطل الذی وجودہ کعدمہ لا ان النکاح ینقسم الی باطل وفاسد اھ (ص ۱۷۱ ج ۳)

(۲) نکاح باطل وفاسد میں صرف باب عدۃ میں فرق ہے کہ باطل موجب عدہ نہیں ہے

اور فاسد موجب عدۃ ہے بقیہ احکام میں فرق نہیں۔

(۳) اور بعض عبارات میں جو نکاح باطل کی بعض صورتوں میں ثبوت نسب کی نفی کی گئی ہے جس سے باطل وفاسد میں ثبوت نسب میں بھی افتراق معلوم ہوتا ہے وہ صاحبین کے قول پر مبنی ہے۔ جو بعض کے نزدیک مفتی بہ ہے ورنہ امام صاحب تو نکاح محارم میں بھی ثبوت نسب کے قائل ہیں اور اس کو شبہۃ العقد میں داخل کرتے ہیں اور شامی نے باب الحدود میں اسی کی تصحیح نقل کی ہے۔

(۴) نکاح باطل وفاسد دونوں میں عورت اور مرد میں توارث نہیں ہوتا۔

(۵) رہا مہر تو فاسد میں مہر مثل لازم آتا ہے جو مسمیٰ سے زیادہ نہ ہوگا اور باطل میں بھی مہر مثل لازم ہے جتنا بھی ہو خواہ مسمیٰ کے برابر یا زائد کما مر عن الخانیۃ فی نکاح المحرم۔

(۶) دو بہنوں سے آگے پیچھے نکاح کیا جائے تو دوسرا باطل ہے دوسری عورت مرد کی وارث نہ ہوگی مگر دوسری عورت دخول ووطی سے مہر خاندانی کی مستحق ہے اور امام صاحب کے نزدیک دوسری کی اولاد ثابت النسب بھی ہے اور صاحبین کے نزدیک بظاہر ثابت النسب نہ ہونا چاہئے مگر عبارت باب الحدود سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ امام سے صاحبین کا اختلاف صرف نکاح محارم میں ہے یعنی محارم ابدیہ میں بقیہ محرمات کے نکاح میں اختلاف نہیں اور ان میں وہ بھی نکاح کو موجب شبہۃ مانتے ہیں تو اس بنا پر نکاح اختین میں صاحبین کے نزدیک بھی اولاد کا نسب ثابت ہونا چاہئے۔

پس صورت مسئولہ میں دوسری عورت مسماۃ افضل خود تو نیاز اللہ کی وارث نہیں نہ اس کے ذمہ عدت واجب ہوئی البتہ اس کی اولاد مثل اولاد زوجۂ اولیٰ کے نیاز اللہ کی وارث ہے اور مسماۃ افضل مہر مثل کی مستحق ہے۔ تقسیم ترکہ واخراج بطون خود فرمالیں، واللہ اعلم۔ ۳ ربیع الاول ۴۵ھ

نکاح معتدہ

سوال (۱) میری بیٹی کو خاوند نے طلاق دیدی اور عدت کے اندر صرف آٹھ ہی دن کے بعد میں نے اس کا نکاح دوسری جگہ کردیا سنا ہے کہ یہ نکاح نہیں ہوا اس کو کئی سال سے گذر گئے اولاد بھی ہوچکی اب کیا کیا جاوے یہ اولاد حلالی ہے یا حرامی اب دونوں کا نکاح کردیا جاوے تو آئندہ کے لئے گناہ سے حفاظت ہوجاوے گی یا نہیں ؟

الجواب : بیشک یہ نکاح ثانی عدت کے اندر ہوا ہے اس لئے درست نہیں ہوا اور ان دونوں کا اب دوبارہ نکاح کردینا ضرور چاہئے اور اس زمانہ میں جو وطی ہوئی ہے وہ وطی بالشبہ کے حکم میں ہے اگر زوجین اپنے نکاح کو نکاح بھی سمجھتے تھے اور وطی بالشبہ سے اولاد حرامی نہیں ہوتی اور اگر زوجین اول ہی سے اپنے نکاح کو حرام سمجھے ہوئے تھے تو سوال دوبارہ کیا جائے اور صورت

مذکورہ میں زوج اول کی عدت تو تمام ہو چکی ہے پس اگر اس وقت نکاح صحیح زوج ثانی کے ساتھ ہی کیا جائے تو بس اور عدت کی ضرورت نہیں اور اگر زوج ثانی کے علاوہ کسی اور سے کیا جائے تو ایک اور عدت لازم ہوگی واللہ اعلم۔ ۲۰ جمادی الاولی ۴۳ھ۔

نومسلمہ سے قبل از انقضاء عدت نکاح کا حکم

سوال (۱۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس صورت میں کہ زید نے ایک غیر مسلمہ منکوحہ کو اغوا کر کے مسلمہ کرالیا اور بغیر انتظار کے اس کے ساتھ وطی کرتا رہا اور وہ عورت زید سے حاملہ بھی ہوگئی اور بعد دو ماہ کے زید نے اس عورت سے نکاح کرلیا تو آیا یہ نکاح جائز ہے یا ناجائز ہے بینوا توجروا۔

الجواب: فی العالمگیریۃ (ص ۲۷۴۵) واذا اسلم احد الزوجین فی دار الحرب ولم یکونا من اھل الکتاب او کانا والمرأۃ ھی التی اسلمت فانہ یتوقف انقطاع النکاح بینھما علی مضی ثلاث حیض سواء دخل بھا او لم یدخل بھا کذا فی الکافی فان اسلم الآخر قبل ذلک فالنکاح باق ولو کانا مستامنین فالبینونۃ اما بعرض الاسلام او بانقضاء ثلث حیض کذا فی العنایۃ اھ اس عورت سے جواز نکاح تین حیض گذرنے پر موقوف ہے پس اگر وقت نکاحِ زید تک اس عورت کو تین حیض آچکے تھے تب تو یہ نکاح درست ہوگیا اور اگر تین حیض نہیں آئے تھے تو یہ نکاح درست نہیں ہوا بعد وضع حمل کے تجدید نکاح کی جائے اور اس وقت تک اس عورت سے قربت وغیرہ اور تقبیل و لمس سب حرام ہے۔ واللہ اعلم۔ ۲۲ رج ۲ ۴۴ھ۔

حکم نکاح بین الرضیعین

سوال (۱۳) کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید و بکر دونوں آپس میں رضاعی بھائی بہن اس طرح پر کہ ایام رضاعت میں زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا اور بکر نے زید کی ماں کا۔ زید و بکر کی مائیں خالدہ و زبیدہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ زید کا عقد (ہندہ) کے ساتھ ۱۸ھ میں ہوا جو بکر کی علاتی حقیقی (یعنی نسبی ۱۲) پھوپھی ہے اور اسی طرح (ہندہ) زید کی رضاعی پھوپی ہے۔ زید و بکر کی رضاعت کا علم بوقت نکاح وقبل نکاح خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کو تھا اور خود ہندہ و زید اور اس کے والدین بھی بخوبی جانتے تھے لیکن زید و بکر کے رضاع سے اس کا خیال کسی کو قبل نکاح یا بوقت نکاح نہ ہوا کہ اس رضاعت کی حرمت کا اثر (ہندہ) تک جاتا ہے اور ہندہ زید کے لئے محل نکاح نہیں ہے اور بعد نکاح بھی عرصہ تک کسی کا خیال باوجود علم رضاعت منتقل نہ ہوا کہ زید و ہندہ بوجہ رضاعت پھوپی اور بھتیجے ہیں۔

مسئلہ کی تحقیق و آگاہی:۔ جبکہ نکاح کو بارہ تیرہ سال گذر چکے اور چند اولاد بھی ہوئیں اور دو بیٹے زندہ موجود بھی ہیں (بکر) کا چھوٹا بھائی (عمر) جو بزمانہ عقد اپنی پھوپی ہندہ کے بہت کم سن تھا جب سن تمیز کو پہونچا اور تحصیل علوم دینیہ میں مشغول ہوا تو فقہ کی کتابوں میں اس نے رضاعت کا بیان پڑھا اس وقت اسے یہ خیال ہوا کہ میری پھوپھی ہندہ کا جو عقد زید سے ہوا وہ بوجہ رضاعت غلط ہوا چونکہ رضاعت کا علم خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کو تھا اور سب جانتے تھے کہ زید و بکر رضاعی بھائی ہیں اس کی تحقیق و صحت کو معلوم کرنا نہ تھا عمر نے اپنی پھوپی ہندہ کو خاموشی سے حرمت و فساد نکاح سے آگاہ کیا اور چونکہ ہندہ بھی ایک خاندان کی لڑکی ہے اور رضاعت مذکورہ کا اس کو علم ہمیشہ سے بخوبی تھا اور اسی طرح زید بھی بخوبی واقف تھا، بوجہ آگاہی مسئلہ دونوں نے خاموشی کے ساتھ علیحدگی اختیار کی اور اس وقت سے جس کو عرصہ تخمیناً ۶ سال کا ہوتا ہے بوجہ خوف حرمت رضاعت ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور اس خاموش علیحدگی کو خاندان کے بہت سے لوگ جانتے ہیں مثلاً بکر، عمر، زید کا باپ ہندہ کی ماں بہن، بہنوئی وغیرہ۔ ہاں عام طور پر اعلان نہیں ہے اب بعض لوگ زید سے یہ کہتے ہیں کہ چونکہ حرمت رضاعت کا علم بہت عرصہ کے بعد ہوا ہے لہٰذا یہ معتبر نہیں ہے تم جس طرح آپس میں زن و شوہر کی طرح رہتے تھے رہو لیکن زید اس کو منظور نہیں کرتا زید کہتا ہے کہ عمر کا بیان شہادت نہیں ہے وہ تو ایک غلطی کی اطلاع ہے اگر خود میری نظر سے یہ مسئلہ گذرتا تو بھی میں یہی کرتا اس لئے کہ رضاعت کا تو مجھ کو قبل نکاح علم تھا اور میں نے بچپن میں بارہا اپنی رضاعی ماں اور اپنی ماں سے اس وقت کے حالات سُنے ہیں اور خاندان کے چھوٹے بڑے رضاعت سے آگاہ تھے اور ہیں جو پچھلا غلطی اور جہالت سے ہوا وہ خدا معاف کرے اب علم و یقین ہوتے ہوئے کس طرح کروں۔ پس واقعات حالات مذکورہ کے بنا پر اب زید و ہندہ کو کیا کرنا چاہئے باہم زن و شوہر کے تعلقات پھر قائم کرلینا چاہئے یا ترک ہی رکھنا چاہئے۔ نان و نفقہ بحالت علیحدگی زید پر واجب ہے گا یا نہیں۔ نکاح جو ہوا اعتبار کیا جائے گا اور اولاد کا نسب صحیح ہے یا نہیں مہر ذمہ زید کے کل واجب ہے یا نہیں ہے بینوا توجروا۔

الجواب: صورت مسئولہ میں زید کو لازم ہے کہ ہندہ کو اپنے لئے حرام سمجھے اور چونکہ ۶ سال سے دونوں میں علیحدگی ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ عدت تین حیض بھی گذر چکی ہوگی پس اگر زید نے علیحدگی کے وقت ہندہ سے یہ لفظ بھی زبان سے کہدیا ہو کہ تو میرے لئے حلال نہیں اس لئے اب میں تیرے ساتھ میاں بی بی کے تعلقات نہیں رکھتا بلکہ تم سے الگ رہوں گا تو

اب ہندہ کو اپنا نکاح جس سے چاہے کر سکتی ہے اور اگر بالفرض تین حیض نہ آئے ہوں تو تین حیض کے بعد جس سے چاہے نکاح کرے اور اگر زید نے صرف عملی علیحدگی اختیار کی ہے اور زبان سے علیحدگی اختیار نہیں کی تو ابھی ہندہ دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی بلکہ جب زید اس سے زبانی علیحدگی ظاہر کر دے اور اس کے بعد تین حیض گذر جائیں تب وہ اس کے نکاح فاسد سے علیحدہ ہو گی اور یہ علیحدگی دونوں پر واجب ہے زید کو چاہئے کہ اس کو طلاق دیدے یا زبان سے اتنا کہدے کہ میں تجھ سے الگ ہوتا ہوں اگر زید یہ لفظ نہ کہے تو ہندہ کو چاہئے کہ وہ شوہر کے سامنے یہ لفظ کہدے کہ میں تجھ سے الگ ہوتی ہوں بہر صورت میں یہ تعلق فاسد منقطع ہو جائے گا اور اس صورت مذکورہ میں اولاد سب حلالی ہے اور ثابت النسب ہے، اور ہندہ کے لئے زید پر مہر مثل بھی لازم ہے اگر مہر مقررہ مہر مثل سے زیادہ ہو اور اگر مہر مثل مہر مقررہ سے کم ہو تب بھی مہر مثل ہی دیا جائیگا قال فی الشامیة تحت قول الدر وعدة المنکوحة نکاحاً فاسداً ھی المنکوحة بغیر شھود ونکاح امرأة الغیر بلا علم بانھا متزوجة و نکاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عندہ خلافاً لھما الی ان قال وتقدم فی باب المھر ان الدخول فی النکاح الفاسد موجب للعدة وثبوت النسب ومثل له فی البحر ھناك بالتزوج بلا شھود وتزوج الاختین معاً و الاخت فی عدة الاخت ونکاح المعتدة والخامسة فی عدة الرابعة والامة علی الحرة اھ (۹۹۹ ج ۲) قلت وفی صورة المسئولة تزوج بالمحرمة مع عدم العلم بالحرمة فھو فاسد بالاتفاق لا باطل وفی الدر ومبدأھا فی النکاح الفاسد بعد التفریق من القاضی او المتارکة ای اظھار العزم من الزوج علی ترك وطئھا بان یقول بلسانه ترکتك ونحوہ (کخلیت سبیلك او فارقتك) ومنه الطلاق او انکار النکاح لو بحضرتھا والا لا - لا مجرد العزم لو مدخولة والا فیکفی تفرق الابدان اھ قال الشامی قوله من الزوج قید به لان ظاھر کلامھم انھا لا تکون من المرأة قال فی البحر ورجحنا فی باب المھر انھا لا تکون من المرأة ایضاً ولذا ذکر مسکین من صورھا ان تقول فارقتك اھ ورجحه باتفاقھم علی ان لکل منھما فسخ ھذا النکاح والفسخ متارکة اھ (ص ۱۰۰۷ ج ۲) فی الدر المختار (و یجب مھر المثل فی نکاح فاسد بالوطء) فی القبل (لا بغیرہ ولم یزد) مھر المثل (علی المسمی) لرضاھا بالحط ولو کان دون المسمی لزم مھر المثل (ص ۵۷۵ ج ۲ شامی) - ۸ شعبان ۴۴ھ

نومسلمہ منکوحہ کافرے قبل از انقضاء عدت نکاح جائز نہیں ہے

سوال (۱۴) کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس صورت میں کہ ہندوستان میں موجودہ حالت میں اگر کوئی غیر مسلمہ مشرف باسلام ہو۔ اور حالت کفر میں منکوحہ بھی ہو۔ زوج اول اسلام سے انکاری بھی ہو۔ اس صورت میں نومسلمہ کا نکاح وقت اسلام سے کتنے دن بعد جائز ہے۔ اگر فقہ حنفیہ کے اس اصل کو مدنظر رکھا جاوے۔ کہ عورت مہاجرہ نہ ہو تو بعد گذرنے تین ماہ کے ابانت ہوتی ہے۔ زمانہ موجودہ میں اتنی مدت کا انتظار موجب ارتداد ظاہر ہوتا ہے، ضرورت وقت و اصل فقہ کے توافق کی صورت رقم فرما کر شکریہ کا استحقاق بخشیں؟

الجواب؛ جب تک اس نومسلمہ کو اسلام لانے کے بعد تین حیض نہ آجائیں اس وقت تک اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے جائز نہیں۔ اور جس عورت کے لئے اتنی مدت کا انتظار موجب ارتداد ہو اس کا اسلام ہی قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ اسلام یہ ہے کہ مسلمان ہونے والا حکم شرعی کا پابند ہو نہ یہ کہ وہ قانون شرعی کو اپنا پابند بنانا چاہے پس ایسے شخص کے مرتد ہونے سے کچھ رنج نہیں۔ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے پہلے ہی سے اسلام کو اسلام سمجھ کر قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ محض شہوت رانی کے لئے اس نے اسلام کا نام کیا ہے، واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ، ۲۰ محرم ۴۷ھ۔

نعم الجواب الذی لا یتجاوزہ الصواب، اشرف علی، ۲۳ محرم ۴۷ھ۔

دوران عدت نکاح کی خاص صورت کا حکم

سوال (۱۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں کہ زید نے مسماۃ ہندہ کو طلاق دیدی بعد از طلاق پانچ یوم بعد۔ قبل انقضائے عدت ہندہ نے عمرو سے نکاح کر لیا دس برس تک عمرو کے گھر میں اسی نکاح سے یعنی جو کہ قبل از انقضاء عدت ہوا تھا رہی، عمرو کو لوگ کہتے رہے کہ تو عدت گذار کر نکاح پھر کرلے عمرو نے دس برس بعد ایک روز بیٹھے بیٹھے نکاح پھر کر لیا اور اس نکاح ہونے کے بعد عمرو نے ہندہ کو طلاق ثلاثہ دیدی اب پھر ہندہ اور عمرو کا باہمی سلوک ہو گیا ہے اور پھر وہ باہمی نکاح کرنا چاہتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ عمرو نے جو نکاح دس برس بعد کیا تھا اس میں بھی طلاق کی عدت گذارنی چاہئے تھی بعدہٗ نکاح کرنا چاہئے تھا انہوں نے ایسا نہیں کیا لہٰذا بعد از طلاق بلا حلالہ نکاح عمرو کے ساتھ ہو سکتا ہے اب دریافت طلب صرف یہ امر ہے کہ ہندہ کا نکاح عمرو سے بلا حلالہ ہو سکتا ہے یا حلالہ کرنے کے بعد ہو سکتا ہے جواب با صواب دیں؟

الجواب؛ صورت مسئولہ میں دوبارہ جو نکاح کیا گیا وہ صحیح ہو گیا تھا اس لئے اس کے بعد تین طلاق دینے سے حرمت مغلظہ ہو گئی اب بدون حلالہ عمرو سے نکاح نہیں ہو سکتا جو لوگ

یہ کہتے ہیں کہ دس سال کے بعد جو نکاح کیا گیا اس میں بھی ۔۔۔ طلاق لازم تھی (یعنی عورت کو زوج ثانی کے جدا کردینے اور تفریق کے بعد عدت گذرنے پر نکاح کیا جاتا تب صحیح ہوسکتا تھا) ان کا یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ عدت کے اندر نکاح کرنے سے اس عدت میں اضافہ نہیں ہوتا وہ عدت تو وقت طلاق سے تین حیض آنے تک ختم ہوجاتی ہے البتہ بعض صورتوں میں خود اس نکاح فاسد کی وجہ سے دوسرے شخص کے لئے عدت واجب ہوتی ہے یعنی دوسرا کوئی شخص نکاح کرنا چاہے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ بدون تفریق اور تفریق کے بعد عدت گذرے بغیر نکاح کرے اور اگر خود وہی شخص نکاح کرے کہ جس نے عدت سابق میں نکاح کیا تھا تو اس کے لئے اس نکاح فاسد کی وجہ سے عدت واجب نہیں ہے۔

قال الشامی فلو کانت وطئت بعد حیضة من الاولی فعلیها حیضتان تکملة للاولی وتحتسب بهما من عدة الثانی فاذا حاضت واحدة بعد ذلک تمت الثانیة ایضا نهر وهذا اذا کان بعد التفریق بینها وبین الواطی الثانی اما اذا حاضت حیضة قبله فهی من عدة الاول خاصة وتمامه فی البحر عن الجوهرة (ص ۱۰۲ ج ۲) وفی الصفحة الآتیة واذا تمت عدة الاول حل للثانی ان یتزوجها لا لغیره مالم یتم عدة الثانی بثلاث حیض من التفریق وفیه ایضا (ص ۵۰۷ ج ۲) اما نکاح منکوحة الغیر ومعتدته فالدخول فیه لا یوجب العدة ان علم انها للغیر لانه لم یقل احد بجوازه فلم ینعقد اصلاً وبعد سطر وعلی هذا فیقید قول البحر هنا[عه] ونکاح المعتدة بما اذا لم یعلم بانها معتدة الخ

کتبہ الاحقر عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ، ۲۰ ر ۲ ج ۴۵ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔

دوران عدت نکاح کی خاص صورت کا حکم

سوال (۱۶) عرض ہے کہ ایک لڑکی کا نکاح گیارہ سال کی عمر میں نابالغی کی حالت میں ہوا اور رواجاً خاوند کے مکان پر بھیجی گئی بعد یک شب کے واپس بلالی گئی اور خاوند کے ساتھ تنہا رہنے کا اتفاق ہوا ممکن ہے کہ صحبت ہوئی ہو لیکن لڑکی نابالغ تھی پھر دوبارہ کبھی خاوند کے مکان پر نہیں گئی باہمی تکرار کی وجہ سے اور چار سال ماں باپ کے مکان پر ہی نکل گئے آئندہ اتفاق کی صورت نظر نہ آنے کی وجہ سے چار سال بعد جبکہ لڑکی بالغہ ہوچکی

عہ ای فی وجوب العدة ۱۲ منہ

جس کو چار سال ہوئے۔

(۳) سابق خاوند سے تو پوچھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن لڑکی خود خلوت اور صحبت دونوں کی مقر ہے لیکن اس کے گھر والے اس کے خلاف ہیں۔

(۴) دوسرے (یعنی موجودہ) خاوند سے صحبت کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا اور اب تک ہے۔

(۵) زوج سابق سے صحبت کا علم ہونے کے بعد صحبت کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ لڑکی بیان کرتی ہے کہ جب سے مجھے سابق خاوند نے تین طلاق دی ہیں اس کے بعد ایک حیض آیا اور پھر دوسرا نکاح ہونے کے بعد ایک حیض آیا اور اب ان دنوں میں تیسرا حیض جاری ہے۔

یہ بھی لڑکی سے کہا گیا کہ تو نے نکاح کے پہلے خلوت کا ذکر کیوں نہیں کیا تو لڑکی نے جواب دیا کہ مجھ سے کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

یہ بھی واضح ہے کہ دوسرا نکاح ہونے کے بعد پہلی ہی رات کو غالباً صحبت کے بعد اول خاوند سے صحبت ہونے کا علم ہوگیا اور اس دوسرے خاوند کو بھی نکاح ہونے میں شک رہا بلکہ بار بار یہ خیال اس کے دل میں آتا رہا کہ نکاح نہیں ہوا لیکن پھر بھی وہ اس وقت تک اس سے صحبت کرتا رہا اور پھر لڑکی سے بھی کہہ دیا کہ نکاح نہیں ہوا۔ البتہ دوسرے لوگوں اور اس کے والدین کو ابھی تک اس کا علم نہیں۔ اب شرعی حکم بتلایا جاوے کہ نکاح ہوا یا نہیں اگر نہیں ہوا تو اب پھر نکاح کرسکتا ہے یا نہیں۔ نیز جبکہ لڑکی کو طلاق کے بعد تیسرا حیض بھی شروع ہوگیا، اب اس حیض کے پورا ہونے کے بعد نکاح کرے یا کیا؟

(نوٹ) زوجین کو اس دیدہ دانستہ جسارت اور احکام شرعیہ کی مخالفت پر سخت تنبیہ کی گئی اور زوجین میں علیحدگی اور توبہ واستغفار کی تاکید کرکے سوال لکھ کر واپس کردیا کہ توبہ واستغفار کے بعد مکرر سوال کیا جاوے۔ پھر سوال مکرر آیا جس میں زوجین کا علیحدہ ہوجانا ظاہر کیا اس پر زوجین کو آئندہ کے لئے عاجزی کے ساتھ توبہ واستغفار کرتے رہنے کی ترغیب دی گئی اور مندرجہ ذیل جواب دیا گیا۔

الجواب: اب دوبارہ اس زوج ثانی سے نکاح ہوسکتا ہے تیسرے حیض ختم ہونے کے بعد زوج اول کی عدت طلاق گذر چکی ہے اور زوج ثانی سے نکاح ہوسکتا ہے البتہ اگر کوئی اور شخص اس زوج ثانی کے علاوہ اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو اس سے ابھی نکاح نہیں ہوسکتا بلکہ اس عورت کو زوج ثانی کے جدا کردینے کے بعد سے تین حیض آنا شرط ہے کما فی الشامی

تھی اور عمر بھی پندرہ سال ہو چکی تھی خاوند نے طلاق دیدی طلاق دینے کے بعد ایک ماہ چار دن کے لڑکی نے دوسرا نکاح کرلیا نکاح سے پہلے تحقیقات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ خاوند سابقہ کے یہاں جو شب کو رہی تھی خاوند سے علیحدہ رکھی گئی تھی اس پر علماء نے بلا عدت نکاح کا حکم دے دیا نکاح ثانی ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ خاوند سابقہ سے صحبت یا خلوت کا اتفاق رہا اب اس صورت میں جبکہ طلاق کے ایک ماہ اور چار دن بعد بلا عدت پورے کئے ناواقفی کی وجہ سے نکاح کرلیا یہ نکاح جائز ہوا یا نہیں اور اگر نکاح ناجائز ہوا تو عدت کب سے شمار کی جاوے۔ تاریخ طلاق سے جو کہ اگلے خاوند نے دی تھی یا جب سے صحبت کا ہوجانا اگلے خاوند سے معلوم ہوا تھا اس وقت سے کیونکہ طلاق سے ایک ماہ چار دن بعد تو نکاح ہوا اور نکاح ہونے کو پندرہ روز ہوئے کل ایک ماہ انیس دن ہو چکے ہیں یہ عدت میں شمار کئے جائیں گے یا کیا اور ایام عدت میں موجودہ خاوند سے عورت علیحدہ رہے یا کیا بعد طلاق لڑکی کو ایک مرتبہ حیض بھی بیس پچیس یوم کے بعد آیا فقط جواب سے جلد مطلع فرمایا جاوے؟

تنقیح:۔ اس سوال کے متعلق چند امور دریافت طلب ہیں ان کا جواب آنے کے بعد انشاء اللہ حکم شرعی لکھا جائے گا۔

(۱) دوسرے نکاح سے قبل خلوت وصحبت کی تحقیق کس کس سے کی گئی تھی؟

(۲) اور اب کون کون صحبت کو بیان کرتا ہے اگر پہلے اس لڑکی یا زوج نے انکار کیا تھا اور اب وہی اقرار کرتے ہیں تو انکار سابق کی وجہ کیا بیان کرتے ہیں؟

(۳) اگر لڑکی اور زوج سابق خلوت اور صحبت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ بھی لکھا جاوے کہ دوسرے گھر والے کیا کہتے ہیں؟

(۴) دوسرے خاوند سے اب تک صحبت یا خلوت ہوئی یا نہیں؟

(۵) اگر ہوئی تو زوج سابق سے صحبت کا علم ہونے کے قبل یا بعد؟

تمام واقعات اور بیانات مع اس سوال وتنقیح کے واپس کیا جاوے فقط۔ ۲۰ ربیع ۱ سنہ ۴۸ھ

جواب تنقیح: (۱) لڑکی کے والدین سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ سابق خاوند سے خلوت کا اتفاق ہی نہیں ہوا (۲) دوسرا نکاح ہونے کے بعد خود لڑکی نے دریافت کرنے پر اقرار کیا کہ سابق خاوند سے مجھے خلوت اور صحبت دونوں کا اتفاق ہوا یہ اتفاق سابق شادی کے دن صرف دو تین گھنٹہ کے لئے ہوا اس کے بعد میں پھر سابق خاوند سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا

تحت قول الدر (والمرئی) من الحیض (منهما) وهذا اذا کان بعد التفریق بینهما وبین الواطی الثانی اما اذا حاضت حیضة قبله فهی من عدة الاول خاصة وتمامه فی البحر من الجوهرة الی ان قال وفی البحر عن الخانیة واذا انقضت عدة الاول حل للثانی ان یتزوجها لا لغیره مالم تتم عدة الثانی بثلاث حیض من التفریق وهکذا فی العالمگیریة الا انه لم یذکر حکم الحیض قبل التفریق، واللہ اعلم بالصواب۔ احقر عبدالکریم عفا عنہ، ۱۶ ربیع ۲ سنہ ۴۸ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔

اقرار نامہ کے خلاف ورزی کی صورت میں بیوی کے نکاح ثانی کی ایک صورت

سوال (۱۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت اپنے خاوند سے ناراض ہوکر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد شوہر نے رضامندی کے ساتھ حسب ذیل اقرار نامہ تحریر کیا۔ اس میں مبلغ چھ روپیہ ماہوار دینے قرار پائے۔ جبکہ شوہر نے تقریباً آٹھ ماہ تک کچھ نہیں دیا تو زوجہ نے اس کے بعد اس اقرار نامہ کی رو سے اپنے آپ کو مطلقہ سمجھ کر شوہر مذکور کی زندگی میں دوسرا نکاح کرلیا اور کئی سال اس کے گھر میں رہی۔ مگر کسی نے زوج سے اس رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جو اس نے اپنے ذمہ مقرر کرلی تھی لہذا یہ عقد جائز ہوا یا نہیں۔

نقل اقرار نامہ

منکہ حفیظ ولد نبی بخش قوم شیخ ساکن گنگوہ مکتیسر کا ہوں۔ جو کہ نان نفقہ کے مبلغ چھ روپیہ ماہوار دینے قرار پائے اس کے ادا کرنے میں مجھ کو کسی وقت کوئی عذر نہ ہوگا اور مبلغ دو روپیہ ماہوار بچوں کے کپڑوں وغیرہ کے صرف کے واسطے میں نے مقرر کردئے ہیں۔ جو میں اس اقرار سے کسی قسم کا کوئی عذر کروں تو مع بی بی بچوں کے بالکل قطعی دست بردار ہوں گا۔ لہذا یہ چند کلمے بطریق اقرار نامہ کے لکھ دئے کہ سند ہوں اور بوقت ضرورت کام آویں فقط۔

تنقیح:۔ اقرار نامہ میں جو یہ لکھا ہے کہ "اس کے ادا کرنے میں مجھ کو کسی وقت کوئی عذر نہ ہوگا" اس کے متعلق وہاں کے سمجھدار محاورہ شناس لوگوں سے دریافت کرکے لکھا جاوے کہ وہاں کے لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ میں خود رقم مقررہ دیدیا کروں گا یا یہ مطلب ہے کہ جب مانگا کرے گی جب ادا کرنے میں عذر اور حیلہ بہانہ نہ کروں گا

جواب تنقیح:۔ اس عبارت کا محاورہ میں یہ مطلب ہوتا ہے کہ بلا مطالبہ رقم معینہ ماہوار

ادا کرتا رہوں گا۔

الجواب : اگر جواب تنقیح کے موافق اس عبارت کا یہی مطلب متعین ہو کہ بلا مطالبہ ادا کرتا رہوں گا اور وہاں کے لوگوں کو سنکر اس کے خلاف کا شبہ نہوتا ہو تو طلاق واقع ہوچکی ہے اور زوج ثانی کا نکاح صحیح ہوگیا بشرطیکہ عدت کے بعد ہوا ہو اور اگر اس عبارت میں یہ شبہ بھی ہوتا ہو کہ مطالبہ کرنے پر رقم معینہ ادا کروں گا تو طلاق واقع نہیں ہوئی اور نکاح باطل ہے کما ھو الظاہر لیکن بہر حال زوج ثانی پر مہر واجب ہے صحت نکاح کی صورت میں تو مہر مقررہ اور فساد نکاح کی صورت میں مہر مثل اور مہر مقررہ دونوں میں سے جو کم ہو وہ واجب ہے کیونکہ ہمبستری کے بعد نکاح فاسد میں بھی مہر واجب ہوتا ہے فی العالمگیریہ (ص ۲۲۶ ج ۲) وان کان قد دخل بہا فلہا الاقل مما سمی لہا ومن مہر مثلہا ان کان ثمہ الخ فقط واللہ اعلم۔ کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ۔ (بر ضمیمہ ص ۲۴)

فصل فی الاولیاء والاکفاء

نابالغہ کا نکاح چچا نے کردیا اور ماں ناراض ہو الخ

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ دختر زید نابالغہ کا اس کا برادر حقیقی عمرو بعد وفات زید بلا رضامندی زید جبراً نکاح اپنے فرزند سے کردے اس نیت سے کہ دختر مذکور کی والدہ یا اس کا ماموں کہ جو بعد وفات زید اس کے ہر طرح کے خرچ وغیرہا کا کفیل ہو رہا ہے کسی دوسری جگہ کردیوے درست ہے یا نہیں؟ دختر مذکور مع اپنی والدہ کے جو قصبہ چھپرولی ضلع میرٹھ اپنے ماموں کے یہاں رہتی ہے کسی تقریب میں قصبہ شاملی گئی ہوئی تھی واپسی میں جس وقت گاڑی کیرانہ کے قریب آئی تو عمرو مذکور مع چند مردمان لٹھ بند ہوکر آیا اور لڑکی کو بزور اتار کر اپنے مکان پر لے گیا اور اس کا نکاح اپنے لڑکے سے کرکے دختر مذکور کو چھپرولی اس کی والدہ کے پاس چھپرولی اس کے ماموں کے یہاں پہونچادیا یہ نکاح درست ہے یا نہیں۔

الجواب : صورت مذکورہ میں دختر زید نابالغہ کا ولی شرعاً اس کا برادر حقیقی عمرو ہے دختر مذکور کی ماں یا اس کا ماموں ولی نہیں ہے لہٰذا عمرو نے جو نکاح اس دختر کا اپنے بیٹے سے کردیا ہے وہ صحیح ہے بشرطیکہ نکاح خاندانی مہر پر ہوا ہو اور خاندانی مہر سے بہت زیادہ قلیل مہر پر نکاح نہ کیا ہو۔ قال فی الدر وان کان المزوج غیرہما ای غیر الاب وابیہ لا یصح

النکاح من غیر کفو او بغبن فاحش اصلاً وان کان بکفو وبمہر المثل صح ولکن لہما ای الصغیر والصغیرۃ خیار الفسخ بالبلوغ او العلم بالنکاح بعدہ ام ملخصا (ص ۵۰۰ و ۵۰۱ ج ۲ مصری) واللہ اعلم ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۴۰ھ

اگر ماں باپ کی رضامندی سے نکاح ہو تو لڑکی کو خیار بلوغ نہیں ہے

سوال (۲) اس مسئلہ میں علماء دین کیا فرماتے ہیں جبکہ ایک شخص نے اپنی نابالغ دختر کا نکاح ایک بالغ لڑکے سے کیا اور اس لڑکی کا والد ہمیشہ شراب پیتا تھا نیز اس نے قبل از نکاح شراب پی ہوئی تھی اور بیہوشی کی حالت میں تھا اس نے عین نکاح کے وقت بکواس شروع کردیا تو اس کے قریبی رشتہ داروں نے اس کو ایک مکان میں بند کردیا لڑکی کی والدہ اور دادی اس جگہ موجود تھیں ان کی بھی نا مرضی تھی مگر بعد کچھ جد وجہد کے مشورہ کرکے لڑکے کی طرف سے ایک اقرار نامہ سرکاری کاغذ پر لکھوایا گیا پیشتر نکاح پڑھنے کے کہ میں اپنی زوجہ کو اپنی تمام زندگی میں وداع کراکر اپنے گھر نہ لے جاؤں گا ہمیشہ اپنی بود وباش اپنے سسرال کے گھر رکھوں گا اور پانچسو روپیہ بابت مہر مؤجل عند الطلب ادا کردوں گا نیز اگر میں اپنے شہر سے باہر کسی اور شہر یا ملک میں برائے روزگار چلا جاؤں تو پانچ روپیہ ماہوار خرچ نان پارچہ ادا کرتا رہونگا بعد نشہ اترنے کے اس کاغذ اقرار نامہ سے لڑکی کے والد کی تسلی کردی گئی اور کاغذ دیدیا گیا یعنی لڑکی کے والد کو، اب اس نکاح کو عرصہ چھ سال کا گذر گیا اور لڑکی اب بالغ ہوگئی ہے اس عرصہ میں اس کا شوہر نہ اپنی زوجہ کو اپنے گھر لے گیا اور نہ بموجب اقرار نامہ اپنی سسرال میں آکر رہا اور نہ کوئی خرچ نان پارچہ ادا کیا اب لڑکی اپنے بالغ ہونے پر بموجب شرع محمدی بذریعہ فقہ امام صاحب اس نکاح کو فسخ کرکے اپنی مرضی سے اور کسی دوسرے شخص سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب : خیار بلوغ اس وقت ہوتا ہے جبکہ باپ اور دادا کے سوا کوئی اور ولی نکاح نابالغہ کا کرے اور صورت مذکورہ میں یہ نکاح باپ کی اجازت سے ہوا ہے کیونکہ وہ بعد نکاح کے اس پر راضی رہا اس لئے صورت موجودہ میں لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں واللہ اعلم۔ ۱۸ رجب سنہ ۴۰ھ

ولی اقرب کے ہوتے ہوئے اگر ولی ابعد نابالغہ کا نکاح پڑھادے اور ولی اقرب سکوت اختیار کرے تو کیا حکم ہے

سوال (۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل میں :
مسماۃ ہندہ یتیمہ نابالغہ کے دو حقیقی چچا عمرو وبکر اور ایک حقیقی چچازاد بھائی زید جو ہندہ کا بہنوئی بھی ہے موجود ہیں زید نے اپنی حقیقی چچیری بہن مسماۃ ہندہ کا اپنی ولایت سے خالد کے ساتھ نکاح پڑھا دیا چونکہ عمرو وبکر دونوں چچا اپنی پسند کردہ لڑکوں سے ہندہ کا

نکاح کرنا چاہتے تھے شریک مجلس نکاح نہ ہوئے نہ مجلس نکاح میں نکاح کے وقت خالد کے ساتھ نکاح پڑھانے سے انکار کیا اور نہ ان کے پاس جاکر ہندہ کے نکاح مذکورہ کی اجازت حاصل کی گئی لیکن اب کچھ عرصہ کے بعد یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہندہ کا نکاح ہی نہیں ہوا۔ مندرجہ ذیل سوالات کی ضرورت ہے۔

(۱) حقیقی چچا کی موجودگی میں حقیقی چچا زاد بھائی کی ولایت معتبر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) یہ نکاح جائز ہوا یا نہیں، جائز و ناجائز کی وجہ کیا ہے؟

(۳) کیا زید کا حقیقی بہنوئی اور حقیقی چچیرا بھائی ہونا ہندہ کے معاملہ نکاح میں اس کی ولایت کو چچاؤں کی ولایت پر ترجیح دیتا ہے؟

(۴) اگر نکاح جائز ہو گیا تو کیا اب حقیقی چچاؤں کے انکار سے وہ فسخ ہو گیا؟

استفسار از مجیب:- (۱) کیا اب بھی ہندہ نابالغ ہی ہے؟ (۲) جب اس نکاح کی خبر عمرو بکر کو پہنچی انہوں نے سکوت کیا یا کچھ کہا اگر کہا تو کیا کہا یا خبر پہنچنے کے وقت سکوت کیا اور پھر کچھ کہا؟

جواب از سائل:- (۱) ہندہ اب بھی نابالغ ہی ہے (۲) جب اس نکاح کی خبر عمرو بکر کو پہنچی تو انہوں نے سکوت کیا چنانچہ ہندہ نکاح کے بعد کچھ عرصہ اپنے خاوند کے مکان پر رہ بھی گئی ہے۔ اب اہل محلہ کے کہنے سننے سے عمرو بکر نے ایسا کہنا شروع کیا۔

الجواب: قال فی الخلاصۃ فی بیان ترتیب الاولیاء ثم العم لاب وام ثم لاب ثم بنوھم علیٰ ھذا الترتیب اھ ص۱۸ ج۲، وفی الدر فلو زوج الابعد حال قیام الاقرب توقف علیٰ اجازتہ. قال الشامی تقدم ان البالغۃ لو زوجت نفسھا غیر کفو فللولی الاعتراض ما لم یرض صریحا او دلالۃ کقبض المھر ونحوہ فلم یجعلوا سکوتہ اجازۃ والظاھر ان سکوتہ ھنا کذلک فلا یکون سکوتہ اجازۃ لنکاح الابعد وان کان حاضرا فی مجلس العقد ما لم یرض صریحا او دلالۃ تأمل اھ ص۵۱۶ ج۲۔ صورت مسئولہ میں حقیقی چچا کی موجودگی میں حقیقی چچا زاد بھائی ولی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ بہنوئی بھی ہو پس ہندہ کا نکاح چونکہ بلا اجازت ولی اقرب کے ہوا تھا وہ اولاً موقوف تھا اگر ولی اقرب اس کو جائز کر دیتا جائز ہو جاتا اور اس کا سکوت اجازت نہیں اب چونکہ ولی نے اس نکاح سے اپنی ناراضی ظاہر کر دی اور اس سے پہلے کوئی قول و فعل دال بر اجازت اس سے صادر نہیں ہوا بجز سکوت کے اس لئے ہندہ کا نکاح خالد سے باطل ہو گیا، واللہ اعلم۔

۸ رشعبان ۱۳۴۱ھ۔

احکام کفاءت اور اس بات کا بیان کہ نسب مرد میں معتبر ہے نہ کہ عورت میں

سوال: (۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ (۱) کفاءت نسب شرعاً کن کن امور میں قابل اعتبار ہے؟

(۲) ایک شخص زید نے ایک عورت نومسلمہ سے جس کا باپ مشرک ہے نکاح کیا اس کی اولاد ہوئی وہ اولاد اور ایک شخص والدین کی جانب سے صدیقی ہے ان میں کون از روئے نسب افضل ہے اور ایک شخص سید ہو کہ جس کی ماں نومسلمہ ہو تو اس کی لڑکی کا کفو عربی النسل غیر قریشی ہو سکتا ہے یا نہیں اور قریشی اس کا کفو ہے یا نہیں؟

(۳) جس جگہ عربی النسل غیر قریشی باعزت سمجھا جاتا ہے اس جگہ وہ شخص کہ جس کی ماں مشرکہ ہو بعد میں مسلمان ہو گئی اور باپ سید ہے باعزت از روئے نسب ہے یا نہیں؟

(۴) ایک شخص کہ جس کے والدین سید ہیں اور ایک شخص کہ باپ سید ہے وہ اس کا کفو ہو سکتا ہے یا نہیں معہ حوالہ کتب تحریر فرمایا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (۱) کفاءت نسب و اسلام و حریت و دیانت و مال و حرفت میں معتبر ہے۔

(۲) نسب کا اعتبار مرد سے ہوتا ہے نہ کہ عورت سے اگر عورت عجمی ہو اور باپ عربی ہو تو اولاد عربی صاحب نسب ہو گی اور کفاءت میں وہ ان لوگوں کے برابر ہے جن کے ماں باپ دونوں عربی النسل ہیں۔ قال العلامۃ عبد الحیؒ فی فتاواہ ناقلا عن شرح الغرر الولد یتبع الاب فی النسب لانہ للتعریف والام لا تشتھر اھ ونقل عن البحر حتی لو تزوج ھاشمی امۃ انسان فاتت بولد فھو ھاشمی تبعا لابیہ رقیق تبعا لامہ کما فی فتح القدیر. وعن حاشیۃ الدر للطحطاوی قولہ ولا فی نسب ای لا یتبع امہ فی نسب ھذا نص صریح فی ان ابن الشریفۃ لیس بشریف وان کان لہ شرف. حموی اھ ص ۳۹۳ ج۲۔ وعن رد المحتار لابن عابدین من کان امھا علویۃ وابوہ عجمی یکون العجمی کفوا لھا وان کان لھا شرف ما لان النسب للآباء ولذا اجاز دفع الزکوۃ الیھا فلا یعتبر التفاوت بینھما من جھۃ شرف الام ولم أر من صرح بھذا واللہ اعلم اھ ص۵۲۳ ج۲۔ وفیہ ایضاً الکفاءۃ معتبرۃ من جانبہ ای الرجل لان الشریفۃ تأبی ان تکون فراشا للدنی ولذا لا تعتبر من جانبھا لان الزوج مستفرش فلا تغیظہ دناءۃ الفراش وھذا عند الکل

فی الصحیح اھ ص ۵۲۰ ج ۲ ۔ پس جس صدیقی کی ماں نومسلمہ ہے وہ اس صدیقی کا کفو ہے جس کے ماں باپ دونوں صدیقی ہیں گو اس کو فی الجملہ ایک شرف حاصل ہے مگر کفارت میں اس کا اعتبار نہیں ۔ اور وہ سید جس کی ماں نومسلمہ ہے نسباً سید ہے اور اس کی اولاد بھی سید ہے لہذا اس کی بیٹی کا کفو عربی النسل غیر قریشی نہیں ہوسکتا ۔ ہاں قریشی اس کا کفو ہوسکتا ہے ۔

(۳) بعض مشائخ کے نزدیک حسیب معزز نسیب کا کفو ہے ۔ مگر یہ قول ضعیف ہے صحیح یہ ہے کہ حسیب نسیب کا کفو نہیں قالوا الحسیب کفؤ للنسیب حتی ان الفقیہ یکون کفواً للعلویۃ ذکرہ فی قاضی خان والعتابی فی جوامع الفقہ وفی الینابیع العالم کفو للعربیہ والعلویۃ والاصح انہ لا یکون کفوًا للعلویۃ کذا فی غایۃ السروجی اھ (ص ۱۵ ج ۲) عالمگیریہ ۔ پس وہ سیدہ جس کی ماں نومسلمہ ہے اس کا کفوٗ عربی النسل غیر قریشی نہیں ہے گو معزز کیسا ہی ہو ۔

(۴) ہاں کفوٗ ہے ۔ واللہ اعلم ، حررہ الاجوبۃ کلہا الاحقر ظفر احمد عفی عنہ بامر سیدہ حکیم الامۃ دام مجدہم ۔

۲۹ ، ذی القعدہ ۱۳۴۱ھ ۔

جس جگہ سیدہ کا نکاح غیر سید کے ساتھ عار سمجھا جاتا ہو وہاں سید اور غیر سید میں کفارت کا نہ ہونا

سوال (۵) جس ملک میں عورت سیدہ کے نکاح کرنے سے ساتھ غیر سید کے فتنہ ہوتا ہو کہ ناکح اور اس کے اخوان شہود وغیرہ کو قتل کیے بغیر نہیں چھوڑتے ایسے حالت ہے کہ تمام اقوام مسلمانان عورت سیدہ کو مثل ماں بہن پھوپھی وغیرہ محرمات ابدیہ کے خیال کرتے ہیں ابتداء پیدائش سے تاحال اس جگہ سیدہ کا نکاح کسی غیر شخص سے نہ کیا اور نہ کرنے کا آئندہ ارادہ ، ایسے حالت میں فقریش بعضہم اکفاء بعض پر عمل کرکے فتوی جواز نکاح سیدہ با غیر سید دیکر اس کو قتل کرایا جائے یا کہ بنا بر قول محمدؒ بعد عبارت مذکورہ الا ان یکون نسباً مشہوراً کاھل بیت الخلافۃ جس پر علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں حتی لا یکافؤا اھل بیت الخلافۃ غیرھم من القرشیین ھذا ان قصد بہ عدم المکافاۃ لا ان قصد بہ تسکین الفتنۃ اور ایک حدیث کی تحقیق کرکے فرماتے ہیں فیدور الحکم مع العرف حتی یکون الحائک کفواً للعطار بالاسکندریۃ لما ھناک من حسن اعتبارھا وعدم عدھا نقصاً غرض بنا پر عرف الناس کا فتنہ وا ثار فتنہ عدم جواز کا حکم ہوگا یا نہ ؟ اور پھر اسے باب الکفوٗ میں فرماتے ہیں وبالجملۃ فلا حدیث اصل فاذا ثبت فیمکن تفصیلھا بالنظر الی عرف الناس فیما یحقرونہ

ویعیرون بہ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں سیدہ کا نکاح ساتھ غیر سید کے نہ ہونا چاہیئے بینوا توجروا ۔

۲۰

الجواب ؛ قال فی الھدایۃ ولا یعتبر التفاضل فیما بین قریش لما رونیا وعن محمدؒ کذلک الا ان یکون نسباً مشھوراً کاھل بیت الخلافۃ کانہ قال تعظیماً للخلافۃ وتسکیناً للفتنۃ اھ قال فی العنایۃ یعنی قال محمد لا یعتبر التفاضل فیما بین قریش الا ان یکون النسب نسباً مشھوراً فی الحرمۃ کاھل بیت الخلافۃ فحینئذٍ یعتبر التفاضل حتی لو تزوجت قرشیۃ من اولاد الخلفاء قرشیاً لیس من اولادھم کان لاَولیاء حق الاعتراض قال المصنف کانہ یعنی محمداً قال ذٰلک تعظیما للخلافۃ وتسکیناً للفتنۃ لا لانعدام اصل الکفاءۃ اھ وفی فتح القدیر حکی قول الشافعی ان الھاشمی والمطلبی اکفاء دون غیرھم بالنسبۃ الیھم اھ (ص ۱۹ ج ۳) ۔ جس ملک میں سیدہ کا نکاح غیر سید قرشی سے کیا جانا موجب عار شدید ہو جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے وہاں قول محمدؒ کے موافق تسکین فتنہ کے لئے یہ فتوی دیدینا جائز ہے کہ قرشی غیر سید سیدہ کا کفو نہیں جس کی تائید امام شافعی کے قول سے بھی ہوتی ہے ، واللہ اعلم ۔ ۵ ، ذی الحجہ ۴۲ھ ۔

دھوکہ سے غیر کفوٗ میں نکاح کا حکم

سوال (۶) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید جس کا دماغ خراب تھا اور ایک عرصہ تک مجنونانہ حالت میں رہا تھا اور اس کے اقرباء نے ایک شخص مسمی بکر کو دھوکہ دیکر کہ اب اس کی حالت درست ہوگئی ہے زید کا نکاح ہمراہ دختر بکر کے پڑھوا دیا نکاح کے وقت لڑکی و لڑکا ہر دو بالغ تھے مجلس نکاح میں ایجاب وقبول زید کے ساتھ ہوا تھا مجلس نکاح میں جس وقت زید کو لایا گیا اس کے چہرہ سے آثار جنون ضرور نمایاں تھے لیکن زید کے اقرباء نے بکر کو لفظوں سے ایسا اطمینان کیا کہ اس نے یعنی بکر نے اپنی دختر کنواری ہندہ بالغہ کا نکاح اپنے ولایت سے پڑھوا دیا لیکن لڑکی سے ایجاب قبول نہیں کرایا اور نہ حسب رواج اس وقت ہندہ کو رخصت کرکے زید کے گھر بھیجا گیا یہ قرار پایا تھا کہ ایک ہفتہ میں انتظام کرکے رخصتی ہوجاوے گی لیکن زید نے ہفتہ بھی نہ ہونے دیا دو تین یوم بعد بلا اطلاع کسی طرف کو چلا گیا جس کو عرصہ تین سال سے زائد ہوگیا ہے مسماۃ ہندہ بدستور اپنے والدین کے گھر میں ہے اور تین سال سے زید کی اطلاع کبھی کہیں کبھی کہیں سے معلوم ہوجاتی ہے کہ فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے ایسی حالت میں یہ نکاح جو ایک دھوکہ دیکر کرایا گیا ہے

بروئے شریعت جائز ہے یا ناجائز رہا؟ جو کچھ الفاظ تحریر کئے گئے ہیں سر مُو فرق نہیں حلفیہ صدق
دل سے بلا رو رعایت بخوف خداوند عالم وحضور سرور کائنات تحریر کئے گئے ہیں۔

تنقیح:۔ (۱) لڑکی سے جو ایجاب قبول نکرانا لکھا ہے اس کا کیا مطلب ہے آیا زبان سے
نہیں کہلایا یا اذن بھی نہیں لیا اگر اذن لیا گیا تو وہ خاموش ہوئی یا کچھ کہا اور اگر نکاح کے وقت
اذن نہیں لیا تو بعد نکاح کے جب اس کو اطلاع ہوئی تو کیا کہا اور اطلاع کس کے ذریعہ سے ہوئی؟

(۲) ایسا ہی سوال شاکر الدین صاحب محلہ انصاریاں نے بھیجا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ اب وہ
مجنونانہ حالت میں کبھی کہیں کبھی کہیں دیکھا جاتا ہے اس میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا اگر یہ صحیح
ہے تو اس حالت کو بیان کرنے والے عادل ہیں یا نہیں؟

(۳) نیز یہ بھی لکھا جائے کہ زید کا جنون مطبق ہے جو سال بھر یا سال کے اکثر حصہ میں رہتا تھا
یا غیر مطبق ہے جو سال کے کم حصہ میں رہتا تھا اور زیادہ حصہ سال کا افاقہ میں گذرتا تھا ان سوالات
کا جواب دیا جائے اور جواب کے ساتھ یہ پرچہ ضرور واپس کیا جائے پہلے پرچہ کے واپس نکرنے کی
وجہ سے دوبارہ تنقیح کی ضرورت ہوگی۔

جواب تنقیحات:۔ (۱) یہ کہ لڑکی سے نہ اذن لیا گیا نہ ایجاب قبول کرایا گیا بلکہ اس
کی بلا رضا والدین نے اس کا نکاح بزعم ولایت پڑھوا دیا بعد نکاح جب اس کو اطلاع نکاح کی ہوئی
تو اوس نے ناراضی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ میرے باپ نے مجھکو کیوں ڈبو دیا لیکن شرم ولحاظ کی وجہ
سے والدین کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکتی۔

(۲) سوال شاکر الدین اسی کے متعلق تھا زید کی مجنونانہ حالت کی خبر اکثر بذریعہ مسلمان ومعتبر
اشخاص سے معلوم ہوئی ہے جس کو جھوٹ باور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

(۳) زید کا جنون مطبق ہے سال کا زیادہ حصہ جنون میں گذرتا ہے اور تھوڑا حصہ سکون میں اور
جنون کی یہ حالت ہے کہ یا تو ہر وقت بولتا رہتا ہے یا ایسا خاموش ہوجاتا ہے کہ ہفتوں بالکل چپ رہتا
ہے لہذا التماس ہے کہ جواب باصواب سے مطلع فرمایا جائے؟

الجواب، واللہ الموفق بالصواب۔ صورت مسئولہ میں ہندہ کا نکاح زید کے ساتھ بوجہ
عدم کفارت کے اور اولیاء زید کے دھوکہ دینے کے صحیح نہیں ہوا قال فی الدر ولکن فی النہر
عن المرغینانی المجنون لیس بکفوٴ للعاقلة اھ قال الشامی نقلا عن النہر
لانہ یفوت مقاصد النکاح فکان اشد من الفقر ودناءة الحرفة وینبغی اعتمادہ

لان الناس یعیرون بتزویج المجنون اکثر من ذی الحرفة الدنیئة اھ (ص۵۳ ج۲)
وفیہ ایضا الکفاءة معتبرة فی ابتداء النکاح للزومہ او لصحتہ من جانبہ ای
الرجل لان الشریفة تأبی ان تکون فراشا للدنی اھ قال الشامی معناہ معتبرة فی
اللزوم علی الاولیاء حتی ان عند عدمہا جاز للولی الفسخ اھ فتح وھذا بناء
علی ظاہر الروایة من ان العقد صحیح وللولی الاعتراض اما علی روایة الحسن
المختارة للفتوی من انہ لا یصح معتبرة فی الصحة وکذا لو کانت الزوجة
صغیرة والعاقد غیر الاب والجد فقد مر ان العقد لا یصح اھ (ص۵۱۹ ج۲)
وفی الدر ایضا ویفتی فی غیر الکفوٴ بعدم جوازہ اصلا وھو المختار للفتوی لفساد
الزمان فلا تحل مطلقة ثلاثا نکحت غیر کفوٴ بلا رضی ولی بعد معرفتہ ایاہ
فلیحفظ اھ قال الشامی قال شمس الائمة وھذا اقرب الی الاحتیاط
کذا فی تصحیح العلامة قاسم لانہ لیس کل ولی یحسن المرافعة والخصومة
ولا کل قاض یعدل ولو احسن الولی وعدل القاضی فقد یترک انفة للتردد
علی ابواب الحکام واستثقالا لنفس الخصومات فیتقرر الضرر فکان منعہ
دفعا لہ فتح قال وقولہ نکحت نعت لمطلقة وقولہ بلا رضی متعلق بنکحت
وقولہ بعد ظرف للرضی والضمیر فی معرفتہ للولی وفی ایاہ لغیر الکفوٴ وقولہ
بلا رضی نفی منصب علی المقید الذی ہو رضی الولی والقید الذی ہو بعد
معرفتہ ایاہ۔ فیصدق بنفی الرضی بعد المعرفة وبعدمہما وبوجود الرضی مع
عدم المعرفة ففی ہذہ الصور الثلاثة لا تحل وانما تحل فی الصورة
الرابعة وہی رضی الولی بغیر الکفوٴ مع علمہ بانہ کذلک اھ (ص۴۸۷ ج۲)
قلت والمسئلة وان کانت مفروضة فیما اذا نکحت المرأة عاقدة بنفسہا
ولکن لا فرق بین مباشرة الولی العقد وکونہ عاقدا وبین مباشرة
المرأة برضی الولی وکونہا عاقدة فکما لم یصح النکاح فی الثانی بدون
معرفة الولی بالکفاءة فکذا اذا باشر الولی بنفسہ العقد ولم یعلم
بہا ودعوی الفرق بینہما لا یتأتی الا بالفارق المعتبر فان الولی فی نکاح
البالغة لیس الا سفیرا محضا وانما یشترط وجودہ حال عدم الکفاءة

لحصول اذنه ورضاه نقط ومباشرته العقد ومباشرة المرأة له برضاه فی ذلك سواء فکان حکمهما واحدًا انما ذکر فی بعض العبارات الفقهیة ان الولی لو زوجها برضاها ولم یعلم بعدم الکفاءة ثم علم لاخیار لأحد الا اذا شرط الکفاءة او اخبروا بها وقت العقد فتزوجها علی ذلك ثم ظهر انه غیر کفوء کان له الخیار ولوالجیة المشعر بصحة النکاح وثبوت الخیار للولی مبنی علی ظاهر الروایة دون روایة الحسن المختارة للفتوی۔

خلاصہ یہ ہے کہ درمختار میں جو بالغہ مطلقہ ثلثہ کے نکاح کو غیر کفو کے ساتھ بلا رضائے ولی کے ناجائز کہا ہے شامی نے اس کی چار صورتیں کی ہیں (۱) ولی کو اس شخص کا غیر کفو ہونا معلوم ہوا اور ولی راضی نہو (۲) ولی راضی بھی نہیں اور اس کو عدم کفارت کا علم بھی نہیں (۳) ولی راضی ہے مگر عدم کفائت کا اس کو علم نہیں۔ ان تین صورتوں میں روایت حسن پر نکاح صحیح نہیں ہوتا صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ ولی کو عدم کفائت کا علم ہو اور اس پر وہ راضی ہو، میں کہتا ہوں کہ عورت کا خود بذاتہا نکاح کرنا اور ولی کا عدم کا کفائت ناواقف ہو کر اس عقد پر راضی ہونا اور ولی کا عاقد نکاح ہونا اور عدم کفارت سے ناواقف ہو کر راضی ہونا ان دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے جب کفارت میں دھوکہ دیا جائے گا تو جو حکم خود عورت کے نکاح کرنے کا ہے وہی حکم ولی کے نکاح کرنے کا ہونا چاہئے اور جیسا کہ شق اول میں رضا ولی مع عدم معرفتہ بالکفارت صحت نکاح کو کافی نہیں ایسا ہی ولی کے عاقد ہونے میں بھی اس کی رضا مع عدم المعرفۃ کافی نہیں۔

وایضًا فان المرأة فی صورة السوال بالغةٌ ولیس للولی ولایة الاجبار علیها بل یجب لصحة النکاح اذنها صراحةً فی غیر الکفوء ویکفی سکوتها رضًا فی الکفوء وههنا لم یوجد منها ما یدل علی رضاها واذنها بل اظهرت عدم الرضا لما بلغها الخبر فلم یصح النکاح لهذا الوجه ایضًا قال فی الدر ولا تجبر البالغة البکر علی النکاح فان استأذنها هو ای الولی وهو السنة او وکیله او رسوله او زوجها ولیها واخبرها رسولها او فضولی عدل فسکتت او ضحکت غیر مستهزئة او بکت بلا صوت فلو بصوت لم یکن اذنا فهو اذن اھ قال الشامی واختلف فیما اذا زوجها غیر کفوء فبلغها فسکتت فقالا لا یکون رضا وقیل فی قول ابی حنیفة یکون رضًا ان کان المزوج ابا او جدا وان کان غیرهما فلا کما فی الخانیة اخذًا من

مسألة الصغیرة المزوجة من غیر کفوء اھ قال فی النهر وجزم فی الهدایة بالاول بلفظ قالوا اھ (ص ۴۷۹ ج ۲) قلت وظاهره کون المسئلة اتفاقیة ومن ذکر فیه خلاف ابی حنیفة لیس عنده روایة عنه وانما اخذه من مسئلة الصغیرة ولذا ذکره الشامی بلفظ قیل الدال علی تضعیفه واللہ اعلم۔

پس ہندہ صورت مسئولہ میں بدون طلاق و عدت کے کسی اپنے ہم کفو سے دوسرا نکاح کر سکتی ہے کیونکہ زید سے اس کا نکاح صحیح ہی نہیں ہوا اس لئے کہ ولی کو خود کفارت کا یعنی زید کے عاقل ہونے کا علم نہ تھا اور اس کو دھوکہ دیا گیا اور لڑکی نے بھی یعنی ہندہ نے خبر نکاح سنکر صراحۃً اجازت نہیں دی حالانکہ اس صورت میں صریح اذن کی ضرورت تھی محض سکوت کافی نہ تھا، واللہ اعلم۔

۶ صفر ۴۵ھ۔

مسلمان کنندہ کے ولایت سے نابالغہ نومسلمہ کے نکاح کا حکم

سوال (۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ:۔

مسماۃ عیدیا جس کی عمر اس وقت میں ۱۱ سال کی ہے چمار کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں مسماۃ جھنکویا نے بلا معاوضہ مسماۃ نصیبا کو (جو پیشتر قوم کی ڈھمیر تھی اور قریب ۱۵ سال ہوئے کہ مسلمان ہو گئی تھی) جبکہ مسماۃ عیدیا ۴ ماہ کی تھی نصیبا کو دے دیا مسماۃ نصیبا نے ۴ ماہ کی عمر مسماۃ عیدیا لڑکی کو مسلمان کرایا اب مسماۃ عیدیا ۱۱ سال کی ہے ۹ سال کی عمر میں نکاح برضامندی اپنے شوہر مسمی کریم کی اجازت سے زید کے نکاح میں دے دی گئی تو ایسی حالت میں نکاح جائز ہے یا نہیں یا پھر دوبارہ مسلمان ہو کر نکاح ہونا چاہئے؟ بینوا توجروا۔

تنقیح:۔ (۱) یہ نکاح مسماۃ عیدیا کے مسلمان ہونے کے بعد ہوا یا مسلمان ہونے سے پہلے؟

(۲) اس وقت مسماۃ عیدیا بالغ تھی یا نابالغ؟ کیونکہ بعض لڑکیاں نو سال کی عمر میں بھی بالغ ہو جاتی ہیں جس کی علامت حیض کا آنا ہے۔

(۳) اگر مسماۃ عیدیا نکاح کے وقت بالغ تھی تو اس نے اپنی زبان سے نکاح کی اجازت دی تھی یا نہیں؟ ان تنقیحات کے جواب کے بعد حکم نکاح بتلایا جائے گا اور طلاق کا حکم بھی صحت نکاح پر موقوف ہے اس کا حکم بھی بعد جواب تنقیحات بتلایا جائے گا جواب کے ساتھ یہ دونوں پرچے بھی بجنسہٖ واپس ہوں فقط۔

۳۰ محرم ۴۵ھ۔

جواب تنقیحات: (۱) مسماۃ عیدیا ۴ ماہ کی عمر میں مسلمان ہوئی تھی۔ اور اسی مسلمانی کی حالت میں جب عمر ۹ سال ہوئی تو نکاح کیا گیا۔

(۲) مسماۃ عیدیا اُس وقت میں نابالغ تھی۔ کوئی علامت سنِ بلوغ کی نہیں تھی (یعنی نکاح کے وقت وہ بالغ نہ تھی۔

(۳) مسماۃ عیدیا اس وقت میں یعنی نکاح کے وقت نابالغ تھی۔ اگر بالغ ہوتی تو اجازت دیتی۔ نابالغی کی صورت میں تعلقات زوجین اور زناشوئی کے معاملات سے قطعاً ناواقف تھی۔ اجازت دینا کیا۔

الجواب! مسماۃ عیدیا کا نکاح جو بحالت نابالغی مسمیٰ زید سے ہوا تھا وہ نکاح شرعاً درست نہیں ہوا کیونکہ اس وقت مسماۃ عیدیا نابالغ تھی اور مسماۃ نصیبا یا اس کا شوہر کریم بخش شرعاً اُس کے ولی نہیں تھے تو یہ نکاح صغیرہ بدون ولی ہوا۔ اور نکاح صغیرہ بدون ولی کے باطل ہے لہٰذا یہ نکاح باطل ہوا اور جب تک مسماۃ عیدیا بالغ نہو جائے اُس وقت تک اُس کا نکاح کسی کی ولایت سے نہیں ہو سکتا الا بولایۃ القاضی والی ھو فی بلادنا قال فی الدر د لا ینعقد للملتقط علیہ نکاح وبیع وکذا الاجارۃ فی الاصح لان الولایۃ علیہ فی مالہ ونفسہ للسلطان لحدیث "السلطان ولی من لا ولی لہ" اھ قال الشامی قولہ ولا ینفذ علیہ نکاح لانہ یعتمد الولایۃ من القرابۃ والملک والسلطنۃ ولا وجود لواحد منھا نھ (ص ۹۰، ج ۳) بعد بلوغ کے مسماۃ عیدیا کی صریح رضا و صریح اجازت سے اس کا نکاح دوبارہ کیا جائے خواہ مسمیٰ زید ہی سے یا جس کے ساتھ مسماۃ مذکورہ راضی ہو اور بلوغ کے بعد بھی اس کا سکوت قبل نکاح اذن نہ ہوگا، واللہ اعلم۔ ۷ صفر ۴۵ھ۔

چودہ سال کی عمر میں لڑکی کا دعویٰ بلوغ اور باپ کا غیر کفو میں بلا اجازت اس کے نکاح کی ایک صورت کا حکم

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کے فریب میں آکر اپنی لڑکی ہندہ (چہار[۱۴] سالہ) کا نکاح بکر کے لڑکے عمر کے ساتھ ہونا منظور کیا اور بکر نے فوراً اپنے ہی مکان پر زید کی موجودگی میں نکاح براہ چالاکی کر دیا۔ زید کی لڑکی کو قطعی خبر نہیں وہ اپنے میکہ میں یعنی دوسرے گاؤں میں تھی ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ کا دن گذر شب میں یہ واقعہ ہوا ۱۲ کی صبح کو جب زید اپنے مکان پر واپس گیا تو لڑکی کو اس نکاح سے منکر اور غیر رضامند پایا اور اپنے جملہ اہل قرابت کے سامنے ہدف ملامت ہوا کیونکہ بوجوہات مختلف یہ نکاح ناموزوں اور زید کو دھوکہ میں لا کر ہوا تھا زید

الگ پشیمان ہندہ علیحدہ نالاں اس سال میں ۱۲ تاریخ کا دن گذر گیا ۱۳ تاریخ کو بکر کے گاؤں کا ایک شخص مل گیا جس سے بکر کے پاس زید کی جانب پر یہ پیام بھیجا گیا کہ ہندہ کو اس نکاح سے جس میں اس کے باپ زید کو مغالطہ دیکر رضا حاصل کی گئی سخت اختلاف اور قطعی انکار ہے اور وہ اس غم میں بیہوش ہے لہٰذا بکر اس نکاح کو فسخ و باطل منصور کر کے زید اور ہندہ کی جان چھوڑ دے کوئی فتنہ قایم نہ کرے بکر اور اس کا لڑکا اس نکاح کو جائز اور واثق ہونے کے بیان کے ساتھ مصر ہے کہ ہندہ کی شادی اب دوسری نہیں ہو سکتی ازدواج مکر شرعاً اور قانوناً نادرست ہے۔ ہندہ نے نکاح کی خبر پانے کے چودھویں یا پندرھویں روز اپنی جانب سے ایک نوٹس بنام بکر و ابن بکر بذریعہ ڈاک بھیجا کہ باپ ہمارا کم عقل ہے، تم لوگوں کے فریب میں آگیا میں شرعاً بالغہ ہوں (لڑکی کی عمر نکاح کے روز تک پورے ۱۴ سال کی تھی) اس لئے بذریعہ نوٹس ہٰذا نکاح کی منظوری سے قطعی انکار کرتی ہوں آئندہ اس کا خیال ہرگز نہ کیا جائے پس بلحاظ حالات مذکورہ نکاح مذکورہ جائز ہے یا ناجائز اور ہندہ اپنا نکاح اپنی رضا سے کسی دوسرے شخص سے شرعاً کر سکتی ہے یا نہیں؟ بیّنوا توجروا۔

تنقیح:- ہندہ کی عمر جب نکاح کے وقت پوری چودہ[۱۴] سال کی تھی اور اس حالت میں وہ دعویٰ بلوغ کا کرتی تھی تو اس سے دریافت کیا جائے کہ اُس وقت اُس میں کونسی علامت بلوغ کی پائی گئی تھی اور یہ سوال اس طرح کیا جائے کہ کوئی عورت اُس کو جواب سمجھانے نہ پائے۔

(۲) کیا ہندہ نے اس نکاح کی خبر سنکر اسی مجلس میں نکاح سے انکار کیا جس مجلس میں اس کو خبر پہونچی تھی یا اُس مجلس میں سکوت کیا اور دوسری مجلس میں انکار کیا صاف لکھا جائے۔

(۳) بکر نے زید کو کیا فریب دیا اس فریب کی تشریح کی جائے اور زید بکر کے فریب میں کیوں آیا اس کو بھی واضح کیا جائے اس کے بعد جواب دیا جائے گا یہ پرچہ بھی جواب تنقیح کے ساتھ واپس ہو فقط۔ ۲۸ ربیع الاول ۴۵ھ۔

جواب تنقیح:- عرض یہ ہے کہ لڑکی کے باپ نے کنبہ کی دو خاص عورتوں کو لڑکی کے پاس بھیجکر دریافت کیا کہ نکاح کے روز تک کن علامات کی بنا پر اس نے اپنے کو بالغ سمجھا لڑکی نے جواب دیا کہ جو علامات بلوغ دنیا میں مسلّمہ ہیں مجھ میں موجود تھیں چونکہ باپ بھی قریب سامنے موجود تھا لڑکی نے کہا کہ آپ کیوں نہیں لکھ دیتے کہ (لڑکی بلاشبہ بظہور علامات بلوغ بالغہ تھی) اس سے زیادہ کن لفظوں میں میں کہوں۔ کیا شرم و حیا کوئی چیز نہیں۔ عورتوں نے باپ کی ملامت کی اور کہا کہ بات تو صاف ہو گئی اب کیا صراحت چاہتے ہو وہ خاموش ہو گیا۔

(۲) نکاح کی خبر اندازاً آدھی رات کے وقت جب لڑکی کو ملی تو اس نے اظہار نفرت اور الفاظ انکار رونے اور بین کے ساتھ ظاہر کئے اور فرط غم میں بیہوش ہو گئی لڑکی کی ماں لڑکی کی ہمخیال اور گھر میں شریک حال تھی اس بنا پر اسی مجلس میں انکار سمجھنا چاہیئے۔

(۳) بکر نے زید کو یہ فریب دیا کہ کفو اور طبقہ بندی اور رسم ورواج کے لحاظ سے وہ زید کے خاندان میں نہ کبھی شادی کر سکا تھا نہ بحالت اعلان شادی اب بھی ممکن تھی زید کے کنبہ کے لوگ بکر کے خاندانی حالت کو مختلف اعتبارات سے بہتر نہیں سمجھتے علاوہ ازیں بکر از قوم ملک وزید از قوم شیخ فاروقی ہے دونوں میں باعتبار مختلف فرق امتیازی ہے بکر نے زید کو فریب اور مغالطہ دیکر یوں ہاں کہلوا لیا اگر یہ طریقہ مغالطہ آمیز بکر نہ اختیار کرتا تو بالاعلان مناکحت ناممکن تھی اور زید کے بھائی بند اہل کنبہ وزید کی بیوی ولڑکی کبھی اس عقد ناموزوں کو نہ گوارا کرتے نہ کیا۔ زید بکر کے فریب میں یوں آیا کہ اس کے دروازہ پر لڑکا پڑھانے کے سلسلہ میں مقیم تھا اور بوجہ غربت یہ کام اختیار کیا تھا اور چونکہ قدرۃً و خلقۃً زید نہایت کم عقل اور سادہ لوح ہے اس وجہ سے فریب میں آگیا۔ تنقیحوں کے جوابات بالتفصیل لکھ دیئے گئے اب جواب باصواب سے ممنون فرمایا جائے فقط والسلام۔

الجواب؛ قال فی الدر: وادنی مدۃ له اثنتا عشرۃ سنة ولها تسع سنين هو المختار كما هو فی احکام الصغار فان راهقا بان بلغا هذا السن فقالا بلغنا صدقا ان لم يكذبهما الظاهر كذا قيده فی العمادية وغيرها فبعد ثنتی عشرۃ سنة يشترط شرط اخر لصحة اقراره بالبلوغ وهو ان يكون بحال يحتلم مثله والا لا يقبل قوله شرح وهبانية وهما حينئذٍ كبالغ حكما فلا يقبل جحوده البلوغ بعد اقراره وفی الشرنبلالية يقبل قول المراهقين قد بلغنا مع تفسير كل بما اذا بلغ بلا يمين اھ قال الشامی وفی الشرنبلالية وعبارتها يعنی وقد فسرا ما به علما بلوغهما وليس عليهما يمين اھ قال ابو السعود والظاهر ان هذا هو المراد مما نقله الحموی عن شرح درر البحار من انه يشترط لقبول قولهما ان يبينا كيفية المراهقة حين السوال عنه اھ (ص ۱۴۸ ج ۵) وفی تنقيح الحامدية قال شيخ الاسلام وهذا من باب الاحتياط (ای مطالبة التفسير عنهما) وانما يقبل قوله بغير هذا التفسير وكذا الجارية اذا اقرت بالحيض اقول المشهور فی كتب المذهب صحة الاقرار بالبلوغ من الغلام بعد اثنتی عشرۃ

سنةً ومن الجارية بعد تسع سنين وقول شيخ الاسلام ان هذا الاستفسار من باب الاحتياط يفيد انه فعله القاضی فهو الاولی ثم قال بعد ذكر عبارة الحموی عن درر البحار وفی المنح عن الخانية صبی اقر انه بالغ وقاسم وصی المنية قال ابن الفضل ان كان مراهقاً ويحتلم مثله يقبل قوله وان كان مراهقاً ويعلم ان مثله لا يحتلم لا تجوز قسمته ولا يقبل قوله لانه يكذب ظاهراً وتبين بهذا ان بعد اثنی عشرۃ سنةً اذا كان بحال لا يحتلم مثله اذا اقر بالبلوغ لا يقبل اھ (ص ۱۵۰ ج ۲) قلت واطلاق المتون يدل علی قبول قول المراهقين بدون التفسير اذا كانوا بحال يحتلم او تحيض مثلهم فليعول عليه۔

صورت مسئولہ میں اگر یہ لڑکی جسم اور اٹھان میں ایسی ہو کہ عادۃً ایسی لڑکی کو حیض آسکتا ہو اُس کا دعویٰ بلوغ قبول کیا جائے گا اور جب وہ ایسی ہو تو اس کا نکاح مذکور کو سنتے ہی رد کرنا اس نکاح کے لئے مبطل ہوگا اور اگر وہ اٹھان میں ایسی نہ ہو کہ اُسے حیض آسکے تو سوال دوبارہ کیا جاوے فقط۔ ۳۰ ربیع الثانی ۴۵ھ۔

حکم تولیت نکاح یتیمہ

سوال (۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسمیٰ زید فوت ہوگیا اس نے ایک بنت صغیرہ مسماۃ کریمہ زوجہ مسماۃ ہندہ اور ام مسمات زینب چھوڑی اور اپنے حیات میں ایک ذی علم متدین شخص وصی مقرر کیا اور صغیرہ مسماۃ کریمہ کی تزویج کو بھی اپنے وصی کے حوالے کیا اب سوء اتفاق سے زندگی زوجہ ہندہ کو ایک شخص مفلس قلاش بغرض طمع اس کے جائداد کے بدراہ کرکے اس کو اس پر آمادہ کیا ہے کہ اپنا نکاح اس سے اور صغیرہ کریمہ کا نکاح اس کے بیٹے سے کردے لیکن صغیرہ کریمہ کی جدہ صحیحہ مسماۃ زینب کو اس امر سے سخت صدمہ اور الم اور اضطراب ہوتا ہے اور صغیرہ کو بھی تمام ضرر اور نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے پس اس صورت میں جب وصی کو ولایت نکاح نہیں اور متون عند عدم العصبات اُم کو اُم الاب پر مقدم لکھتے ہیں لیکن صاحب درالمختار نے ولی کی تعریف میں مالم یکن متهتکا کا قید بھی لگایا ہے اور مسماۃ ہندہ بلاشک فاسقہ متہتکہ ہے پس اگر مصلحت وضرورۃ وتحصناً من الضرر التام للیتیمہ جدہ صحیحہ مسماۃ زینب یتیمہ کریمہ کا نکاح کسی اہل علم متدین مالدار سے کردے تو نکاح صحیح ہوگیا یا نہیں؟ بینوا توجروا مہربانی فرماکر جواب شافی مدلل عنایت فرمادیں جو مسئلہ واقعی اور ضروری ہے

الجواب: قال فی الدر فان لم یکن عصبة فالولایة للأمّ ثم لأمّ الاب وفی القنیة عکسه اھ قال الشامی ای حیث قال فیہا ام الاب اولیٰ فی التزویج من الأمّ قال فی النہر وحکی عن خواہر زادہ وعمر النسفی تقدیم الاخت علی الام لانہا من قوم الاب ای فیکون من اعتبر ترجیح قوم الاب یرجح الجدۃ للاب والاخت علی الام لکن المتون علی ذکر الام عقب العصبات اھ (ص ۵۱۲ ج ۲)

قال فی الدر ابأ اوجدٌ المعروف منہما سوء الاختیار مجانة وفسقا وان عرف لم یصح النکاح اتفاقاً اھ قال الشامی: والحاصل ان المانع ھو کون الاب مشہوراً بسوء الاختیار قبل العقد فاذا لم یکن مشہوراً بذلک ثم زوج بنته من فاسق صح وان تحقق بذلک انه سیئ الاختیار واشتہر به عند الناس فان زوج بنتا اخری من فاسق لم یصح العقد الثانی لانه کان مشہوراً بسوء الاختیار قبله بخلاف العقد الاول لعدم وجود المانع قبله اھ (ص ۴۹۹ ج ۲) قلت فعلی ھذا لا یمکن سلب الولایة عن الام بمجرد تہتکہا نعم لو افتی مفتٍ فی مثل تلک الحالة بتقدیم ام الاب علی الام فلا انتاء بذلک مجال لذھاب بعض المشائخ الی تقدیم قوم الاب علی الام فلینظر، واللہ اعلم۔

صورت مسئولہ میں اگر جدۂ صحیحہ یتیمہ مذکورہ کا نکاح بدون اجازت اُم کردے اور اس کے مصالح دینیہ ودنیویہ کی پوری طرح رعایت کرے تو جدہ صحیحہ کا کیا ہوا نکاح صحیح ہوگا اور اگر بحالت عدم بلوغ نکاح کیا جائے تو لحاظ کفو اور مہر مثل ضروری ہے غیر کفو میں یا مہر مثل سے کم میں نکاح نہ کیا جاوے واللہ اعلم۔

۲۶ جمادی الاولیٰ ۴۳ھ۔

گونگے نے اشارہ سے اذن دیکر نابالغ لڑکی کی شادی کرادی تو نکاح صحیح ولازم ہو جائے گا بعد بلوغ فسخ نہیں کر سکتی

سوال (۱۰) گونگے نے اپنی نابالغ لڑکی کا اشارہ سے اذن دیکر شادی کرادی بعد بلوغ لڑکی اس نکاح کو فسخ کرا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر وہ اشارہ ولایت میں کافی تھا تو وہ نکاح لازم ہو گیا

فی الاشباہ والنظائر (ص ۲۶۲) الاشارۃ من الاخرس معتبرۃ قائمة مقام

العبارۃ فی کل شیئ الیٰ ان قال الافی الحدود الخ وفیه ایضاً ولابد فی اشارۃ الاخرس ان تکون معھودۃ والا لا تعتبر فقط۔ کتبه الاحقر عبد الکریم عفی عنه۔

صورت ولایت نکاح وجائداد نابالغان

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ محمودہ نے انتقال کیا اور حمیدہ، سعیدہ اور صالحہ تین لڑکیاں نابالغان اور مسماۃ واحدہ ماں اور زید باپ کو وارث شرعی چھوڑا۔ حمیدہ، سعیدہ اور صالحہ نابالغان کے نکاح کے ولی ان کے حقیقی چچا کے لڑکے ہیں اور نابالغان کے پرورش کا حق شرعاً مسماۃ واحدہ کو ہے جو کہ نابالغان کی نانی ہے مسئلہ جواب طلب یہ ہے کہ نابالغان حمیدہ، سعیدہ اور صالحہ کے مال واسباب وجائداد کی ولایت کس کو حاصل ہے آیا نانی جائداد وغیرہ کا انتظام کرکے اور تحصیل وصول کراکے نابالغان کی پرورش کرے یا وہ لوگ جائداد کا انتظام کریں جو کہ نکاح کے ولی ہیں اس مسئلہ میں سخت اختلاف واقع ہو رہا ہے جس سے نابالغان کو نقصان پہونچنے کا خطرہ ہے لہذا مفصل اور مدلل جواب تحریر فرماکر عند اللہ ماجور ہوں اور جو کچھ تحریر فرماویں اس کی دلیل شرعی بھی تحریر فرماویں ورنہ یتیموں اور نابالغوں کو نقصان پہونچے گا۔ بیّنوا توجروا

الجواب: ولایت مال یعنی تصرف وحفظ کی اصل میں باپ کے لئے ہے وہ نہ ہو تو اس کا وصی وہ نہ ہو تو دادا اور دادا کے بعد دادا کا وصی ولایت مال کا مستحق ہے ان چاروں میں سے اگر کوئی موجود ہو تو مال پر کسی قسم کی ولایت دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوتی لیکن جب یہ چاروں نہوں تو پھر جس کو پرورش کا حق ہے اس کو حفظ مال کی ولایت حاصل ہوتی ہے نہ ولایت تصرف یعنی جس کو ولایت حفظ حاصل ہے وہ بلا ضرورت مال یتیم میں تصرف نہیں کر سکتا نہ بلا ضرورت کوئی شے خریدنا جائز ہے نہ کسی شے کا فروخت کرنا جائز ہے بلکہ فقط ضرورت کی وجہ سے خرید وفروخت جائز ہے مثلاً کھانا کپڑا وغیرہ خریدنا جائز ہے اور اسی طرح نفقہ وغیرہ کی ضرورت سے کسی شے کا فروخت کرنا بھی جائز ہے البتہ جائداد غیر منقولہ کو کسی حال میں فروخت کرنے کی اجازت نہیں فی کتاب الھبة للھدایة (واذا وھب للیتیم ھبةً فقبضہا ولیه وھو وصی الاب اوجدّ الیتیم اووصیّهٗ جاز) لان لھؤلاء ولایة علیه لقیامھم مقام الاب (وان کان فی حجر امه فقبضہا له جائز) لان لھا الولایة فیما یرجع الیٰ حفظه وحفظ ماله وھذا من

بابه لانه لا یبقی الا بالمال فلابد من ولایة التحصیل وقال صاحب الکفایة تحت قوله لان لهؤلاء الخ) وفی الایضاح ولا یجوز قبض غیر هؤلاء الاربعة اراد بتلک الاربعة الاب ووصیه والجد اب الاب ووصیه مع وجود واحد منهم سواء کان الصبی فی عیال القابض او لم یکن وسواء کان ذا رحم محرم منه او اجنبیاً لانه لیست لهؤلاء ولایة التصرف فی المال فقیام ولایة من یملک التصرف فی المال یمنع ثبوت حق القبض له ثم قال وان لم یکن احد من هؤلاء الاربعة جاز قبض من کان الصبی فی حجره وعیاله ولم یجز قبض من لم یکن فی عیاله لانه اذا کان فی عیاله فله علیه ضرب ولایة الخ (فتح القدیر ج ۷ ص ۲۹۴)

وفی الهدایة ونوع اٰخر ما کان من ضرورة حال الصغار وهو شراء ما لابد للصغیر منه وبیعه واجارة الاٰظار وذلک جائز ممن یعوله وینفق علیه کالاخ والعم والام والملتقط اذا کان فی حجرهم واذا ملک هذا النوع فالولی اولیٰ به الا انه لا یشترط فی الولی ان یکون الصبی فی حجره (هدایة اخیرین ص ۴۲۶ متفرقات کتاب الکراهیة) وفی الفتاوی الحامدیة (ص ۲۹۶ ج ۲) ثم ان ما مر ان عائل الیتیم یملک بیع ما لابد منه خاص بغیر العقار من نحو المنقولات اما العقار فلیس له بیعه ولو مع وجود المسوغات لما فی الدر المختار حیث قال وهذا ای بیع العقار للمسوغ لو البائع وصیاً لا من قبل ام او اخ فانهما لا یملکان بیع العقار مطلقا ولا شراء غیر طعام وکسوة الخ تأمل اھ وقال صاحب البدائع فی تعلیل هذه المسئلة لان الوصی خلف الموصی قائم مقامه فلا یثبت له الا قدر ما کان للموصی وهو قضاء الدین والحفظ الخ (بدائع جلد ۵ ص ۱۵۵) جب معلوم ہوگیا کہ اولیاء اربعہ کے بعد ولایت مال اس کو پہنچتی ہے جس کو حق حضانۃ حاصل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں حق حضانۃ نانی کو حاصل ہے پس ولایت حفظ مال بھی نانی کو حاصل ہے،

واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۴ / شوال سنہ ۴۳ھ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔ ۱۵ شوال سنہ ۴۳ھ۔

کفارت کا اعتبار مرد کی جانب ہے

سوال (۱۲) معروض آنکہ زید نے اپنی بی بی ہندہ کو طلاق

مغلظ دیدی پھر زید نے ہندہ کو بعد طلاق مغلظ رکھ لیا اب وہ دونوں رہنے لگے بعدہٗ چند اولاد پیدا ہوئیں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں زینب و بتول جب دونوں لڑکیاں بالغ ہوئیں تو زید نے ان دونوں کی شادی کردیا زینب کے ایک لڑکا پیدا ہوا اس کے بعد اس کا شوہر انتقال کرگیا۔ اب عمرو ایک ایسا شخص جس کی خاندان ایسے فعل شنیع اور ایسی نفسانیت سے بالکل پاک ہے بلکہ پُشتہا پُشت سے اس کی خاندان میں سُنا جاتا ہے کہ بہت ہی لوگ سلیم الطبع و دیندار تھے وہ زینب مذکورہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کا نکاح اس سے بکراہت ہوگا یا بلاکسی کراہت کے؟ اور جو اولاد اس سے پیدا ہوگی اس کے نسب میں نقصان رہے گا یا نہیں اور آئندہ نسل خراب ہونے کا ڈر ہے یا نہیں؟

الجواب؛ فی العالمگیریة (ص ۱۵ ج ۲) الکفاءة معتبرة فی الرجال للنساء للزوم النکاح کذا فی محیط السرخسی ولا تعتبر فی جانب النساء للرجال کذا فی البدائع فاذا تزوجت رجلاً خیراً منها فلیس للولی (ای لولی الرجل) ان یفرق بینهما فان الولی لا یتعیر بان یکون تحت الرجل من لا یکافئه کذا فی شرح المبسوط للامام السرخسی وفی الدر المختار (لا تعتبر من جانبها) لان الزوج مستفرش فلا تغیظه دناءة الفراش وهذا عند الکل فی الصحیح کما فی الخبازیة (شامی ص ۵۲۰ ج ۲) وفی تنقیح الفتاوی الحامدیة (ص ۱۲ ج ۱) وجزم بعدم حصوله علی احکام القرشیین لتصریح الفقهاء بان الولد یتبع اباه بیقین الخ ان عبارتوں سے معلوم ہوگیا کہ اگر کم درجہ کی عورت سے نکاح کرلیا جاوے تو یہ موجب عار نہیں اور نہ اس سے نسب میں کچھ فرق آوے گا کیونکہ نسب باپ سے ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ۔ ۸ جمادی الثانیہ سنہ ۴۳ھ۔

البتہ اس صورت میں جو اولاد پیدا ہوگی وہ نجیب الطرفین نہ ہوگی اس سے نسب میں تو فرق نہ ہوگا البتہ عمدگی نسب کی کم ہوجائے گی۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔

بالغہ حرہ کا نکاح بلا اجازت اس کے باپ نے کردیا الخ

سوال (۱۳) علماء دین و مفتیان شرع متین اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک لڑکی بالغہ کے نکاح کے وقت اس کے والد نے نہ تو اس کو مطلع کیا اور نہ اس سے اجازت چاہی بغیر اس کی اطلاع کے اس کا عقد کردیا بعد عقد ہوجانے کے لڑکی بہت روئی اور بوقت رخصت بھی بہت روئی اور اس کے شوہر نے اس پر ہر قسم کا ظلم و تعدی کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور اس لڑکی کو اپنی جان تلف ہوجانے کا اندیشہ قوی ہے اور اب وہ اپنے

والد کے گھر ہے شوہر کے گھر جانے سے انکار کرتی ہے لہذا گذارش ہے کہ کوئی صورت عند الشرع اس کی خلاصی کی ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر ہو سکتی ہے تو وہ کیا صورت ہو سکتی ہے اور عقد مذکور صورت مذکورہ میں جائز ہوا یا نہیں؟ فقط بینوا توجروا۔

الجواب: فی الشامی (ص ۴۹۰ ج۲) وصرح به ایضاً فی الذخیرة حیث قال بعد حکایة الروایتین وبعضهم قالوا ان کان مع الصیاح والصوت فهو رد والا فهو رضی وهو الاوجه وعلیه الفتوی اھ اس سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا رونا اگر ناخوشی کر اور رد کرنے کے واسطے آواز کے ساتھ چلا کر تھا تو نکاح صحیح نہیں ہوا البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ رونا نکاح کی اطلاع ہوتے ہی پایا گیا ہو اگر نکاح کی خبر پاکر ذرا بھی اپنے اختیار سے خاموش رہی تو نکاح صحیح ہو گیا اور اس کے بعد رونے سے نکاح میں فرق نہ آئے گا فی الدر (فسکتت) عن رده مختارة قال الشامی اما لو اخذها عطاس او سعال حین اخبرت فلما ذهب قالت لا ارضی او اخذ فمها ثم ترک فقالت ذلک صح ردها لان سکوتها کان من اضطرار (ص ۴۹۰ ج۲) اور جس صورت میں نکاح صحیح ہو گیا ہے اس صورت میں علاوہ طلاق کے کوئی صورت علیحدگی کی نہیں۔ احقر عبد الکریم ۲۷ رجب ۴۴ھ۔

الجواب صحیح - ظفر احمد عفا اللہ عنہ - ۲۹ رجب ۴۴ھ۔

ماموں اور خالو نے بالغہ کا نکاح بلا اس کی رضامندی کے کر دیا تو یہ منعقد ہو جائیگا یا نہیں

سوال (۱۴) عرض خدمت میں یہ ہے کہ ایک لڑکی کے ماں باپ فوت ہو گئے تھے اس وقت وہ لڑکی تقریباً چودہ سال کی عمر تھی جس وقت اس لڑکی کے ماں باپ فوت ہوئے لیکن اس لڑکی کے ماں باپ نے اپنی زندگی میں رشتہ منگائی کر دی بعد فوت ہونے ماں باپ کے وہ لڑکی اپنے ماموں خالو کے یہاں اسی موضع میں آ گئی تھی جس موضع میں اس کے ماں باپ نے رشتہ منگائی کر دی تھی وہاں وہ آکر کچھ عرصہ کے بعد ایک اپنے ہمجولی برادری کے لڑکے کے اوپر عاشق ہو گئی پس جس پر وہ لڑکی عاشق ہوئی اسی سے اپنا نکاح چاہتی تھی اس کے ماموں خالہ نے جس وقت یہ بات سنی ایک اور دوسری جگہ اس لڑکی کا نکاح کر دیا براہ زبردستی کے وہ لڑکی وہاں دس بیس روز رہ کر چلی آئی اسی گانوں میں جس میں اس کے ماموں خالہ رہتے تھے وہاں آکر بعد ایک مہینہ کے اس لڑکے کو کہیں لیکر چلی گئی جس پر وہ عاشق تھی لہذا حضور اب وہ طلاق نہیں دیتے ہیں جس کے ساتھ میں اس لڑکی کا نکاح ہوا تھا اور نہ وہ اس کو اپنی زوجیت میں لیتے ہیں پس حضور سے ہم لوگ امیدوار ہیں کہ اس لڑکی کا نکاح اس

لڑکے کے ساتھ (یعنی معشوق کے) درست ہو سکتا ہے یا نہیں اور وہ لوگ طلاق تمام عمر نہیں دیتے ہیں عار دنیا کے سبب سے۔

تنقیح: (۱) نکاح کے وقت لڑکی نے زبان سے اجازت دی تھی یا صاف انکار کیا تھا یا خاموش رہی تھی صاف صاف لکھیں۔

(۲) نکاح کے بعد خاوند کو ہمبستری کا موقع دیا تھا یا نہیں ان دونوں نمبروں کا جواب آنے پر مسئلہ بتلایا جاوے گا اور یہ دونوں پرچے بھی ساتھ بھیجیں اور کسی صاف لکھنے والے سے لکھوا کر بھیجیں۔

جواب تنقیح: جس وقت وہ لڑکی لڑکے کے ساتھ گئی ۲۴ھ میں لڑکی کی عمر اس وقت بیس ۲۰ سال کی ہو گئی تھی اور اس لڑکے کے ساتھ میں گئے ہوئے عرصہ دو سال کا ہو گیا پس اب عمر لڑکی کی بائیس ۲۲ سال ہو گئی ہے جس وقت وہ لڑکی ماموں اور خالو کے یہاں آئی اس وقت اس کی عمر چودہ سال کی تھی اور نکاح جس وقت اس کے ماموں اور خالو نے اس کی بلا رضی کے دوسری جگہ کیا اور اس وقت بھی عمر لڑکی کی بیس سال کی ہو گئی تھی اور اس نکاح پر رضامند نہیں تھی ہم نے خوب اچھی طرح سے حال دریافت کیا ہے ان لوگوں سے جو اس وقت نکاح کے وقت موجود تھے ان لوگوں نے یہ بات کہی ہے کہ ہمارے سامنے نکاح لڑکی کا ہوا ہے مکان چوپال میں اور مکان زنانے میں نکاح نہیں ہوا ہے بوجہ اس کے کہ وہ لڑکی مسماۃ مقصودن صاف انکار کرنے گی کیونکہ اس لڑکی کی رضامندی تو اسی لڑکے سے ہے جس پر وہ ہمیشہ سے رضامند ہے لہذا حضور کو معلوم ہو کہ اس لڑکی کے ماموں اور خالو نے نکاح چوپال میں اس واسطے کیا تا کہ ہماری حماقت ان دس آدمیوں میں انکاری ہونے سے نہ ہوئے یہ کام نکاح کا اس پردہ ہو جاوے ایسا ہی ہوا نکاح ہونے کے بعد وقت دس ۱۰ بجے رات کے اس لڑکی کا ماموں بنام میر جہت وخالو ولی محمد اور عمر انمبردار ان تینوں آدمیوں نے اپنی ایک رائے ملا کر اس لڑکی کے پاس گئے اور اس کا انگوٹھا جبراً ایک کتاب پر لگانے گئے وہ لڑکی تمام رات سوچتی رہی انگوٹھا لگانے کے بارے میں کہ میرا انگوٹھا جبراً لگایا گئے بعد اس بات کے اگلے روز لڑکی کو وہاں بھیج دی ڈولے میں بٹھا کر جہاں کی وہ بارات آئی تھی وہاں جا کر وہ لڑکے کو لیکر چلی گئی جس پر وہ عاشق تھی عرصہ دو سال ہو گئے ہیں علاوہ اس کے ہم نے اور عورتوں کے ہاتھ دریافت کیا ہمبستری کا تو ان عورتوں نے بھی یہی کہا کہ ہمبستری اس لڑکے کے ساتھ نہیں ہوئی جس کے ساتھ نکاح چوپال میں ہوا اور وہ عورتیں تینوں اس لڑکی مقصودن کی ہمجولی اور

ہم وردی اور سہیلی تھی اور اس لڑکے کی ماں اور بہن سے بھی یہی حال معلوم ہوا کہ ہمارے لڑکے کے
ساتھ وہ لڑکی ہمبستر نہیں ہوئی اور مسماۃ مقصوداً کا بھی یہی بیان ہے کہ نہ میں نے اجازت نکاح کی دی
اور نہ کسی نے مجھ سے پوچھا بوجہ اس کے کہ وہ خود ہی جانتے تھے کہ اگر ہم پوچھیں گے تو صاف انکار کر دے
گی پس اگر وہ مجھ سے پوچھتے بھی تو میں صاف انکار کر دیتی کیونکہ میں رضامند نہ تھی اور نہ میں وہاں جاکر
اس لڑکے سے ہمبستر ہوئی۔ پس حضور کو معلوم ہوئے کہ ہم نے سب حال اچھی طرح دریافت کر کے
تحریر کر دیا ہے آپ مسئلہ نکاح کا تحریر کر کے روانہ فرما دیں۔

الجواب: واللہ الموفق للصواب۔ قال فی الدر فان استاذنها غیر
الاقرب کاجنبی اوولی بعید فلا عبرة لسکوتها بل لابد من القول کالثیب البالغة
اوماهو فی معناه من فعل یدل علی الرضا کطلب مهرها ونفقتها وتمکینها من الوطی
ودخوله بها برضاها ظهیریة وقبول التهنئة والضحك سرورا ونحو ذلك
بخلاف خدمته اوقبول هدیته اه قال الشامی عن المحیط والظهیریة و
لو اکلت من طعامه اوخدمته کما کانت فلیس برضا دلالة اه وفیه ایضا قبله
باسطر عن الخانیة الولی اذا زوج الثیب فرضیت بقلبها ولم تظهر الرضا بلسانها
کان لها ان ترد لان المعتبر فیها الرضا باللسان او الفعل الذی یدل علی الرضا
نحو التمکین من الوطی وطلب المهر وقبول المهر دون قبول الهدیة وکذا
فی حق الغلام (۲ ج ۲۹۴)۔

سائل نے جو صورت واقعہ بیان کی ہے کہ مسماۃ مقصودن کی عمر نکاح کے وقت بیس سال کے
قریب تھی اور اس کا نکاح ماموں اور خالو نے بدون اس سے پوچھے کر دیا اس سے اجازت نہیں
لی اور وہ جانتے تھے کہ مسماۃ کی رضا اس جگہ نکاح کی نہیں ہے تو یہ نکاح فضولی کا عقد ہوا جس کی
صحت اس پر موقوف تھی کہ مسماۃ کی طرف سے یا تو صراحۃً رضامندی کے الفاظ بعد علم نکاح کے
پائے جاتے یا کوئی ایسا فعل پایا جاتا جس سے رضا پر دلالت ہوتی۔ صورت واقعہ سے معلوم
ہوا کہ مسماۃ نے خبر نکاح سنکر رضا ظاہر نہیں کی اور نہ وہ خوشی سے بارات کے ساتھ گئی بلکہ ماموں خالو
کے جبر سے گئی اور نہ وہاں جاکر ناکح سے ہمبستر ہوئی نہ اس کو اس کا موقعہ دیا اور وہاں سے آکر اپنی ناراضی
کا صاف اظہار کیا تو اگر یہ سب بیانات صحیح اور واقعہ کے مطابق ہیں تو جزئیات مذکورہ کی بنا پر یہ نکاح صحیح
نہیں ہوا بلکہ جب مسماۃ نے اس سے ناراضی ظاہر کی اسی وقت کالعدم ہو گیا اور اب مسماۃ مقصودن

جہاں چاہے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ ۲۲ رجب ۴۵ھ

۲۱

باپ کا لڑکی کے نکاح پر روپیہ طلب کرنا اس کی رضامندی کی دلیل ہے یا باپ کی صریح رضامندی اسکے بعد بھی ضروری ہے

سوال (۱۵) ہندہ نابالغہ کا باپ جیل خانہ میں تھا ہندہ کے برادر کلاں بالغ نے زید سے ہندہ کا نکاح کر دینے کی
بات چیت درست کی رخصتی کے روز باپ بھی آگیا اور کہا کہ اگر زید مجھ کو ۳۰ روپیہ دیوے تو میں نکاح
کر دینے میں راضی ہوں۔ پس زید نے روپیہ دیدیا اور وہ راضی ہو گیا اور اس کی رضا پر برادر کلاں زید کے
مکان میں ڈولی لے جاکر نکاح کر دیا ہندہ ایک ماہ تک زید کے پاس رہی باپ اور برادر وغیرہ خویش و
اقارب چند بار آئے گئے بعد ایک ماہ کے بوجہ لالچ دنیوی کے ہندہ کو باپ نے اپنے گھر بٹھا رکھا اور
کہا کہ میں تو زید کے ہمراہ نکاح کر دینے پر راضی نہ تھا میرے بیٹے نے نکاح دیا ہے پھر وہ لڑکی بکر کو دیدی،
اس کے بعد ایک عالم کو ثالث مقرر کیا اس نے دعوی الرجلین علی امرأة واحدة کا لحاظ
کر کے دونوں زوج اور ہندہ کا باپ اور ہندہ کا وکیل اس کا برادر کلاں وغیرہ کے سامنے بڑی مجلس
میں موافق طریقہ شرعیہ دعوی سنا زید کی طرف سے نصاب شہود عدول مسلّم جرح موثر سے پایا گیا کہ باپ
۳۰ روپیہ ہمارے سامنے لیکر راضی ہوا اور بیٹے نے موافق مرضی باپ کے جاکر نکاح کر دیا۔ قاضی
صاحب نے وکیل مسماۃ اور زوج ثانی اور باپ کو کہا کہ گواہوں کو قسم دیتے ہو سب نے کہا کہ ہم نے اس
کی بات پر اعتبار کر لیا ہم ان کو قسم نہیں دیتے پس قاضی نے بحضور وکیل ہندہ اور زوج ثانی و والد
ہندہ وجلسہ عظیمہ حکم دیدیا کہ زید کا نکاح درست ہے اور بکر کا باطل ہے بعدہ مسمات کے وکیل
اور والد زوج ثانی نے کہا کہ ہم ۵۰ روپیہ دیتے ہیں اور خلع ہو جانا چاہئے اور خلع کا معنی بھی سنا گیا
کہ خلع طلاق بائن ہوتی ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ یہ شہادت باخذ دراہم واسطے راضی ہونے کے اور
شہرت اس رضامندی کی عام وخاص پر اور عدم اعتراض باپ کا وقت رخصتی کے اور ایک ماہ تک
کمال اختلاط وانبساط اور بغیر قسم کے گواہی کی تصدیق اور التماس خلع بمعنی طلاق بائن نہ بمعنی طلاق
مطلق صلح قاطع نزاع۔ آیا یہ کل امر مثبت رضاء والد ہندہ کے اور موجب صحت نکاح زید کے
ہیں یا نہیں بصورت وجود وعدم عبارت کتاب وفصل و باب ضرور قلمبند فرماویں جزاک اللہ
تعالی خیر الجزاء فقط۔

الجواب: قال فی الدر وله ای للولی اذا کان عصبة الاعتراض فی غیر
الکفوء مالم یسکت حتی تلد منه اه قال الشامی زاد لفظ یسکت للاشارة الی
ان سکوته قبل الولادة لا یکون رضا وان هذه لیست من المسائل التی نزل

فیها السکوت منزلة القول اھ (۲۸۶ ج ۲) ثم قال فی الدر فرضا البعض من
الاولیاء قبل العقد او بعدہ کالکل الیٰ ان قال وقبضہ ای
المھر ونحوہ مما یدل علی الرضا دلالۃ اھ قال الشامی قولہ قبل
العقد وبعدہ فیہ ان الرضا قبل العقد یعم علی کل من الاول والثانی (ای النکاح
بالکفؤ وبغیر الکفؤ) اھ وقولہ ونحوہ بالرفع عطفاً علی قبضہ ای ونحو قبض
المھر کقبض النفقة او المخاصمة فی احدھما وان لم یقبض وکالتجھیز ونحوہ
فتح اھ (ص ۲۸۸ ج ۲)

صورت مسئولہ میں ہندہ نابالغہ کے باپ کا یہ قول کہ زید مجکو ۳۰۰ روپیہ دیدے تو میں نکاح کردینے
پر راضی ہوں اس کی رضا پر دلالۃً دال ہے جبکہ اس کو ۳۰۰ روپیہ دیدیا گیا گو ان روپوں کا لینا
اس کو جائز تھا اگر بطور مہر معجل کے نہیں پھر روپیہ لینے کے بعد اس کے صریح الفاظ کی ضرورت
نہیں بلکہ یہ دلالت بھی کافی ہے جیسا کہ عبارت مذکورہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قبض مہر وقبض نفقہ وتجہیز
ومخاصمہ فی المہر والنفقہ بھی بمنزلہ قول رضا کے ہے اور چونکہ آج کل ہندوستان میں جاہل لوگوں میں
لڑکی پر کچھ رقم لینے کا رواج ہو رہا ہے تو اس رقم کا مانگنا اور اس پر رضا کو معلق کرنا اور بعد میں
اس رقم پر قبضہ کرلینا بھی قرائن رضا سے ہے پس زید کا نکاح صحیح ہوگیا اور بکر کا باطل ہوگیا باقی انبساط
آمد ورفت قائم مقام قول رضا کے نہیں ایسے ہی بکر اور والد ہندہ کا یہ کہنا کہ خلع ہوجانا چاہیئے
یہ بھی اقرار بالنکاح نہیں قال فی الدر وقولہ لعبدہ طلقها رجعیة اجازة للنکاح
الموقوف لا طلقها او فارقها لانه یستعمل للمتارکة اھ قال الشامی ای قولہ
طلقها او فارقها لانه یستعمل للمتارکة فیکون ردا ویحتمل الاجازة فحمل
علی الرد لانه ادنی لان الدفع اسهل من الرفع اھ (ص ۶۱۳ ج ۲) قلت وایضاً
نطلبہ الخلع یحتمل الصلح فی الصورة المسئولة فلا یکون اقراراً بصحة
النکاح، واللہ اعلم۔ ۲۲ ذیقعدہ ۴۵ھ۔

قاضی نابالغ لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول کرالے اور ولی حاضر نہ ہو تو نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہیں

سوال (۱۶۱) اگر ولی تصریحاً نہ اجازت دے نہ وقت نکاح کے حاضر رہے خصوص لڑکی کا ولی مگر
اور سامان دونوں طرف کے ولی سب کریں مثلاً نسبت ٹھیک کرنا فرش فروش چھوہارہ وغیرہ لوگوں
کا بلانا اور اسی قبیل کے تمام کام کریں لیکن قاضی صرف نابالغ لڑکی ولڑکے سے ایجاب وقبول

کرادے تو ایسی صورت میں نکاح ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب: اگر قاضی کو لڑکی کے یا لڑکے کے ولی نے بلایا ہے کہ تم اگر میری لڑکی یا لڑکے
کا نکاح کردو تب تو اس کی طرف سے قاضی وکیل ہوگیا صرف دوسرے ولی کی طرف سے اجازت کی
ضرورت رہی۔ اگر دوسرے ولی نے عقد کے بعد اجازت صراحۃً دیدی یا کوئی فعل ایسا کیا جو اجازت
پر دلالت کرے مثلاً لڑکی کے ولی نے جہیز وغیرہ دیا اور لڑکے کے ولی نے جہیز پر قبضہ کیا تو اب
دوسرے کی طرف سے بھی اجازت پائی گئی اور نکاح صحیح ہوگیا اور جو افعال سوال میں مذکور ہیں
وہ اجازت کے لئے کافی نہیں کیونکہ وہ عقد کے پہلے کے افعال ہیں نہ بعد کے۔ اور اگر قاضی کو
لڑکی اور لڑکے کے ولی میں سے کسی نے نہیں بلایا بلکہ وہ خود ہی خبر نکاح سنکر آگیا یا کسی اور شخص
کے بلانے پر آگیا اور بدون اجازت احد الولیین کے اس نے نکاح پڑھا تو یہ نکاح موقوف
رہا جو بعد اجازت اولیاء طرفین کے نافذ ہوگا۔ اور اگر ان اولیاء میں سے کسی نے اس نکاح کو صراحۃً
یا دلالۃً نافذ نہ کیا تو یہ نکاح موقوف رہے گا جس کو یہ صغیرین بعد بلوغ کے نافذ کرسکتے ہیں،
بشرطیکہ نکاح کے وقت دونوں عاقل تمیز دار ہوں کہ نکاح کے معنی کو سمجھتے ہوں اور اگر وہ نکاح
کو سمجھتے بھی نہوں تو نکاح باطل ہے۔ قال فی الدر وقبضہ ای الولی المھر ونحوہ
مما یدل علی الرضا رضاءً دلالۃً اھ قال الشامی کقبض النفقة او المخاصمة فی
احدھما وان لم یقبض وکالتجھیز ونحوہ اھ (ص ۲۸۸ ج ۲) وفیہ ایضاً صغیرة
زوجت نفسها ولا ولی ولا حاکم ثمه توقف وصح باجازتها بعد بلوغها
لان له مجیزاً وھو السلطان اھ قال الشامی والصغیر کالصغیرة اھ وقال
ایضاً قولہ صغیرة زوجت نفسها ای من کفؤ بمهر المثل والا لم یتوقف لان الحاکم
لا یملک العقد علیها بذلک فلا یملک اجازته فکان عقدا بلا مجیز نعم لو
کان لها اب او جد وزوجت نفسها کذلک توقف لان له مجیزاً وقت العقد
لان الاب والجد یملکان العقد بذلک اھ (ص ۵۱۵ ج ۲) وفی الخلاصة
عن الاجناس کل عقد له مجیز حال وقوعه یتوقف علی الاجازة وما لا مجیز
له حال وقوعه لا یتوقف اھ (ص ۱۷ ج ۲)۔ ۸ محرم ۴۶ھ۔

ماں کی ولایت سے نابالغ کے نکاح کی ایک صورت

سوال (۱۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا اور اس کے ساتھ ایک

لڑکا تھا اب اس لڑکے کی شادی اس شخص نے گانوں میں کردی لڑکا نابالغ تھا اور لڑکی بالغ تھی جس عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا وہ عورت اس کے یہاں سے چلی گئی اب وہ لڑکا اور لڑکے کی بہو رہ گئی اب اس شخص نے اپنے سوتیلے لڑکے کی منکوحہ بہو کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے وہ جائز ہے یا نہیں۔

الجواب ؛ جب تک یہ لڑکا بالغ نہو اور بالغ ہو کر اس عورت کو طلاق ندے اور طلاق کی عدت نگذر جائے اس وقت تک اس عورت سے کسی کا نکاح درست نہیں کیونکہ اس لڑکے کا نکاح اس لڑکی سے درست ہو گیا ہے گو یہ سوتیلا باپ اس کا ولی نہیں مگر لڑکے کی ماں اس کی ولی تھی اور ظاہر یہ ہے کہ ماں کے علاوہ اس کا کوئی ولی نہیں اور یہ نکاح ماں کی رائے ورضا سے ہوا ہے لیکن اگر ماں کی رائے اور رضا سے نہیں ہوا تو سوال دوبارہ کیا جائے اور یہ بھی بتلایا جائے کہ اس لڑکے کا کوئی ولی ماں کے علاوہ ہے یا نہیں اور ماں نے یا اس ولی نے اس نکاح کی خبر سنکر نکاح کو منظور کیا یا اس پر ناراضی وانکار کا اظہار کیا فقط۔ ۱۸ رجب ۴۶ھ

ماموں نے نابالغ بھائی کی موجودگی میں نابالغہ کا نکاح کردیا الخ

سوال (۱۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمیان زید وہندہ کو جبکہ ان دونوں کے والدین کا وفات ہو گیا بوجہ نابالغی بغرض پرورش مسمیٰ بکر جوان دونوں یعنی زید وہندہ کا ماموں ہے اپنے مکان پر لے گیا اور اپنے لڑکے مسمیٰ بقریدوے ہندہ کا بغیر اجازت زید نکاح کردیا حالانکہ زید وہندہ اب تک نکاح مذکور پر راضی نہیں ہیں اور اب ہندہ تقریباً ماہ دوماہ سے بالغہ ہے اور عرصہ آٹھ مہینہ سے اپنے بھائی مسمیٰ زید کے یہاں چلی آئی ہے تو صورت مذکورہ میں ہندہ کا نکاح بقریدوے از روئے شرع درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا۔

الجواب ؛ صورت مذکورہ میں چونکہ ہندہ قبل بلوغ وبعد بلوغ اپنے ماموں کے نکاح سے کارہہ تھی لہذا نکاح مذکور صحیح نہیں ہوا مطابق حدیث لانکاح الا بولی کے ولی کا ہونا ضروری ہے اس لئے نکاح صحیح نہیں ہوا ہندہ دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد عبداللہ مدرس مدرسہ فیض عام۔ ۳۰ رجمادی الاولیٰ ۴۶ھ۔

احمد عفی عنہ مدرس فیض عام۔ ۳۰ ج ا ۴۶ھ۔

ماموں بھی ولی ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے اس کی تحقیق کی ہے اور اس اعتبار سے نکاح ہوجائے گا مگر بلوغ اور علم بالنکاح کے بعد خیار فسخ حاصل رہتا ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک ماموں ولی نہیں اور امام ابو یوسف صاحب کی اشہر الروایتین یہی ہے دیکھو ہدایہ اور حسن بن زیاد نے بھی

امام صاحب سے یہی روایت کیا ہے اور الولایۃ الی العصبات بھی اسی کی موید ہے اور خیار فسخ کی تاثیر کے لئے قضا کی شرط ہے جو آجکل قریباً اس دیار میں متعذر الحصول ہے اس لئے اگر کوئی حنفی امام صاحب علیہ الرحمۃ کی دوسری روایت پر فتویٰ دے اور سرے سے نکاح کے انعقاد ہی کا انکار کرے تو اس ہیچمدان کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے بہتر ہوگا کہ اس مسئلہ کی تحقیق حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ العالی سے کرلی جاوے۔ ناچیز عبداللطیف نعمانی مدرس دارالعلوم مئو اعظم گڑھ۔

الجواب من تھانہ بھون:

صورت مسئولہ میں چونکہ نکاح بولایت ولی صحیح منعقد ہو چکا ہے بشرطیکہ کفو سے مہر مثل پر ہوا ہو اسلئے اگر ہندہ اس کو بعد بلوغ کے فسخ کرنا چاہے تو قاضی اسلام کے یہاں مرافعہ کرے اور اگر قاضی اسلام میسر نہیں تو صبر کرے یا کسی طرح خاوند کو خلع پر راضی کرے بہرحال بدون قضاء قاضی یا طلاق زوج کے یہ نکاح فسخ نہیں ہوسکتا اور بدون اس کے ہندہ کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔

پہلا جواب کسی غیر مقلد کا معلوم ہوتا ہے وہ بالکل غلط ہے کیونکہ حدیث لانکاح الا بولی سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بدون ولی کے نکاح نہیں لیکن اس کے کیا معنیٰ ہیں آیا یہ کہ باطل ہے یا مناسب نہیں دونوں احتمال ہیں انہوں نے بدون حدیث کے ایک احتمال کو ترجیح کیونکر دی اور اگر ایما امرءۃ نکحت نفسھا بدون اذن ولیھا فنکاحھا باطل پیش کریں تو اس کی صحت ثابت کریں اور تصحیح حدیث میں کسی محدث کی تقلید نکریں ورنہ فہم حدیث میں فقہاء کی تقلید سے کیوں عار ہے۔ دوسرے اگر اس کو بھی تسلیم کرلیا جائے تو وہ حدیث سے یہ ثابت کریں کہ خال ولی نہیں اگر حدیث الولایۃ الی العصبات پیش کریں تو اس کی صحت بدون تقلید محدثین کے ثابت کریں۔ پھر حدیث ہی سے عصبات کے ایسے معنیٰ ثابت کریں جو خال پر صادق نہ آتے ہوں۔ نیز یہ بھی بتلائیں کہ اس حدیث میں تو صرف اتنا ہے کہ عصبات کو ولایت حاصل ہوتی ہے یہ کہاں ہے کہ غیر عصبات کو کسی وقت بھی ولایت حاصل نہیں ہوتی حدیث میں کوئی لفظ نفی کا نہیں ہے اگر ان امور کو حدیث ہی سے حل نکرسکیں تو اہل حدیث ہونے کا اور حدیث سے فتویٰ دینے کا دعویٰ نکریں۔

مجیب ثانی حنفی معلوم ہوتا ہے مگر ان کو امام صاحب کی دوسری روایت ضعیفہ پر فتویٰ

دینے کا خیال ہو رہا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل تو اجتہادات میں بہت کم نکلیں گے جن میں اختلاف علماء یا اختلاف روایات نہ ہو دیکھنا یہ ہے کہ اختلاف کے وقت قوت کس کو ہے قول ضعیف پر فتوی جائز نہیں سو ظاہر ہے کہ امام صاحبؒ سے جو روایت اہل متون نے نقل کی ہے اور متون ہی نقل مذہب کے لئے موضوع ہیں وہ یہی ہے کہ عدم عصبات کے وقت ماں کو اور ذوی الارحام کو ولایت تزویج حاصل ہے اور دلیل سے بھی قوت اسی کو ہے اور امام ابو یوسف بھی امام ابوحنیفہ ہی کے ساتھ ہیں ھذا ھو الاصح الارجح کما صرح بہ فی فتح القدیر وبسط الکلام فی الدلالۃ ص ۱۸۲ ج ۳ وفی رد المحتار ص ۵۱۴ ج ۲ باب الولی، واللہ اعلم۔ ۱۰ رمضان ۴۶ھ۔

گونگی بہری لڑکی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا نکاح کس طرح کیا جائے

سوال (۱۹) علماء دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک عورت ہے نہ اس کو سنتا ہے اور نہ کچھ وہ زبان سے کہہ سکتی ہے اور عمر اس کی ۲۱ سال کی ہے اور اشارہ بھی کچھ نہیں سمجھتی مگر کھانے اور پینے کا اور پائخانے اور پیشاب کی جس وقت ضرورت ہوتی ہے خود کہہ دیتی ہے اور نہ اس کے کوئی ولی ہے اب اس کا نکاح کس صورت سے کرنا چاہئے۔ فقط والسلام۔

الجواب: یہ نہیں ہو سکتا کہ اس لڑکی کا عصبہ کوئی نہ ہو ہاں یہ ممکن ہے کہ عصبہ قریب نہ ہو لیکن عصبہ بعید ضرور ہوگا۔ اگر یہ لڑکی شیخ زادی ہے تو سارے شیخ زادے اس کے عصبہ ہیں ان میں جو زیادہ دور نہ ہو وہ اس کا ولی ہوگا مثلاً جو شیخ زادہ اس کی بستی میں ہے وہ دوسری بستی کے شیخ زادے سے مقدم ہے اور اگر شیخ زادی نہیں بلکہ مغل پٹھان یا جلاہی وغیرہ ہے تب بھی اتنی بات معلوم ہو سکتی ہے کہ اس لڑکی کے باپ کی رشتہ داری کن کن مواضع میں تھی انہی مواضع میں اس کے باپ کی رشتہ داری میں جو شخص سب سے زیادہ قریب ہوگا وہی اس کا عصبہ اور ولی ہوگا، ولی کی اجازت سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے، واللہ اعلم۔ ۷ رمضان ۴۶ھ۔

اَب وجَدّ کے کئے ہوئے نکاح میں صغیر وصغیرہ کو خیار بلوغ حاصل نہ ہونے کی دلیل

سوال (۲۰) سید سلیمان ندوی نے حنفیہ کے خلاف یہ لکھا ہے کہ اَب وجَدّ اگر صغیر وصغیرہ کا نکاح کر دیں تو انہیں خیار بلوغ حاصل ہونا چاہئے کیونکہ خیار نہ ہونے پر حدیث سے ثبوت نہیں۔ بلکہ حدیث میں یہ ہے کہ جن عورتوں نے آکر دربار رسالت میں باپ کے نکاح پر ناگواری ظاہر کی حضورؐ نے بلا اس کے دریافت فرمائے کہ تم بوقت نکاح نابالغ تھیں یا بالغ نکاح فسخ کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ تزویج اَب کے بعد حق فسخ رہتا ہے۔

مبسوط، بدائع، بذل وغیرہ میں حضرت عائشہؓ کے واقعہ نکاح سے ثبوت دیا ہے مگر حدیث میں خیار نہ دینے کا ذکر ہے نہیں اور عدم ذکر سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے۔ انت ومالک لأبیک سے بھی استدلال بظاہر نہیں ہوتا۔ اَب کی تزویج کے بعد صغیرہ بکر کو خیار بلوغ نہ ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے مگر ثبوت نہیں ملتا حضرت کچھ ارشاد فرماویں کہ ثبوت کہاں سے ہوا۔

الجواب: اس مسئلہ کی دلیل اجماع امت کافی ہے۔ اَب کی تزویج کے بعد صغیرہ بکر کو خیار بلوغ نہ ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اور اجماع خبر واحد سے اقویٰ ہے۔ فلا حاجۃ إلی الاستدلال بالاخبار وایضًا فالاستدلال بنکاح عائشۃؓ تام فقد ثبت انہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر بریرۃ حین عتقت وقال لبنت حمزۃ حین زوجها وھی صغیرۃ لها الخیار اذا بلغت فلو کان الخیار ثابتا للصغیرۃ اذا زوجها ابوھا لصرح النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین تزوج عائشۃ بان لها الخیار اذا بلغت والسکوت فی موضع البیان بیان فثبت ان لا خیار للصغیرۃ والحال ھذہ وایضًا فقولہ تعالیٰ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اطلق للاولیاء انکاح مولیتھم التی لا زوج لها وھذا ھو معنی الایم لغۃ واطلاق ذلک لهم یقتضی تمام العقد بانکاحهم وثبوت الخیار بعد تمام العقد خلاف القیاس فیقتصر علی مورده وقد خیر صلی اللہ علیہ وسلم الثیب والبکر البالغۃ ولم یخیر الصغیرۃ الا اذا زوجها غیر الاب کما ورد انہ زوج امامۃ بنت حمزۃ وقال لها الخیار اذا بلغت (فتح القدیر ص ۱۷۵ ج ۳) ولم یثبت انہ خیر صغیرۃ زوجها ابوھا فلا خیار لها، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۵ صفر ۴۷ھ۔

(تتمہ) وفی الجوھر النقی قال ابن المنذر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ولا تنکح البکر حتی تستأذن وھو قول عام وکل من عقد علی خلاف ما شرع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو باطل لانہ الحجۃ علی الخلق ولیس لاحد ان یستثنی من السنۃ الا سنۃ مثلها فلما ثبت ان ابا بکر الصدیق زوج عائشۃ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھی صغیرۃ لا امر لها فی نفسها کان ذلک مستثنی منه انتهی کلامہ (ص ۲۶ و ۲۷ ج ۷) وھذا صریح فی ثبوت نفی الخیار لعائشۃ

اما نقلاً وابن المنذر حجة فی النقل واما لکون السکوت بمعرض البیان بیاناً
نفیہ تائید لما قلنا اوّلاً فافہم ۔

بالغہ لڑکی اگر غیر کفو میں نکاح بلا اجازت اولیا کرے تو نکاح باطل ہے

سوال (۲۱) (۱) علمائے دین اس مسئلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ مومن قوم کا ایک مرد کا نکاح شیخ، سید، پٹھان وغیرہ اقوام کی عورتوں سے ہوسکتا ہے یا نہیں ۔

(۲) اور کیا اس عورت کے اولیاء کو ایسی صورت میں جب اس نے برضائے خاطر اور بعد بلوغت کسی مومن دیندار ذی علم سے نکاح کیا ہے، حق فسخ حاصل ہے؟ بینوا توجروا ۔

الجواب : (۱) بدون رضاء عورت کے اولیاء کے نہیں ہوسکتا ۔

(۲) اگر کوئی شریف سید شیخ مغل پٹھان عورت اپنے اولیاء کی بدون رضاء واجازت مجلاہے سے نکاح کرلے تو یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا بلکہ ابتداء ہی سے باطل ہے فسخ کی بھی ضرورت نہیں ۔ وظاہر الروایۃ ان النکاح ینعقد وللاولیاء حق الفسخ والاعتراض ولکن المتأخرین افتوا بروایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ انہ لا یصح ولا ینعقد یہ تو سوال کا جواب ہے مگر اس مسئلہ کی بنا اس پر نہیں کہ قوم مومن شرعاً رذیل ہے فقد قال تعالیٰ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ فالکرم انما ھو بالتقوی والرذالۃ بالمعصیۃ ۔ بلکہ اس کی بنا اس پر ہے کہ نکاح کے مصالح عادۃً ہم کفو قوم ہی میں حاصل ہوتے ہیں اور یہ مشاہد ہے اس کا انکار نہیں ہوسکتا اس لئے شریعت نے نکاح میں کفاءت کا لحاظ کیا ہے تاکہ مصالح نکاح بخوبی حاصل ہوں البتہ اگر عورت کے اولیا راضی ہوکر غیر کفوء سے کردیں تو ان کا راضی ہونا اس کی علامت ہوگی اس غیر کفوء سے بھی مصالح نکاح حاصل ہونے کی امید ہے تو اس صورت میں غیر کفوء سے بھی عورت کا نکاح درست ہے ۔ اور مصالح نکاح صرف میاں بیوی کی رضامندی میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ زوج وزوجہ کی قرابت میں رابطہ اتحاد ومحبت وتعاضد وتناصر پیدا ہونا بھی ملحوظ ہے اور یہ بات غیر کفو کے نکاح میں مفقود ہے اِلّا نادراً والنادر کالمعدوم فلا یعتبر بہ فی الاحکام اور غیر کفوء سے نکاح کرکے اگر عورت کا خاوند جلد مرجائے اور لاولد مرجائے یا بچے چھوٹے چھوٹے ہوں تو اب اس عورت کی امداد اس کا خاندان تو ناراضی کی وجہ سے کرے گا نہیں تو اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے وغیر ذالک من المصالح اس لئے کفاءت کا نکاح میں لحاظ ہے اور یہ امر قوم مومن ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اگر کوئی سیدزادی یا شیخزادی

پٹھان یا مغل مرد سے بدون اپنے اولیاء کی اجازت کے نکاح کرلے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اور اگر عدم کفاءت میں وہ مرد بڑھا ہوا ہو تو نکاح درست ہے عورت کے ادنیٰ ہونے سے وہ مصالح فوت نہیں ہوتے، واللہ اعلم ۔

۲۴ / ج ۲ سنہ ۴۷ھ ۔

باپ نے لاعلمی میں نابالغہ لڑکی کا نکاح فاسق سے کردیا نکاح کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شرابی و بدچلن ہے تو باپ کا کیا ہوا نکاح صحیح ہوا یا نہیں

سوال (۲۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ لڑکی نابالغہ کا عقد لڑکی کے باپ نے پینتیس ۳۵ سالہ عمر والے شخص کے ساتھ کردیا لڑکی نے بالغ ہوتے ہی اس کے ساتھ جانے یا رہنے سے انکار کردیا کیونکہ وہ شخص شراب خوری اور بدچلنی وغیرہ کے کاموں میں مصروف رہتا ہے اور نماز وغیرہ کا قطعی پابند نہیں محض عیدین کی نماز شاذ و نادر پڑھ لیتا ہے اور لڑکی قرآن شریف ومسائل ضروری سے واقف ہے اور نماز کی بھی پابند ہے شوہر سے طلاق کے لئے کہا جاتا ہے مگر انکار کرتا ہے لڑکی کا باپ بھی اسے شوہر کے ایسے حالات دیکھ کر نہیں چاہتا کہ میں ایک ایسی شائستہ اور دیندار لڑکی کو ایسے گمراہ شخص کے ساتھ کردوں جو بالکل احکام شرع کا پابند نہ ہو بروقت عقد ولی جائز کو اس کے ناشائستہ حرکات سے بالکل بے خبری تھی پس ایسی صورت میں اس سے طلاق حاصل کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور لڑکی کا طلاق مانگنا حق بجانب ہے یا نہیں اور ایسے شخص کے ساتھ ولی جائز کا (بے جانے ہوئے) نکاح کردینا جائز ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا ۔

الجواب ؛ اگر سوال واقع کے مطابق ہے کہ ولی کو اس شخص کی بدچلنی وغیرہ کا نکاح کے وقت علم نہ تھا اور بعد میں علم ہوا اور ولی خود بدچلن نہیں تو یہ نکاح بالکل صحیح نہیں ہوا لڑکی کو طلاق لینے کی کچھ ضرورت نہیں وہ بدون طلاق ہی کے دوسرے نیک شخص سے نکاح کرسکتی ہے ۔

قال فی رد المحتار واما اذا کانت صغیرۃ فزوجہا ابوہا من فاسق فان کان عالماً بفسقہ صح العقد ولا خیار لہا اذا کبرت لان الاب لہ ذلک (ای عند الامام لا عندہما ۱۲) مالم یکن ماجناً کما مر فی الباب السابق واما اذا کان الاب صالحاً وظن الزوج صالحا فلا یصح قال فی البزازیۃ زوج بنتہ رجلاً ظنہ مصلحاً لا یشرب مسکراً فاذا ھو مدمن فقالت بعد الکبر لا ارضی بالنکاح ان لم یکن ابوھا یشرب المسکر ولا عرف بہ وغلبۃ اھل بیتہا مصلحون فالنکاح باطل بالاتفاق اھ (ص ۵۴۶ ج ۲) واللہ تعالیٰ اعلم ۔

۴ / ذیقعدہ سنہ ۴۷ھ ۔

ولایت نکاح میں حقیقی بہن، ماموں اور اخیافی بھائی سے مقدم ہے

سوال (۲۳) ایک نابالغہ کے والدین فوت ہو گئے اس وقت اس کا ماموں اور اخیافی بھائی اور حقیقی بہن اور ماں کا پہلا شوہر زندہ ہے، ولایت نکاح ان میں سے کس کو حاصل ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں ولایت نکاح حقیقی ہمشیرہ کو ہے قال فی الدر فان لم یکن عصبة فالولایة للام ثم لام الاب ثم للاخت لاب وام ثم للاخت لاب ثم لولد الام الذکر والانثی سواء اھ (ص ۵۱۲ ج ۲) واللہ اعلم۔

۲۰ ذیقعدہ ۴۷ھ۔

ولی عصبہ نابالغہ کے نکاح کا حق ماں کو تفویض کر دے تفویض کے بعد ماں نابالغہ کا نکاح کسی سے کر دے پھر ولی عصبہ کسی اور سے اس کا نکاح کر دے تو کون سا نکاح صحیح ہے

سوال (۲۴) ایک شخص نعمت اللہ مر گیا اور اس نے مرنے سے پہلے اپنے عصبہ کو اور زوجہ کو وصیت کی کہ میری لڑکی نابالغہ شریفن کا نکاح میرے سالے کے لڑکے سے کر دینا۔ عصبہ نے بعد موت مورث کے ایک اقرار نامہ اسٹامپ پر تحریر کر کے مسماۃ شریفن کی ماں کے حوالے کیا جس میں یہ لکھا کہ:

"مسماۃ شریفن کا نکاح حسب وصیت نعمت اللہ مسماۃ رحمت (مادر شریفن)
کرے گی مجھے یا میرے قائم مقام کو کوئی عذر نہ ہوگا شادی کا خرچہ مسماۃ رحمت
برداشت کرے گی"

اس کے بعد لکھتا ہے:

"اور جس کو مسماۃ رحمت پسند کرے گی وہاں مسماۃ شریفن کا نکاح بمرضی خود
کر سکے گی مجھے عذر نہ ہوگا"

اس کے بعد قادر بخش اور مسماۃ رحمت میں کچھ تنازعہ ہو گیا۔ مسماۃ رحمت نے اس خیال سے کہ مبادا تنازعہ کی وجہ سے یہ شریفن کے نکاح میں بھی گڑبڑ نہ کرے شریفن کا نکاح حسب وصیت نعمت اللہ اپنے بھتیجے سے کر دیا یہ خبر پا کر قادر بخش نے شریفن کا نکاح دوسرے شخص سے کر دیا اب ان دونوں نکاحوں میں سے کونسا نکاح صحیح ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں شریفن کا نکاح وہی صحیح ہے جو اس کی ماں بیوہ نعمت اللہ نے کیا ہے اور جو نکاح اس کے بعد قادر بخش نے کیا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ گو قادر بخش عصبہ ہے اور دراصل ولایت نکاح اسی کو حاصل تھی مگر اس نے بذریعہ اقرار نامہ تحریری شریفن کے نکاح

کا اختیار اس کی ماں کو سپرد کر دیا ہے اس کے الفاظ مندرجہ اقرار نامہ تفویض پر صاف دلالت کرتا ہے اور جو عقد بعد تفویض من لہ الحق صادر ہو وہ صحیح ہوتا ہے قال فی البحر وقولها (ای البالغة للولی) ذلک الیک اذن مطلقا ثم ذکر مسئلة ذکر الولی بین یدیها اقواما لا یحصون فسکتت فلیس برضا ثم قال وهذا کله اذا لم تفوض الامر الیه اما اذا قالت انا راضیة بما تفعله او زوجنی ممن تختاره ونحوه فهو استیذان صحیح اھ (ص ۱۱۲ ج ۳) ولا یخفی وجود التفویض من الولی الی الام فی الصورة المسئولة فهو اذن لها مطلقا بنکاح مولیته والاذن قبل العقد کالاجازة بعده لما فی الدر واذنه لعبده فی النکاح ینتظم جائزه وفاسده فلو نکح العبد لمهر من نکحها فاسدا بعد اذنه اھ وفیه قبله وقوله لعبده طلقها رجعیة اجازة للعقد الموقوف اھ (ص ۶۱۲ ج ۲) وفی الهدایة فی بیع الفضولی واذن المالک بعده لان الاجازة اللاحقة بمنزلة الوکالة السابقة اھ (ص ۷۳ ج ۳)۔ دوسرے قادر بخش نے شریفن کا دوسرا نکاح محض ضد اور نفسانیت اور نزاع باہمی کی وجہ سے کیا ہے لڑکی کی مصلحت پر نظر کر کے نہیں کیا اور یہ درست نہیں فکان کمن زوج مولیته برجل طمعا فی مال یعطاه رشوة وهذا یبطل الولایة کذا ههنا واللہ تعالیٰ اعلم۔ ظفر احمد عفا عنہ۔ ۲۱ ذیقعدہ ۴۷ھ

الجواب صحیح عندی، اشرف علی عفی عنہ۔ ۲۱ ذیقعدہ ۴۷ھ۔

بالغہ عورت بدون اذن ولی کفو میں مہر مثل سے کم پر اپنا نکاح کرے تو نکاح صحیح ہوگا یا نہیں

سوال (۲۵) کیا فرماتے ہیں علمائے حنفیہ ان مسائل میں: اگر کسی عاقلہ بالغہ ذات الولی کا نکاح اپنے کفو کے ساتھ اپنی رائے سے مہر مثل سے کم پر نکاح کر لے تو وہ مثل نکاح بغیر الکفو کے غیر صحیح ہوگا یا بنا بر اس فرق کے جو ذیل کی عبارت میں مذکور ہے صحیح ہوگا اور اولیاء کو صرف اتمام مہر کا مطالبہ ہوگا وہ عبارت یہ ہے۔ فی الدر المختار ولو نکحت باقل من مهرها فللولی الاعتراض حتی یتم مهر مثلها او یفرق القاضی بینهما فی رد المحتار قوله: الاعتراض افاد ان العقد صحیح وتقدم انها لو تزوجت غیر کفو فالمختار روایة الحسن انه لا یصح العقد ولم ار من ذکر مثل هذه الروایة (ای روایة عدم الصحة) ههنا مقتضاه انه لا خلاف فی صحة العقد ولعل وجهه انه لا یمکن الاستدراک هنا

باتمام مہر المثل بخلاف عدم الکفاءۃ (باب الکفاءۃ) قلت والمراد بما تقدم مافی الدر المختار وله الاعتراض فی غیر الکفو الی قوله ویفتی فی غیر الکفو بعدم جوازه اصلاً وهو المختار للفتویٰ لفساد الزمان۔

الجواب: علامہ شامی نے اس مقام پر جو کچھ لکھا ہے محض ان کی رائے ہے نقل نہیں ہے اور اس رائے پر صاحب تحریر مختار نے اعتراض کیا ہے بلفظ ولکن التعلیل المذکور للافتاء بعدم الجواز فی غیر الکفو جار فی مسئلۃ التزوج بدون مہر المثل ومقتضی لعدم الجواز تامل اھ (ص ۱۸۵ ج ۱) وفیه ایضاً علیٰ قوله ومقتضاه انه لا خلاف الخ مانصه تقدم ان مقتضی العلة انه لافرق بین المسئلتین اھ ص ۱۹۱ ج ۱ واللہ اعلم۔

قال فی العالمگیریة: ولو زوج ولده الصغیر من غیر کفؤ بان زوج ابنه امة اوابنته عبداً اوزوج بغبن فاحش بان زوج البنت ونقص من مهرها اوزوج ابنه وزاد علی مهر امرأته جاز وهذا عند ابی حنیفة وعندهما لا یجوز الزیادة والحط الابما یتغابن الناس فیه قال بعضهم فاما اصل النکاح فصحیح والاصح ان النکاح باطل عندهما[عه] هکذا فی الکافی والصحیح قول ابی حنیفة کذا فی المضمرات واجمعوا علیٰ انه لا یجوز ذلک من غیر الاب والجد ولا من القاضی اھ (ص ۱۸ ج ۲)۔

قلت: ومقتضی تعلیل المتاخرین لروایة الحسن عن ابی حنیفة عدم الجواز عنده ایضاً خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں یعنی مہر مثل سے کم کرنے میں صاحبین کا قول تو یہ ہے کہ نکاح صحیح نہیں جبکہ عورت نے خود بلا رضا اولیاء مہر کم کیا ہو یا ولی نے بلا رضا عورت کے کم کیا ہو اور امام صاحب کے نزدیک نکاح صحیح ہے اور مضمرات میں قول امام ہی کو صحیح کہا ہے، لہذا فتویٰ تو صحت نکاح کے باب میں امام صاحب ہی کے قول پر دیا جائے گا مگر احوط یہ ہے کہ مہر مثل سے مہر کم نہ باندھا جائے کیونکہ خلاف سے بچنا اولیٰ ہے۔ ولیتنبه لهذا فان الناس

عه ولیس الحکم خاصًا بنکاح الصغیرین بل عام للبالغین ایضاً کما فی البدائع، دسیاتی ۱۲

عنه غافلون فیرون نقص المهر سنة وثواباً ولا یعلمون ان فی ذلک نقص حق المرأة وسکوت المرأة البالغة البکر انما یکون رضا لقبول النکاح فقط لا لنقص المهر فان السکوت لا یکون حجة فی الاموال، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قال فی البدائع ومنها کمال مهر المثل فی النکاح الحرة العاقلة البالغة نفسها من غیر کفو بغیر رضا الأولیاء فی قول ابی حنیفة حتی لو زوجت نفسها من کفؤ باقل من مهر مثلها مقدار ما لا یتغابن فیه الناس بغیر رضا الاولیاء فللاولیاء حق الاعتراض عنده فاما ان یبلغ الزوج الی مهر مثلها او یفرق بینهما وعند ابی یوسف ومحمد هذا لیس بشرط ویلزم النکاح بدونه حتی یثبت للاولیاء حق الاعتراض وهاتان المسئلتان اعنی هذه المسئلة والمسئلة المتقدمة علیها وهی ما اذا زوجت نفسها من غیر کفؤ ولغیر رضا الاولیاء لاشک انهما یتفرعان علی اصل ابی حنیفة وزفر واحدی الروایتین عن ابی یوسف وروایة الرجوع عن محمد لان النکاح جائز واما علی اصل محمد فی ظاهر الروایة عنه واحدی الروایتین عن ابی یوسف فلا یجوز هذا النکاح فیشکل التفریع فتصور المسئلة فیما اذا اذن الولی لها بالتزویج فزوجت نفسها من غیر کفؤ باقل من مهر مثلها اھ (ص ۳۲۲ ج ۲)۔

وفی البحر تحت قول الکنز من نکحت غیر کفؤ فرق الولی مانصه وهذا ظاهر فی انعقاده صحیحا وهو ظاهر الروایة عن الثلاثة والمفتی به روایة الحسن عن الامام من عدم الانعقاد اصلا اذا کان لها ولی لم یرض به قبل العقد وفی الخلاصة وکثیر من مشائخنا افتوا بظاهر الروایة وهذا یدل علی ان کثیرا من المشائخ افتوا بانعقاده فقد اختلف الافتاء اھ ملخصا (ص ۱۲۸ ج ۳)

قلت ولم یثبت افتاءهم بقول الصاحبین ولا بمقتضی تعلیل روایة الحسن فی مسئلة تقلیل المهر عن المثل بل صرح فی الهندیة ان الصحیح فی مسئلة تقلیل المهر عن المثل قول ابی حنیفة ان اصل النکاح صحیح وروایة الحسن عن الامام لیست صریحة فی هذه المسئلة وانما هی فی الکفاءة فالاحوط الافتاء بالمنع من ذلک ای التقلیل واذا وقع التزویج بالاقل من الاب والجد

فینبغی الافتاء بالانعقاد اما من غیرهما وهی صغیرة فلا، واللہ اعلم۔

یکم صفر ۱۳۴۸ھ۔

نکاح نابالغہ کی ایک صورت کا حکم

سوال

(۲۶) علمائے دین و مفتیان شرع متین ایسی حالت میں کیا فرماتے ہیں۔ ہندہ جس کی عمر دس سال یا کچھ زائد ہے سن تمیز کو پوری طرح پہونچ چکی ہے اور نیک و بد کا بخوبی امتیاز ہے لیکن نابالغ ہے والد اس کا بزور وجبر زید کے ساتھ کہ جس کی عمر ساٹھ سال سمجھی جاتی ہے عقد کرنا چاہتا ہے ہندہ زید کے ساتھ کسی طرح راضی نہیں ہے بلکہ خودکشی وجان کھونے پر آمادہ ہے اس کے والد نے مجبور ہوکر ظاہر کیا کہ زید کے ساتھ نہیں بلکہ بکر کے ساتھ کہ جس کی عمر بھی مناسب ہے عقد ہوتا ہے روز نکاح جب ہندہ کو معلوم ہوا کہ وہی زید بوڑھا آدمی ہے دھوکا دیا جاتا ہے نکاح کے خوف سے بھاگ کر دوسرے شخص کے مکان میں چھپی اس کے والد کو جب خبر ہوئی چھری وغیرہ لیکر اس مقام پر پہونچا اور قتل کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور بزور اپنے مکان میں پکڑ لایا اور بلا رضامندی ہندہ کے نکاح ہوگیا مگر ہندہ نے ایجاب وقبول نہیں کیا برابر انکار رہا ہندہ رخصت ہوکر زید کے یہاں نہیں گئی بعد چار سال کے محض دباؤ وڈرانے کی غرض سے ایک مقدمہ فوجداری میں ہندہ کے باپ اور اس کے خاص عزیزوں پر زید نے دائر کیا زید کے خاص عزیزوں نے اپنی رہائی وگلوخلاصی ہندہ کے رخصت ہوجانے پر سمجھ کر بزور وجبر رخصت کرادیا اس خوف سے ہندہ وہاں جاکر بیمار ہوگئی اور وہاں بھی وہی نارضامندی برابر رہی اور یکجائی کی نوبت نہیں آئی اب عمر ہندہ کی بیس برس ہے اور اپنے باپ کے مکان میں ہے جان کھونے پر آمادہ ہے مگر زید کے ساتھ رہنے یا اس کے گھر جانے پر رضامند نہیں ہے، فقط اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کے ساتھ جو نکاح ہندہ کا بحالت نابالغی بلا رضامندی ہندہ، ہندہ کے باپ نے کردیا تھا وہ صحیح نکاح ہوا تھا یا نہیں اور اب ہندہ بالغ ہوگئی ہے اور دوسرا نکاح دوسرے شخص کے ساتھ کرنا چاہتی ہے بلا زید کے طلاق دئے ہوئے ہوسکتا ہے یا نہیں اور کس طرح سے دوسرا نکاح ہوسکتا ہے؟

تنقیح: ۱ کیا ہندہ کے باپ نے اس نکاح میں زید سے کچھ رقم لی ہے یا کچھ رقم لینا طے ہوا تھا۔ یا ہندہ کے باپ کو زید سے کچھ اور طمع تھی صاف صاف لکھا جائے نیز ہندہ کے باپ نے اس نکاح سے پہلے کسی اور لڑکی کے نکاح میں لڑکے والوں سے روپئے لئے ہیں یا نہیں؟

۲ بروقت نکاح ہندہ کا کوئی اور ولی باپ کے سوا موجود تھا یا نہیں مثلاً ماں، بھائی وغیرہ اور یہ لوگ زید سے ہندہ کا نکاح ہونے پر راضی تھے یا نہیں؟

۳ زید خاندان وغیرہ کی حیثیت سے ہندہ کا ہم کفو ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے جواب پر حکم نکاح بتلایا جائے گا۔ فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ۔

۵ صفر ۱۳۴۵ھ۔

جواب تنقیح: ۱ رقم کی بابت زید اور اس کے بہنوئی نے کچھ لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ روپیہ دیکر نکاح کیا ہوں بلا رقم خرچ کئے ہوئے بھلا وہ کیوں ہوتا اور ایسا نکاح ہوجانے کے بعد کثرت رائے اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ ضرور کچھ رقم لی گئی اور قبل نکاح زید ہندہ کے باپ کو بہت سے تحفہ تحائف دیتا تھا اور لڑکوں کی شادی نہ تو اس طرح ہوئی ہے جس میں کوئی خاص عزیز مثل بہنوئی خواہ بہن وغیرہ کے نہ شریک کئے گئے ہوں اور نہ اس طرح کا بے جوڑ معاملہ کہ جس سے لڑکی خود انکار کردیوے اور زبردستی نکاح مشہور ہو۔

۲ بروقت نکاح ہندہ کی ماں موجود تھی کہ جس کا ارادہ قطعی نکاح کرنے کا نہیں تھا مگر بلحاظ شوہر کے کچھ بس ودم نہیں مار سکتی تھی سوائے ماں کے اور کوئی دوسرا وارث یا عزیز موجود نہیں تھا۔

۳ زید خاندان کی حیثیت سے ہندہ کا ہم کفو نہیں ہے ہندہ کا حسب نسب زید سے کہیں اچھا ہے، زید وہندہ کے باپ سے کبھی کی جان وپہچان نہ تھی اور نہ آمد ورفت تقریب مابین کبھی تھا۔

دوبارہ تنقیح: زید کس بات میں ہندہ سے گھٹا ہوا ہے دونوں کی ذات کیا کیا ہے اس کے جواب کے بعد حکم بتلایا جاوے گا نیز یہ بھی لکھیں کہ جن لوگوں کے سامنے زید اور اس کے بہنوئی نے اس نکاح میں رقم لینا بیان کیا ہے وہ لوگ دیندار معتبر ہیں یا نہیں؟ فقط ظفر احمد۔

جواب تنقیح دوبارہ: ۱ زید ہندہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ کیونکہ حسب نسب بتیر سے اپنے برادرانہ وغیر برادرانہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے اور اب تک اچھا ہے۔ اور اس کا قاعدہ خاص طریقہ اسلام پر ہے اور فرض اسلام وطریقہ مسلمانی کو باقاعدہ ادا کرتی ہے۔ زید کا حسب نسب معمولی درجہ کا ہے اور قاعدہ بالکل خراب ہے یعنی زید کے یہاں کی عورتیں اکثر بازار جاتا یا

کہیں دوسری جگہ جانا ہو تو بلا کسی پردہ کے اور بلا کسی امداد یعنی دوسرا مرد جوان کے گھر کا ہو اس کے ساتھ نہ جانا بلکہ خود تنہا دوسری جگہ جانا جو دیگر اشخاص کے دیکھنے میں بالکل معیوب بات سمجھی جاتی ہے اور بات چیت بالکل اہل ہنود کے قاعدہ سے ملتی ہے۔

ع۲ زید و ہندہ ہم قوم ہیں اور شیخ کہے جاتے ہیں۔

ع۳ رقم کے بابت زید اور اس کے بہنوئی نے ایسے شخص کے سامنے بیان کیا ہے جو دیندار اور نہایت معتبر شخص ہیں اور احکام خدا اور رسول سے واقف ہیں علاوہ بریں اور کئی جگہ رقم کا تذکرہ برادری و غیر برادری میں بذریعہ زید و اس کے عزیزان مثلاً بہن و بہنوئی وغیرہ سے آچکا ہے۔

الجواب ؛ فی الدر المختار (ولزم النکاح ولو بغبن فاحش) بنقص مہرها وزیادة مهره (او) زوجها (بغیر کفؤ ان کان الولی) المزوج بنفسه بغبن (ابا او جدا) وکذا المولی وابن المجنونة (لم یعرف منهما سوء الاختیار) مجانة وفسقاً (وان عرف لا) یصح النکاح اتفاقاً وقال الشامی تحت (قوله وان عرف لا) بعد الاشکال والجواب: والحاصل ان المانع هو کون الاب مشهورا بسوء الاختیار قبل العقد فاذا لم یکن مشهورا بذلك ثم زوج بنته من فاسق صح وان تحقق بذلك انه سیٔ الاختیار واشتهر به عند الناس فلو زوج بنتاً اخری من فاسق لم یصح الثانی لانه کان مشهوراً بسوء الاختیار قبله بخلاف العقد الاول لعدم وجود المانع قبله (ص ۴۹۹ ج ۲)۔

وفی العالمگیریة (ص ۱۸ ج ۲) ولو زوج ولده الصغیر من غیر کفوء بان زوج ابنه امةً او ابنته عبداً او زوج بغبن فاحش بان زوج البنت ونقص من مهرها او زوج ابنه وزاد علی مهر امرأته جاز وهذا عند ابی حنیفة رح هکذا فی التبیین وعندهما لا یجوز فی الزیادة والحط الا بما یتغابن الناس فیه قال بعضهم فاما اصل النکاح فصحیح والاصح ان النکاح باطل عندهما هکذا فی الکافی والصحیح قول ابی حنیفة رح کذا فی المضمرات وفی السطر الاٰتیة منه والخلاف فی ما اذا لم یعرف سوء اختیار الاب مجانةً او فسقاً اما اذا عرف ذلك منه فالنکاح باطل اجماعاً

(وفی تنقیح الفتاوی الحامدیة (ص ۲۲ ج ۱) (سئل) فی هاشمی زوج صغیرته بغیر هاشمی عالما بذلك راضیا به فهل یصح النکاح.

(الجواب) نعم والحالة هذه اھ۔

۲۲

ان سب عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس سوال میں اگر زید کو دین کے اعتبار سے ہندہ کا کفؤ بھی تسلیم نہ کیا جائے (جس کو جواب تنقیح میں مجمل بیان کیا گیا ہے) تب بھی نکاح صحیح ہو گیا پس ہندہ زید سے طلاق لئے بدون دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی کیونکہ ہندہ کے والد کی طمع (اگر وہ ثابت ہو جاوے) اسی نکاح ہندہ میں معلوم ہوئی ہے اس سے پیشتر اس سے ایسا واقعہ نہیں ہوا جو سوء اختیار کی شرط ہے۔ واللہ اعلم کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔ ۱۵ ربیع الاول ۴۵ھ۔

باپ نے ایک جگہ نکاح کی وصیت کی تو ولی دوسری جگہ لڑکی کا نکاح کر سکتا ہے

سوال (۲۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ پھول بہار کے والد بنام عبدالجلیل نے دختر مذکور کی نسبت زید سے کی تھی اور مرتے وقت یہ وصیت اس کی والدہ اور دادی سے کی تھی کہ پھول بہار کا نکاح زید سے کرنا کہ جس سے کہ میں نے نسبت کی پس صورت مذکور میں پھول بہار کا ولی نکاح بلا اس کی والدہ کی اطلاع کے اس کے والد کی وصیت کے خلاف پھول بہار کا عقد کسی دوسرے سے کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ؛ اس وصیت پر عمل ضروری نہیں ہے اس لئے ولی بلا اطلاع والدہ کے وصیت کے خلاف کر سکتا ہے البتہ اگر اوس جگہ نکاح کرنے میں کوئی شرعی خرابی نہ ہو تو وصیت کا لحاظ کرنا جائز ہے مگر واجب نہیں، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ۔ ۱۹ جمادی الاخری ۴۵ھ۔

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ۔ ۱۹ جمادی الاخری ۴۵ھ۔

باپ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی سے غیر کفؤ میں کر دے تو نکاح منعقد ہو جائیگا

سوال (۲۸) چہ میفرمایند علمائے دین و مفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ زید اور عمر نجیب الطرفین پابند صوم و صلوٰۃ ہیں زید اپنی آبائی خاندان سادات سے ہے اور عمر اپنے آبائی خاندان پٹھان سے ہے زید کی رشتہ داری علاوہ سادات کے دیگر خاندان یعنی پٹھان اور شیخوں سے بھی مشترک ہے علیٰ ھذا القیاس عمر کی رشتہ داری بھی علاوہ پٹھانوں کے خاندان سادات اور شیخوں میں مشترک ہے حتیٰ کہ عمر کا نانا خاندان سادات سے ہے کیا ایسی صورت میں زید کی لڑکی عمر کے لڑکے سے منسلک ہو سکتی ہے یا نہیں جواب باصواب سے مطلع فرمائیے؟

تنقیح:۔ لڑکی بالغہ ہے یا نہیں اگر بالغہ ہے تو وہ اس رشتہ پر راضی ہے یا نہیں اور بالغہ نہیں ہے تو زید لڑکی کی کس مصلحت سے اس جگہ نکاح کرتا ہے یا کسی اپنی غرض سے کرتا ہے مفصل لکھیں اور زید کے باپ دادوں میں، تو کوئی پٹھان تو نہیں کیونکہ رشتہ داری کا مفہوم اس کو بھی عام ہے۔ فقط۔

جواب تنقیح:۔ لڑکی بفضلہ تعالیٰ بالغہ ہے سن پندرھواں سال ہے مگر اس ملک کا یہ رواج نہیں ہے کہ اس کو اس قدر آزادی حاصل ہو کہ اپنے والدین کی موجودگی میں بوجہ شرم و لحاظ کے اپنے تئیں رضامندی ظاہر کر سکے۔

(۲) زید کو کوئی مصلحت یا غرض دنیوی نہیں ہے محض خداوند تعالیٰ کی رضامندی و رضا جوئی درکار ہے بدیں خیال خاندان سادات یا شیخوں میں ہنوز کوئی لڑکا پابند صوم و صلوٰۃ دستیاب نہیں ہوا اور جو ملتے بھی ہیں وہ زمانہ کے بگڑے ہوئے روشن خیال جنٹلمین وضع میں نظر آتے ہیں۔ برعکس اس کے عمر اور اس کے اولاد بفضلہ تعالیٰ نجیب الطرفین اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں لہذا ایسی صورت میں شریعت کیا اجازت دیتی ہے؟

(۳) زید کے آباء و اجداد میں سوائے سادات کے کوئی شیخ یا پٹھان نہیں گذرا البتہ فرقہ اناث سے جملہ مشترک ہیں فقط۔

الجواب: اگر لڑکی بالغہ[عہ] ہے اور باکرہ ہے اور اس کا ولی غیر کفو سے نکاح کرتا ہے اور لڑکی اس نکاح پر خاموش رہے یا زبان سے اس کو منظور کرے تو نکاح صحیح ہے غیر کفو سے نکاح کرنا اس صورت میں مضائقہ نہیں رکھتا، واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۸ رجب ۴۵ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ، ۸ رجب ۴۵ھ

ولی خود نابالغہ سے نکاح کرے تو کس کی ولایت و اجازت سے نکاح ہوگا

سوال (۲۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ عمر نے انتقال کیا ایک زوجہ و دختر مسماۃ ہندہ و برادرزادہ حقیقی مسمیٰ بہ زید و نبیرہ پھوپھی و خالہ زاد برادر چھوڑا ظاہر ہے کہ برادرزادہ حقیقی ولی نابالغہ لڑکی کا ہے اب ولی مذکور کی خواہش ہے کہ اپنا نکاح خود نابالغہ سے کرے دریافت طلب یہ ہے کہ اس نکاح کا ولی کون شخص ہوگا اور

[عہ] یعنی یا اس کو حیض آنے لگا ہو یا پورے پندرہ سال کی ہوگئی ہو اور اگر حیض نہ آتا ہو اور پورے پندرہ سال کی نہ ہو تو نابالغہ ہے اگر ایسا ہو دوبارہ سوال کیا جائے ۱۲ از حضرت مدظلہم العالی

یہ نکاح کس کی اجازت سے ہوگا۔ بحوالۂ کتاب جواب دیں اللہ آپ لوگوں کو اجر دے گا۔

الجواب من بعض العلماء:

صورت مسئولہ میں برادرزادہ حقیقی خود نکاح کر سکتا ہے اور وہ خود اجازت دے گا بشرطیکہ لڑکی نابالغہ کا نقصان کسی قسم کا متصور نہ ہو۔ اور دیانت و امانت سے اس عقد کو کرے اگر برادرزادۂ حقیقی نے نکاح کر لیا اور اس میں نابالغہ کا نقصان ہوا تو بعد بلوغ نابالغہ کو حق فسخ کا ہوگا جیسا کہ عبارت شرح وقایہ جلد ثانی ص۲۱ سے ظاہر ہے وصح انکاح الاب والجد عند عدم الاب الصغیر والصغیرۃ بغبن فاحش فی المھر او من غیر کفوٴ لا لغیرھما ای لا یصح لغیر الاب والجد انکاح الصغیر والصغیرۃ بغبن فاحش فی المھر او من غیر کفو اتفاقاً واللہ اعلم بالصواب کتبہ عبدالحمید غفرلہ ساکن قصبہ نگرھنہ،

لقد اصاب من اجاب محمد عبدالاحد کان اللہ لہ۔ ساکن قصبہ نگرھنہ۔

۲۷ شوال سنہ ۱۳۲۸ھ۔

رد من بعض العلماء:

مفتی نے جو یہ جواب لکھا ہے کہ صورت مسئولہ میں برادرزادۂ حقیقی خود نکاح کر سکتا ہے اور وہ خود اجازت دے گا بشرطیکہ لڑکی نابالغہ کا نقصان کسی قسم کا متصور نہ ہو اور دیانت و امانت سے اس عقد کو کرے اہ نمعلوم مفتی رحمنا اللہ ولہ کا اس انعقاد سے کیا مراد ہے اگر عقد لازمی مراد ہے تو عقد لازم نہ ہوگا موقوفی ہوگا۔ اور مفتی رحمنا اللہ ولہ نے جو یہ جواب دیا ہے کہ۔ اگر برادرزادۂ حقیقی نے نکاح کر لیا اور اس میں نابالغہ کا نقصان ہوا تو بعد بلوغ نابالغہ کو حق فسخ کا ہوگا۔ یہ مفتی رحمنا اللہ ولہ کا تساہل ہے کیونکہ اگر چچیرے بھائی نے نابالغہ سے غبن فاحش مہر میں اپنے ساتھ نکاح کر لیا تو یہ نکاح باطل ہوگا موقوفی نہ ہوگا اسی واسطے وقایہ متن والا بولتا ہے صح انکاح الاب والجد عند عدم الاب الصغیر والصغیرۃ بغبن فاحش فی المھر او من غیر کفوٴ لا لغیرھما۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اگر چچیرے بھائی نے نابالغہ سے مہر میں غبن فاحش کر کے نکاح کر لیا تو یہ نکاح صحیح ہوگا۔ جیسا کہ شرح وقایہ میں ہے وان فعل غیرھما فلھما ان یفسخا بعد البلوغ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شارح وقایہ سے یہاں وہم واقع ہوا ہے جو اس نکاح کو صحیح ہونا بتاتا ہے حالانکہ نہ لازماً نہ موقوفاً کوئی نکاح نہیں ہوا۔ چنانچہ درمختار میں ہے وان کان المزوج غیرھما ای غیر الاب و ابیہ لا یصح النکاح من غیر کفوٴ وبغبن فاحش اصلا وما فی صدر الشریعۃ صح

ولهما فسخه وهم وان کان من کفوء بمهر المثل صح ولکن لهما ای الصغیر وصغیرة خیار الفسخ بالبلوغ او العلم بالنکاح بعده انتہے ملخصًا۔

اور در مختار کی شرح شامی میں ہے قوله صح ولهما فسخه ای بعد بلوغهما والجملة قصد بها لفظها مرفوعة المحل علی انها بدل من ما او محکته بقول محذوف ای قائلا وقوله وهم خبر عن ما وعبارة صدر الشریعة فی متنه وصح انکاح الاب و الجد عند عدم الاب الصغیر والصغیرة بغبن فاحش ومن غیر کفوء لا غیرهما وقال فی شرحه ای لو فعل الاب او الجد عند عدم الاب لا یکون للصغیر والصغیرة حق الفسخ بعد البلوغ وان فعل غیرهما فلهما ان یفسخا بعد البلوغ اه ولا یخفی ان الوهم فی عبارة الشرح وقد نبه علی وهمه ابن الکمال وکذا المحقق التفتازانی فی التلویح فی بحث العوارض وذکر انه لا یوجد روایة اصلا و اجاب القهستانی بان صحته بالغبن الفاحش نقلتها فی الجواهر عن بعضهم و بغیر کفوء نقلتها فی الجامع عن بعضهم قال وهذا یدل علی وجود الروایة اه قلت وفیه نظر فان ما کان قولا لبعض المشائخ لا یلزم ان یکون فیه روایة عن ائمة المذهب ولا سیما اذا کان قولا ضعیفًا مخالفا لما فی مشاهیر کتب المذهب المعتمدة انتهی کلامه، وقال فی هامش شرح الوقایة وهذا یدل علی وجود الروایة وفیه انه قول غیر معتبر والاصح بطلان انکاح غیرهما بغبن فاحش ومن غیر کفوء من اصله انتهی۔

اب صورۃ مسئولہ کا جواب لکھا جاتا ہے کہ نابالغہ کا چچیرا بھائی جو ولی ہے اگر وہی اپنے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو ایسی صورت میں بھی ولی چچیرا بھائی ہی ہوگا اور اپنے ساتھ اپنی اجازت سے مہر بالمثل میں نکاح کر سکتا ہے مگر نابالغہ کو اختیار ہے کہ بعد بلوغ اس نکاح کو قائم رکھے یا فسخ کردے۔ ہدایہ میں ہے ویجوز نکاح الصغیر والصغیرة اذا زوجهما الولی فان زوجهما الاب او الجد یعنی الصغیر والصغیرة فلا خیار لهما بعد بلوغهما و ان زوجهما غیر الاب والجد فلکل واحد منهما الخیار اذا بلغ ان شاء اقام علی النکاح وان شاء فسخ انتهی ملخصا اور جاننا چاہئے کہ صورت مسئولہ میں چچیرا بھائی نابالغہ کا ولی واصل ہے یعنی خود اپنے ساتھ اگر مہر بالمثل میں نکاح کرنا چاہتا ہے تو یہ نکاح

صحیح ہوگا مگر نابالغہ کو بعد بلوغ فسخ وعدم فسخ کا اختیار ہے شرح وقایہ میں ہے ویتولی طرفی النکاح واحد لیس بفضولی من جانب وهو علی اقسام منها ان یکون الواحد اصیلا وولیا کابن العم یزوج بنت عمه الصغیرة انتهی بتغیر ما۔ حاصل کلام اگر چچیرا بھائی نابالغہ چچازاد بہن سے مہر بالمثل میں یا بغیر نقصان فاحش نکاح کرے گا تو صحیح ہوگا ورنہ نہیں واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ کتبہ عبد الرشید بن شوق نیموی عظیم آبادی رحمہما اللہ تعالیٰ ۳۰ شوال ۱۳۴۸ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

الجواب من جامع امداد الاحکام

الجواب الثانی صحیح۔ ولکن خیار الفسخ بعد البلوغ یقتضی قضاء القاضی ویتوقف علیه ولا تنفرد المرأة بفسخ نکاحها بعد البلوغ بدون القضاء و لیس لنا فی الهند قاض شرعی یتولی فسخ مثل هذا النکاح، واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ۔ ۱۵ ذیقعدہ ۴۸ھ۔

دھوکہ سے غیر کفو میں نکاح ہوگیا تو لڑکی اور اولیاء کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا

سوال (۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ بالغہ کا نکاح اس کے سوتیلے باپ نے زید کے ساتھ کردیا جس نے اپنے کو شیخ انصاری بتلایا بعد نکاح معلوم ہوا کہ زید نوربافِ ہے چونکہ یہ نکاح لاعلمی میں غیر کفو میں ہوگیا کیا شرعًا یہ نکاح درست اور جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صورت مسئولہ میں نکاح تو ہوگیا لیکن چونکہ زید نے ہندہ کو اور اس کے اولیاء کو دھوکہ دیا کہ اپنے کو انصاری ظاہر کیا اور یہی سمجھ کر وہ لوگ نکاح پر راضی ہوئے اس لئے ہندہ کو اور اس کے اولیاء کو اس نکاح کے فسخ کرانے کا حق حاصل ہے وہ عدالت میں دعوی کرکے نکاح کو فسخ کرا سکتے ہیں اگر حاکم عدالت مسلمان ہو تو اس کا فسخ شرعًا بھی معتبر ہے اگر مسلمان نہ ہو تو اس کے بعد ہندہ کو اپنا مقدمہ برادری کی پنچایت کے سامنے بھی پیش کرنا چاہئے جس میں کسی عالم کو بھی شریک کیا جائے برادری اس نکاح کو فسخ کردے گی تو شرعًا نکاح فسخ ہوجائے گا جس کے بعد ہندہ دوسری جگہ اپنا نکاح کفو میں کرسکے گی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ الحیلۃ الناجزہ، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ظفر احمد عفا عنہ۔ ۲۶ رشعبان ۵۶ھ۔

بیان الحق والصواب
فی
مسئلۃ الکفاءۃ بالانساب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مبسملاً وحامداً ومصلیاً۔

مخدوم ومکرم حضرت مولانا! السلام علیکم، چونکہ میرا اور آپ کا نیز کل اہل حق کا اعتقاد یہ ہے کہ سوا انبیاءؑ کے کوئی معصوم عن الخطار نہیں ہے اس لئے اس عریضہ کے لکھنے کی جرأت کرتا ہوں وہ یہ کہ امر مسلّم ہے کہ احکام قرآن کی تنسیخ صرف آیات قرآن سے ہی ہوسکتی ہے حسب لاینسخ کلامی کلام اللہ حدیث متواتر سے بھی قرآن کے احکام نہیں ترک ہوسکتے ہیں اور اس لئے حضرت عمرؓ نے زینب کی حدیث پر عمل نہیں کیا جب یہ امور مسلّمہ ہیں تو کیا استحسان سے نصوص قرآنیہ کو چھوڑنا جائز ہے؟ حال یہ ہے کہ استحسان بھی قیاس ہی کا ایک قسم ہے یقیناً میرا اور آپ کا اعتقاد یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اب عرض یہ ہے کہ تراضی زوجین فی النکاح فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم کے نص صریح سے ثابت ہے اور اس لئے کل فقہاء نے بالاتفاق نکاح کے

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کلامی لا ینسخ کلام اللہ حدیث صحیح بھی نہیں، متواتر تو کیا ہوتی اس کی سند میں ایک راوی متّہم بالوضع ہے ملاحظہ ہو تنقیح المشکوٰۃ ص ۴۵، اور آیت فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَھُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ الآیۃ ثیبات کے متعلق ہے جو پہلے ذات ازواج رہ چکی ہیں اس سے مطلقاً تراضی کے اشتراط پر استدلال کرنا عربیت سے نادانی پر مبنی ہے۔ فقہاء نے تراضی کو ضرور شرط کیا ہے مگر وہ شرط عام ہے خواہ تراضی زوجین ہو اگر دونوں حر اور بالغ ہوں یا تراضی اولیاء وموالی ہو اگر نابالغ یا غلام باندی ہوں اس آیت سے فقہاء کے اس قول کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ آیت مطلقاً ثیبات بالغات کے حق میں ہے۔ اور اگر بالفرض اس سے مطلقاً اشتراط تراضی پر استدلال کیا جائے تو آگے بالمعروف کی قید بھی تو مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ تراضی مطلقاً معتبر نہیں بلکہ اسی وقت معتبر ہے جبکہ قاعدۂ معروفہ کے

انعقاد میں تراضی زوجین شرط اور قید لگایا ہے وینعقد بایجاب وقبول بالتراضی آپ کے سامنے ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ قبل از بلوغ تراضی نہیں ہے پس اگر کسی نے نابالغ کا نکاح کیا خواہ باپ ہو یا دادا ہو پس وہ نکاح تراضی بعد البلوغ پر موقوف رہنا چاہئے اس لئے کہ باپ دادا کو حق نہیں ہے بغیر مرضی لڑکی کے نکاح کرنے کا خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ چنانچہ خنساء کی حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے اور قرآن کے نص مذکور سے ثابت ہوتا ہے پھر یہ فتویٰ دینا جیسے کہ آپ نے بہشتی زیور میں تقلیداً درج فرمایا ہے کہ اگر لڑکی کا نکاح باپ دادا نے کیا ہو تو بعد بالغ ہونے کے اس کو توڑنے اور فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے کتنی بڑی جرأت ہے کہ نص قرآن تو بآواز بلند تراضی کا اعلان کرتا ہے اور احناف محض تقلید کی وجہ سے ایک صورت میں بدون تراضی نکاح نافذ قرار دیتے ہیں لڑکی بعد بالغ ہونے کے صاف انکار کرتی ہے کہ میرے باپ نے نکاح میری لاعلمی میں قبل از بلوغ کیا ہے وہ مجھ کو منظور نہیں ہے اور احناف کہتے ہیں کہ اگرچہ تم راضی نہ ہو اور اس نکاح کو ناپسند کرتی ہو مگر تم کو توڑنے اور فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے اس لئے کہ تمہارے باپ یا دادا نے کیا ہے تو کیا خدا کے یہاں ابو حنیفہؒ احناف کو اس جرأت علی کتاب اللہ سے نجات۔

موافق ہو اور قاعدہ معروفہ اسلام میں یہی ہے کہ نابالغ لڑکی کا نکاح ولی کی رضا سے ہوتا ہے اور ولی اگر باپ ہو تو لڑکی کو بعد بلوغ کے اختیار نہیں ہوتا جیسا آئندہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے اس کا ثبوت آتا ہے اسی قید بالمعروف سے حنفیہ نے یہ کہا ہے کہ اگر عورت مہر مثل سے کم پر یا غیر کفوء سے نکاح پر راضی ہوجائے تو یہ رضا معتبر نہیں کیونکہ خلاف معروف ہے اس وقت ولی کو حق عضل حاصل ہوگا۔ پس اذا تراضوا بینھم کو دیکھ لینا اور بالمعروف سے قطع نظر کرنا علم نہیں ہے جہل ہے۔ قال ابن العربی المالکی فی احکام القرآن لہ قولہ تعالیٰ اذا تراضوا بینھم بالمعروف یعنی اذا کان کفوءً لھا لان الآیۃ نزلت فی ثیب مالکۃ امرھا فدل علی ان المعروف المراد بالآیۃ ھو الکفاءۃ وفیھا حق عظیم للاولیاء لما فی ترکھا من ادخال العار علیھم وذلک اجماع من الامۃ اھ ص ۱۸۵ ج ۱ وانکحوا الایامیٰ منکم میں اولیاء کو خطاب ہے کہ جن عورتوں کے شوہر نہ ہوں ان کا نکاح کردو۔ ایم عام ہے ہر غیر ذات زوج کو۔ آگے ارشاد ہے والصالحین من عبادکم وامائکم اپنے غلام اور باندیوں

دلا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں. پھر کیونکر ایسی تقلید کورانہ کی وجہ سے عُسر کے تنگ احاطہ میں مسلمانوں کو قید کیا جاتا ہے اور یُسر کے میدان وسیع میں جانے کی اجازت نہیں دیتے ہیں؟ قرآن تو یوں فرماتا ہے ویوم ینادیھم فیقول ماذا اجبتم المرسلین کیا یہ بھی کہیں سے ثابت ہے کہ خدا ائمہ اربعہ یا اور کسی بزرگ کی تقلید کے بارے پوچھے گا؟

دوسری عرض یہ ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم عام ہے اور اس کا یہی معنی ہے کہ اکرم عند اللہ فی الدنیا والآخرۃ متقی اور پرہیزگار ہے خواہ وہ کوئی ذات ہو عرب یا عجم یا جولاہا یا دھنیا یا شیخ یا پٹھان یا شیخ یا سید یا علوی یا انصاری یا اور کوئی کلمہ گو ہو اور احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح ہے. فاظفر بذات الدین سے عام بذات الدین مراد ہے خواہ کوئی ذات اور کوئی قوم ہو اور کوئی پیشہ کرتا ہو اس سے نہ آپ انکار کر سکتے ہیں نہ اور کوئی منصف مزاج مسلمان اور انکاح میں جو یہ ارشاد ہے اذا وجدت لھا کفوًا اس سے

میں سے جو نیک ہوں ان کا بھی نکاح کر دو اسی سے یہ معلوم ہوا کہ نابالغہ اور غلام باندی کے نکاح میں ولی اور مولیٰ کی رضا کافی ہے نابالغہ اور غلام باندی کی رضا شرط نہیں ورنہ یہاں بھی اذا تس اضوا کی شرط مذکور ہوتی. احناف اور شوافع وغیرہم جو مجتہدین کے واسطے سے قرآن و حدیث کو سمجھتے ہیں وہ جرأت علی اللہ نہیں کرتے، جرأت علی اللہ وہ کرتے ہیں جو محض قرآن و حدیث کا ترجمہ دیکھکر مجتہد بنے بیٹھے ہیں حالانکہ وہ محض مطالعۂ ترجمہ سے نہ طبیب و ڈاکٹر بن سکتے ہیں نہ وکیل و بیرسٹر، یہ محض دین سے بے اعتنائی ہی تو ہے کہ ہر شخص اس میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

آیت ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم میں فخر بالانساب کی ممانعت ہے مسئلہ کفارت کی نفی کہاں ہے. اور جو شخص مسئلہ کفارت کو فخر بالانساب سمجھتا ہے وہ جاہل ہے مسئلہ کفائت کا مدار اسی تعارف پر ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا. جس سے معلوم ہوا کہ شعوب و قبائل کو تعارف میں دخل ہے اور نکاح کی بنیاد ہی تعارف پر ہے بدون تعارف کے جو نکاح ہوگا اس میں مقصد نکاح فوت ہوگا زوجین میں الفت

ع۵ (حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وہی ذات الدین مراد ہے چنانچہ دوسری حدیث صحیح میں اس کی تصریح ہے اذا خطب الیکم من ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد عریض. ہر مومن باللہ ورسولہ سے اس حدیث میں ہر اس مسلمان کو ارادہ کرے گا جو موصوف بالدین المرضی والخلق المرضی ہو خواہ وہ کوئی ذات ہو پس یہ تفریق بین المومنین جو آپ نے تقلیداً بہشتی زیور میں درج کیا ہے کہ فلانے کے یہاں نکاح بے جوڑ ہے اور فلانے کے یہاں با جوڑ ہے اور نصوص قرآن و حدیث پر غور نہیں فرمایا ہے اس کا جواب خدا کو دیں گے کیا ابو حنیفہ یا صاحب ہدایہ وغیرہ کی تقلید حجت عند اللہ ہو سکتی ہے؟ ہاں مولانا یہ جو کچھ ہے کفار اور زمانۂ جاہلیت کا رسم بد ہے جو بد نصیبی اور تقلید کورانہ سے مسلمانوں میں چلی آتی ہے آپکے سامنے حدیث صحیح موجود ہے جس میں آنحضرتؐ نے فخر بالانساب کو مانند ضحک عن الضرطۃ زمانۂ جاہلیت یا کفار کا رسم بد قرار دیا ہے پر کیونکر نصوص قرآن و حدیث سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور محض رسم و رواج کی بنا پر اور تقلید کورانہ کی وجہ سے وہ چیز جس کو آنحضرتؐ

و محبت نہ ہوگی اس لئے نکاح میں تعارف کی ضرورت ہے جو شعوب و قبائل پر مبنی ہے، اس سے کسی خاندان پر کسی خاندان کی ایسی فضیلت لازم نہیں آتی کہ عمل ہی سے استغنار ہو جائے ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کا یہی مطلب ہے. پس جو لوگ اس آیت سے ابطال کفارت پر استدلال کرتے ہیں وہ قرآن میں اپنی رائے سے زیادتی کرتے ہیں. اگر وہ تدبر سے کام لیتے تو اسی آیت سے کفارت کے مسئلہ کو سمجھ لیتے.

فاظفر بذات الدین میں مردوں کو خطاب ہے کہ دیندار عورت کو تلاش کرو. اور مردوں کے واسطے فقہاء نے کفارت کی شرط کہاں لگائی ہے، مرد جس مسلمان عورت سے چاہے نکاح کر سکتا ہے، کفارت کی شرط عورتوں کے واسطے ہے، اس سے اس حدیث میں کچھ تعرض نہیں اور جو شخص اس سے عورتوں کے لئے خطاب سمجھے وہ عربیت سے محض نابلد ہے. البتہ اذا خطب الیکم من ترضون دینہ وخلقہ میں عورتوں کی بابت مردوں کو خطاب ہے کہ جب تمہارے پاس

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) حدیث میں ہے الارواح جنود مجندۃ ما تعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف فلا دلیل علی کون التعارف فی الآیۃ مخصوصًا بتعارف الاشخاص بل ھو عام لتعارف الارواح والاشخاص جمیعًا ۱۲ ظ

کفار جاہلیت کی رسم بد فرماتے ہیں حکم اسلام اعتقاد کیا جاتا ہے اور فقہاء نے جو احادیث اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں کفارت کے بارے میں ان کو کون تسلیم کر سکتا ہے جو نصوص قرآن و احادیث صحیحہ سے خلاف ہیں۔

کوئی ایسا شخص پیغام لائے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے اپنی عورتوں کی شادی کر دو۔ مگر یہاں فقط دین پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ خلقہ بھی فرمایا گیا ہے، اور مشاہدہ ہے کہ شعوب و قبائل کے اخلاق میں باہم زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، ایک قریشی سید کے جو اخلاق عالیہ ہوں گے وہ کسی جلاہے یا تیلی کے نہیں ہو سکتے، اس قید سے خود کفارت کے اعتبار پر اشارہ موجود ہے مگر کوئی نہ سمجھے تو اس کا کیا علاج؟ نیز اس حدیث میں لفظ فزوجوہ اس بات کو بھی بتلا رہا ہے کہ نکاح میں ولی کی رضا کافی ہے کیونکہ یہاں اولیاء ہی کو خطاب ہے پس نا بالغ لڑکیوں کی رضا کو شرط بنانا حدیث میں رائے کو دخل دینا ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ابو حنیفہؒ اور صاحب ہدایہ نے جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن سے سمجھ کر کہا ہے، مگر یہ اس چودھویں صدی کی حریت اور آزادی کا اثر ہے کہ اخلاف امت سلف کو تو بُرا کہتے ہیں اور اپنی رائے سے دین کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر بالانساب کی ضرور مذمت کی ہے مگر اعتبار کفارت کی مذمت نہیں فرمائی اور دونوں کو ایک سمجھنا سراسر جہالت ہے کیا حدیث میں یہ نہیں ہے

ائمہ احادیث نے شکر اللہ سعیہم ان چھ کتابوں میں انہی احادیث کو درج کئے ہیں جو ان کی تحقیق اور تنقید میں صحیح تھیں اور جن کو اس وقت تک اہل السنہ والجماعۃ مانتے چلے آتے ہیں پس ان سے خلاف جو احادیث فقہاء نے نقل کئے ہیں ان کو کون تسلیم کر سکتا ہے حضرت مولانا اگر آپ قرآن اور احادیث صحیحہ پر غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کفارت کے مسائل جو فقہاء نے درج کئے ہیں شاید ان میں سے ایک آدھ قابل عمل ہو۔ قرآن کے بارے خدا فرماتا ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مدکر۔ پس قرآن تو ہر ذی عقل

الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا اور حدیث میں یہ نہیں ہے الائمۃ من قریش اور کیا قرآن میں نہیں ہے لا یستوی منکم من انفق قبل الفتح و قاتل۔ جس میں مہاجرین کو غیر مہاجرین سے افضل کہا گیا ہے، کیا قرآن میں نہیں ہے، ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون، جس میں عالم کو جاہل سے افضل کہا گیا ہے، کیا قرآن میں نہیں ہے ام نجعل المتقین کالفجار، جس میں صلحاء کو فاسقوں سے افضل کہا گیا ہے یہی وہ امور ہیں جن کی کفارت میں رعایت ہے۔

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ مسئلہ کفارت صرف احادیث ہی نہیں بلکہ نص قرآن سے بھی ثابت ہے مگر کوئی نہ سمجھے تو اس کا کیا علاج؟ کفارت کے متعلق جو احادیث ہیں ان میں سے ایک آدھ بھی قابل عمل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کیا کافی نہیں؟ پھر اس کا انکار کرنے والا منکر حکم رسول ہوگا یا نہیں:

ولقد یسرنا القرآن للذکر کی جو تفسیر آپ نے سمجھی ہے وہ تفسیر بالرائے ہے، یقیناً قرآن عربی فصیح و بلیغ ہے، اس کا سمجھنا فصحاء و بلغاء عرب ہی کا منصب ہے محض ترجمہ

عربی دان بخوبی سمجھ سکتا ہے خدا نے قرآن میں جو یہ فرمایا ہے انا خلقناکم الآیۃ اور شعوب اور قبائل بنایا ہے یہ صرف تعارف کے لئے ہے نہ تفاضل کے لئے ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو ایمان لایا وہ ہر مسلمان کا کفو ہوا اور ہر مسلمہ کا نکاح اس سے با جوڑ ہے نہ بے جوڑ خواہ وہ عرب ہو یا عجم یا جولایا یا دھنیا یا اور کوئی پیشہ کرتا ہو۔

ہاں احادیث میں جو خلق مرضی اور دین مرضی کفارت فی النکاح کا معیار قرار دیا گیا ہے وہ ضروری اور قابل لحاظ ہے اور طول بالمال اور استطاعت بالبارۃ بھی شرط ہے اور قرآن وحدیث سے ثابت ہے مگر یہ جو احناف نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ اکفار نو مسلم کے لئے کم از کم ابوان فی الاسلام

جاننے سے قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا چنانچہ اوپر آیات واحادیث گذر چکی ہیں جن کے سمجھنے میں آپ نے غلط فاحش کا ارتکاب کیا ہے، پھر قرآن اگر ذکر کے لئے آسان ہے تو کیا استنباط احکام کے لئے بھی آسان ہے؟ جو اس کا دعوی کرے یقیناً جرأت علی اللہ کا ارتکاب کرتا ہے ذکر و استنباط میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ کافروں سے مسلمان عورتوں کا نکاح نکرو۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ اسلام لانے کے بعد سب کے سب برابر ہیں جو یہ دعوی کرتا ہے وہ قرآن میں اپنی رائے سے اضافہ کرتا ہے، پھر ولا تنکحوا میں صاف اشارہ ہے کہ عورتوں کا نکاح کرنا نکرنا مردوں کے ہاتھ ہے اسی لئے تو مردوں کو خطاب کیا گیا کہ تم ان کا نکاح کافروں سے نکرو۔

حدیث میں خلق مرضی کی رعایت کا حکم ہے وہی تو فقہاء کی شروط کفارت کی دلیل ہے کیونکہ شعوب وقبائل کے اخلاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

حضرات صحابہ تو سب کے سب ایسے ہی تھے کہ کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اس لئے وہ سب کفو تھے ان میں کسی کے

ہونا چاہئے جو نص قرآن سے بالکل خلاف ہے کیوں مانا جاتا ہے صحابہ کرام کے پاک دماغوں میں ہرگز یہ خلاف نصوص خیالات نہ تھے بلکہ لاکھوں کو مشرف باسلام کیا اور جو مسلمان ہوا اگرچہ اس کا باپ کافر ہو وہ کل اہل اسلام کا کفو اور حقوق میں مساوی ہوتا تھا خود صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ کا باپ ابو قحافہ مکہ میں کفار کے ساتھ تھا اور غالباً وہ فتح مکہ سے قبل اسلام نہیں لایا تھا مگر حضرت ابوبکر پر کسی نے یہ طعن نکیا کہ تمہارا باپ کافر ہے اس لئے تم ہمارا کفو نہیں ہو ایسے ہزارہا امثلہ موجود ہیں اور آپ کے سامنے ہیں پھر کیونکر تقلید کورانہ کی وجہ سے نصوص قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ کرام بالائے طاق رکھا جاتا ہے اور تفریق بین المومنین کے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں فرقہ ناجیہ حسب ھم الذین علی ما انا علیہ واصحابی وہی ہیں جو صحابہ کرام کے تعامل کو اپنا دستور العمل بناتے ہیں اور واللہ باللہ ثم باللہ کہ صحابہ کرام میں کفارت کے یہ خیالات نہ تھے جن کو احناف نے اپنا ایمان واسلام قرار دیا ہے۔

باپ کے کافر ہونے سے دوسرے پر فوقیت لازم تھی لہذا وہاں ابوان فی الاسلام معیار کفارت کیونکر ہوتا اس کا ثبوت دینا چاہئے کہ صحابہ نے نکاح میں عرب وعجم کا بھی لحاظ نہیں کیا اور حنفیہ کے پاس اس کی دلیل موجود ہے کہ اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ روی البزار بسند۲ عن سلمان رضی اللہ عنہ قال نفضلکم یا معاشر العرب لتفضیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ ایاکم فلا ننکح نساءکم ولا نؤمکم فی الصلوۃ قال الحافظ ابن تیمیۃ فی اقتضاء الصراط المستقیم وھذا اسناد جید ورواہ الثوری عن ابی اسحق عن ابی لیلی عن سلمان انہ قال فضلتمونا یا معاشر العرب باثنین لا نؤمکم ولا ننکح نساءکم اھ ص ۷۶۔ حافظ ابن تیمیہ نے بتلایا ہے کہ یہ حدیث ان فقہاء کی حجت ہے جو کفارت میں عربیہ کا عجمی کے مقابلہ میں لحاظ کرتے ہیں اور جو شخص احادیث صحیحہ کو صرف صحاح ستہ میں منحصر کرتا ہے وہ اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے، مؤطا مالک، مسند احمد، مسند شافعی، مسند ابی حنیفہ، مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند بزار، مسند ابی یعلی جامع سفیان ثوری، جامع وکیع ومستدرک حاکم وغیرہ میں ہزارہا احادیث صحیحہ موجود ہیں۔

آج کل آریہ سماجی پلیٹ فارم کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ اسلام لانا اپنے آپ کو نہ صرف عقبیٰ کے عذاب میں گرفتار کرنا ہی بلکہ دنیا میں بھی عذاب میں پڑ جانا ہے اس لئے کہ تم کو مسلمان اپنی برادری میں شامل نہ کریں گے نہ تم کو لڑکی دیں گے اور نہ تمہاری لڑکی سے شادی کریں گے ہاں آریہ سماجی ہو جاؤ اور شدہ ہو جاؤ تو تم کو ہم دل سے اپنی برادری میں شامل کرتے ہیں تم کو لڑکی دیں گے تمہاری لڑکی سے شادی کریں گے۔ آخرت کے بارے میں تو آریہ سماجیوں کا کہنا اگرچہ غلط ہے مگر دنیا کے بارے بالکل درست ہے اور اس وجہ سے دیگر مذاہب والے اسلام قبول نہیں کرتے ہیں خادم کا چشم (دید) واقعہ ہے بہار کے علاقہ میں کاستون کا ایک خاندان مسلمان ہو گیا جن میں بڑے بڑے لوگ تھے، ایک ان میں خان بہادر وکیل محمد جان تھے ان کو اسلام لانے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کرنے میں بڑی دقت پیش آئی یہ دیکھ کر آریہ سماجیوں نے دعوت ارتداد دی اور کہا کہ تم شدہ اور آریہ ہو جاؤ ہم ابھی تمہاری لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی اچھے سے اچھے گھرانے میں کرتے ہیں مگر چونکہ وہ راسخ الاعتقاد تھے مرتد نہ ہوئے۔

حدیث مذکور میں جو تکن فتنة فی الارض وفساد عریض وارد ہے وہ یہی

آریہ سماج کے مسئلہ کفارت پر اعتراض کرنے سے اگر یہ مسئلہ غلط ہو جائے گا تو ستیارتھ پرکاش اٹھا کر دیکھو اس میں اسلام کے عقائد و عبادات کا بھی مضحکہ اڑایا گیا ہے تو کیا دوسروں کے اعتراض سے اپنے سارے گھر ہی کو برباد کر دو گے تم تو یہ کہتے ہو کہ مسئلہ کفارت کفار کو اسلام سے روک رہا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ قربانی ان کو اسلام سے روکتی ہے تیسرا کہتا ہے کہ ختنہ کا مسئلہ مانع ہو رہا ہے چوتھا کہتا ہے کہ نماز کا حکم مانع ہو رہا ہے تو بس اسلام ہی ان کی خاطر مٹا دو۔

پھر مسئلہ کفارت کا یہ مطلب کس نے بتلایا ہو کہ عورت مسلمہ کا نکاح غیر کفو میں ہو ہی نہیں سکتا اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ نابالغ لڑکی کا نکاح غیر کفو میں نہ کیا جائے کیونکہ نابالغ لڑکی کے نکاح میں تمام مصالح کی رعایت ضروری ہے کیونکہ وہ خود اپنی مصالح کو نہیں سمجھ سکتی۔ اور بالغ عورت کا نکاح غیر کفو میں بدون اس کی مرضی کے نہ کیا جائے، تراضی طرفین کی ضرورت کا تم کو خود اعتراف ہے، نیز عورت بالغہ غیر کفو میں بدون اولیاء کی رضا کے خود نکاح نہ کرے کیونکہ اذا اتاکم من ترضون دینه وخلقه فی وجوه سے رضائے اولیاء کی ضرورت بھی ثابت ہے نیز ترمذی کی حدیث ہے ایما امرأة نکحت

کفارت کے نامشروع مسائل ہیں جو زمانہ جاہلیت کے کفار کی رسم بد ہیں اور حدیث صحیح اس کا گواہ ہے اور اشاعت اسلام کے لئے سد باب ہیں مگر بدنصیبی اور تقلید کورانہ آبائی سے احناف نے ان کو مُنزّل مِنَ اللہ اعتقاد کر لیا ہے۔ یہ میں جو عرض کر رہا ہوں نہ صرف میری رائے ہے بلکہ بڑے بڑے ائمہ سلف کی رائے ہے کفایہ شرح ہدایہ میں سفیان زہری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس کفارت سے جو احناف نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے سخت منکر تھے اور فرماتے تھے کہ عرب اور عجم وغیرہ سب برابر ہیں ان میں تفاضل صرف باعتبار تقویٰ کے ہے، اور کفایہ میں اس کی تردید میں متعدد احادیث ہیں ایک ان میں سے یہ ہے الناس سواسية كاسنان المشط، علامہ شامی جو بڑے حنفی ہیں اس کی تردید کرتے ہیں آپ کے سامنے یہ کتابیں موجود ہیں آپ نے ضرور ملاحظہ کئے ہوں گے علاوہ بریں نصوص احادیث صحیحہ اور نصوص قرآن سے یہ مسائل احناف خلاف ہیں اور جیسے کہ عرض کر چکا ہوں ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا صاف بتاتی ہے کہ ہر کافر اور مشرک بعد ایمان لانے کے ہر مسلم مسلمہ کا کفو ہے۔ اور اس سے نکاح کرنا بے جوڑ نہیں ہے بلکہ با جوڑ ہے بشرطیکہ اس میں دین مرضی اور خلق مرضی ہو اور استطاعت

نفسها من غير ولی فنکاحها باطل باطل باطل، حیرت ہے کہ اہل حدیث نکاح بدون ولی کو جائز نہیں کہتے اور غیر کفو میں بدون ولی کی مرضی کے نکاح کو جائز کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر عورت اور اس کے اولیاء غیر کفو میں نکاح پر راضی ہوں تو اس سے حنفیہ نے کب منع کیا ہے؟ پس آریہ کا اعتراض حنفیہ کے مذہب پر نہیں ہو سکتا حنفیہ تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ تراضی عورت و اولیاء شرط ہے یہ نہیں کہتے کہ نکاح مطلقاً صحیح نہیں، یا عورتوں اور مردوں کو غیر کفو سے راضی نہ ہونا چاہئے۔

سفیان زہری کون ہیں؟ آپ کو نام بھی صحیح نہ آیا، اور اگر کوئی ہو تو میں بتلا چکا ہوں کہ کفارت کا ثبوت احادیث صحیحہ اور قرآن کی دلالت سے موجود ہے اس کے مقابلہ میں حنفیہ پر کسی کا قول حجت نہیں۔

الناس سواسية كاسنان المشط یہ حدیث صحاح میں ہے تو دکھلائی جائے اور غیر صحاح میں ہے تو اس سے احتجاج کا آپ کو کیا حق ہے؟ پھر اس سے مسئلہ کفارت کی نفی کیونکر ہو گئی آدمی سب برابر ہیں مگر پھر بھی علم و جہل، صلاح و فسق اخلاق وغیرہ کا فرق موجود ہے اس فرق سے کیونکر آنکھیں بند کی جائیں گی پھر شعوب و قبائل کا تعارف

خود حضرت لوط ان لوطیوں سے فرماتے تھے هٰؤلاء بناتی هن اطهر لکم حال یہ ہے کہ نہ مذہب ایک اور نہ قومیت، یہ دوسری بات ہے کہ اسلام نے کافر سے نکاح ناجائز کیا اور حضرت لوط کے مذہب میں جائز تھا مگر کفارت فی الاسلام اس طرح پر جیسے کہ احناف نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہاں سے ثابت ہوتا ہے نصوص قرآن وحدیث تو اس کی تردید کرتی ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کی ایک بیوی حضرت یوسفؑ کی والدہ تو ان کے خاندان سے تھیں مگر دوسری کنیز تھیں نہ معلوم کس قوم کی تھیں، جامی فرماتے ہیں۔

بیا بنگر کنیزک زادگان را
ز راہ عقل و دین افتادگان را

جب حضرت یعقوبؑ اپنی اولاد کو لیکر مصر گئے تو یقینی امر ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے گھر میں یہ غیر ممکن تھا کہ سب کی شادی آپس میں ہو بلکہ قبطیوں سے خلط ملط ہوا جیسے حضرت یوسف نے زلیخا امراۃ العزیز سے نکاح کیا جو بت پرست اور قبطیہ تھیں اس طور پر ان کے بھائیوں کے رشتے بھی قبطیوں میں ضرور ہوئے ہوں گے۔ جب حضرت موسیٰ مدین گئے تو وہاں ایک مرد صالح کی لڑکی سے شادی کی جو یقیناً ان کے ہم قوم اور ہم نسب نہ تھے حضرت موسیٰ

هٰؤلاء بناتی سے حضرت لوط کی بیٹیاں مراد نہیں بلکہ اسی قوم کی عورتیں مراد ہے مطلب یہ ہے کہ مرد، مردوں سے مشغول نہوں بلکہ اپنی عورتوں سے متنفع ہوں جو میری بہو بیٹیاں ہیں، اُمت کی عورتیں نبی کے لئے بمنزلہ اولاد کے ہوتی ہیں، اور جب اس وقت نکاح کے لئے اسلام بھی شرط تھا جیسا آپ کو مسلّم ہے کہ بعد میں اسلام نے اس کو شرط کیا تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ بعد میں کفارت کی بھی شرط ہو گئی ہو۔

جن آیات واحادیث سے تم نے ابطال کفارت سمجھا ہے میں بتلا چکا ہوں کہ وہ کفارت پر دال ہیں کما مر

حضرت یعقوب علیہ السلام کی دوسری بیوی غیر خاندان سے تھی یا حضرت یعقوب کی اولاد نے قبطی عورتوں سے نکاح کیا یا حضرت موسیٰ کی بیوی (احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں مگر اہل حدیث کی حدیث دانی ملاحظہ ہو کہ اس کو صرف مشہور کہکر ٹالا جاتا ہے) کس خاندان کی تھیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جُرہم قبیلہ میں شادی کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اقوام کی عورتوں سے نکاح کیا اس کو مسئلہ کفارت سے کیا تعلق؟ یہ سب کچھ دلیل ہے اس کی کہ آپ نے کفارت کے مسئلہ کو مطلق نہیں سمجھا، اس کا ثبوت

اسرائیلی اور وہ مرد صالح نہ معلوم کس قوم کے تھے مشہور تو یہ ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ پیغمبر تھے مگر قرآن میں ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مرد صالح تھے۔

حضرت اسماعیلؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ مکہ معظمہ میں رہے جوان ہونے پر جرہم کے قبیلہ کی کئی عورتوں سے نکاح کیا جن میں سے چند کو طلاق دیا، خود سرور کائنات فخر موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قولاً اپنی امت کو فخر بالانساب کے رسم بد سے ڈرایا اور فرمایا کہ یہ زمانۂ جاہلیت کے کفار کی رسم بد ہے بلکہ فعلاً آپ نے مختلف اقوام کی عورتوں کو اپنے حرم نبویؐ میں داخل کیا تاکہ امت محمدیؐ سے یہ رسم بد کفارہ جاتا رہے حضرت صفیہ یہودی تھی اور اُمِّ ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ فراعنہ کی قوم میں سے تھیں اور یہ دونوں حرم سرائے پیغمبرؐ میں تھیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے مجوسیہ آتش پرست پارسیہ سے نکاح کیا جس سے سادات کے نسب کا سلسلہ ہے۔

علی ھذا القیاس قرون اولیٰ میں ہزاروں مثالیں ہیں کہ ان بزرگوں نے نکاح میں قومیت کا لحاظ نہ کیا بلکہ حسب ارشاد قرآن فانکحوا ما طاب لکم من النساء جو عورت پسند آئی بشرطیکہ مسلمان ہونے کے

دو کہ حضورؐ نے اپنی کسی نابالغ لڑکی کا نکاح غیر کفو سے کیا ہے یا آپ کی کسی لڑکی نے بدون آپ کی رضا کے غیر کفو سے نکاح کیا ہے۔

قرون اولیٰ میں اس کی ہزاروں لاکھوں مثالیں ہیں کہ مردوں نے ہر خاندان کی عورتوں سے شادی کی مگر اس سے مسئلہ کفارت کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوتا، اس کا ثبوت دیا جائے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنی

اس سے نکاح کیا پس ثابت ہوا کہ نکاح کے کفارت کے بارے احناف نے جو قومیت اور پیشہ اور عرب اور عجم کا فرق اپنی کتابوں میں درج کیا ہے وہ نہ صرف نصوص قرآن و حدیث سے خلاف ہے بلکہ تعامل انبیاء سے اور تعامل قرن اولیٰ سے بھی خلاف ہے۔

اور دیگر ممالک اسلام میں یہ رسم بد کفار جاہلیت کا زیادہ لحاظ نہیں ہے صرف ہندوستان میں ہنود کے اثر سے یہ رسم جاری ہے ظاہر ہر کہ ہندوں میں اس بات کا بڑا احتیاط ہے کہ ہر قوم کی شادی اس قوم میں ہونی چاہئے، یہی رسم ہنود اور کفار مسلمانوں میں جاری ہے اور احناف کی کتابوں میں چونکہ اس کے لئے کچھ مسالحہ ملتا ہے اس لئے دوستوں نے اس کو منزل من اللہ اعتقاد کرلیا ہے اور تفریق بین المومنین کے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا کے نص صریح پر عمل نہیں کر سکتے ہیں۔

اور نص صریح ولا یسخر قوم من قوم سے غافل ہو کے ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بلکہ کمینہ اور رذیل کہکر غیبت اور بہتان کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ اپنی نادانی

نابالغ لڑکیوں کا نکاح غیر کفو سے کیا ہے یا ان کی بالغ لڑکیوں نے بدون رضا ء اولیاء غیر کفو سے نکاح کیا ہے اور اس کو جائز سمجھا گیا، بدون اس کے جو کچھ تم نے لکھا ہے اس سے مسئلہ کفارت کے خلاف نہ تعامل انبیاء کا ثبوت ہوسکتا ہے نہ تعامل خیر القرون کا۔

کفار کی رسم بد تو یہ ہے کہ ان کے مرد بھی اپنی گوت کے سوا نکاح نہیں کرتے۔ مسئلہ کفارت کا یہ مطلب جس نے سمجھا ہو وہ جاہل ہے۔ حنفی مرد ہر خاندان میں نکاح کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں ہزاروں کے گھر میں نومسلم عورتیں موجود ہیں جن کو مسلمان کر کے نکاح میں داخل کیا گیا ہے، مسئلہ کفارت کا جو مطلب ہے وہ بار بار مذکور ہو چکا ہے اس کو اعتصام بحبل اللہ کے خلاف سمجھنا سراسر نادانی ہے بلکہ اس کو اتحاد و اتفاق میں بڑا دخل ہے کیونکہ تعارف کا مدار اسی پر ہے اور بدون تعارف کے اتفاق نہیں ہوسکتا۔

لا یسخر قوم من قوم کو مسئلہ کفارت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر مسئلہ کفارت کو کوئی جاہل فخر بالانساب کا ذریعہ بنائے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے یہ مسئلہ اس کا ذمہ دار نہیں، اگر کوئی شخص نماز پڑھ کر اپنے کو بزرگ اور ولی

اور جہالت اور تقلید کورانہ آبائی سے اس غیبت اور بہتان کو گناہ نہیں خیال کرتے ہیں، بلکہ شیر مادر اعتقاد کرتے ہیں آخر پیغمبر نے غیبت کی تعریف یوں فرمائی ہے ذکرک اخاک بما یکرہ، اور یقینی امر ہے کہ کسی شخص کو جولاہا اور دھنیا وغیرہ کہنا اس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے پس یہ یقینی غیبت ہے اور رذیل اور کمینہ کہنا یقینًا بہتان ہے چنانچہ ارشاد ہے فان لم یکن فیہ ما تقول فقد بہتہ بل اول الذکر الفاظ بھی بہتان ہے اس لئے کہ ان لوگوں کو بھی یہ الفاظ کہے جاتے ہیں جو ان پیشوں سے مطلق تعلق نہیں رکھتے ہیں اور معزز پیشوں میں اچھی اچھی حیثیت رکھتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اسلام جو خدا کا آخری دین ہے اور مسلمانوں کو خیر الامم کا لقب دیا گیا ہے اور اتحاد اور مساوات اور اتفاق اسلام کا اصل الاصول ہے وہ مسلمانوں میں مفقود اور دیگر ملل باطلہ میں بخوبی موجود ہے آریہ سماجیوں کا ذکر تو ہو چکا کہ جو کوئی شدھ اور آریہ ہو اس کو بلا امتیاز

سمجھنے لگے اور بے نمازیوں کو حقیر جاننے لگے تو کیا اس سے نماز کو کہہ دو گے؟ اگر جولاہا، دھنیا، موچی وغیرہ پیشہ کی وجہ سے کسی قوم کا لقب ہے تو جو لوگ ان القاب سے برا مانتے ہیں وہ اپنے جائز پیشہ کو برا سمجھتے ہیں اور جائز پیشہ کو برا سمجھنا خود برا ہے، اور اگر یہ لقب پیشہ کی وجہ سے نہیں ہے کسی اور وجہ سے ہے تو اس وجہ کو ظاہر کر کے بتلایا جائے کہ یہ الفاظ غیبت میں کیونکر داخل ہوگئے؟ کسی پیشہ ور کو اس کے پیشہ کے نام سے یاد کرنا ہرگز غیبت نہیں کتب رجال دیکھو۔ حلاج، نداف، خیاط، اسکاف وغیرہ القاب بلا تکلف محدثین نے استعمال کئے ہیں بلکہ وہ تو اعمیٰ، اعمش، اعرج وغیرہ بھی استعمال کرتے ہیں جب کہ کسی کا لقب مشہور ہو جائے، اور اس کو غیبت نہیں سمجھا گیا۔ کسان کو کسان، بھنگی کو بھنگی، چمار کو چمار ہی کہا جائے گا اور کیا کہا جائے گا؟ فاعتبروا یا اہل الحدیث مدعی الاجتہاد۔

اپنی جماعت میں داخل کرتے ہیں اور بلا تردد اس سے رشتہ داری کرتے ہیں، عیسائیوں میں چمار سے لیکر برہمن اور چھتری شامل ہیں مگر عیسائی ہونے کے بعد قومیت کی جہالت جاتی رہتی ہے اور بلا امتیاز ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور رشتہ داری کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے مگر احناف کے یہ کفارت کے یہ نامعقول مسائل نہ صرف مسلمانوں میں تفریق اور تشتت کا باعث ہیں بلکہ دوسرے اقوام کو اسلام لانے سے روکتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے تو لڑکوں کی شادی کہاں کریں گے؟

آریہ سماج یا عیسائی جیسا کسی قوم کو اپنی لڑکیاں دیتے ہیں دنیا کو معلوم ہے وہ لڑکیاں تو کیا دیتے کسی کو اپنا حقہ بھی نہیں دے سکتے غلط باتیں لکھنے سے واقعات نہیں بدلا کرتے، ہمارے یہاں سیکڑوں ہندو بھنگی چمار مسلمان ہوئے ہیں کسی کو بھی یہ شکایت نہیں کہ مجھے مسلمان عورت نہیں ملتی ہر نو مسلم کو اس کے مناسب مسلمان عورتیں ہمیشہ مل جاتی ہیں، اگر تمہاری طرف نو مسلموں کو مسلمان عورتیں نہ ملتی ہوں تو ان کو ہمارے پاس بھیجدو، اگر وہ واقعی سچے مسلمان ہوں گے ان کو مسلمان عورتیں ضرور مل جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ نہ ہندؤں کو نکاح کا بہانہ ہے نہ عیسائیوں کو سب کو اس کا یقین ہے کہ مسلمانوں کی برابر کسی قوم میں مساوات نہیں مگر جن لوگوں کو اپنے جائز پیشے کا نام بھی ناگوار ہے یہ سب ان کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔

پھر اگر حنفیوں کے مسئلہ کفارت سے ہندؤں کو اسلام سے رکاوٹ ہے تو ہندوستان میں کروڑوں جلاہے، تیلی غیر مقلد موجود ہیں وہ کیوں ان کے سامنے اپنی لڑکیاں پیش نہیں کر دیتے تاکہ ان کو شکایت کا موقعہ نہ رہے، آخر اسلام تو سب ہی کا ہے فقط شریفوں کا نہیں ہے نہ فقط حنفیوں کا ہے، میں بتلا

یہ میں عرض کر چکا کہ قرون اولیٰ میں یہ رسم اور یہ ترتیب کہنا اور رد ق زمانہ جاہلیت کے کفار سے چلا آیا ہے شاید کسی کے خیال میں یہ وسوسہ شیطانی آوے کہ تم نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ بلکہ پیغمبروں نے دوسرے اقوام کی عورتوں سے نکاح کیا ہے نہ یہ کہ اپنی لڑکیوں کا نکاح دوسرے اقوام سے کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کے بارے یہ حکم ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو مگر مسلمان عورتوں کا نکاح ان سے نہیں ہو سکتا۔

پس اہل اسلام کے بارے یہ خیال غلط ہے سب سے بڑھکر تو نص قرآن ہے جس پر ایمان لانا فرض ہے اور قرآن میں یہ صاف حکم ہے و لا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا اور یہ حکم ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن جس کا صاف مطلب بلا تاویل یہ ہے کہ جو مشرک ایمان لاوے خواہ وہ عجم ہو یا عرب اور جو مشرکہ ایمان لاوے خواہ وہ عربیہ ہو یا عجمیہ ان کے ساتھ رشتہ نکاح با جوڑ اور مناسب ہے اور کفارت کے جو قیود احناف نے اپنی کتابوں

چکا ہوں کہ مسئلہ کفارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر کفو میں شادی نہ کرو صرف اتنا مطلب ہے کہ غیر کفو میں بدون رضائے اولیاء و رضائے عورت کے نکاح نہ کیا جائے۔

ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا سے یہ استدلال کرنا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان اپنی لڑکیاں ہر مسلمان کے نکاح میں دیدیا کرتے تھے غلط استدلال ہے آیت کے کسی لفظ سے اس کا ثبوت نہیں ہو سکتا، میں بار بار بتلا چکا ہوں کہ حنفیہ نے جو شروط کفارت کیلئے ذکر کی ہیں نصوص قرآن و احادیث اس کی مؤید ہیں۔ پس جھوٹ اور افترار وہ کرتا ہے جو نہ مسئلہ کفارت کی حقیقت

میں درج کیے ہیں اس نص قرآن سے چونکہ خلاف
ہیں اس لئے وہ جھوٹ اور ناقابل عمل ہیں۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اعلیٰ خاندان
کے مرد اور عورت حسن خلق اور حسن خُلق کے لحاظ
سے زیادہ تر بالا اور برتر ہوتے ہیں اور اسی لئے
خدا نے کوئی پیغمبر چھوٹے گھرانے میں نہیں بھیجا
ہے چنانچہ ارشاد ہے مابعث من نبی الا
فی احساب قومہ اور حسن صوری اور حسن
معنوی، ان دیگر کمالات مرغوبہ ان میں زیادہ
ہوتے ہیں اور صفات حسنہ ان میں زیادہ پائے
جاتے ہیں اور اس لئے عام طور پر لوگ یہ چاہتے
ہیں کہ میرا نکاح بڑھے گھرانے میں ہو یہ بالکل
درست ہے اور قرآن کے اس ارشاد کے مطابق
ہے فانکحوا ماطاب لکم من النساء
یعنی ان عورتوں سے نکاح کرو جو تم کو پسند ہو
مگر یہ امور طبعیہ ہیں اور ہر شخص کی طبیعت کی خواہش
اور رغبت مختلف ہوتی ہے وللناس فیما
یعشقون مذاہب۔ اور اس میں کوئی
ہرج اور مضائقہ نہیں ہے مضائقہ اور ہرج
اور ظلم اور نصوص قرآن وحدیث سے خلاف یہ ہے
کہ مسلمانوں میں کفارت مخترعہ کی وجہ سے تفریق
پیدا کی جاتی ہے اور یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ فلانے
کے یہاں نکاح باجوڑ ہے اور فلانے کے یہاں بے جوڑ
ہے۔ حضرت مولانا آپ نے سیکڑوں تصنیفات
محض خدا کے لئے لکھی ہیں اگر ان مسائل پر آپ

کو سمجھتا ہے نہ قرآن وحدیث کو۔

جبکہ تم کو بھی یہ تسلیم ہے مابعث نبی الا فی
احساب قومہ کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ
شریف خاندانوں میں مبعوث ہوا کرتے تھے،
کوئی نبی چھوٹے گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تو
اس سے خود یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء کے
خاندان کی لڑکیاں چھوٹے خاندانوں میں نہ جاتی
تھیں ورنہ ان کے خاندان دوسروں سے
بڑے کیونکر رہتے چھوٹے اور بڑے خاندان
کا امتیاز باہمی اختلاط کے بعد باقی نہیں
رہ سکتا پس تمہارا وہ قول غلط ہوگیا کہ انبیاء کا
تعامل مسئلہ کفارت پر نہ تھا۔ نیز جب اللہ تعالیٰ
نے انبیاء کے لئے بڑے گھرانوں کو منتخب فرمایا
ہے تو معلوم ہوا کہ کسی خاندان کا بڑا ہونا چھوٹا
ہونا خدا کی طرف سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ
کے نزدیک سب خاندان برابر تھے تو اس
حدیث کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے کہ انبیاء کیلئے
بڑے گھرانے تجویز کئے گئے۔ پس مسئلہ کفارت
کا ثبوت خود حق تعالیٰ کے فعل سے ہوگیا۔
اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسئلہ کفارت
کو تفریق بین الامم کا سبب سمجھنا غلط ہے ورنہ
لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے خود تفریق کی ہے کہ
بڑے گھرانوں میں تو انبیاء بھیجے جلاہوں تیلیوں
میں انبیاء نہ بھیجے۔

غور فرمائیں گے اور جو نصوص قرآن وحدیث
میں نے پیش کی ہیں انہی کے مطابق ایک رسالہ
تصنیف فرمادیں تاکہ مسلمانوں میں سے یہ تفریق فی
کفارۃ النکاح جاتی رہے اور مثل آریوں اور
عیسائیوں کے واعتصموا بحبل اللہ پر عمل
کرکے باہم رشتہ پیدا کریں تو خدا کے یہاں
آپ کو بڑا ثواب ملے گا جو قوم ترقی کے میدان
میں قدم رکھتی ہے وہ اس تفریق کو بالائے طاق
رکھتی ہے قادیانیوں نے بھی اوٹھایا پس آپ
نصوص پر غور فرماکر احناف سے اوٹھائیے۔
ھذا والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ
فردہ الی اللہ والرسول۔

خادم عبداللہ از کالج فیض آباد۔

۴ - ۷ - ۱۳۵۸ھ۔

تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس انتخاب
کا سبب یہ تھا کہ حسن صوری اور حسن معنوی اور
دیگر کمالات مرغوبہ ان میں زیادہ ہوتے ہیں
اور صفات حسنہ ان میں زیادہ پائے جاتے
ہیں اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ بھی ملالو کہ
نکاح میں الفت اور محبت اور تعلق دائم کی
ضرورت ہے اور وہ بدون توافق طبائع کے
نہیں ہوسکتا اور توافق طبائع کا مدار انہی
صفات کے اشتراک پر ہے جس کا انکار مکابرہ
ہے تو اس سے خود مسئلہ کفارت کا ثبوت ہوگیا
اور یہ مقدمہ ہر چند کہ عقلی اور بدیہی ہے مگر
حدیث اذا اتاکم من ترضون خلقہ
ودینہ فزوجوہ سے بھی ثابت ہے کیونکہ
شریف خاندان والی کو چھوٹے خاندان والے
کے اخلاق پسند نہیں ہوسکتے، اگر انصاف
سے غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ کفارت
قرآن وحدیث سے ثابت ہے اس کا انکار
نہیں ہوسکتا والسلام علیٰ من اتبع
الھدیٰ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۶ رجب سنہ ۵۸ھ

تتمہ :- یہ تو اعتراضات کا جواب تھا جس میں ضمناً کچھ دلائل بھی آگئے ہیں اب مستقلاً
کفارت کے دلائل ملاحظہ ہوں :-

(۱) روی مسلم من حدیث واثلۃ بن الاسقع ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من بنی
اسمٰعیل واصطفیٰ من بنی کنانۃ قریشا واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم وزاد الترمذی

ان اللہ اصطفی من ولد ابراھیم اسمٰعیل ومن ولد اسمٰعیل کنانۃ الحدیث قال الحافظ فی التلخیص لایعارض ھذا ما رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ مرفوعًا لینتہین اقوام یفتخرون بآبائھم الحدیث لانہ محمول علی المفاخرۃ المفضیۃ الی احتقار المسلم وعلی البطر وغمط الناس وحدیث واثلۃ تستفاد منہ الکفاءۃ ویذکر علی سبیل شکر المنعم۔

و[۲]روی الترمذی عن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ یا علی لاتؤخر ثلاثا الصلوٰۃ اذا اتت والجنازۃ اذا حضرت والایم اذا وجدت لھا کفوًا ، رجالہ موثقون کما فی الاعلاء وقال البیہقی امثل ما ورد فی اعتبار الکفاءۃ حدیث علی ھذا کذا فی التلخیص ص ۲۶۹ ج ۱ وصححہ الحاکم فی المستدرک واقرہ علیہ الذھبی ص ۱۶۲ ج ۲۔

و[۳]قال الشافعی فی اصل الکفاءۃ فی النکاح حدیث بریرۃ لما خیرت لانھا انما خیرت لان زوجھا لم یکن کفوًا اھ ای لان الراجح عند المحدثین ان زوجھا کان عبدا کذا فی التلخیص ص ۲۶۹ وحدیث بریرۃ متفق علیہ مشھور۔

و[۴]قال ایضا روی الشافعی عن ابن ابی فدیک عن ابن ابی ذئب عن ابن شھاب انہ بلغہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قدموا قریشا ولا تقدموھا ورواہ البیہقی من حدیث علی بن ابی طالب وجبیر بن مطعم وغیرھما وقد جمعت طرقہ فی جزء کبیر اھ ص ۱۲۵ وھذا مما احتج بہ الشافعیۃ علی الکفاءۃ۔

و[۵]قال ابن تیمیۃ فی اقتضاء الصراط المستقیم ص ۷۶ وایضًا فان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لما وضع الدیوان العطاء کتب الناس علی قدر انسابھم فبدأ باقربھم فاقربھم نسبًا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما انقضت العرب ذکر العجم ھکذا کان الدیوان علی عھد الخلفاء الراشدین وسائر الخلفاء من بنی امیۃ وولد العباس الی ان تغیر الامر بعد ذلک وبسبب ھذا الفضل ما اختصوا بہ فی عقولھم والسنتھم واخلاقھم واعمالھم و فیہ دلالۃ علی اعتبار التقدم بالنسب بالاجماع۔

و[۶]روی الخلال بسندہ عن عمر رضی اللہ عنہ قال لامنعن فروج ذوات الاحساب

الا من الاکفاء ، احتج بہ احمد بن حنبل وھو الامام فی الحدیث فقال اذا تزوج المولی العربیۃ فرق بینھما وھو قول سفیان لقول عمر فذکرہ کذا قالہ الموفق فی المغنی ص ۳۷۲ ج ۷ واحتجاج مثل ابن حنبل بحدیث تصحیح لہ
و[۷]استدل ابن الجوزی فی التحقیق علی اعتبار الکفاءۃ بحدیث عائشۃ انہ علیہ السلام قال تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء ولہ طرق عدیدۃ من حدیث انس وعمر بن الخطاب رواہ ابن ماجۃ والحاکم والبیہقی کذا فی العزیزی ھو صحیح علی قاعدۃ السیوطی وصححہ بالرمز فی الجامع الصغیر ص ۱۲۹۔

کیا ان دلائل کے بعد بھی کسی کو یہ کہنے کا منہ ہے کہ بہشتی زیور میں جو مسئلہ کفارت کا ذکر ہے وہ ہندوستان کی ہندو اقوام کا اثر ہے نعوذ باللہ من ذلک۔ سوچنا چاہئے کہ یہ الزام کہاں تک پہنچتا ہے جبکہ حدیث وقرآن سے کفارت کا ثبوت موجود ہے۔ موفق الدین حنبلی امام الحنابلہ نے مغنی میں اعتبار کفارت پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے ، اشتراط کفارت میں تو علماء کا اختلاف ہے مگر اعتبار کفارت میں کسی کا اختلاف نہیں۔ سفیان ثوری کا قول وہی ہے جو امام ابو حنیفہ وغیرہ کا ہے۔ ابن رشد نے بھی کفارت کے اعتبار پر اجماع نقل کیا ہے نفس اعتبار کفارت میں کسی کا اختلاف نہیں اگر کچھ اختلاف ہے تو اس کی تفصیلات وفروع میں ہے ملاحظہ ہو ص ۱۰ ج ۲۔ علامہ ابن العربی مالکی نے آیت وَلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ بالمعروف سے مراد کفارت ہے پھر فرمایا ہے کہ اعتبار کفارت پر امت کا اجماع ہے اور یہ عورت کے اولیاء کا حق ہے ملاحظہ ہو ص ۸۵ ج ۱۔ ابن حزم ظاہری اگرچہ کفارت فی الدین کے سوا کسی کفارت کے قائل نہیں مگر وہ بھی رعایت کفو کو مستحب اور مختار کہتے ہیں قال وانما تخیرنا نکاح الاقارب لانہ فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم ینکح بناتہ الا من بنی ھاشم وبنی عبد شمس وقال اللہ تعالیٰ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اسوۃ حسنۃ ص ۲۴ ج ۱۰۳۔

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ سے کفارت کا ابطال نہیں ہوتا کیونکہ اس میں مردوں کو اختیار دیا گیا ہے عورتوں کو اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کرلیں ، انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم کو نکاح سے کچھ تعلق نہیں یہاں اصلاح اور مصالحت کا ذکر ہے اور اس باب میں سب مسلمانوں کا بھائی بھائی ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے ،

دینی بھائی ہونا کفو ہونے کو مستلزم نہیں۔ فاسق فاجر بھی دینی بھائی ہے مگر نص موجود ہے، افمن کان مومناً کمن کان فاسقاً لایستوون۔

مسئلہ اولیٰ بھی یعنی نابالغہ لڑکی کا نکاح باپ کردے تو اس کو بلوغ کے بعد اختیار نہ ہوگا اجماعی مسئلہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے ابن حزم ظاہری بھی اس کے قائل ہیں جو قیاس واستحسان سے بمراحل دور ہیں اس کو حنفیہ کا استحسان کہنا جہالت ہے، قال فی المحلی وللأب ان یزوج ابنته الصغیرة البکر مالم تبلغ بغیر اذنها ولاخیار لها اذا بلغت قال والحجة فی ذلک انکاح ابی بکر رضی اللہ عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عائشة وهی بنت ست سنین وهذا امر مشهور غنیاً عن ایراد الاسناد فیه فمن ادعی انه خصوص لم یلتفت الی قوله لقول اللہ عز وجل لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ ص ۴۶۰ ج ۹

ولم یثبت انه صلی اللہ علیه وسلم خیرها ولو فعل لنقل کما نقل تخییره لبریرة حین اعتقت قال ابن المنذر اجمع کل من نحفظ عنه اهل العلم ان نکاح الاب ابنته الصغیرة جائز اذا زوجها من کفؤ یجوز له ذلک مع کراهتها وامتناعها ثم ذکر حدیث عائشة تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وانا بنت ست سنین وزوج علی ابنته ام کلثوم وهی صغیرة عمر بن الخطاب (مغنی ص ۳۶۶ ج ۷) والبسط فی المطولات وفیما ذکرناه بالاختصار کفایة لاهل العلم والانصاف والدرایة والحمد للہ ولی الحمد والهدایة وصلی اللہ علی سیدنا النبی محمد وعلی آله واصحابه اولی الفضل والولایة والحمد للہ الذی بعزته وجلالته ونعمته تتم الصالحات۔

باب الوکالۃ بالنکاح

نکاح کے وقت وکیل نے عورت کے نام میں غلطی کردی تو نکاح نہیں ہوا

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ بروقت نکاح ہندہ اور زینب یہ غلطی ہوگئی کہ ہندہ نے جس شخص کے ساتھ نکاح باندھنے کی اجازت دی تھی اس کے روبرو زینب کا نام

لے دیا گیا اور زینب نے جس شخص کے ساتھ اپنا نکاح باندھنے کی اجازت دی تھی اس شخص کے روبرو ہندہ کا نام لے دیا گیا ان دونوں شخصوں میں سے ہر ایک نے قبول کیا ایسے نکاح کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں نکاح نہیں ہوا۔ دونوں کا نکاح دوبارہ صحیح نام کے ساتھ ہونا چاہئے۔ قال فی الدر (ص ۴۵۰ ج ۲) غلط وکیلها بالنکاح فی اسم ابیها بغیر حضورها لم یصح للجهالة وکذا لو غلط فی اسم بنته اھ وفی الشامیة تحت قوله لم یصح۔ والظاهر انه فی مسئلتنا لا یصح عند الکل لان ذکر الاسم وحده لا یصرفها عن المراد الی غیره بخلاف ذکر الاسم منسوبا الی اب آخر فان فاطمة بنت احمد لا تصدق علی فاطمة بنت محمد تأمل وکذا یقال فیما لو غلط فی اسمها اھ۔ وفی العالمگیریة ص ۳ ج ۲ رجل له بنت واحدة اسمها فاطمة قال رجل زوجت منک ابنتی عائشة ولم تقع الاشارة الی شخصها ذکر فی فتاوی الفضیلی انه لا ینعقد النکاح واللہ اعلم بالصواب۔ ۲۲ محرم سنہ ۴۰ھ۔

معتدہ نے کسی کو وکیل بالنکاح بنایا اور جب اس نے نکاح کروا دیا تو اس نے کسی اور دوسرے شخص سے خود نکاح کرلیا تو نکاح اول صحیح ہے یا نکاح ثانی

سوال (۲) ایک بیوہ عورت نے اپنی عدت میں ایک شخص کو وکیل مقرر کرکے کہا کہ میرا نکاح بعد گذرنے عدت کے دین محمد سے کردینا بعد گذرنے عدت کے وکیل نے نکاح مسماۃ کا دین محمد سے کردیا جب عورت کو معلوم ہوا کہ میرا عقد وکیل نے دین محمد سے کردیا ہے تو بعد اس کے دوسرے روز عورت نے اپنی رضا سے ایک اور شخص کے ساتھ اپنا عقد کرالیا آیا نکاح اول جو کہ وکیل مقرر کردہ عورت نے کردیا ہے بعد عدت کے وہ صحیح ہے یا نکاح ثانی جو عورت نے اپنی رضا سے کرایا۔ ہے وہ صحیح ہے مہربانی فرماکر ہر ایک سوال کا جواب عبارت کتب مخصوصہ وحدیث شریف ودلیل شرع کے ساتھ تحریر فرمادیں چونکہ سب لوگ کہتے ہیں کہ آیت اور حدیث سے ثابت کرو بہت لوگ رسومات بری سے خراب ہوگئے ہیں اس لئے عند اللہ حوالہ کتاب وصفحہ ونمبر وغیرہ تحریر فرماکر اپنی مہر ثبت فرماکر مشکور فرمادیں۔ فقط۔

الجواب: صورت مسئولہ میں جب عورت نے ایک شخص کو وکیل بالنکاح کردیا اور اس کو وکالت سے معزول بھی نہیں کیا تو جو نکاح وکیل نے کردیا ہے وہ نافذ ہوگیا اب عورت نے

جو دوسرا عقد اس کے بعد دوسرے شخص سے کیا ہے وہ بالکل درست نہیں ہوا نکاح اول بدستور باقی ہے لیکن اگر عورت اس دوسرے شخص سے ہم صحبت ہو چکی ہے پس اگر اس کو نکاح اول کی خبر تھی تو اس سے علیحدگی کے بعد ایک عدت دوسری اس عورت کے ذمہ ہوگی۔ بعد انقضاء عدت دین محمد کو اس سے وطی جائز ہوگی باقی نکاح دین محمد کا اس عدت میں بھی باقی رہے گا اور اگر دوسرے شخص کو بھی پہلے نکاح کی خبر تھی تو عورت پر عدت ثانیہ واجب نہ ہوگی۔ فی العالمگیریۃ لوتزوج بمنکوحۃ الغیر وھو لا یعلم انھا منکوحۃ الغیر فوطئھا تجب العدۃ و ان کان یعلم انھا منکوحۃ الغیر لا تجب حتی لا یحرم علی الزوج وطیھا کذا فی فتاوی قاضی خان اھ (ص ۹ ج ۲)

۲۲ جمادی الثانیہ سنہ ۴۲ھ۔

بالغہ عورت اگر غیر ولی کے اجازت طلب کرنے پر سکوت اختیار کرے جبکہ غیر ولی نے خود کو عورت کے ولی کا رسول یا وکیل ظاہر نہ کیا ہو اس صورت میں لڑکی کا سکوت اذن سمجھا جائے گا یا نہیں

سوال (۳) ایک شخص سے ولی نے کہا کہ جاؤ لڑکی سے جو بالغہ باکرہ ہے نکاح کی اجازت لے آؤ اور اس کے کان میں یہ بات ڈال دو کہ تیرا نکاح فلاں شخص سے کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ شخص ولی کا وکیل ہوگا یا رسول؟

(۲) اگر یہ شخص جاکر لڑکی سے اتنا ہی کہدے کہ "تیرا نکاح فلاں سے کرتے ہیں" یہ نہیں کہا کہ مجھے ولی نے بھیجا ہے یا میں اس کی طرف سے وکیل یا رسول ہو کر آیا ہوں اور لڑکی نے اس کی بات سن کر سکوت کیا تو اس صورت میں لڑکی کا سکوت معتبر ہے یا نہیں اور یہ سکوت اجازت پر محمول ہوگا یا نہیں؟

الجواب؛ (۱) قال الشامی بعد تفصیل الفرق بین الوکیل والرسول و حاصلہ انہ یصیر وکیلاً بالفاظ الوکالۃ ویصیر رسولاً بالفاظ الرسالۃ و بالامر. لکن صرح فی البدائع ان افعل کذا او اذنت ان تفعل کذا توکیل ویؤیدہ ما فی الولوالجیۃ فذکرہ ثم قال وافاد انہ لیس کل امر توکیلا بل لا بد مما یفید کون فعل المامور بطریق النیابۃ عن الآمر فلیحفظ اھ ص ۶۱۷ ج ۲، وفی البحر ان الرسالۃ لا تتضمن الوکالۃ لانھا فوقھا اھ (ص ۱۴۸ ج ۷)۔

چونکہ ولی کا یہ قول کہ جاؤ لڑکی سے اجازت نکاح لے آؤ یا اس کے کان میں یہ بات ڈال دو۔ محتمل ہے وکالت اور رسالت دونوں کو اور کوئی لفظ صریح موجب توکیل موجود نہیں بجز

امر کے اور امر محتمل طرفین ہے اس لئے اس کلام کو رسالت پر محمول کرنا لازم ہے کیونکہ وہ ادنیٰ ہے والادنیٰ ھو المتیقن۔

(۲) اگر اس شخص نے لڑکی سے جاکر اپنی وکالت یا رسالت کا اظہار نہیں کیا۔ تو اس کے قول کو سنکر لڑکی کا سکوت کرنا مفید اذن نہ ہوگا۔

قال الشامی فالرسول لا بد لہ من اضافۃ العقد الی مرسلہ لما مر عن الدرر من انہ معبر وسفیر بخلاف الوکیل فانہ لا یضیف العقد الی المؤکل الا فی مواضع کالنکاح والخلع والھبۃ والرھن ونحوھا فان الوکیل فیھا کالرسول حتی لو اضاف النکاح لنفسہ کان لہ اھ (ص ۶۱۷ ج ۲)۔

وفی البحر تحت قول الکنز وفیما یضیفہ الی المؤکل کالنکاح وغیرہ یتعلق بالموکل الخ ما نصہ امر والحقوق فی کل لا یستغنی الوکیل عن اضافتہ الی موکلہ لان الوکیل فیھا سفیر محض الا تری انہ لا یستغنی عن اضافتہ العقد الی المؤکل ولو اضافہ الی نفسہ کان النکاح لہ فصار کالرسول وھذا لان الحکم فیھا لا یقبل الفصل عن السبب لانہ اسقاط فیتلاشی فلا یتصور صدورہ من شخص و ثبوت حکمہ لغیرہ فکان سفیراً الی ان قال واشار بالکاف فی قولہ کالنکاح الی بقیۃ افراد ھذا النوع ولذا قال فی الھدایۃ من اخواتہ العتق علی مال الکتابۃ والھبۃ وکذا اذا کان الوکیل من جانب الملتمس اھ ص ۱۵۲ ج ۷

قال ابن عابدین فی حاشیۃ البحر وکذا بقیۃ الصور الآتیۃ یقول الوکیل من جھۃ طالب التملک ھب فلانا او تصدق علیہ او اعرہ او اودعہ او ارھن عندہ کذا او اقرضہ کذا ولو قال ھبنی او تصدق علی او اعرنی الخ یقع لہ لا للمؤکل اھ الی ان قال فعلی ھذا قولھم التوکیل بالاستقراض باطل معناہ انہ فی الحقیقۃ رسالۃ لا وکالۃ فلو اخرج الکلام مخرج الوکالۃ لم یصح بل لا بد من اخراجہ مخرج الرسالۃ کما قلنا وبہ علم ان ذلک غیر خاص بالاستقراض بل کل ما کان تملیکا اذا کان الوکیل من جھۃ طالب التملک لا من جھۃ المملک (ای یعم ۱۲) فان التوکیل بالتملیک صحیح لا بطلب التملک بل ھو رسالۃ ھذا ما ظھر لی ولم ارہ مذکور، قلت وفی الصورۃ المسئولۃ لم یوجد

ما یدل علی کون هذا الاجنبی وکیلا کما قلنا فی الجواب الاول وان سلمنا ان الامر فیہ یدل علی التوکیل فهو وکیل من جانب الملتمس ای من جهة طالب التملك وقد عرفت ان التوکیل بطلب التملك لا یصح بل هو رسالة وقد تقدم ان الرسول لابد له من اخراج الکلام مخرج الرسالة والا لا یکون رسولاً واذا لم یکن رسولاً لم یکن طالبا للاذن من جهة الولی بل من جهة نفسه وهو اجنبی محض فلا یکون سکوت البنت ح علم الرضا لکونه سکوتاً بعد کلام الاجنبی معها لا کلام رسول الولی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحکم۔

۲۷ رصفر ۴۶ھ۔

حکم بایجاب وکیل بالفاظ اذن دادہ است

سوال (۴) بعونہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت تاج العلماء سراج الفضلاء مدظلہ العالی!

شرائط ملازمانہ وضوابط تلازمانہ بجا آوردہ بعد عرض ملازمان ثریا مکان برساندکہ محمد رشید احمد وکیل زبیدہ خاتون مع دو شاہد عادل بحضار مجلس در آمدہ ناطق شدہ زبیدہ خاتون دختر محمد نصیر احمد یک ہزار روپیہ مہر متعین نمودہ بمعرفت من نزد اسد اللہ کہ پسر عبد اللہ اذن نکاح دادہ است واسد اللہ قبول نمودہ پس لفظ اذن نکاح دادہ است از الفاظ ایجاب است یا نہ بابراھینِ قاطعہ بزیر کلک نادر سلک آوردہ این ہیچمدان را سرفراز دارین فرمایند زیادہ آفتاب عنایت درخشان بادا الیٰ یوم التناد۔

الجواب: لفظ اذن نکاح دادہ از الفاظ ایجاب نکاح نیست بلکہ مشعر از توکیل است پس تکلم وکیل بلفظ انشاء لازم بود چون وکیل بعد ازان تکلم بلفظ انشاء نکردہ ایجاب محقق نہ شدہ پس تجدید نکاح لازم است واگر در عرف سائل اذن نکاح بمعنی انشاء نکاح مستعمل است سوال بار دیگر کردہ باید، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۷ ررمضان ۴۷ھ۔

فصل فی الجہاز والمہر

زوجہ کے مہر میں سراً زیادتی کرنا

سوال (۱) کیا حق مہر نکاح کے بعد (دس یا پندرہ سال بعد) ایزاد ہو سکتا ہے جو منکوحہ کے کہنے پر (جو عموماً دیگر وارثان کا حصہ کم کرنے کی خاطر

کیا جاتا ہے) جائز ہے یا نہ اور کیا ایسے مہر کو دیگر ورثاء جائز قرار دیویں یا نہ بالخصوص جو مہر از قسم مکان یا زمین زوج نے خفیہ بذریعہ تمسک بعد مدت دراز نکاح کے تحریر کر دیا ہو اور یہ شرط بھی تحریر کر دی ہو کہ کاغذات سرکار میں داخل خارج کرا دوں گا مگر وہ بھی اپنی پندرہ سالہ بقیہ حیات تحریر تمسک عملدرآمد بھی نہ کرایا ہو اس کو جائز رکھا جاوے یا ناجائز؟ واضح رہے کہ یہ تمسک ایک سوتیلی ماں نے اپنے حق میں کبھی خفیہ تحریر کرایا ہو اور والد مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکوں سے جو دوسری بیوی سے ہوں ذکر تک بھی نہ کیا ہو اور نہ ہی اس کی بابت اپنی باقی ماندہ حیات میں ۱۵ سالہ کاغذات سرکاری میں عملدرآمد نہ کرا دیا ہو۔

۲۴

الجواب: زیادت مہر میں عقد کے بعد جائز ہے خواہ کتنی ہی مدت کے بعد زیادت کی ہو۔ الزیادة فی المهر صحیحة حال قیام النکاح عند علمائنا الثلاثة کذا فی المحیط فاذا زادها فی المهر بعد العقد لزمته الزیادة کذا فی السراج الوهاج هذا اذا قبلت المرأة الزیادة اھ عالمگیریة (ص ۲۹ ج ۲) لیکن جب یہ زیادہ خفیہ طور پر ہوئی ہے اور ورثہ زوج کو اس کا علم نہیں ہے تو عورت کے ذمہ دو گواہ قائم کرنا ہے کیونکہ وہ مدعیٔ زیادت ہے اگر وہ دو گواہ اس پر قائم کر دے کہ زوج نے بعد نکاح کے مہر میں اس قدر زیادت کی تھی یا یہ ثابت کر دے کہ زوج نے زیادت مہر کی تحریر دو گواہوں کے سامنے لکھی تھی اور گواہ بھی اس کی گواہی دیں اور بہر صورت یہ دعویٰ اور گواہی کسی قاضی شرعی کے اجلاس میں ہو اور وہ اس گواہی کو قبول کر لے تو زوجہ مقدار زیادت کو ترکہ سے لے سکتی ہے اور اگر وہ گواہ نہ قائم کر سکے تو بقیہ ورثہ سے قاضی قسم لے کہ ان کو اس زیادت کا علم نہیں اور نہ میت نے یہ تحریر ان کے سامنے لکھی ہے اگر وہ قسم کھالیں تو عورت کا دعویٰ باطل ہے ورنہ اس کا دعویٰ قبول ہوگا اور اگر ورثہ اس کو تسلیم کر لیں کہ یہ تحریر میت کے خط کے مشابہ ہے لیکن اس پر قسم کھالیں کہ میت نے ہمارے سامنے کوئی تحریر نہیں لکھی اور نہ ہم کو اس تحریر کا علم ہے تب بھی ان کی قسم معتبر ہے اور عورت کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ مجرد تحریر کا شریعت میں اعتبار نہیں ہے فان الخط یشبه الخط هکذا فهمته من القواعد ولم ار له جزئیة صریحة فمن وقف علیها فلیحرره واللہ اعلم۔

۲۶ رربیع الثانی ۴۰ھ۔

ناقابلِ جماع عورت کے مہر کا حکم

سوال (۲) ایک شخص نے نکاح کیا تھا بوقت صحبت دیکھا کہ عورت کے صرف پیشاب کا ایک سوراخ ہے اور پستان بھی ہے مگر صحبت کے قابل نہیں تب اس نے اس کو

طلاق دے دیا اب اس کا مہر ادا کرنا واجب ہے یا نہ۔

الجواب: جس عورت کے صرف پیشاب کی جگہ ہے جماع کی جگہ نہیں ہے اس سے خلوت کرنا مؤکد مہر نہیں لہذا جب اس کو طلاق دیدی گئی تو شوہر کے ذمہ نصف مہر ادا کرنا واجب ہے مہر کامل ادا کرنا واجب نہیں قال فی العالمگیریة ومن الموانع لصحة الخلوة ان تکون المرأة رتقاء او قرناء او عضلاء او شعراء کذا فی التبیین ص ۲۴ ج ۲۔

۱۸ محرم سنہ ۴۱ھ۔

ولی صغیرہ کے معاف کردینے سے مہر ساقط نہیں ہوتا

سوال (۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین متین مسئلہ ذیل میں کہ زید نے مسماۃ ہندہ یتیمہ نابالغہ سے نکاح کیا لیکن بوجہ نابالغ ہونے کے خلوت وہمبستری نہیں ہوئی اور ہندہ کسی کے بہکانے سے دن کے وقت بلا اجازت اپنے شوہر کے چوری سے اپنے گھر سے نکل کر اپنی والدہ کے گھر چلی گئی۔ زید نے اس کی اس کی ناجائز حرکت سے ناراض ہوکر ہندہ کے بھائی ولی کو اور والدہ کو اور محلہ کے پنچوں کو جمع کر کے ہندہ کی یہ ناجائز حرکت ظاہر کی، اس پر پنچوں نے بعد دریافت حالات ہندہ کے بھائی اور والدہ کی رائے سے فیصلہ کردیا کہ چونکہ ہندہ بلا اجازت شوہر دن کے وقت گھر سے نکل گئی ہے اور شوہر سے فارغ خطی چاہتی ہے اس لئے ہم کو آیندہ زوجین کے باہمی تعلق قائم رہنے کی امید نہیں ہے اور ہندہ کے پھر نکل جانے کا اندیشہ ہے لہذا طرفین کی رضامندی سے سرکاری کاغذ پر اس طرح پر تحریری فارغ خطی ہوگئی کہ زید سے شوہر کا خرچہ معاف کرادیا اور ہندہ کی طرف سے اس کے بھائی ولی نے مہر کی معافی لکھدی۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر ہندہ کا بھائی ولی یا ہندہ خود بالغ ہوکر کسی کے بہکانے سے زید پر مہر کا دعویٰ کرے تو وہ شرعاً مہر کی مستحق ہوسکتی ہے یا نہیں اور ایسی نابالغہ کے مہر کیلئے جس سے صرف نکاح ہوا ہو خلوت اور ہمبستری نہ ہوئی ہو شرعاً کیا حکم ہے وہ مہر کی مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں اگر زید نے ہندہ کو طلاق دیدی ہے تو ہندہ پر طلاق بائن واقع ہوگئی لیکن ہندہ کے بھائی نے جو ہندہ کی طرف سے مہر کی معافی لکھدی ہے اس سے مہر کی معافی نہیں ہوئی ہندہ اپنے نصف مہر کی مستحق شرعاً ہے قال فی الدر خلع الاب صغیرته بمالها او مهرها طلقت فی الاصح کما لو قبلت هی وهی ممیزة ولم یلزم المال لانه تبرع اھ فان خالعها الاب علی مال ضامنا له ای ملتزما لا کفیلا لعدم وجوب المال علیها صح والمال علیه کالخلع مع الاجنبی فالاب اولیٰ بلا سقوط مهر

لانه لم یدخل تحت ولایة الاب الخ قال الشامی ای سواء کان الخلع علی المهر او علی الف مثلا لکن اذا کان علی المهر فلها ان ترجع به علی الزوج والزوج یرجع به علی الاب لضمانه الخ ص ۹۳۷ ج ۲، قلت وههنا لا یرجع الزوج علی اخ المرأة لانه لم یضمن بل انه ابرأ الزوج من جانب المرأة وهذا لا یدخل فی معنی الضمان۔ والله اعلم۔ ۵ ربیع الثانی۔

مہر کے مطالبہ کے واسطے ڈگری کرنا جائز ہے یا نہیں نیز شوہر کے مفلس ہونیکی صورت میں کیا شوہر کے باپ سے مہر کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے

سوال (۴) اگر کسی دختر کے شوہر کے پاس فی الحقیقت کچھ زر نقد یا جائداد منقولہ وغیر منقولہ نہیں ہے تو اس کے باپ کو شرعاً یہ جائز اور مناسب ہے کہ اگر عدالت انگریزی میں اپنے مطالبہ مہر کی ڈگری کرا کر اس کے شوہر کو بموجب قانون انگریزی قید خانہ میں ڈلوادے کسی صحابی یا سلف صالحین نے کبھی ایسا کیا ہے؟

کوئی شخص اپنی دختر کے شوہر کے باپ کو شرعاً مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے ذمہ کا مہر جبراً اس کی زوجہ کے باپ کو ادا کرے؟

الجواب: دائن کو بیشک اتنا حق ہے کہ اگر مدیون ہٹ دھرمی کرتا ہو اور باوجود قدرت کے دین ادا نہ کرتا ہو تو اس کو حبس کرادے لیکن جب حاکم کو یہ بات محقق ہوجائے کہ مدیون تنگدست ہے تو پھر اس کو قید کرنا جائز نہیں علیٰ هٰذا قید کرانا بھی بصورت مذکور درست نہیں حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ یعنی اگر مدیون تنگدست ہو تو زمانۂ وسعت تک مہلت دینی اس کو ضروری ہے باقی علاوہ مدیون کے دوسرے شخص کو جب تک وہ ضامن نہ ہوجائے قید کرنا یا کرانا درست نہیں قال الله تعالیٰ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یجنی جان الا علی نفسه ولا یوخذ المرء بجریمة غیره او کما قال والله اعلم بالصواب۔

احقر عبد اللطیف عفا الله عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور۔

الجواب صحیح حق عنایت الٰہی عفی عنہ

الاجوبۃ کلہا صحیحۃ احقر ظفر احمد عفا الله عنہ ۸ شوال سنہ ۴۱ھ۔

الزیادة فی مهر احدی الزوجتین بعد العقد هل توجب تسویة الاخری فیها ام لا

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک عورت ہندہ سے پانچ ہزار

روپیہ مہر پر نکاح کیا اُس کے بہت مدت بعد دوسری عورت زینب سے پانچ سو روپیہ مہر پر نکاح کیا اور دونوں کو ان کا مہر ادا بھی کر دیا۔ زینب نے ایک روز ارمان کیا کہ تم نے میرا مہر بہت کم رکھا زید نے اس کی دلجوئی کے لئے یہ قصد کیا کہ تین سو چار سو روپے اس کے مہر میں اور زیادہ کر کے (کیونکہ زیادت بعد العقد بھی اصل کے ساتھ بتصریح فقہا ملحق ہو جاتی ہے) اتنی رقم یعنی تین سو چار سو اُس کو اور دیدوں خواہ نقد یا کسی مکان کا ایک حصہ کہ زینب کو فی الحال اس حصہ مکان کی ضرورت بھی ہے لیکن زید کو اس میں تردد یہ ہے کہ جس طرح تمام حقوق میں زوجتین کے درمیان تساوی ضروری ہے کہیں یہ زیادت فی مہر احدٰہما خلاف عدل نہ ہو جاوے اس لئے استفتار کیا جاتا ہے کہ یہ زیادت فی مہر احدٰہما جائز ہے یا نہیں اگر کوئی دلیل صریح نہو تو کوئی کلیہ ہی شافی ہو کافی ہے اور تصریح فقہی اگر مل جاوے تو اقرب الی الاقناع ہے فقط۔

الجوابُ الاوّل من بعض العُلَمَاء:

موافق اس قاعدہ فقہیہ کے کہ زیادت فی المہر بعد العقد ملحق باصل المہر ہے اور ہبۂ مبتدءہ نہیں ہے کما یقول بہ الامام زفر رحمہ اللہ تعالیٰ زیادت فی مہر احدی الزوجات درست ہے خصوصاً اس زوجہ کے مہر میں زیادتی کرنا جس کا مہر اصل سے کم ہو اور اضرار زوجہ ثانیہ اس سے مقصود نہو (اور اس کو حیلہ ترک عدل وتسویہ بین جو کہ واجب ہے نہ بنایا جائے) خلاف عدل نہیں معلوم ہوتا۔ فتح القدیر کے جزئیہ ذیل سے بھی یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ زیادت فی المہر اگر بطریق رشوت نہو تو درست ہے عبارت اُس کی یہ ہے (قولہ وان رضیت احدی الزوجات بترک قسمہا لصاحبتہا جاز) ھذا اذا لم یکن برشوۃٍ من الزوج بان زادھا فی مہرھا تفعل او یتزوجہا بشرط ان یتزوج اخریٰ فیقیم عندھا یومین وعند المخاطبۃ یوماً فان الشرط باطل ولا یحل لہا المال فی الصورۃ الاولیٰ فلہ ان یرجع فیہ الخ اور عنایہ کی یہ عبارت بھی جواز کی طرف مشیر ہے قولہ خلافاً لزفر فانہ یقول الزیادۃ ھبۃ مبتدأۃ لا تلتحق باصل العقد ان قبضت ملکت والا فلا الخ اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ ثلثہ زیادت کو ہبہ مبتدأۃ قرار نہیں دیتے کہ اس کو خلاف عدل کہا جائے کیونکہ یہ تصریح ہے کہ ہبات میں بھی تسویہ بین الزوجات

ضروری ہے کما فی العینی علی البخاری وتمام العدل ایضاً بینہن تسویتہن فی النفقۃ والکسوۃ والھبۃ ونحوھا فقط، واللہ تعالیٰ اعلم کتبہ ....

۵ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ

الجواب صواب

محمد .... عفا اللہ عنہ

الجواب الثانی من جامع امداد الاحکام

اقول وباللہ التوفیق۔ زیادت فی المہر کا ملحق باصل العقد ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کے جملہ احکام مثل مہر کے ہوں چنانچہ زیادت کا دخول سے متنصف ہونا اور قبل دخول متنصف نہ ہونا اس پر دال ہیں۔

نیز اس زیادت کا ملحق بالاصل ہونا اس کو بھی مستلزم نہیں کہ اس کے لئے ہبہ کے احکام مطلقاً نہ ثابت ہوں۔ دراصل اس مسئلہ میں حنفیہ کا امام زفر اور شافعی وغیرہ سے جو اختلاف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حنفیہ اس کو محض ہبہ مستانفہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے کچھ احکام ہبہ کے اور کچھ احکام مہر کے ثابت کرتے ہیں اور زفر وشافعی اس کو من کل وجہ ہبہ مستانفہ سمجھتے ہیں ائمہ ثلثہ حنفیہ اس کو ہبہ ابتداءً ومہر انتہاءً کہتے ہیں اسی لئے وہ اس زیادت کو حق متعاقدین میں بحکم مہر کہتے ہیں اور حق ثالث میں ہبہ وتبرع کما یظہر من کلام الفقہاء ودلیلہ شرط بقاء الزوجیۃ لجواز ھذہ الزیادۃ علی الظاہر کما فی الدر۔ فلو کان کالمہر فی جمیع الاحکام لم یکن بقاء الزوجیۃ شرطاً لان المہر یبقی ولو انعدمت الزوجیۃ کما لا یخفی۔

قال فی النہر والظاہر عدم الجواز بعد الموت والبینونۃ والیہ یرشد تفسیر المحیط بحال قیام النکاح اذ نقلوا ان ظاہر الروایۃ ان الزیادۃ بعد ہلاک المبیع لا تصح وفی روایۃ النوادر تصح ومن ثم جزم فی المعراج وغیرہ بان شرطہا بقاء الزوجیۃ حتی لو زادھا بعد موتہا لم تصح (ای لعدم المحل وقت الزیادۃ ۱۲) والالتحاق باصل العقد وان کان یقع مستنداً الا انہ لا بد

ان ثبتت[عه] اولا فی الحال ثم یستند اھ اور طحطاوی نے عدم اشتراط بقاء زوجیۃ کو گو ترجیح دی ہے مگر اس کی بناء التحاق باصل العقد پر نہیں رکھی بلکہ یہ کہا ہے و کون ظاھر الروایۃ عدم الصحۃ الزیادۃ بعد ھلاک المبیع لا یقتضی ان یکون ظاھر الروایۃ ھنا لفرق بین الفصلین قام عند المجتھد فانہ فی النکاح امر اللہ تعالیٰ بعدم نسیان الفضل بین الزوجین وھذہ الزیادۃ من مراعاۃ الفضل اھ شامی (ص ۵۵۲ و ۵۵۳ ج ۲) قول اول میں شرط بقاء زوجیت کی وجہ یہ تھی کہ صحت زیادت کے لئے وجود محل ضروری ہے اور قول ثانی نے زیادت کو مراعات فضل میں داخل کرکے اس شرط کی نفی کر دی بہرحال یہ مسئلہ سب کو تسلیم ہے کہ زیادت مہر من کل وجہ مثل مہر کے نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ ہبہ من وجہ ہے اور مہر من وجہ ہے۔ ہبہ کی حیثیت سے بعض احکام میں یہ اصل مہر سے منفصل ہے مثلاً بحالت مرض موت مہر مثل پر زیادت باطل ہے لما فیہ من ابطال حق الورثۃ قال فی الدر وما لزمہ فی مرضہ لسبب معروف بینۃ او بمعاینۃ قاض علی ما اقر بہ فی مرض موتہ ولو ودیعۃ والسبب المعروف ما لیس بتبرع کنکاح مشاھد ان بمھر المثل اما الزیادۃ فباطلۃ وان جاز النکاح اھ (ص ۸۰۷ ج ۴) فھذا کما تری قد ادخل الشھادۃ ھنا فی التبرع وھذا اذا کانت الزیادۃ فی صلب العقد ولو کانت بعد العقد فتبطل بالاولیٰ وان کان المھر اقل من المثل والعلۃ کونہ تبرعا فی الاصل ابتداءً کما لا یخفی۔ اور مہر کی حیثیت سے اس زیادت کے لزوم میں قبضہ شرط نہیں اگر ہبہ محضہ ہوتا تو بدون قبض کے لزوم نہ ہوتا پس حنفیہ کا اس زیادت کو ملحق باصل العقد کہنا صرف بایں معنیٰ ہے کہ یہ لزوم میں محتاج قبض نہیں کما یدل علیہ قول صاحب العنایۃ خلافا لزفر فانہ یقول الزیادۃ ھبۃ مستانفۃ لا تلتحق باصل العقد ان قبضت ملکت والا فلا الخ باقی تمام احکام اس کیلئے ہبہ کے ثابت ہیں مثلاً قبول مرأۃ کا شرط ہونا اور زوجیت کا باقی رہنا وغیرہ وغیرہ جو اصل مہر میں شرط نہیں نیز اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ زیادت فی المہر در اصل زیادت فی ثمن المبیع پر قیاس کیا گیا ہے اور زیادت فی ثمن المبیع کے متعلق درمختار میں تصریح ہے لکن انما یظھر فی الشفعۃ فی الحط فقط قال الشامی لان[عه] فی الزیادۃ ابطال حق الشفیع الثابت قبلھا فلا یملکانہ فلہ ان یاخذ بدون الزیادۃ اھ (ص ۲۶۶ ج ۴) نعدم ان الزیادۃ فی العقد لا تسقط ولا تبطل حقا ثابتا للغیر قبلھا۔

اب صورت مسئولہ کا حکم واضح ہو گیا وہ یہ کہ منکوحہ ثانیہ سے جو قلیل مہر پر نکاح کیا گیا ہے اگر یہ مہر مثل تھا تب تو اس کا مستحق زیادت نہ ہونا ظاہر ہے اور اگر مہر مثل نہ تھا بلکہ اس سے کم تھا تو اس نے اپنے حق کو وقت نکاح کے خود ہی ساقط کر دیا ہے والساقط لا یعود۔ اور اس سے نکاح ہو جانے کے بعد زوجہ اولیٰ کا ہبہ و نفقہ وغیرہ میں حق مساوات ثابت ہو چکا ہے لہذا ثانیہ کے مہر میں زیادت کرنے سے گو وہ اصل عقد کی طرف مستند ہو زوجہ اولیٰ کا حق مساوات باطل نہیں ہو سکتا کیونکہ زیادت فی العقد باوجود استناد الی الاصل کے کسی حق ثابت قبلھا کو باطل نہیں کر سکتی کما مر فی مثال الشفیع۔ بس اس زیادت کا ثمرہ صرف یہ ہوگا کہ وہ مہر میں داخل ہو کر محتاج قبض فی اللزوم نہیں رہے گا باقی احکام تبرع و ہبہ کے بجالہا باقی رہیں گے۔ اور اگر زیادت فی المہر کو اصل سے ملحق کرکے موجب العدل والتسویہ نہ مانا جائے تو اس میں ھدم باب القسم بالکل لازم آئے گا کیونکہ پھر تو ہر شخص جو کچھ چاہے گا کسی ایک زوجہ کو دے دیا کرے گا اور یہ کہہ دے گا کہ میں تیرے مہر میں یہ زیادت کر رہا ہوں اور جس جزئیہ کے مفہوم سے مجیب اول نے استدلال کیا ہے وہ استدلال بھی صحیح نہیں، یہ جزئیہ تو غور کرنے کے بعد اس امر پر دال ہے کہ زیادت فی المہر من کل وجہ بحکم مہر نہیں بلکہ اس کی حالت موجودہ کے احکام بھی اس کے لئے ثابت ہوتے ہیں۔ غور کرنا چاہئے کہ اس صورت میں زیادت فی المہر کو جو رشوت

عه ھذا صریح فی ان تلک الزیادۃ تلتحق باصل المھر بعد ثبوتھا فی الحال وثبوتہ انما ھو بصورۃ الھبۃ والشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ فیثبت لھا احکام التبرع فی الجملۃ ۱۲ منہ

عه قلت ھذا صریح فیما ذکرتہ قبل ان ھذہ الزیادۃ مھر انتھاءً فی حق المتعاقدین وتبرع زائد فی حق الثالث فلذا لم یعد ھا من الثمن فی حق الشفیع ۱۲ منہ

کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زیادت کو قسم کا مقابل کیا گیا ہے اور یہ تقابل اسس زیادت کی حالت موجودہ قبل الاستناد ہے ورنہ بعد الاستناد تو یہ زیادت مہر کا جزو ہوکر عوض مُتفع ہے اور مُتفع شرعاً متقوم ہے اس کا معاوضہ رشوت کبھی نہیں ہوسکتا پس فقہاء کا اس زیادت کو رشوت کہنا صاف بتلا رہا ہے کہ زیادت فی المہر کے لئے مطلقاً احکام مہر ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس کی صورت موجودہ کے احکام بھی ثابت ہوتے ہیں پس جس صورت میں کہ زیادت بعوض ترک قسم ہو اس وقت تو رشوت ہونے کی وجہ سے باطل ہے کیونکہ قسم متقوم نہیں جس کا عوض دیا جائے اور جس صورت میں کہ عوض ترک قسم نہ ہو اس وقت یہ اِحْدَی الزَّوجتین کے ساتھ صلہ زائدہ ہے پس صلہ زائدہ کے احکام ثابت ہوکر استناد الی الاصل کے احکام ثابت ہوں گے اور اس کے لئے صلہ زائدہ کے احکام کا فی الجملہ ثابت ہونا اوپر عبارات درمختار ورد المختار وغیرہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ مریض کی زیادت کو فقہاء نے تبرع میں داخل کرکے بدون اجازت ورثہ باطل کہا ہے علیٰ ھذا اس زیادت کو بیع کی صورت میں مبطل حق شفیع نہیں مانا گیا اور اس کے لئے قبول وغیرہ کو شرط قرار دیا گیا ہے اسی طرح یہاں بھی اس زیادت سے زوجہ ثانیہ کا حق مساوات جو ثابت قبل الزیادۃ ہے باطل نہیں ہوسکتا ھذا واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

۴؍ شعبان سنہ ۴۳ھ

اسی عورت کے مہر کا حکم جو رضاعی بہن ہو اور لاعلمی میں ان کا نکاح ہوگیا ہو

سوال (۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید اور ساجدہ نے ایام طفلی میں مختلف الاوقات یکے بادیگرے مسماۃ ہندہ کا دودھ پیا اور جب یہ دونوں کچھ تھوڑا سن تمیز کو پہنچے تو ایام نابالغی ہی میں مسائل اور احکام دینی کی ناواقفیت کی وجہ سے زید اور ساجدہ کا باہم عقد ہوگیا اور بلوغیت کے بعد کچھ عرصہ تک ان کے درمیان تعلقات شوہری اور زوجیت کے قائم رہے بعد ازاں جب مسئلہ رضاعت سے واقفیت حاصل ہوئی اور بہ تحقیقات اپنے درمیان رضاعی بھائی بہن ہونا پایۂ ثبوت سے درجہ یقین کو پہونچا ہوا پایا تو مسماۃ ساجدہ نے زید سے کنارہ کشی اختیار کرکے اس کے گھر سے اپنے میکہ چلی آئی اور زبانی اور تحریری اطلاع اپنے مورثان کو اس امر کی دی کہ اب میں ہرگز زید کے ساتھ تعلقات زوجیت کے نہیں رکھنا چاہتی اس معاملہ میں اگر آپ لوگ سختی بھی کیجئے یا جان سے مار ڈالئے تب بھی میں زید

کے گھر نہ جاؤں گی اور نہ اس سے پھر زوجیت کے تعلقات قائم کروں گی زید نے بھی ثبوت رضاعت کے بعد سکوت اختیار کیا اور نہ پھر کبھی ساجدہ کو اپنے گھر بلایا۔ اس تفرقہ کو چھ سات مہینہ گذرے ہوں گے کہ قضاء الٰہی سے زید کا انتقال ہوگیا چونکہ زید صاحب جائداد تھا اس لئے طمع دنیا سے اب مسماۃ ساجدہ بحق زوجیت وراثتاً و بالعوض دینِ مہر کے دعویدار ہے تو اس صورت میں کیا مسماۃ ساجدہ زید مرحوم کی جائداد سے بحق زوجیت وراثتاً ترکہ شرعی اور دین مہر پانے کی مستحق ہوسکتی ہے؟

الجواب: ساجدہ اس صورت میں مہر مثل کی تو مستحق ہے اگر زید سے ہمبستری ہوچکی ہو مگر میراث کی مستحق نہیں اور مہر مثل خاندانی مہر کو کہتے ہیں ساجدہ کے جدی خاندان میں عورتوں کا عموماً جو مہر باندھا جاتا ہو اس میں ساجدہ کی حیثیت وصورت وغیرہ کا بھی لحاظ کیا جائے گا کہ اس جیسی عورت کا مہر کتنا ہوا کرتا ہے وہ ساجدہ کا مہر مثل ہے اب اگر وہ مہر مقررہ کے برابر ہی ہے تو مہر مقررہ ملے گا اگر کم ہے تو کم ملے گا اگر زیادہ ہے تو مقررہ سے زیادہ نہ ملے گا۔ قال فی الدر: ویجب مھر المثل فی نکاحٍ فاسدٍ وھو الذی فقد شرطا من شرائط الصحۃ کشھود اھ قال الشامی ومثلہ تزوج الاختین معاً ونکاح الاخت فی عدۃ الاخت ونکاح المعتدۃ والخامسۃ فی عدۃ الرابعۃ اھ (ص ۵۷۴ ج ۲) قلت ونکاح المحارم عند بعضھم فی الباطل ولکن قال الشامی والحاصل انہ لافرق بینھما (ای الفاسد والباطل) فی غیر العدۃ اھ (ص ۵۷۵ ج ۲) علیٰ ان ھذا النکاح لعلہ بشبھۃ لان الزوجین انما تیقنا بالرضاع بینھما بعد بلوغھما بزمان کما یظھر من السوال فیکون الوطی وطیا بالشبھۃ والموطوءۃ بشبھۃ تستحق مھر المثل کما صرحوا بہ واما حرمان المیراث فلما صرح بہ فی الدر (ص ۷۴۵ ج ۲) ویستحق الارث باحد ثلاثۃ برحم ونکاحٍ صحیحٍ فلا توارث بفاسدٍ ولا باطلٍ اجماعاً اھ، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷؍ شعبان سنہ ۴۳ھ۔

مہر کا ادا کرنا یکمشت ضروری ہے یا قسط وار بھی درست ہے

سوال (۷) شوہر کو روزانہ بارہ ۱۲ آنہ کی آمد ہے اس میں مہر میں ماہانہ دس روپیہ دیتا ہوں اور اس کے سوائے کوئی ملک وغیرہ نہیں آیا وہ ماہانہ دس روپیہ قبول کرسکتی ہے؟

الجواب: بحالت قیام نکاح تو اقساط کے ساتھ مہر ادا کرسکتا ہے اور بعد طلاق و خلع کے عورت یکمشت کل مہر وصول کرنے کی مستحق ہے اور اس وقت اقساط کا مقرر کرنا شوہر کے اختیار میں نہیں بلکہ حاکم کی رائے پر ہے۔

حکم منع المرأة نفسها عن زوجها بقبض المعجل والتفصیل فی ذلک

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ خالدہ خانم اپنے شوہر خالد سے قبل وطی یعنی رخصت ہونے سے پہلے کل زرِ مہر یا کوئی جزو زر مہر لینے کی عند الشرع مستحق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا، اگر مہر معجل ہو یا مؤجل ہر دو صورت میں مستحق ہے یا کیا؟

الجواب: قال فی الدر ولها منعه من الوطی ودواعیه والسفر بها ولو بعد خلوة رضیتها لاخذ ما بین تعجیله من المهر کله او بعضه او اخذ قدر ما یعجل لمثلها عرفا به یفتی لان المعروف کالمشروط ان لم یؤجل او یعجل کله فکما شرطا لان الصریح یفوق الدلالة الا اذا جهل الاجل جهالة فاحشة فیجب حالا الا التاجیل بطلاق او بموت فیصح للعرف لها قال الشامی عن شرح الجامع لقاضی خان انه لو کان المهر مؤجلا لیس لها المنع قبل حلول الاجل ولا بعده وکذا لو کان المؤجل بعضه واستوفت العاجل وکذا لو اجلته بعد العقد ثم قال وعلی قول ابی یوسف لها المنع الی استیفاء الاجل فی جمیع هذه الفصول اذا لم یکن دخل بها الخ قال فی الدر وعن الثانی لها منعه ان اجله کله وبه یفتی استحسانا ولوالجیة اه قال الشامی وهذا اذا لم یشترط الدخول قبل حلول الاجل فلو شرطه ورضیت به لیس لها الامتناع اتفاقا اه (ص ۵۸۸ و ۵۸۹ ج ۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مہر کی مختلف صورتیں ہیں:

۱۔ کل مہر معجل ہو یا بعض معجل ہو یعنی وقت نکاح کے تصریح کر دی گئی ہو کہ مہر کا کل یا بعض معجل ہوگا اس صورت میں عورت کو قبل رخصت و خلوت کل یا بعض جو بھی معجل طے ہوا ہو طلب کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۲۔ بعض معجل ہو اور بعض مؤجل ہو تو معجل کے وصول کے بعد بقیہ کے بھی مطالبہ کا حق عورت کو ہے لیکن اس کے وصول ہونے پر اپنے نفس کی تسلیم کو موقوف نہیں کر سکتی۔

(۳) کل مؤجل ہو اور اجل طلاق یا موت ہو تو عرف کی وجہ سے تاجیل مجہول صحیح ہے اور اس صورت میں عورت کو طلب مہر کا تو حق ہے مگر اس کے کسی جزو یا کل کے وصول ہونے پر اپنے نفس کی تسلیم کو موقوف نہیں کر سکتی بلکہ اگر شوہر بدون کچھ مہر دیئے اس کو اپنے پاس رکھنا چاہے تو اس کو حق امتناع نہ ہوگا۔ البتہ امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ مہر کل مؤجل ہو تو عورت کو حق امتناع ہے مگر یہ جب ہے کہ شوہر نے دخول قبل الاداء کی شرط نہ کی ہو اور یہ شرط کرلی ہو تو اتفاقاً عورت کو حق امتناع نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل مرد کو اس شرط کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مہر کل مؤجل ہونے کی صورت میں اگر عورت نے یہ شرط کرلی ہو کہ قبل ادا مہر میں دخول کو منظور نہ کرونگی تو اس کو حق امتناع ہے ورنہ نہیں۔ کیونکہ کل مہر کو مؤجل کرنا ہندوستان میں رائج ہے اور اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دخول اداء مہر پر موقوف نہیں والمعروف کالمشروط پس اگر عورت نے اس امر معلوم عرفاً کی صراحۃً نفی نہیں کی تو گویا وہ بھی دخول قبل اداء پر راضی ہوگئی، ھذا واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۸ ذیقعدہ ۴۲ھ

صحیح مہر معلوم نہ ہو اور وارث اپنے دعویٰ پر گواہ نہ رکھتے ہوں تو مہر مثل پر فیصلہ ہوگا

سوال (۹) عبداللہ خاں مرحوم نے دو شادیاں کیں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا اُس کی اولاد موجود ہے اور دوسری بیوی زندہ موجود ہے اور اس سے دو بچے ہیں۔ عبداللہ خان اور ان کے والد نے اس پہلی بیوی کا مہر کسی مقدمہ کی شہادت میں اپنا بیان یہ دیا ہے کہ میری بیوی کا مہر ایک ہزار روپیہ ہے اور ان کے والد نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ میرے لڑکے کی بیوی کا دین مہر ایک ہزار روپیہ ہے۔ عبداللہ خان کی بیوی کی بہنوں کا مہر ۵۔ ۵ ہزار روپیہ ہے اور ان کی پھوپھیوں کا مہر بھی ایک ہزار روپیہ ہے اور ان کے والد یعنی صاحبداد خان کی بیوی کا مہر بھی پانچ ہزار روپیہ ہے اور ان کے لڑکوں کی بیویوں کا مہر بھی پانچ پانچ ہزار روپیہ ہے اب عبداللہ خان کی اول بیوی کی اولاد یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہماری والدہ کا مہر پچیس ۲۵ ہزار روپیہ ہے۔ جس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ دوسری بیوی اور اس کی اولاد کو محروم کر کے خود ہی اپنے والد کی جائیداد پر قابض رہیں اور اپنے سوتیلی ماں اور بھائی بہن کو کچھ نہ دیں، دریافت طلب یہ امر ہے کہ ایسی صورت میں عبداللہ خان مرحوم کی پہلی بیوی کا مہر از روئے شرع شریف کیا قرار دیا جاوے؟ عبداللہ خان نے جو وصیت نامہ

مرنے سے پیشتر لکھا ہے اُس میں سب بہن بھائی کو لکھا ہے کہ اتفاق سے رہنا اور دوسری بیوی زندہ کا مہر ایک ہزار روپیہ لکھا ہے جو واقعی ٹھیک ہے مگر پہلی بیوی کے مہر کا کچھ ذکر نہیں لکھا خدا معلوم کہ ادا کر گیا یا مرحومہ نے معاف کر دیا اس کا علم اللہ کو ہے۔

الجواب: اگر زوجہ اولیٰ کی اولاد اپنے دعویٰ پر دو عادل گواہ نہیں رکھتے تو مہر مثل پر فیصلہ کیا جاوے اور مہر مثل میں عورت کے خاندان کا اعتبار ہے سوال میں ظاہر کیا ہے کہ عبداللہ خان کی سالیوں کا مہر ۵۔۵ ہزار روپیہ ہے بس اس کے مطابق پانچ ہزار روپیہ عبداللہ خان کی زوجہ اولیٰ کا مہر قرار دیا جاوے کما فی الدر المختار (وبعد موتهما فقی القدر القول لورثته و) فی الاختلاف (فی اصله) القول لمنکر التسمیة (لم یقض بشیئ) مالم یبرهن علی التسمیة (وقالا یقضی بمهر المثل) کحال حیاة (وبه یفتی) وفی الشامی تحت قوله لم یقض بشیئ لان مهر المثل یختلف باختلاف الاوقات فاذا تقادم العهد یتعذر الوقوف علی مقداره فتح وهذا یدل علی انه لو کان العهد قریبا تقضی به بحر قلت وبه صرح قاضی خان فی شرح الجامع (ص ۵۹۴ ج ۲)۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۹ ر جمادی الثانیہ ۴۴ھ۔
الجواب صحیح، ظفر احمد۔ ۱۹ ر ج ۲ ۴۴ھ۔

جو شخص بیوی کو مہر نہ دے اور نہ نیت ادا کی ہو تو اس کی اولاد کو ولد الحرام کہہ سکتے ہیں یا نہیں

سوال (۱۰) کوئی شخص بہت زیادہ اپنی حیثیت سے مہر مقرر کرے جو محض ایک برادری کی رسم کے لحاظ سے ہو اتنی رقم اس کی حیثیت کے اعتبار سے ادا کرنا ناممکن ہے مہر دینے کی نسبت کہتا ہے کہ یہ ایک فرضی بات ہے کون دیتا کون لیتا ہے اگر اتنا مہر مقرر نہ کروں تو نکاح ہی نہ ہو تو ایسے شخص کی اولاد کو کوئی ولد الزنا کہے یا سمجھے تو گناہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اس شخص کی اولاد کو ولد الزنا کہنا حرام ہے اور حرامی سمجھنا بھی بمعنی متعارف جائز نہیں اور حدیث میں جو ایسے شخص کو زانی کہا گیا ہے اس سے مراد گناہ میں مثل زانی کے ہوتا ہے۔ اور مثل زانی پر احکام زانی کے جاری کرنا درست نہیں۔

حکم تجدید نکاح بزیادت مہر از مہر سابق اور اس صورت میں شوہر کے ذمہ کونسا مہر واجب ہوگا۔

سوال (۱۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید عمر ۲۵ سال

اور عابدہ عمر ۱۴ سال ہر دو باوجود بالغین ہونے کے ان کے باہم عقد نکاح اس صورت میں واقع ہوا کہ وکیل اپنے دو شاہدوں کے ہمراہ ایک عام جلسہ میں آکر عابدہ اور اس کے والد کے وکیل بنانے کا اقرار دونوں شاہدین سے کرا کر زید کے ساتھ عابدہ کا نکاح ایک سو پچیس (۱۲۵) روپیہ مہر مؤجل پر ایجاب قبول کرا ہی دیا تھا کہ عابدہ کا ماموں اس جلسہ میں آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مہر بالکل کم ہے چالیس (۴۰) تولہ سونا چاہئے اور اسی پر اصرار کر کے عابدہ کے والد کو بھی مجبور کیا حتی کہ ثانی نکاح چالیس تولہ سونے پر کرا ہی چھوڑا حالانکہ زید زوج ایک سو پچیس (۱۲۵) روپیہ کا بار بھی نہیں اٹھا سکتا اور اس نے تقریب نکاح کا خرچ جو قرض لیکر کیا تھا اس کے ضائع ہو جانے کے خوف سے اور شریعت کی لاعلمی کی وجہ سے طوعاً و کرہاً نکاح ثانی بھی قبول کر لیا۔

(۱) عند الشرع کونسا نکاح منعقد ہوا اوّل یا ثانی؟ (۲) زوجہ کا ماموں نکاح ثانی بالجبر کرانے کا مستوجب ہے یا نہیں؟ (۳) نکاح اوّل کا مہر واجب الاداء ہے یا ثانی کا؟ (۴) مہر مؤجل زوجہ کو کس وقت ادا کیا جا سکتا ہے؟

اس کے چار ماہ بعد زوج و زوجہ میں باہمی تنازع ہوا اور عابدہ کے والد نے عابدہ کو بے اجازت زید کے مکان سے لیجا کر اپنے مکان پر بٹھا رکھا ہے اور زید کے ہاں آنے نہیں دیتا آیا عابدہ کا نان و نفقہ زید پر واجب الاداء ہے یا نہیں مع حوالہ کتب معتبرہ ارقام فرما کر عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں؟

الجواب: قال فی العالمگیریة الزیادة فی المهر صحیحة حال قیام النکاح عند علمائنا الثلاثة کذا فی المحیط فاذا زادها فی المهر بعد العقد لزمته الزیادة کذا فی السراج الوهاج هذا اذا قبلت المرأة الزیادة سواء کانت من جنس المهر اولا من زوج اوولی. کذا فی النهر الفائق والزیادة تتأکد باحد معان ثلثة اما بالدخول او بالخلوة الصحیحة واما بموت احد الزوجین الخ ولو تزوج امرأة بالف درهم ثم جدد النکاح بالفین اختلفوا فیه ذکر الشیخ الامام المعروف بخواهر زاده فی کتاب النکاح ان علی قول ابی حنیفة ومحمد لا یلزمه الالف الثانیة ومهرها الف درهم وعلی قول ابی یوسف یلزمه الالف الثانیة وبعضهم ذکر الخلاف علی عکس

هذا قال بعض مشائخنا المختار عندنا ان لایلزمه الالف الثانیة کذا
فی الظهیریة (قلت وهذا اذا کان المقصود بالتجدید تجدید النکاح
هزلا وتلعبا) ففی العالمگیریة ایضا عقب ذلک مانصه وفتوی القاضی
الامام علی انه لایجب بالعقد الثانی شیئ الا اذا عنی به الزیادة فی
المهر فحینئذ یجب المهر الثانی کذا فی الخلاصة اھ (ص ۲۹ ج ۲)

پس صورت مسئولہ میں نکاح ثانی تو لغو ہے لیکن چونکہ اس سے مقصود محض زیادت مہر تھی اس لئے مہر وہی واجب ہوگا جو دوبارہ مقرر کیا گیا ہے کیونکہ زید زوج نے اس کو برضا منظور کیا ہے اس پر اکراہ شرعی کا تحقق نہیں ہوا اور گو ماموں اس صورت میں ولی نہ تھا مگر اول تو اس نے والد عابدہ کو اپنے ساتھ متفق کر کے ایسا کیا ہے دوسرے مدار تو زوج کے منظور کرنے پر ہے جب اس نے دوسرے نکاح کے مہر کو منظور کر لیا تو اس کی طرف سے زیادت فی المہر کا تحقق ہو گیا پس اگر زوجہ مسماۃ عابدہ نے بھی اس زیادت کو قبول کر لیا ہو یعنی اس کو دوسرے نکاح کی مہر زائد پر ہونے کی اطلاع ہوئی ہو اور اس پر اس نے سکوت کیا اور نکاح ثانی سے انکار نہیں کیا تو یہ مہر لازم ہو گیا جو دخول یا خلوت سے مؤکد بھی ہو گیا اور اگر اس کو اطلاع نہیں ہوئی تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

اور مہر مؤجل ہر ملک میں وہاں کی اصطلاح کے موافق ہے بعض جگہ طلاق یا موت کے وقت واجب الادا ہوتا ہے اور بعض بلاد میں وقت مطالبہ زوجہ کے ہم کو بنگال کی اصطلاح معلوم نہیں اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اور عابدہ جو اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے تو اس کے متعلق بھی یہ بات دریافت طلب ہے کہ وہ مہر کے متعلق کسی جھگڑے کی وجہ سے گئی ہے یا کسی اور بات پر جھگڑا ہوا ہے؟

اور یہ بھی لکھا جائے کہ بنگال میں مہر مؤجل کا ادا مطالبۂ زوجہ پر واجب ہوتا ہے یا طلاق وموت پر؟

اور صورت مسئولہ میں کل مہر مؤجل تھا یا کوئی حصہ معجل بھی تھا اور جو حصہ معجل تھا وہ عابدہ کو وصول ہو گیا یا نہیں؟ واللہ اعلم۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

ایسی عورت جو کسی علت کے سبب جماع کے قابل نہ ہو اس کے مہر وغیرہ کا کیا حکم ہے

سوال (۱۲) بعد آداب کے عرض یہ ہے کہ میرے عزیز رحمن بیگ سلمہ کی شادی قریب گیارہ سال ہوئے

جب ان کی خالہ کی لڑکی سے ہوئی تھی جب لڑکی بالغ ہوئی ہم بستری کے لئے اپنے شوہر کے پاس سوئی شوہر ہمبستری یعنی جماع کے لئے آمادہ ہوا تو اندام نہانی میں ایک ہڈی حائل ہوئی جس کی وجہ سے جماع کرنے سے مجبور رہا دوسرے روز صبح زنانہ شفاخانہ کی لیڈی نے ملاحظہ کیا تو بعد معائنہ کہا کہ یہ عورت مرد کے قابل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پستان چھاتیاں ابھری ہیں مردوں کا سا سینہ صاف ہے۔ اس وقت لڑکی کی عمر ۲۲ سال ہے۔ عرصہ تک میاں بیوی نے راز کو پوشیدہ رکھا، شفاخانہ کے معائنہ کرانے کے بعد بھی، آخر جب عزیزوں نے مجبور کیا تب صاف صاف بیان کیا، لیڈی ڈاکٹرنی جو انگریزی میم تھی پھر دوبارہ دیکھا اور کہا کہ لڑکے کی شادی دوسری کر دو یہ عورت مرد کے کام کی نہیں ہے لہذا عرض ہے کہ جب دوسری شادی عزیز کی ہو جاوے گی تو اس پہلی عورت کا جو نا قابل مرد ہے اس کا کیا حق اپنے شوہر پر رہے گا یا نہیں رہے گا، مہر پانچ سو روپیہ کا ہے طلاق ابھی نہیں دی ہے دوسری شادی جب ہی ہوگی جب اس پہلی سے نجات ملے گی دوسری شادی جہاں ہوگی بات چیت سب طے ہو گئی ہے مگر اس ہی بنا پر اڑی ہوئی رکی ہوئی ہے کہ پہلی عورت مہر لینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں۔ طلاق دینے کے بعد شوہر پر جو کچھ مہر وغیرہ کا حق حقوق ہے۔ براہ کرم بہت جلد اطلاع دیں کہ اس کو طلاق دیکر دوسری شادی کی جاوے اور یہ نکاح بھی اس عورت سے جائز ہوا یا ناجائز جب کہ وہ مرد کے قابل ہی نہ تھی حدیث سے سب باتوں کے جواب سے شاد فرماویں؟

الجواب: قال فی الدر والخلوة بلا مانع حسی وطبعی وشرعی (رتق بفتحتین التلاحم وقرن بالسکون عظم وعفل بفتحتین غدة وصغر لایطاق معه الجماع) کالوطأ فیما یجیئ ای فی ثبوت النسب وتاکد المهر ص ۵۵۹ ج ۲ وفیه ایضا ویجب العشرة ان سماها او دونها ویجب الاکثر منها ان سمی الاکثر ویتاکد عند وطأ او خلوة صحت او موت احدهما ویجب نصفه بطلاق قبل وطأ او خلوت (صحت) وعاد النصف الی ملک الزوج بمجرد الطلاق اذا لم یکن مسلما لها وان کان مسلما لها لم یبطل ملکها منه بل توقف عوده الی ملکه علی القضاء او الرضی اھ ص ۵۲۲ ج ۲۔

وفیه ایضا فی باب القسم یجب ان یعدل فیه ای فی القسم بالتسویة

فی البیتوتۃ وفی الملبوس والمأکول والصحبۃ لافی المجامعۃ کالمحبۃ بل یستحب بلافرق بین فحل وخصی وعنین ومجبوب ومریض وصحیح وصبی دخل بامرأتہ وبالغ لم یدخل بحر بحثا واقرہ المصنف ومریضۃ و صحیحۃ وحائض وذات نفاس ومجنونۃ لاتخالف ورتقاء وقرناء و وصغیرۃ یمکن وطیہا اھ (ص ۶۵۵ ج ۲)۔

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے کہ اس عورت سے نکاح درست ہوگیا اور
(۱) اگر اس عورت کو طلاق دے دی گئی تو وہ نصف مہر کی مستحق ہوگی۔
(۲) اور اگر طلاق نہ دی گئی تو زوج کے مرنے پر وہ مہر کامل کی مستحق ہوگی اسی طرح اگر یہ زوجہ مرگئی تو اس کے ورثہ شوہر سے پورے مہر میں حقدار[عہ] ہوں گے۔
(۳) اگر طلاق نہ دی گئی بلکہ اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح کیا گیا تو یہ زوجہ بھی دوسری کی طرح نفقہ وسکنیٰ اور شب باشی میں مساوات کی مستحق ہوگی اس کا حق ان امور میں دوسری سے کم نہ ہوگا ہاں صرف جماع مساوات کی مستحق نہیں کیونکہ وہ جماع کے قابل ہی نہیں اگر قابل بھی ہوتی جب بھی جماع میں مساوات کرنا واجب نہیں صرف مستحب ہوگا واللہ اعلم۔

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۶ھ۔

ایسی عورت جو کسی علت کے سبب جماع کے قابل نہ ہو اس کے مہر وغیرہ کا کیا حکم ہے

سوال (۱۳) ایک کنواری عورت کے والدین جس کی عمر سترہ برس کی ہے اس کی شادی (ایک شریف نوجوان پردیسی کسی شخص سے کرتے ہیں) بعد رخصتی شب عروسی کے اول وقت میں جبکہ عورت کی ساس کچھ مطابق رسم نصیحت پند کرنے جاتی ہے تو عورت نہایت شرم سے اپنی ساس سے کہتی ہے کہ اماں جو کچھ آپ نے فرمایا یہ درست ہے میں اس کو شکر کیا کروں میں اس قابل ہی نہیں کہ میں ان کے پاس یا وہ میرے پاس آسکیں میں مجبور ہوں زیادہ دریافت حال پر عورت نے کہا کہ میرا جسم اور عورتوں کا سا نہیں ہے قدرت نے پیشاب کے واسطے صرف چھوٹا سا سوراخ عطا کیا ہے تو اس پر اس کی ساس دو عورتوں کو بلاتی ہے اور اس کا جسم دیکھکر تصدیق کرتی ہے کہ دلہن کا بیان سچ ہے۔

عہ اور ان ورثہ میں شوہر بھی ہے اس کا حصہ شرعی مہر میں سے معاف ہو جاوے گا ۱۲ اشرف علی

۲۵

کہا جاتا ہے کہ شادی کیوں کرائی۔ وہ جواب دیتی ہے کہ میرے ماں باپ میں ایک وقت بحث بھی ہوئی مگر میرے والد نے والدہ کو ڈانٹا جو میں نے سنا اور مجھے بھی خاموش کردیا گیا میں مجبور تھی۔ چنانچہ لڑکے کو ہنوز اس عورت کے پاس نہیں جانے دیا اس کے والدین کو بلایا گیا وہ اپنی خطا پر نادم ہوکر لڑکی کو گھر واپس لے گئے اور کہا کہ ہم علاج کراکر واپس کریں گے علاج کرایا گیا چار برس سے ہنوز آرام نہیں ہوا۔ لڑکا حیران ہے کہتا ہے کہ طلاق ہی دلادو میں دوسری جگہ شادی کرلوں میری عمر مت ضائع کرو اس عورت کے ماں باپ زور دیتے ہیں کہ مہر اور ہمارا سامان واپس کردو۔ لڑکا غریب ہے مجبور ہے لڑکا کہتا ہے میرا اس میں کیا قصور ہے کیا مجھے آپ نے آگاہ کیا میری شادی کرنے کا کیا یہی نتیجہ ہے شادی اسی لئے ہوتی ہے کہ ایسے دھوکہ دیا جاوے محض کسی ناجائز لالچ سے جس کی تم کو خبر تھی افسوس ہے۔ امید ہے کہ بامہر فتویٰ مرحمت فرماویں اور چونکہ حضور سادہ کارڈ پر جواب صادر فرماویں گے کچھ تفصیل ضرور ہو کہ ہر آدمی وقت فیصلہ سمجھ سکے حضور کے جواب کا انتظار ہے (۱) یہ کہ ایجاب قبول ہوئے یا نہیں؟ (۲) نکاح ہوا یا نہیں (۳) اس دھوکہ کی صورت میں مہر واجب ہوا یا نہیں؟ جبکہ یہ عورت اور اس کے ماں باپ کا قصور ہے زیادہ والسلام۔

الجواب؛ صورت مسئولہ میں نکاح درست ہوگیا کیونکہ صحت نکاح کے لئے عورت کا عورت ہونا کافی ہے قابل جماع ہونا ضروری نہیں۔ اب اگر اس کو طلاق دی گئی تو چونکہ یہ طلاق قبل از دخول وخلوت صحیحہ ہے اس لئے شوہر پر مہر کامل تو واجب نہوگا ہاں نصف مہر واجب ہوگا۔ اور مہر عورت کا حق ہے جو نکاح سے واجب ہوجاتا ہے، عورت یا والدین کے قصور سے مہر ساقط نہیں ہوسکتا ہاں اگر بیوی مہر کو معاف کردے تو وہ اپنا حق معاف کرسکتی ہے، واللہ اعلم۔

۲۲ رجب ۱۳۴۶ھ۔

جہیز وغیرہ دینے کا حکم

سوال (۱۴) بعد سلام مسنون دیگر ممالک کی مجھے خبر نہیں مگر ہندوستان میں عام طور پر رواج ہے کہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کو سسرال سے شادیانہ کپڑے دیئے جاتے ہیں میرے خیال میں عوام اور خواص سب ہی اس کو لازم اور واجب سمجھتے ہیں کیونکہ کوئی شادی آج تک ایسی نہ دیکھی گئی اور نہ سنی گئی کہ جس میں کپڑے نہ دیئے گئے ہوں کپڑے دینے کے لئے لوگ بہت کچھ اہتمام کرتے ہیں اور شادی کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں کیا یہ ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ لوگ قولاً اور فعلاً ثابت کررہے ہیں۔ جناب حضرت نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی متعدد شادیاں کیں۔ ان کی بنات طیبات کی شادیاں ہوئیں کیا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شادیوں میں کپڑے لئے دیئے تھے۔ حضرات صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی شادیوں میں کپڑوں کے لین دین رائج تھی۔ حضرات تابعین اور تبع تابعین نیز ائمۂ دین متین کے زمانے میں یہ رسم ورواج تھا یا نہیں اگر نہیں تھا تو کب سے رواج ہوا شادیوں میں شادیانہ کپڑے لئے دیئے جائیں یا نہیں۔ جو حکم شرعی ہو مفصل مدلل تحریر فرما کر مخلوقات خدا کو راہِ راست سے واقف فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب؛ باپ اپنی لڑکی کو نکاح کے وقت جہیز دینا سنت نبویہ سے ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو شادی کے وقت جہیز[عہ] دیا ہے۔ اسی طرح نکاح کے وقت شوہر کا عورت کو زیور کپڑے وغیرہ دینا سنت سے ثابت ہے۔ حضرت علیؓ نے جس وقت نکاح کے بعد حضرت فاطمہؓ کے پاس جانا چاہا تو حضور نے فرمایا اعطھا شیئا قال ما عندی ما اعطیھا قال فاین درعک الحطمیۃ الحدیث وفی حدیث الواھبۃ نفسھا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یکن لہ فیھا غرض فقام رجل وقال زوجنیھا یا رسول اللہ ان لم یکن لک بھا حاجۃ فقال ھل عندک ما تعطیھا قال لا الا ازاری قال فالتمس شیئا ولو خاتما من الحدید الحدیث کلاھما صحیح۔

ان روایات سے ثابت ہے کہ شوہر کو عورت کے پاس جانے سے پہلے اُس کو کچھ دینا چاہیئے یہ عورت کا حق ہے۔

پس شادی میں کپڑے زیور وغیرہ دینے کا جو رواج ہے یہ رواج فی نفسہٖ خلاف شرع نہیں۔ البتہ اس میں افراط وغلو مناسب نہیں کہ اس قدر اہتمام کیا جائے جس سے پریشانی ہو اور قرض کا بار عظیم ہو جائے۔ باقی اپنی حیثیت کے موافق اہتمام کرنا شریعت کے موافق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور لڑکے کو جو جوڑا دیا جاتا ہے اس کا ثبوت جزئی تو نہیں ہے مگر کلی ثبوت حدیث

عہ قلت ذکر الحافظ حدیث جھازھا وکذا حدیث علی اعطھا درعک الحطمیۃ فی ترجمۃ فاطمۃ من الاصابۃ (ص ۱۵۸ و ۱۵۹ ج ۸) ۱۲ ظ ف

تھادوا تحابوا سے اس کا بھی ہے کیونکہ اس کا منشا محض اکرام ومحبت کا اظہار ہے اگر غلو نہ ہو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، واللہ اعلم۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ۔

ادائگی مہر میں شوہر اور بیوی کے درمیان بعض شرائط کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے ایک عورت سے کہ تمہارے دو ہزار روپیہ مہر ہے مگر اس شرط پر کہ تم کو اگر میں نے بلا کسی وجہ کے طلاق دے دیا یا گھر سے نکال دیا تو مہر دے دوں گا خواہ معجل ہو یا غیر معجل ہو کوئی تخصیص نہیں ہے اگر اس قسم کے وجوہات پیش نہ آئے تو مہر نہ دوں گا آیا یہ شرط فاسد ہے یا صحیح ہے نیز اس صورت میں مہر مثل ہوگا یا رقم مذکورہ مبلغ دو ہزار روپیہ جو متعین ہے ادا کرے گا اور عورت کی طرف سے یہ عہد ہے کہ ہر طرح سے خاوند کی فرمانبردار رہوں گی۔ اور اگر خاوند کی مرضی کے خلاف کوئی کام مجھ سے سرزد ہوئے تو معاہدہ مندرجہ بالا کالعدم وباطل تصور ہوگا آیا اس آخری شرط کے ماننے کے بعد مہر مثل ہوگا یا نہیں صاف تحریر فرماویں۔ بغرض مزید تفصیل نقل اقرار نامہ بھی ارسال ہے۔

نقل اقرار نامہ ملخصاً

منمقر نے مسماۃ لطیفن الخ سے نکاح ثانی کر کے اپنی زوجیت میں لایا ہے مسماۃ مذکور کا مہر دو ہزار روپیہ شرائط ذیل پر قرار پایا ہے کہ ہر دو معاقدین کا خداوند عالم اتفاق ومحبت سے زندگی بسر کراوے۔ اگر خاوند بلا کسی وجہ یا قصور کے طلاق دے یا گھر سے نکال دے تو مبلغ دو ہزار روپیہ دینا پڑے گا۔ آگے چلکر بیوی کا اقرار ہے

اگر خاوند کی مرضی کے خلاف کوئی کام مجھ سے سرزد ہووے گا تو یہ معاہدہ مندرجہ بالا کالعدم وباطل تصور ہوگا اور مسمقر خاوند کو کوئی عورت شادی شدہ یا نکاح ثانی میری موجودگی میں رکھنے کا ہرگز اختیار نہ ہوگا۔

دیگر یہ بھی فرماویں کہ خاوند کے کاروبار خانگی بذمہ عورت کون کون سے ضروری ہیں؟ زیادہ والسلام۔

الجواب؛ یہ شرط فاسد ہے اور عورت مدخول بہا ہے تو وہ ہر حالت میں دو ہزار کی مستحق ہے خواہ اس کو طلاق دی جائے یا نہ دی جائے گھر سے نکالا جائے یا نہ نکالا جائے اور صورت مسئولہ میں مہر مثل کا کوئی احتمال نہیں لعدم التردید فی

کمیۃ المھر وعدم تعلیقہ علی شیئ وانما علق اداءہ وعدم اداءہ علی شرائط بعد ما جعل المھر الفین کما ھو ظاھر من نقل اقرارنامۃ، واللہ اعلم۔

اور عورت کے عہدے بھی مہر کا ابطال نہیں ہوا بلکہ وہ عہد ہی لغو ہے وہ جب تک صراحۃً معاف نہ کرے اور خوشی سے معاف نہ کرے تو معاف نہ ہوگا۔

اور بیوی کے ذمہ چار باتیں لازم ہیں جن پر شوہر اس کو مجبور کرسکتا ہے:

(۱) جب شوہر مجامعت کے لئے بلاوے اور عورت بیمار نہ ہو تو انکار نہ کرے۔

(۲) شوہر اگر زینت کا طالب ہو تو اس کے لئے زینت و آرائش کیا کرے بشرطیکہ زینت خلاف شرع نہ ہو۔

(۳) شوہر کے گھر سے بدون اس کی اجازت کے باہر قدم نہ رکھے نہ کسی نامحرم کے سامنے چہرہ کھولے۔

(۴) جس شخص کا گھر میں آنا شوہر کو گوارا نہیں اس کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے۔

ان امور کے سوا اور کسی بات پر مرد عورت کو مجبور نہیں کرسکتا اگر مجبور کرے گا، گنہگار ہوگا۔ البتہ عورت کو دیانۃً واجب ہے کہ شوہر جس مباح شرعی کا امر کرے اور اس کی طاقت سے باہر کام نہ ہو اس کو بجالائے خواہ شوہر کو اس کے حکم کا حق ہو یا نہ ہو گو وہ بلا استحقاق کسی زائد کام کا بدون رضا کے حکم کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ لیکن اگر وہ عمل شرعاً مباح اور عورت کی قدرت میں داخل تھا تو عورت بھی مخالفت امر زوج سے گنہگار ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ یکم ذی الحجہ ۴۷ھ۔

سوال (۱۶) (مہر مثل کی تحقیق نہ ہوسکے یا وہ عرفاً مختلف ہو تو کس مہر پر فیصلہ کیا جائے) مہر مثل کی تعریف جو فقہاء نے لکھی ہے اگر اس کی تحقیق نہ ہوسکے یا وہ عرفاً مختلف ہو تو پھر کس مہر پر فیصلہ کیا جاوے گا یا مہر مسمیٰ ہی ہر حالت میں معتبر ہوگا؟

الجواب: فقہاء نے جو مہر مثل کی تعریف لکھی ہے اس کی تحقیق کی ضرورت وہاں ہے جہاں اختلاف صفات زوجین سے مہر خاندانی مختلف ہوجاتا ہے اور جہاں مہر خاندانی ہر حال میں واحد ہو کہ خاندان کی ہر لڑکی کا مہر اس سے کم نہ ہوگا اور غالب احوال میں زیادہ بھی نہیں ہوتا الا نادراً لعارض تو وہاں مہر خاندانی ہی مہر مثل ہوگا اور ہندوستان میں اکثر مقامات پر ہر قوم کا مہر ہر شہر میں رواجاً معین ہے اس سے کم و بیش نہیں ہوتا

پس اسی کو مہر خاندانی کہا جائے گا اور اگر کسی قوم میں مختلف مہور ہوں تو ہر لڑکی کی پھوپیوں، اور چچازاد بہنوں کا مہر اس کے حق میں مہر مثل ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ یکم صفر ۴۸ھ۔

سوال (۱۷) (سقوط مہر کے متعلق "بیان القرآن" کی ایک عبارت کی تشریح) آپ کے مترجم قرآن عظیم کے والمحصنٰت کے حاشیہ پر یہ مضمون مرقوم ہے کہ اگر صحبت یا خلوت نہیں ہوئی اور مرد چھوڑ دے تو نصف مہر لازم ہوگا یہ تو ظاہر ہے اور آگے یہ لکھا ہے کہ اگر عورت ایسا کام کرے جس سے نکاح ٹوٹ جاوے تو پھر بالکل مہر لازم نہ آئے گا اس سے کفر مراد ہے یا اور کچھ ہے؟

الجواب: عورت کی جانب سے نکاح ٹوٹنے کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ عورت مرتد ہوجاوے اور اس کے علاوہ دوسری صورتیں بھی ہیں مثلاً کافر مرد و عورت کا نکاح ہوا تھا مرد مسلمان ہوگیا اور عورت نے اسلام سے انکار کردیا۔ یا عورت نے خاوند کے بیٹے سے بشہوت تقبیل کی۔ یا رضاع کا تحقق ہوا (یعنی ایک بالغہ سے کسی نے نکاح کیا اور ایک چھوٹی بچی سے جس کی عمر دو سال سے کم ہو اور کبیرہ نے صغیرہ کو دودھ پلادیا اور اب تک اس سے دخول نہ ہوا تھا تو کبیرہ کا مہر ساقط ہوگیا اور دونوں حرام ہوگئیں کما فی العالمگیریۃ ص ۲۷۵ اذا تزوج الرجل صغیرۃ وکبیرۃ فارضعت الکبیرۃ الصغیرۃ حرمتا علی الزوج ثم ان لم یدخل بالکبیرۃ فلا مھر لھا الخ یا خیار بلوغ وعتق کی حالت میں عورت نے نکاح فسخ کردیا۔ یا کفو نہ ہونے کے سبب، کما فی العالمگیریۃ ص ۲۲۳ وان جاءت الفرقۃ من جھتھا فلا تجب (ای المتعۃ) کردتھا وابائھا الاسلام وتقبیلھا ابن الزوج بشھوۃ والرضاع وخیار البلوغ وخیار العتق وعدم الکفاءۃ الی ان قال وکل موضع لا تجب المتعۃ فیہ عند عدم التسمیۃ لا نصف المسمی عند وجودھا کذا فی التبیین۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔

سوال (۱۸) (عورت مہر کا روپیہ کس کس کام میں لاسکتی ہے) زید نے اپنی زوجہ کا مہر ادا کردیا مہر کا روپیہ زید کی زوجہ کے پاس موجود ہے اب وہ مہر کا روپیہ خیرات کردیوے یا کسی مسجد یا مدرسہ وغیرہا میں صرف کردیوے تو جائز ہے یا نہیں علاوہ اس کے مہر کا روپیہ کس کام میں لانا چاہئے؟

۱؎ یعنی اگر صحبت یا خلوت صحیحہ سے پہلے شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ دلاور حسین (کملائی)

الجواب ؛ اس کی ملک ہے اس کو پورا اختیار ہے جو چاہے کرے۔

تنبیہ :۔ اگر یہ روپیہ اتنا ہے کہ حج ہو سکے اور اس نے حج نہ کیا ہو تو حج کرنا فرض ہے اور اگر حج کے لئے کافی نہ ہو یا حج کر چکی ہو تو خواہ جمع رکھے اور زکوٰۃ ادا کرتی رہے یا شوہر کو دیدے یا اقارب وغیرہ پر صدقہ یا ھدیہ صرف کر دے خواہ خیرات کر دے ہر طرح اختیار ہے۔

۱۵ رمضان سنہ ۴۸ھ۔

مہر مثل کے بارے میں

سوال (۱۹) زید ولی بالغ جو چچیرا بھائی ہندہ نابالغہ کا ہے اس نے ہندہ سے گواہوں کے سامنے بعوض پندرہ ہزار روپیہ دین مہر کے اپنا نکاح کر لیا اور اس دیار میں مہر معین نہیں ہے کسی کا چالیس ہزار کسی کا تیس ہزار کسی کا پچیس ہزار کسی کا بیس ہزار کسی کا پندرہ ہزار کسی کا دس ہزار علیٰ ھذا القیاس ہوا کرتا ہے۔ اور ہندہ کی ددھیالی عورتوں میں یا اس قبیلہ میں جو ہندہ کے باپ کے قبیلہ کے مماثل ہو۔ کوئی ایسی عورت جو اپنے نکاح کے وقت میں ہندہ کے ساتھ مساوات و مماثلت رکھتی ہو نہیں موجود ہے کہ اس عورت کا جو مہر مقرر ہوا ہو وہی مہر ہندہ کا قرار دیا جائے تو یہ پندرہ ہزار غبن فاحش ہے یا نہیں اور جبکہ ایسی کوئی عورت جو دونوں میں عقد کے وقت مساوات ہو نہیں ملتی ہے تو یہ نکاح صحیح ہوگا یا نہیں۔ اگر نہیں صحیح ہے تو صحیح ہونے کی کیا صورت ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب من بعض العلماء۔

سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ جبکہ اس دیار میں تقدیر مہر بمقدار معین نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی عورت خاندانی موجود ہے جس میں ہندہ کے اوصاف کا اجتماع ہو تو ولی بالغ کو نابالغہ سے چالیس ہزار یا پچیس ہزار میں اپنے ساتھ نکاح کرنا تھا تاکہ پندرہ ہزار میں غبن متصور نہ ہوتا چونکہ ولی نے اپنے ساتھ پندرہ ہزار میں بلا وجود عورت متساویہ مماثلہ نکاح کیا ہے لہذا یہ نکاح صحیح نہ ہوگا ولی کو پھر نکاح بلا مہر مقرر کئے کرنا چاہئے کہ اگر پہلا نکاح صحیح نہ ہوا ہو تو نکاح ثانی صحیح ہوگا۔ فتاوی ہندیہ میں ہے واذا زوج غیر الاب والجد الصغیرة فالاحتیاط ان یعقد مرتین مرة بمہر مسمی ومرة بغیر مہر مسمی لامرین احدھما انہ لو کان فی التسمیة نقصان لایصح النکاح الاول ویصح الثانی بمہر المثل والثانی ان الزوج لو کان حلف بطلاق امرأة یتزوجھا بلفظ ان اتزوج او بلفظ کل امرأة اتزوجھا

ینعقد الثانی بمہر المثل وتحل انتھی وھکذا فی فتاوی قاضی خان وقال فی رد المحتار (ص۵۰۵) نقلاً عن البحر ولذا ذکر فی الخانیة وغیرھا ان غیر الاب والجد اذا زوج الصغیرة فالاحوط ان یزوجھا مرتین مرة بمہر مسمی ومرة بغیر التسمیة لانہ لو کان فی التسمیة نقصان فاحش ولم یصح النکاح الاول یصح الثانی ولیس للتزویج من غیر کفو حیلة کما لا یخفی۔

ہاں اگر کوئی عورت ہندہ کے ددھیالی عورتوں میں سے یا اس قبیلہ میں سے جو ہندہ کے باپ کے قبیلہ کے مماثل ہو۔ ایسی عورت ہو کہ جو اوصاف ہندہ میں ہوں وہ اس عورت میں بھی ہوں تو اس عورت کا جو مہر ہے وہی ہندہ کا ہوگا، اگر اس عورت کا مہر پندرہ ہزار مقرر ہوا تھا تو ہندہ کا بھی پندرہ ہزار یا آٹھ نو ہزار تک ہو سکتا ہے ایسی صورت میں دوبارہ نکاح کی حاجت نہیں۔ اور مہر بالمثل کی تعریف عالمگیری میں یہ لکھی ہے۔ ومہر مثلھا یعتبر بقوم ابیھا اذا استویا سنا وجمالا وبلدا وعصرا ودینا وبکارة وکذا یشترط ان تستویا فی العلم والادب وکمال الخلق وان لا یکون لھما ولد۔ کذا فی التبیین کذا۔

انتھی، واللہ اعلم بالصواب

محمد عبد الرشید

ذوالقعدة سنہ ۱۳۴۸ھ۔

الجواب من جامع امداد الاحکام:

اس میں شک نہیں کہ دوبارہ تسمیہ مہر نکاح کر لینا احوط ہے لیکن مہر مثل ددھیالی خاندان ہی میں منحصر نہیں بلکہ اگر کسی عورت کا مثل ددھیالی خاندان میں نہ ہو تو ننھیالی خاندان سے مہر مثل اس کا معلوم کیا جائے اگر اس میں بھی نہ مل سکے تو دوسرے اجنبی خاندانوں میں جو خاندان اس عورت کے باپ کے خاندان کا عرفاً مماثل ہو اس سے مہر مثل معلوم کیا جائے نیز یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ مہر مثل میں جن اوصاف کے اندر عورتوں کی مماثلت کو فقہاء نے بیان کیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ سب اوصاف میں مماثلت شرط ہے بلکہ بعض اوصاف میں بھی مماثلت کافی ہے صرح بہ فی الشامیة (ص ۵۸۳ ج۲) اس کے بعد امید ہے کہ اس عورت کا مثل اس کے ددھیالی خاندان میں بھی مل جائے گا۔

واللہ اعلم۔ ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۴۸ھ۔

✲✲✲

فصل فی القسم عند تعدد الازواج

دن کے وقت بیویوں کے درمیان عدل کرنا واجب نہیں

سوال (۱) بہشتی زیور سے معلوم ہوا ہے کہ بیبیوں کے درمیان رات میں برابری ضرور چاہئے دن میں برابری نہیں ہے تو اگر کسی بی بی کی باری میں اس کے یہاں دن کو کھانا کھا کر دوسری بی بی کے گھر پر جس کے یہاں باری نہیں ہے دن کو علیحدہ چارپائی پر جا کر سوئے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ صورت درست ہے، واللہ اعلم ۲۷ شوال ۴۰ھ۔

بیویوں کے درمیان عدل کرنے کے معنیٰ اور فقہاء کے کلام پر ایک اشکال کا جواب

سوال (۲) متعدد ازواج میں عدل کا حکم قرآن سے ثابت ہے اور وہاں اسے عام رکھا گیا ہے جس کے معنیٰ یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ کم از کم امور اختیاریہ میں تو من کل الوجوہ عدل ہونا چاہئے یعنی سفر میں اور نفقہ میں اور وطی میں، سفر میں بھی پھر فقہاء نے اجازت دی ہے کہ خواہ جسے لے جاوے۔ نفقہ میں موسرہ اور معسرہ کی حالت کا اعتبار کیا ہے جس سے ممکن اور اغلب ہے کہ ایک کی حیثیت سو روپیہ ماہوار کی ہو اور ایک کی دس روپیہ ماہوار کی۔ وطی میں بھی عدل نہیں ہے بلکہ اختیاری زوجہ پر موقوف ہے۔ اس کے بعد عدل واقعی نہیں رہتا بلکہ ایک فرضی دکھاوے کی صورت رہ جاتی ہے کہ قسم میں دونوں برابر رہیں۔

الجواب: آپ نے عدل کے معنی تسویہ سمجھے ہیں اس لئے غلط فہمی ہوئی عدل کے معنی جور[1] کے مقابل ہیں یعنی ہر چیز کے ساتھ اس کے مناسب اور حق واجب کے موافق برتاؤ کرنا پس اگر زوجتین یسار و اعسار میں مساوی ہیں تو نفقہ میں تسویہ ورنہ حسب حیثیت عدل واجب ہے۔ تعدد ازواج کی صورت میں تسویہ صرف بیتوتہ وصلات زائدہ میں واجب ہے جبکہ سب حرائر ہوں بقیہ امور میں عدل ہی واجب ہے نہ کہ تسویہ۔ ۸ شوال۔

مسائل متفرقہ متعلقہ نکاح

حضرت امام حسینؓ اور حضرت شہر بانو کے نکاح کی تحقیق

سوال (۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جو مال غنیمت میں آیا تھا اس میں حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا آئیں تھی اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادہ بڑے صاحب کو بغیر نکاح کئے ہوئے دے دی گئیں

[1] یعنی ظلم۔ دلاور حسین بنگلہ دیشی۔

چونکہ اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ جو مال غنیمت میں اس زمانہ میں آیا کرتا اور اس میں عورتیں یا لڑکے آتے تھے وہ ویسی ہی تقسیم کر دیا جایا کرتا تھا یا آزاد کر دیا جاتا تھا ان سے نکاح اللہ تعالیٰ نے جائز نہیں رکھا تھا اور یہ شیعہ لوگ جو ہیں وہ کہتے ہیں کہ نکاح ہوا ہے۔ ہمارے بھوپال میں ایک شخص سید صاحب مشہور ہیں وہ تو سنت جماعت ہیں انہوں نے اپنے مکان میں ایک شیعہ صاحب یعنی میر صاحب کو مہمان ٹھیرا لیا ہے وہ شخص رات دن ہر شخص سے مناظرہ کیا کرتا ہے چونکہ میں بھی ان کے مکان میں رہتا تھا ایک روز مجھ سے میر صاحب نے گفتگو کری، میں نے ان سے سوال کیا کہ ایک بات تم بتاؤ انہوں نے حامی بھری اور فرمایا کہ کہئے میں نے پھر ان سے سوال کیا کہ میر صاحب آپ ہر شخص سے مناظرہ کرتے ہیں ایک بات کا ہماری جواب دے دو حالانکہ میں نے ان سے صرف پہلا اتنا دریافت کیا کہ تم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو حق مانتے ہو تو پھر نکاح تم حضرت شہر بانو کا کہاں سے ثابت کرتے ہو چونکہ ہم نے تو سنا ہے کہ نکاح ثابت نہیں ہے اور نہ نکاح ہوتا ہے جب مال خلافت میں آتا ہے تو ان کا نکاح رب العالمین نے جائز نہیں رکھا ہے لہذا میر صاحب غلطی پر ہوا اور نیز میں نے ان کو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو حق مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس حالت میں، اللہ تعالیٰ نے نکاح جائز نہیں رکھا ہے وہ سید تو حلالی اور جو اس کو نہیں مانتے ہیں وہ حرامی ہیں

الجواب: غنیمت میں جو باندیاں آتی ہیں اُن کے ساتھ باندی رکھ کر تو بیشک نکاح جائز نہیں۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو باندی دی جائے وہ اس باندی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو ممکن ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے شہر بانو رضی اللہ عنہا کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا ہو بدون تحقیق کے اس احتمال کو رد نہیں کیا جا سکتا نیز سائل کا یہ قول بھی غلط ہے کہ جو سید لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو نہیں مانتے وہ حرامی ہیں، حرامی یا حلالی ہونے میں خلافت کے ماننے نہ ماننے کو کیا دخل؟ فقط۔ ۲۶ ربیع الثانی ۴۵ھ۔

بیوی پر گھر کا کام اور روٹی پکانا واجب ہے یا نہیں

سوال (۲) بیوی کے ذمہ شوہر کے لئے روٹی پکانا اور گھر کے کام کاج کرنا واجب ہیں یا نہیں؟

الجواب: زوجہ کے ذمہ شوہر کی خدمت و اعمال بیت دیانۃً واجب ہیں قضاءً نہیں لہذا شوہر اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر انکار کرے گی گنہگار ہوگی (بشرط قدرت) تھا

وعدم عجزها) قال فی الدر استاجر امرأته لتخبز له خبزا للاکل لم یجز وللبیع جاز ۔ صیرفیة ۔ قال الشامی قوله لم یجز لان هذا العمل من الواجب علیها دیانة .... وافاد المصنف آخر الباب ان استیجار المرأة للطبخ والخبز وسائر اعمال البیت لا تنعقد ونقله عن المضمرات ط قلت کأنه لانه واجب علیها دیانة ثم راجعت باب النفقة فرأیته علل به وزاد ولو شریفة لانه علیه السلام قسم الاعمال الخ وهذا یدل علی ما قدمنا من ان المفتی به عند المتاخرین فی الاستیجار علی الطاعات ما نصوا علیه لا لکل طاعة اھ ص ۵۹ ج ۵ ۔ ۳ شعبان سنہ ۴۱ھ

منکوحہ نو مسلمہ اگر بت خانہ میں جاکر افعال شرکیہ کرے تو مسلمہ رہی یا نہیں

سوال (۳) ایک مسلمان شخص نے ایک مشرکہ عورت کو کلمہ وغیرہ پڑھا کر نکاح میں لایا بعد نکاح کے وہی عورت اپنے بت خانوں میں جاتی ہے اور وہاں کی رسم وغیرہ بھی بجالاتی ہے اور اسکے لڑکے وغیرہ و سخت تعصب کرتے ہیں کہ مسلمان مذہب کچھ نہیں اور جب تمام گھر والے بت خانے میں جاتے ہیں تو ان کے خاوند بھی ساتھ جاتے ہیں جو کچھ مشرکوں کے یہاں رسم و رواج ہے سب دیکھ بھال کرتے ہیں نہ اپنی عورت کو منع کرتے ہیں نہ اولاد کو ایسے گھروں میں دعوت ہونے سے کچھ کھا سکتے ہیں یا نہیں اگر کسی قوم کے پیشوا نے کھائی تو اس کے پیچھے اقتداء کرنا جائز ہے یا نہیں حالانکہ یہ پیشوا خوب حالت سے واقف ہے اگر نہیں دیکھا تو سنا ضرور ہے ۔

الجواب: جب وہ عورت بدستور بت خانہ میں جاتی ہے اور وہاں جاکر افعال شرکیہ کرتی ہے اور اسکی اولاد کہتی ہے کہ مسلمان مذہب کچھ نہیں تو یہ عورت اور اس کی اولاد مرتد ہے اور اگر شوہر بھی ان کے افعال شرکیہ سے راضی ہے تو وہ بھی مرتد ہے اس کے ساتھ سلام و کلام و تعلقات وغیرہ نہ رکھنا چاہئیں جب تک کہ یہ سب ان افعال سے توبہ نہ کریں اور توبہ کے بعد تجدید نکاح بھی لازم ہے مقتداؤں کو ایسے شخص کے یہاں دعوت قبول نہ کرنا چاہئے لیکن اگر کوئی بیحیائی سے قبول کرے تو اس کے پیچھے نماز درست رہے گی ۔ واللہ اعلم ۔

۶ شعبان سنہ ۴۳ھ

سالی سے زنا کرنے سے بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال (۴) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی بہن سے زنا کرے اور حمل قرار پائے یا نہیں تو اس کی اصل بیوی اس کے تحت میں رہے گی یا نہیں؟

لہ تحت قوله قبیل باب ضمان الأجیر من کتاب الاستیجار ۶: ۶۲ - ایچ ۔ ایم سعید کمپنی ۔ دلاورسین بگہ دیشی۔

الجواب: بیوی کی بہن سے زنا کرنے سے اصل بیوی حرام نہیں ہوتی اس کا نکاح بحالہ باقی ہے ہاں زانی کو گناہ شدید ہوگا ۔

شوہر اپنی بیوی کو والدین کے گھر سے جبراً لا سکتا ہے

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس صورت میں کہ ایک شخص کی منکوحہ عقد نکاح کے ایک سال بعد اپنے والدین کے گھر چند روز کے لئے بغرض ملاقات گئی فی الحال عرصہ دو سال کا ہوتا ہے کہ زوجہ مذکورہ اپنے والدین کے گھر ہے شوہر اب تک برابر نان و نفقہ سے خبرگیری کرتا رہا اور چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے آوے مگر بیوی کے والدین بعض مصالح دنیویہ کی وجہ سے رضامندی سے چھوڑنا نہیں چاہتے ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شوہر کو شرعاً اختیار ہے کہ بجبر واکراہ اپنی بیوی کو یا باستعانت قانون گورنمنٹ اپنی گھر لے آوے اگر ایسا اختیار ہے تو کتاب کا حوالہ بقید صفحہ تحریر فرما کر ممنون فرماویں ۔

الجواب: فی تنویر الابصار ولها منعه من الوطی والسفر بها ولو بعد وطی وخلوة رضیتهما لاخذ ما بین تعجیله او قدر ما یعجل لمثلها عرفا ان لم یوجل کله وقال الشامی (قوله والسفر) الاولی التعبیر بالاخراج کما عبر فی الکنز لیعم الاخراج من بیتها کما قاله شارحوه ط (قوله لاخذ ما بین تعجیله) علة لقوله ولها منعه او غایة له واللام بمعنی الی (قوله او قدر ما یعجل الخ) ای ان لم یبین تعجیله او تعجیل بعضه فلها المنع لاخذ ما یعجل لها عرفا وفی الصیرفیة الفتوی علی اعتبار عرف بلدهما الخ (ص ۵۸۷ و ۵۸۸ ج ۲) ۔

پس اگر وہ شخص مہر معجل ادا کر چکا ہے تو اس کو اختیار ہے کہ باوجود عورت یا اس کے والدین کی رضامندی نہ ہونے کے عورت کو لے آوے اور اگر مہر معجل ادا نہیں کیا تو جب تک ادا نہ کیا جاوے اس وقت تک عورت کو اختیار ہے کہ وہ آنے سے انکار کر دے

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۵ ج ۲ سنہ ۴۴ھ

اور اگر عرف یہ ہو کہ مہر کل مؤجل ہوتا ہو جو موت یا طلاق ہی کے وقت مانگا جاتا ہے جیسا کہ ہماری اطراف میں عرف ہے تو پھر عورت کو انکار کا کچھ حق نہیں اور مسافت قصر سے کم مسافت میں شوہر جہاں چاہے اس کو لیجائے اور اپنے گھر پر تو جبراً لا سکتا ہے فقط ظفر احمد عفا عنہ ۱۶ ج ۲ سنہ ۴۴ھ

بیوی سے کتنی مدت تک نہ ملنے کی اجازت ہے

سوال (۶) کیا یہ صحیح ہے کہ انسان اگر سفر میں جائے کسی ضروری کام کے لئے اور اس کا وہ کام اب تک ختم نہوا اور اس میں چار ماہ ہو جائیں تو بیوی سے چار ماہ میں نہ ملنے سے وہ گنہگار ہوتا ہے ؟ یا کہ وہ مختار ہے کہ جہاں تک چاہے سفر میں رہ سکے ۔

الجواب ؛ اس صورت میں گناہ ہونا مطلقاً لازم نہیں بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ بیوی سے دیانۃً اتنی مدت تک نہ ملنے سے گناہ ہوتا ہے جس میں اندیشہ اس کی عفت زائل ہونے کا ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ اس کو غیر مردوں کی طرف التفات ہوگا اب اس کو ہر شخص اپنی بیوی کی حالت میں غور کر کے دیکھ لے کہ اس کی بیوی کتنی مدت تک مرد سے صبر کر سکتی ہے اور کتنی مدت میں اس کو مرد کی طرف اشتیاق ہوتا ہے بعض فقہاء نے اندازہ سے چار ماہ اس کی مدت مقرر کی ہے وھی مدۃ الایلاء وبھا امر عمرؓ ان لا یحبس رجل فوقھا فی الجیش. مگر اختلاف حالات و امزجہ سے اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے، واللہ اعلم۔ ۱۶ ر ج ا ۱۳۴۶ھ

کیا عورت کا مرد پر حق ہے کہ وہ رات کو اپنے بستر پر لٹائے

سوال (۷) کیا مرد پر عورت کا حق ہے کہ رات کو اپنے بستر پر لٹاوے یا فقط ایک گھر میں ۔ یا کچھ بھی ضروری نہیں دوسرے گھر میں بھی رکھ سکتا ہے اور ایفائے حق جماع کے لئے کبھی کبھی اپنے پاس لانے سے ادائے حق سے سبکدوش ہو جائے گی غرض رات کو سونے میں عورت کا حق کہاں پر سونا ہے ؟

الجواب ؛ مرد کے ذمہ عورت کو اپنے بستر پر لٹانا واجب نہیں یہ واجب ہے کہ رات کو اسی گھر میں سوئے جہاں عورت سوتی ہے بلکہ دیانۃً یہ واجب ہے کہ عورت کے پاس جانے میں اتنی دیر نہ کرے جس سے عورت کے فساد خیال کا خطرہ ہو البتہ اگر کسی کے دو بیویاں ہوں اور وہ ایک گھر میں سوتا ہو تو اس پر دوسری کے گھر سونا بھی واجب ہے تسویۃً وعدلاً فی البیتوتۃ ۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ عورت کو خاوند کے باہر لیٹنے سے وحشت نہوتی ہو اور اگر وحشت ہوتی ہو تو سوال دوبارہ کیا جائے اور یہ بھی بتلایا جائے کہ دفع وحشت کی اور کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں، فقط ۔

۱۵ ر ذیحجہ ۱۳۴۷ھ

خریدکردہ آزاد عورت سے بغیر نکاح وطی کا حکم

سوال (۸) اکثر پہاڑی مقامات پر خرید و فروخت مستورات کی ہوتی ہے کبھی ہندوستانی خرید کردہ عورت سے (کنیز یا حرم یا

باندی) بغیر نکاح وطی جائز ہے یا نہیں اور ناجائز ہے تو بغیر موجودگی گواہان محض ایجاب و قبول اور تعین مہر کے نکاح ہو سکتا ہے یا موجودگی گواہان ضروری ہے؟ فقط

الجواب ؛ اول تو اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں دوسرے جن روایات میں جواز ہے ان میں قید ہے کہ وہ کفار اس کو جائز سمجھیں اور یہ بھی ہنوز متحقق نہیں (اشرف علی) اس لئے ان خرید کردہ عورتوں کو باندی بنا کر اون سے وطی وغیرہ کرنا جائز نہیں نکاح کر لینا چاہیئے اور نکاح کے لئے دو گواہوں کا ہونا شرط ہے بدون دو گواہوں کے نکاح نہوگا فقط

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۴ ر صفر ۱۳۴۵ھ الجواب صحیح ۔ ظفر احمد عفا عنہ

بدون ادائگی مہر معجل بیوی سے مجامعت درست ہے یا نہیں

سوال (۹) در مسئلہ مرقومہ علماء محققین چہ میفرمایند ۔

بدون مہر معجل مجامعت رواست یا نہ ؟

الجواب ؛ مہر معجل ادا کرنے سے قبل عورت کو حق ہے کہ ہمبستری اور خلوت سے انکار کر دے شوہر کو جبر کرنا جائز نہیں ہے اور اگر ایک مرتبہ خلوت یا ہمبستری کی اجازت دیدی اور بعد میں پھر انکار کر دے تب بھی امام صاحبؒ کے نزدیک انکار کا حق رکھتی ہے پس اس صورت میں شوہر کو اس پر جبر کرنا بھی مختلف فیہ ہے امام اعظمؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی جبر حلال نہیں ہے کما قال الشامی تحت قول الدر (لھا منعه) واشار الی انه لا یحل له وطیھا علی کرہٍ منھا ان کان امتناعھا لطلب المھر عندہ وعندھما یحل کما فی المحیط بحر وینبغی تقیید الخلاف بما اذا کان وطئھا اولا برضاھا اما اذا لم یطأھا ولم یخل بھا کذلک فلا یحل اتفاقا ۔ اور حق منع میں چونکہ امام صاحب کا قول مفتی بہ ہے لہذا حرمت استمتاع میں بھی (جو کہ اس کی فرع ہے) انہیں کا قول معتبر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم ۔ ۲۹ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

بیوی کے بعض حقوق کی وضاحت

سوال (۱۰) السلام علیکم ۔ بعد قدمبوسی مسنونہ کے گذارش ہے کہ احقر نے پہلے خط میں دو ضروری مضمون کے متعلق سوال کیا تھا ان میں سے ایک کا جواب کافی مل گیا دوسرے کے متعلق سوال فرمائے ہیں وہ مضمون خانگی انتظام کے متعلق تھا ۔ یعنی احقر کو نوکری کرنے کی وجہ سے ہمیشہ سفر میں رہنا پڑتا ہے اور گھر میں

مربی نہ رہنے کی وجہ سے بیوی صاحبہ کو خورد و پوش دیکر ان کے والد صاحب کے گھر میں رکھتا ہوں انہوں نے بھی رضامندی ظاہر کر کے قبول کر لیا۔ مگر بیوی صاحبہ بوجہ خانگی چون وچرا کے جو عورتوں میں ہوتا ہے وہاں رہنے پر راضی نہیں اس پر حضور والا نے سوال فرمائے ہیں (اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے) جواب دیا تھا کہ اپنے پاس رکھنے کا دو صورت ہے ایک یہ کہ اپنا گھر رکھوں اور خود بھی بوجہ مربی نہ ہونے کے نوکری چھوڑ کر مکان رہوں ان میں کئی طرح کی خرابی ہے ایک یہ کہ ملک میں عام وخاص سب لوگ بدعت و رسوم کے عادی ہیں مکان پر رہ کر ان کے شرور سے محفوظ رہنا دشوار ہوگا، دوسرے ملک میں حلال روزی کی کوئی صورت نہیں لہذا معیشت میں تنگی ہونے کا اندیشہ ہے، تیسرا جمعیت قلب جو اہم ہے فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔ ثانی صورت یہ ہے کہ جہاں نوکری کرتا ہوں ان کو ہی وہاں لیجاؤں مگر یہ بھی دو وجہ سے نہیں ہوسکتا ہے ایک یہ کہ وہ اور ان کے والد صاحب سفر میں جانے پر راضی نہیں، دوسرا یہ کہ جہاں نوکری کرتا ہوں وہ محض ایسا گاؤں ہے کہ جو وظیفہ احقر کو ملتا ہے اس سے کوئی مسافر اپنے اہل وعیال کے ساتھ وہاں رہنے کا انتظام کرنا بڑا دشوار ہے۔

اب قابل دریافت یہ ہے کہ باوجود ان موانع کے ان کی رضامندی کو لحاظ کر کے گھر میں مقیم ہونا پڑے گا یا حسب دستور خورد و پوش دیکر ان کے والد صاحب کے گھر رکھا جائیگا اس پر حضور والا نے ارشاد فرمائے ہیں (یہ مشورہ ہے یا مسئلہ، مشورہ دینا میرا معمول نہیں مسئلہ کسی خاص شبہ کے سبب پوچھا جاتا ہے اس میں کیا شبہ ہوا جو حکم شرعی پوچھنے کی ضرورت ہوئی) جواباً عرض کرتا ہوں یہ مسئلہ ہے مشورہ نہیں۔ اس میں خاص شبہ ہوا کہ اپنی مصلحت ومنافع پر نظر کر کے بیوی صاحبہ کو باوجود عدم رضا ان کی حسب دستور خورد و پوش دیکر ان کے والد صاحب کے پاس رکھنا احقر کے لئے شرعاً جائز ہوگا یا نہیں۔ از روئے شفقت کے جواب سے ممنون فرمادیں۔

الجواب: عورت کا یہ مطالبہ پورا کرنا تو ضروری ہے کہ اس کو الگ مکان دیا جاوے اور اس کو اس پر مجبور کرنا درست نہیں کہ اپنے والد کے ساتھ رہے۔ البتہ عورت کا یہ مطالبہ کہ اس بستی میں نہ رکھا جاوے اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ پس والد صاحب کے مکان کا کوئی مستقل حصہ جس میں کسی اور کا دخل نہ ہو یا اس کے متصل کوئی دوسرا مکان جیسا موقعہ ہو عورت کے واسطے لے دینا کافی ہے۔ ایک ضروری امر قابل غور (یا)

یہ ہے کہ خاوند کی آمد و رفت عورت کے پاس بقدر ضرورت ہوتی رہتی ہے یا نہیں اگر عورت کی ضرورت (یعنی خواہش نفسانی) کا لحاظ کر کے اس کی آمد و رفت کافی مقدار میں ہوجاتی ہے تب تو یہی جواب ہے جو صلا میں لکھا گیا ورنہ دیانۃً یہ ضروری ہے کہ عورت کو اپنے ہمراہ رکھے یا آمد و رفت میں بقدر ضرورت اضافہ کرے، واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم عفی عنہ۔

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ۔ ۲۸ر شوال ۴۸ھ۔

کتاب الطلاق

باب ایقاع الطلاق

زوجہ کو یہ کہنا کہ میں نے تجھ کو صاف دل سے چھوڑ دیا ہے

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید اور اس کی بہن میں کھانا پکانے کی بابت نزاع ہوا بہن کہتی ہے کہ جب تم نے نکاح کر لیا ہے تو تم بیوی کو کیوں نہیں لاتے؟ میں نے سنا اور اس مکان میں جاکر معلوم کیا کہ تمہاری بیوی حاملہ ہے تم وہاں جاتے ہو اس کو کیوں نہیں لاتے؟ زید نے جواب میں کہا میں تو بھادوں (نام ایک مہینہ کا ہے) میں گیا پھر نہیں گیا میں اس کو نہیں لاؤنگا میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے میں نے تین بار کہا ہے میں نے صاف دل سے چھوڑ دیا ہے پھر پوچھنے سے وہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق دیا ہے میں نے طلاق دیا ہے میں نے طلاق دیا ہے زبان بندی بالا کا حاصل یہ ہے کہ زید کی بہن کے پاس طلاق کی جو خبر دی اس سے عورت اوس کی مطلقہ ہوگی یا نہیں زبان بندی بالا اخبار ہے یا انشاء بصورت اول خبر سے طلاق ہوسکتی ہے یا کیا اور حسب زبان بندی زید کے ایقاع پایا گیا یا نہیں بغیر ایقاع کے طلاق واقع ہوگی یا نہیں اور جمیع عقود میں انشاء شرط ہے یا نہیں؟ مخفی نہ رہے کہ ماجرائے مذکور میں پیشتر اس کے زید نے طلاق بالکل نہیں دی اب سوال یہ ہے کہ اس خبر سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں برحق جواب حسب مسائل فقہ واصول کے تحریر فرمائیے ماجور ہوں گے۔

الجواب: صورت مسئولہ میں قائل کا یہ قول کہ میں نے صاف دل سے چھوڑ دیا ہے، اس کا قرینہ ہے کہ اس کی مراد انشاء ہے خبر نہیں لہذا منکوحہ زید پر تین طلاق واقع

ہوگئیں اب بدون تحلیل کے کسی طرح اس سے نکاح درست نہیں، واللہ اعلم۔

لہ ۷ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۰ھ۔

"ہم تم کو طلاق دیدیں گے" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال (۲) شوہر نے ایک قصور کے متعلق اپنی بی بی سے پوچھا اس کی بی بی نے پنے قصور کا اقرار کیا، شوہر نے اپنی بی بی کے قصور کے اقرار کو خوب سمجھ لیا وہ اپنے قصور کے اقرار سے سراپا قصور وار ہے لیکن شوہر نے اقرار کو اپنی بی بی کے اوپر ایسی حیثیت سے ظاہر کیا اور کہا کہ جس میں بی بی کو معلوم ہو کہ شوہر نے ہمارے قصور کو سمجھا نہیں ہم بے قصور ثابت ہوے اور شوہر کو بھی منظور تھا کہ جس میں بی بی کے اوپر اس کے قصور کے اقرار پر اس کے قصور کی ناسمجھی میری ظاہر ہو، اس خیال سے شوہر نے بی بی کے اوپر اسکے قصور کی ناسمجھی اپنی ظاہر کی اور سوچا کہ اگر قصور پر سزا کرے تب بھی بڈر ہو جائے گی اور نہیں سزا کرے جب بھی بڈر ہو جائے گی۔ بلکہ مناسب یہ سمجھا کہ اس کے قصور کے اقرار پر اس کے قصور کی ناسمجھی اپنی ظاہر کر کے اس کو ڈرایا اور کہا کہ اگر ایسا قصور تم کئے ہوتی یا تم سے ہوئی ہوتی تو تم کو ہم طلاق دیدیتے اور حقیقت میں بی بی کا قصور ہو اور قصور کے اقرار کو سمجھتے ہوئے شوہر نے ایسا جملہ کہا ہے اور اس کے ہفتہ روز کے بعد کسی قصور پر غصہ ہو کر کہا کہ اگر تم کو ہم طلاق نہیں دیں تو تم ہم کو چمار کہنا تم کو ہم طلاق دیدیں گے تین مرتبہ ایسے جملہ کو شوہر نے کہا ہے لیکن شوہر کو طلاق کے جملوں کا کچھ یاد خیال نہیں ہے بوجہ سہو و شک کے سخت مجبور ہے اگر کوشش کرتا ہے کہ یاد و خیال کریں تو چند طرح کے وہم طلاق کے جملوں کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ جملہ کہا ہو شاید یہ جملہ کہا ہو شاید یہ جملہ کہا ہو غرض ہر چند طرح کے وہمی جملے خیال میں آتے ہیں شوہر کو اپنی تشفی بخش کوئی جملہ یاد و خیال نہیں ہے اور نہ کچھ بیان کر سکتا ہے ایسی حالت میں . . . .

. . . . . . شوہر نے بی بی سے پوچھا کہ فلاں فلاں وقت میں ہم نے طلاق کا جملہ تم کو کس طرح کہا تھا بی بی نے بیان کیا کہ فلاں وقت میں آپ نے کہا ہے کہ اگر ایسا قصور تم کئے ہوتی یا تم سے ہوئی ہوتی تو تم کو ہم طلاق دیدیتے اور اس کے ہفتہ روز کے بعد آپ نے کہا ہے کہ اگر تم کو ہم طلاق نہیں دیں تو ہم کو چمار کہنا تم کو ہم طلاق دیدیں گے بی بی کے بیان پر شوہر کو کامل تشفی اور یقین اور پورا وثوق ہے اور بی بی کے بیان کو ہم حق سمجھتے ہیں اور بی بی نیک بخت حق گو اور پرہیزگار ہے اس کے بیان پر استفتاء ارسال خدمت ہے جواب سے سرفراز فرمایا جاوے؟

لہ یعنی جرم

۲۶

الجواب: صورت مسئولہ میں طلاق نہیں ہوئی فقد صرح الفقہاء بعدم وقوع الطلاق بصیغۃ المضارع الا اذا غلبت فی الحال، واللہ اعلم۔

۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۰ھ۔

انتہائی غصہ کی حالت میں طلاق دی تو کیا حکم ہے

سوال (۳) ایک شخص کے گھر میں اسکی بیوی، بہن اور بھائی کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا اتنے میں وہ شخص گھر آنکر اس کے چھوٹے بھائی کو جھگڑا رفع ہونے کیلئے مارا اس سے اس کی ماں اس شخص مذکور پر غصہ ہوئی اور بہت گالی دی اس کے بعد وہ شخص غصہ میں آنکر کہا کہ میں ہفتہ عشرہ میں مکان چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاؤں گا اس کے بعد اس کی ماں بولی کہ تم اس بدصورت عورت کے لئے مکان چھوڑنا چاہتے ہو اسی وقت وہ شخص بہت غصہ میں تھا کہ مارے غصہ کے سارا بدن کانپتا تھا ایک مکان پر اطمینان سے کھڑا ہو نہیں سکتا تھا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو گئے تھے اسی وقت اس کی زبان سے "ایک طلاق دو طلاق تین طلاق دیا" نکل آیا اس کے بعد جب خیال ہوا تو بے اختیار رونے لگا اور کہتا تھا کہ میں نے یہ کیا کیا میرے دل میں طلاق دینے کا ارادہ نہیں تھا خدا جانے کس طرح میرے منہ سے یہ کلمہ نکل آیا۔

الجواب: صورت مسئولہ میں اس شخص کی عورت کو اپنے خاوند سے الگ ہو جانا چاہئے اور وہ یہی سمجھے کہ مجھ کو تین طلاق دی گئی ہیں اس کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ شوہر کو اپنے اوپر قابو دے یہ حکم تو عورت کے لئے ہے۔ اور مرد کو چاہئے کہ اگر اس کے نزدیک واقعی غصہ میں اس کی عقل و حواس درست نہ رہے تھے اور اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں زبان سے کیا کہہ رہا ہوں تو وہ کسی حاکم مسلم کے پاس جا کر یہ دعویٰ کرے کہ میں غصہ میں مغلوب الحواس وزائل العقل ہو گیا تھا اور طلاق میں نے بالکل بے خبری کی حالت میں دی ہے حاکم اس سے گواہ طلب کرے گا اس کے بعد اگر حاکم شرعی یہ فیصلہ کرے کہ میرے نزدیک یہ طلاق واقع نہیں ہوئی تب وہ عورت اس کے لئے حلال ہو سکتی ہے اور بعد حاکم مسلم کے فیصلہ کے عورت کو بھی اس شخص کے پاس رہنا جائز ہوگا اور بدون حکم حاکم کے ہرگز عورت کو اس کے پاس رہنا جائز نہیں کیونکہ بظاہر تین طلاق پڑ چکی ہیں، واللہ اعلم۔ ۲۸ جمادی الثانیہ

شوہر نے طلاق دی مگر یاد نہیں کہ "دو" دیں یا تین

سوال (۴) زید نے اپنی زوجہ کو طلاق دی مگر یہ یاد نہیں کہ تین طلاق دی یا دو اور کسی جانب رجحان بھی نہیں صورت

مسئولہ میں طلاق بائن واقع ہوگی یا مغلظہ؟

الجواب؛ قال فی الخلاصۃ رجل حلف بالطلاق وشك الرجل انہ طلق واحدۃ او ثلاثا فھی واحدۃ حتی یستیقن او یکون اکثر ظنہ علی خلافہ اھ ص ۱۲۰ ج ۲۔ صورت مذکورہ میں دو طلاق مانی جاویں گی لیکن اگر عورت کو تین طلاق میں شک نہو تو اس کو شوہر کے پاس رہنا جائز نہیں اور اگر اسے بھی شک ہو تو اس کے لئے وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا، واللہ اعلم۔ حررہ ظفر احمد بامر سیدہ حکیم الامت ۹ ر شعبان۔

صیغۂ مضارع میں طلاق دینے کا حکم

سوال (۵) ہدیہ سلام مسنون۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی دختر محمودہ بالغ کا عقد شرعی مظہر بالغ پسر عمرو سے اس کی خواہش پر بالعوض پانچہزار اشرفی زر سرخ محمد شاہی مہر کے بلا اجازت و اطلاع عمرو کے کر دیا، نکاح کے بعد مطلع ہونے پر عمرو اور اس کے دیگر اعزا نے اس نکاح سے اظہار ناخوشی کیا، اور مظہر کو کہ اس وقت تک زید کے پاس مقیم تھا اس ارادہ سے طلب کیا کہ میں مظہر کا دیگر اعزا کی خوشی و رضامندی سے دوسرا عقد کروں گا، عمرو کی ایسی تحریر آنے پر مظہر نے اپنے باپ کے پاس جانے کی اجازت طلب کی اور یہ کہا اور لکھ دیا کہ میں حسب طلب اپنے والد عمرو کے وطن جاتا ہوں اگر وہاں پہنچکر میرے اس نکاح کے معاملہ نے کوئی دوسری نوعیت اختیار کی اور میرا عقد ثانی کسی دوسری جگہ قرار پایا یا اندر میعاد دس ماہ کے میں نے وطن سے واپس آکر محمودہ کی رخصتی نہ کرائی تو یہ تحریر میری محمودہ دختر زید کے حق میں بطور طلاق کے متصور ہوگی اور بعد انقضاء میعاد معینہ زید کو اپنی دختر محمودہ کے دوسرے عقد کر دینے کا اختیار ہے میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اب میعاد معینہ میں صرف عرصہ دو ماہ کا باقی ہے اور مظہر کی واپسی کی اس وقت تک کوئی امید نہیں معلوم ہوتی میعاد معینہ گذر جانے کے بعد محمودہ منکوحہ کے حق میں شریعت غرا کا کیا حکم ہے جبکہ محمودہ اور مظہر کے درمیان خلوت بھی نہ ہوئی ہو اور ایسی صورت میں مہر کے واسطے کیا حکم ہے؟

الجواب؛ صورت مذکورہ میں اگر دس ماہ میعاد معینہ کے اندر مظہر نے محمودہ کی رخصتی نہ کرائی تو محمودہ پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اور ہر چند کہ قول مظہر بطور طلاق متصور ہوگی الخ صیغہ مضارع کا ہے اور مضارع سے وقوع طلاق نہیں ہوتا مگر جب مضارع بمعنی حال غالب ہو جائے تو فقہاء نے اس سے وقوع طلاق کی تصریح کی ہے اور آجکل

تعلیمیافتہ جماعت نے کچھ ایسا محاورہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ حال کے موقع میں اکثر صیغہ مضارع کا استعمال کرتے ہیں لہذا ہمارے نزدیک اس کلام میں مضارع سے حال ہی مراد ہے اور بعد میعاد معینہ گذر جانے کے محمودہ پر طلاق عائد ہو جائے گی جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد کلام مظہر میں یہ لفظ بصورت حال مذکور ہے اور بعد انقضاء میعاد معینہ زید کو اپنی دختر محمودہ کا دوسرا عقد کرنے کا اختیار ہے الخ یہ صیغہ انشاء اور ایقاع پر صاف دلالت کر رہا ہے، قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: (سئل) فی رجل قال لزوجتہ تکونی طالقۃ ثلثاً بصیغۃ المضارع وغلب استعمالہ فی الحال عرفاً فھل یقع علیھا الطلاق؟ (الجواب) نعم کما افتی بہ الخیر الرملی، واطال الکلام علی حاشیتہ علی البحر فی اجعھا اھ ص ۴۰۶ ج ۱۔

اور صورت مذکورہ میں محمودہ پر عدت لازم نہوگی وہ بلا عدت دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اور مظہر سے وہ نصف مہر وصول کر لینے کی مستحق ہوگی واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفا عنہ۔

صح الجواب، اشرف علی، ۲۲ ر رمضان سنہ ۴۱ھ۔ ۲۲ ر رمضان سنہ ۴۱ھ۔

"طلاق دادم" کہنے کے بعد طلاق بائن کا لفظ بولنے کا حکم

سوال (۶) السلام علیکم۔ در رمضان شریف سنہ ۴۱ھ یک استفتاء در خدمت گرامی عرض داشتہ شد خلاصہ مضمونش آنکہ شخص جاہل زن خود را گفت طلاق دادم طالب علمی او را تلقین نمود کہ برائے انفصال مناقشہ بگو کہ طلاق بائن دادم آن چنیں گفت بعدہٗ دیگر طالب علم گفت کہ بائن را نمی فہمند برائے اطمینان جانبین گفتہ آید کہ جواب دادم باز آن شخص چنیں گفت از آنجناب جواب مورخہ ۴ ر شوال سنہ ۴۱ھ چنیں رسید کہ طلاق مغلظ واقع شد۔ واز جانب حضرت مفتی صاحب دیوبند جواب ارشاد گردید کہ دریں صورت طلاق بائن شدہ است مغلظ نشدہ است توجیہ جواب حضرت مفتی صاحب در فکر قاصر نمی آید مگر وجہ مؤید جواب ایشان در بیاض واحدی منقولاً عن بیاض ہاشمی در جواب استفتاء ہمرنگ استفتاء ما دیدہ شد کہ البائن لا یلحق بالبائن پس در صورت مسئولہ عنہا ہم حسب ارشاد مفتی صاحب عم فیضہ صرف طلاق بائن واقع خواہد شد نہ مغلظ چنانچہ رقم زدہ آنجناب است زیرا کہ دریں صورت یک رجعی ارادۃً و دو بائن بالتفریق تقلیداً از آں شخص صادر گشتہ پس از یک رجعی و یک بائن تغلیظ نمیگردد و دو بائن دیگر بہ بائنِ اول

ہم لاحق نمیشود تا کہ حکم سہ طلاق کردہ آید باید کہ بر جواب خود ثانیا نظر غائر گماشتہ از تحقیق خود ما مستمندان را مستفید فرمایند واصل سوال وجواب راز دفتر فتاوی تلاش فرمایند فقط

الجواب : اگر میں نے اس صورت مسئولہ میں طلاق مغلظ کا فتوی دیا ہے تو میں اس سے رجوع کرتا ہوں اس صورت میں صرف دو ہی طلاق واقع ہوئیں مگر دونوں بائن ہیں، تجدید نکاح سے تعلق زوجیت قائم ہو سکتا ہے ۔ غالباً منشاء میرے اس فتوی کا یہ ہوا کہ شخص مذکور نے دوبارہ لفظ طلاق بائن دائم لکھا ہے اور یہ لفظ محض بائن نہیں ہے بلکہ بائن صریح ہے کہ اس سے بدون نیت کے وقوع طلاق ہو جاتا ہے پس میں نے اس کو صریح سمجھکر بائن کو اس کے ساتھ ملحق کر لیا اور اس صورت میں صاحب نہر وبحر کا قول یہی ہے جو میں نے لکھا ہے مگر محقق یہ ہے کہ بائن صرف صریح رجعی سے ملحق ہوتا ہے نہ صریح بائن سے حققہ الشامی (۳ ج ۲۷۷) لہذا قول محقق کو اختیار کر کے میں اپنے پہلے قول سے رجوع کرتا ہوں؛ والسلام

شوہر نے عصا سے تین لکیریں کھینچیں اور کہا "ایک دو تین میرے گھر سے چلی جا"

سوال (۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ مجھ مسمی عبداللہ ولد اللہ دیا قوم اوان ساکن موضع ارڑ ضلع جہلم تحصیل پنڈ دادنخان ۔ احقر عرصے بیمار تھا میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم مجھ کو تمام زیور دو جس سے میں اپنی بیماری کا علاج کراؤں فروخت کر کے، میری عورت نے کہا میرے پاس زیور نہیں اور جس جگہ احقر نے زیور رکھا تھا وہاں بھی تلاش کیا مجھ کو نہ ملا اور پھر میں نے اپنے عزیزوں سے دریافت کرایا میری عورت نے ان کو بھی یہ کہہ دیا کہ زیور میرے پاس نہیں اسی کے پاس یعنی عبداللہ کے پاس ہے، میں نے پھر اپنی عورت سے کہا کہ اگر تم مجھ کو زیور نہ دو گی تو میں تم کو لاٹھی سے ماروں گا اس نے پھر بھی نہیں بتلایا میں نے اس سے کہا کہ تو یہ تین لکیر لاٹھی سے کھینچ دیتا ہوں کہ ایک دو تین گھر سے نکل جا اور اتنے زیور نہ دیوے گی گھر میں نہ آنے دوں گا عورت اپنے بھائی اور ماں کے پاس چلی گئی تھوڑے عرصہ کے بعد اس کے بھائی اور ماں نے کہا کہ تم زیور ہم کو دو جس سے ہم گذر کریں اس نے ان کو جواب دیدیا کہ زیور میرے پاس نہیں ہے انہوں نے اس کو تنگ کیا اس گاؤں کا ایک آدمی ہمارے یعنی عبداللہ کے گاؤں کا گیا ہوا تھا اس عورت نے کہا کہ تم میرے خاوند سے کہہ دینا کہ مجھ کو لیجاؤ اس نے میرے سے آکر کہا کہ تمہاری عورت کہتی ہے کہ مجھ کو لیجاؤ میں نے اس آدمی کو جواب دیا کہ تم پھر کبھی جاؤ تو اس سے یہ کہنا کہ اگر تو تمام زیور دیوے تو چلی آوے ورنہ خیر

اس نے کہا یعنی عورت نے کہا کہ میں تمام زیور دے دوں گی مجھ کو میری عورت نے بہت آدمیوں میں جھوٹا کر دیا تھا کہ زیور میرے پاس نہیں ہے عبداللہ کے پاس ہے میں نے اسی وجہ سے اس آدمی سے کہا کہ تم زیور لے آؤ تا کہ ان آدمیوں کو کل حال معلوم ہو جاوے کہ واقعی زیور عورت کے پاس ہے ۔ وہ آدمی زیور اور عورت کو لے آیا میں نے وہ زیور اس آدمی کے پاس امانت رکھی کہ ابھی تم ہی رکھو جب کبھی موقع ہو گا تم ان ہی آدمیوں میں مجھ کو دینا جس کے سامنے مجھ کو عورت نے جھوٹا بنایا کچھ عرصہ کے بعد اس نے عورت اور مجھ کو بہت آدمیوں کے سامنے زیور دیدیا ۔ اب میری عورت میرے گھر میں ہے ہمارے گاؤں کے آدمی کہتے ہیں کہ تیرا نکاح نہیں رہا ہمارے گاؤں میں شیعہ لوگ بہت رہتے ہیں وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم پنجوقتی نماز پڑھتے ہو پھر بے نکاحی عورت گھر میں رکھے ہو، اب میرا نکاح رہا یا کہ نہیں آپ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب کے اور شبیر علی صاحب کے بھی دستخط کرا دیں اور حوالہ حدیث کا بھی دیدیں عین عنایت ہو گی اللہ تعالی آپ کو اجر عظیم عطا فرما دیں اس مسئلہ کی خوب صفائی کر دیویں، فقط والسلام ۔

الجواب : اگر سائل نے ایک دو تین کہتے ہوئے زبان سے لفظ طلاق نہیں کہا تو محض لکیریں کھینچکر ایک دو تین کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوئی قال فی العالمگیریۃ امرأۃ قال لہا زوجہا انا استنکف عنک فقالت المرأۃ کالبزاق فی الفم فان کنت تستنکف عنہا فارم بہا فقال الزوج تف تف ورمی بالبزاق وقال رمیت ونوی الطلاق لا تطلق کذا فی الظہیریۃ اھ ص ۲ ج ۲۷۰ وفیہ ایضاً: ولو قالت طلقنی فضربہا وقال لہا اینک طلاق لا یقع وفی مجموع النوازل سئل شیخ الاسلام عمن ضرب امرأتہ وقال دار طلاق قال لا تطلق و سئل الامام احمد القلانسی عمن وکز امرأتہ وقال اینک یک طلاق ثم وکزہا ثانیا وقال اینک دو طلاق وکذا الثالث تطلق ثلثاً فشیخ الاسلام یقول سمی الضرب طلاقاً فیبطل والامام احمد یقول سمی الطلاق فیقع اھ (ص ۲ ج ۲۷۲) قلت وفی الصورۃ المسئولۃ لم یسم الطلاق بل خط خطوطا وقال یک و دو وسہ فلا تطلق علی قول احد، واللہ اعلم ۔

۲۶ صفر سنہ ۴۳ھ ۔

کابین نامہ کے مطابق طلاق واقع ہو جانے کا حکم

سوال (۸) ایک شخص مسمی حافظ زین العابدین جو کہ جمعہ و عیدین کے پیش امام اور مقتدا ہیں ۔ اپنی بی بی کی کابین نامہ میں یہ شرط لکھوا کر اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے خود جا کر رجسٹری کروا دیا ۔ کہ د آپ کی و آپ کی ولی وارث کی بلا اجازت اور آپ کی کل مہر ادا کر کے اس کابین نامہ کی پشت پر وصول دینے کے بغیر غیر کوئی عورت سے نکاح بیاہ نکروں گا ۔ اگر کروں تو وہ عورت اسی وقت میرے حق میں ایک دو تین طلاق ہو گی) اتفاقاً بی بی سے کوئی بات میں ناموافقت ہوئی تب وہ طیش میں آ کر نہ بی بی سے اجازت لیا نہ بی بی کے ولی وارث سے اجازت لیا ۔ نہ مہرانہ کو ادا کیا ۔ دوسری ایک عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ خفت جفت بود باش خانہ داری کرنے لگا ۔ پس مطابق شرع شریف کے اس کی دوسری عورت مطلقہ لبسہ طلاق ہو گی یا نہ ۔ اور اس عورت کے ساتھ خلوت صحبت کرنا اس کے لئے زنا میں محسوب ہو گا یا نہ ۔ اور اس سے اگر اولاد ہو تو حلال زادہ ہو گی یا نہ ۔ اور اس شخص کے پیچھے اقتدار درست ہو گی یا نہ ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب ؛ صورت مسئولہ میں دوسری عورت سے نکاح کرتے ہی اس پر تین طلاق واقع ہو گئی ہیں اب بدون حلالہ کے وہ عورت زین العابدین کے لئے حلال نہیں نہ اس سے زن و شو کا معاملہ درست ہے اور اس حالت میں جو وطی ہو گی وہ حنفیہ کے نزدیک زنا ہو گی مگر اولاد کو حرامی نہ کہا جائے گا لانہ کالوطی بشبھۃ ولان وقوع الطلاق فی ھذہ الحالۃ مختلف فیہ بین الائمۃ فافہم، واللہ اعلم ۔ اس شخص کی اقتدار مکروہ ہے نماز تو ہو جائے گی مگر دوسرا نیک امام میسر آ سکتا ہو تو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہو گی اور اگر دوسرا امام میسر نہ ہو اور نہ اسکو الگ کرنے کی قدرت ہو تو بلا کراہت نماز درست ہے واللہ اعلم ۔

۱۳ ر ذیقعدہ سنہ ۴۲ھ ۔

اس صورت میں طلاق کا حکم جبکہ زوج منکر ہو اور گواہ ایک مرد اور ایک عورت ہو

سوال (۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ شوہر زوجۂ نابالغہ کو غصہ کے سبب تو ماں اور بہن ہیں دو چار مرتبہ کہدیا کسی نے کہا بیوقوف کیا کہہ رہا ہے کہتے ہی طلاق طلاق سات یا آٹھ بار کہدیا دوسرے یا تیسرے روز اس شخص سے تحقیق کی گئی تو اس نے انکار کر دیا کہ میری زبان سے یہ الفاظ نہیں نکلے (یعنی جو الفاظ اوپر ذکر کئے گئے ہیں) لیکن ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہیں اس باب میں شرع شریف کا کیا حکم ہے ۔ دیگر مذکورۂ بالا صورت میں دو مرد اگر گواہ ہوں تو کیا حکم ہے ؟

الجواب ؛ شوہر کا تو ماں اور بہن بچہ کہنا تو لغو ہے اس سے کچھ نہیں ہوتا مگر اس کے بعد جو اس نے سات آٹھ بار طلاق کا لفظ کہا ہے اور اب اس سے انکار کرتا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زوجہ نے طلاق کا لفظ تین بار سن لیا ہو تو اس پر واجب ہے کہ اپنے کو مطلقہ مغلظہ یعنی مطلقۃ الثلاث سمجھے اور شوہر سے علیحدہ ہو جائے اور اس کو اپنے اوپر ہرگز قابو نہ دے ۔ اور اگر زوجہ نے خود یہ الفاظ نہیں سنے تو اگر دو نیک مردوں یا ایک نیک مرد اور دو نیک عورتوں نے اس سے ایسا بیان کیا کہ شوہر نے طلاق کا لفظ تین مرتبہ یا اس سے زائد دفعہ استعمال کیا ہے جب بھی یہی حکم ہے ۔ اور اگر ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہے تو اس سے قضاءً ثبوت طلاق نہیں ہو سکتا جب تک شوہر خود اقرار نہ کرے البتہ اس صورت میں اگر خبر دینے والا ثقہ ہو یا ثقہ تو نہ ہو مگر عورت کے دل کو یہ بات لگی کہ یہ مرد یا عورت سچ کہہ رہی ہے تو اس کو شوہر سے الگ ہو جانا ضروری ہے اور بعد عدت گذارنے کے دوسرا نکاح کسی دوسرے سے کر سکتی ہے گو اولیٰ یہ ہے کہ الگ تو ہو جائے مگر نکاح غیر سے نکرے قال فی الدر عن الجوھرۃ اخبرھا ثقۃ ان زوجھا الغائب مات اوطلقھا ثلثاً او اتاھا منہ کتاب علی ید ثقۃ بالطلاق ان اکبر رأیہ انہ حق فلا بأس ان تعتد وتتزوج الخ قال الشامی وقولہ فلا بأس یفید ان الاولیٰ عدمہ اھ (ص ۱۰۱۴ ج ۲) وفیہ ایضاً تحت قولہ علی ید ثقۃ ھذا غیر قید اھ وفیہ (۷۰۹) والمرأۃ کالقاضی اذا سمعتہ او اخبرھا لایحل لھا تمکینہ اھ ۔

۳ ر ذوالحجۃ سنہ ۴۲ھ ۔

ازالۃ الاغلاق من اضافۃ الطلاق
طلاق میں عورت کی طرف اضافت کی تحقیق

سوال (۱۰) کیا فرماتے ہیں علماء کرام رحمکم اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بی بی کو ایک کام خانگی کرنے کو کہا وہ نہیں کی اس لئے میں نے ان کو لات وغیرہ کچھ مارا پھر بھی وہ کام نہیں کی پھر جب اور مارنے کو ارادہ کیا وہ میری ماں کے پیچھے بھاگی اور ماں حائل ہونے کی وجہ سے نہیں مار سکا تب میں نے یوں کہا کہ ایک طلاق دو طلاق تین طلاق بائن اس گھر کا کھانا اگر کھائے گی تو حرام کھائے گی ان سے جب پوچھا کہ یہ جو تم نے کہا کہ اس گھر کا اگر کھانا کھائے گی تو حرام کھائے گی کس کو کہا کیا تمہاری ماں کو کہا یا تمہاری بی بی کو کہا ؟ اس نے جواب دیا کہ طلاق جس طرف جائے گی یہ بھی اس طرف جائے گا اب بحکم شرع کیا اس کی بی بی مطلقہ لبسہ طلاق ہو گی ؟ بینوا بالدلیل

اس مسئلہ میں علماء دو فریق ہیں۔

فریق اول کہتے ہیں کہ مطلقہ بسہ طلاق ہوگی چونکہ صریح الفاظ سے طلاق دیا اگرچہ تم کو یا نام لیکر نہیں دیا مگر اضافت معنویہ موجود ہے بوجہ واقعہ مذکورہ کے اور وہی اضافت معنویہ وقوع طلاق کا شرط ہے لما فی الشامی لترکہ الاضافۃ ای المعنویۃ فانہا الشرط اور اگرچہ لفظ دیا نہیں کہا مگر لفظ طلاق مصدر ہونے کی وجہ سے طلاق واقع ہوگی دیا وغیرہ کا محتاج نہیں ہے لما فی الشامی قولہ وفی انت الطلاق او الطلاق الخ بیان لما اذا اخبر عنہا بمصدر معرف او منکر او اسم فاعل بعد مصدر کذلک۔ پس صورت مسئولہ میں طلاق ہو جائے گی فقط

فریق ثانی کہتے ہیں کہ صورت مذکورہ میں طلاق واقع نہ ہوگی چونکہ اضافت نہیں ہے اور لفظ دیا وغیرہ کچھ نہ کہا۔ دلیل ان کی عبارت قاضی خان کی ہے کہ" ارتو زن من سہ طلاق " لا تطلق امرأتہ لانہ ما اضاف الطلاق الیہا ، وقولہ رجل قال لامرأتہ اگر توزن من سہ طلاق مع حذف الباء لا یقع الخ

الجواب : فریق اول کا قول صحیح ہے اضافت طلاق جو شرط وقوع ہے اس میں اضافۃ معنویہ کافی ہے اور خطاب کے وقت اضافۃ معنویہ موجود ہوتی ہے قال الشامی والخطاب من الاضافۃ المعنویۃ وکذا الاشارۃ وصرح قبلہ ان الشرط ھی المعنویۃ لا اللفظیۃ قال ولا یلزم کون الاضافۃ صریحا فی کلامہ لما فی البحر لو قال طالق فقیل لہ من عنیت فقال امرأتی طلقت امرأتہ اھ الی ان قال ناقلا عن البحر امرأۃ طالق او قال طلقت امرأۃ وقال لم اعن امرأتی یصدق اھ ویفہم منہ انہ لو لم یقل ذلک تطلق امرأتہ لان الظاہر ان من لہ امرأۃ انما یحلف بطلاقہا لا بطلاق غیرہا اھ (ص ۵۰۷ ج ۲) ملخصا۔ اور خانیہ وغیرہ میں جو مذکور ہے کہ ارتو زن من سہ طلاق لا تطلق لانہ ما اضاف الطلاق الیہا۔ اس میں اور صورت واقعہ میں فرق یہ ہے کہ جزئیہ[عہ] خانیہ اُس

عہ پہلے یہاں یہ لکھا گیا تھا کہ جزئیہ خانیہ دیانت پر محمول ہے اور قضاءً طلاق بدون اضافت صریحہ کے بھی واقع ہے جبکہ اضافت معنویہ خطاب واشارہ موجود ہو چونکہ عورت مثل قاضی کے ہے اس لئے دیانت پر (باقی بر صفحہ آئندہ)

صورت میں ہے جبکہ قرائن سے اضافت الی الزوجہ متعین نہو لان الکلام محتمل الصراف عن زوجتہ اذا لم یضف الطلاق الیہا۔ اور صورت مسئولہ میں قرائن قویہ حالیہ ومقالیہ ارادہ اضافت طلاق الی الزوجہ متعین ہے اما الحال فالغضب وارادۃ ضربہا واما المقال فقولہ طلاق جس طرف جائے گی یہ بھی اسی طرف جائے گی اھ پس صورت مسئولہ میں قضاءً بھی طلاق واقع ہو چکی ہے اور دیانۃً بھی لما سیاتی۔ قال الشامی عن القنیۃ عازیا الی البرہان لصاحب المحیط رجل دعتہ جماعۃ الی شرب الخمر، فقال انی حلفت بالطلاق انی لا اشرب وکان کاذبا فیہ ثم شرب طلقت وقال صاحب التحفۃ لا تطلق دیانۃً اھ وما فی التحفۃ لا یخالف ما قبلہ لان المراد طلقت قضاءً فقط لما مر انہ لو اخبر بالطلاق کاذبا لا یقع دیانۃً بخلاف الہازل فہذا یدل علی وقوعہ وان لم یضفہ الی المرأۃ صریحا نعم یمکن حملہ علی ما اذا لم یقل انی اردت الحلف بطلاق غیرہا فلا یخالف ما فی البزازیۃ اھ وہو ما ذکرہ اولاً قال لہا لا تخرجی من الدار الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لا یقع لعدم ذکر حلفہ بطلاقہا ویحتمل الحلف بطلاق غیرہا فالقول لہ قال الشامی المفہوم من کلام البزازیۃ انہ لو اراد الحلف بطلاقہا یقع لانہ جعل القول لہ فی صرفہ الی طلاق غیرہا اھ (ملخصا متفرقا، ص ۵۰۷ ج ۲) پس جن جزئیات میں اضافت صریحہ نہونے کی وجہ سے عدم وقوع کا حکم مذکور ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ اگر زوج ارادہ طلاق زوجہ کا انکار کرے اور قرائن بھی ارادۂ زوجہ پر قائم نہوں تو طلاق واقع نہوگی لیکن اگر قرائن اضافت الی الزوجہ پر قائم ہوں تو قضاءً بہرحال واقع ہے جبکہ اضافت معنویہ خطاب یا اشارہ موجود ہے، اور عورت مثل قاضی کے ہے وہ اپنے کو مطلقہ ہی سمجھے اور انکار زوج کو ہرگز قبول نکرے، اور صورت مسئولہ میں تو زوج ارادہ طلاق زوجہ کا منکر بھی نہیں پس اس صورت میں تو قضاءً ودیانۃً ہر طرح طلاق واقع ہو چکی۔ واللہ اعلم۔ ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فتویٰ نہیں دیا جا سکتا اھ پھر اس کو حضرت شیخ کے ارشاد سے بدلا گیا اور تحریر" ازالۃ الاغلاق "جواب سابق ہی پر لکھی گئی ہے ۱۲ منہ

تفصیل الجواب

الملقب

بازالۃ الاغلاق عن اضافۃ الطلاق

اقول وبہ نستعین ۔ جواب[ع] سابق پر دو شبہے کئے ہیں ۔ ایک یہ کہ خانیہ وغیرہ کا جزئیہ " ارتوزن من سہ طلاق " بحذف الباء لا تطلق لانہ ما اضاف الطلاق الیہا عدم وقوع طلاق میں مطلق ہے اس کو دیانت کے ساتھ کس دلیل سے مقید کیا گیا ؟

دوسرے یہ عبارت بزازیہ لا تخرجی الا باذنی فانی حلفت بالطلاق لا یقع لعدم ذکر حلفہ بطلاقہا ویحتمل الحلف بطلاق غیرہا فالقول لہ سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اگر زوج ارادۂ طلاق مخاطبہ کا انکار کرے تو قضاءً بھی اس کا قول معتبر ہوگا ۔ اسی طرح جزئیہ بحر لو قال امرأۃ طالق او طلقت امرأۃ ثلثاً وقال لم اعن امرأتی یصدق سے بھی تصدیق قضاءً مفہوم ہوتی ہے اور جواب سابق میں یہ کہا ہے کہ قضاءً صورت مسئولہ میں انکار ارادۂ طلاق مخاطبہ کی تصدیق نہ ہوگی اس کی کیا وجہ ۔

اشکال اوّل کا جواب یہ ہے کہ کلام فقہاء میں ایسے جزئیات کا حکم جن میں اضافت لفظیہ نہیں ہے (اور اضافت معنویہ یعنی مخاطبت موجود ہے) مختلف مذکور ہے ۔ کہیں حکم وقوع طلاق ہے اور کہیں عدم وقوع طلاق ۔

خلاصہ میں ہے لو قالت طلقنی فضربہا وقال اینک طلاق لا یقع ولو قال اینکت طلاق یقع یہاں تو اینک طلاق میں اضافت لفظیہ نہ ہونے کی وجہ سے عدم وقوع کا حکم ہے اس کے بعد ہے وفی مجموع النوازل سئل شیخ الاسلام عمن ضرب امرأتہ وقال دار الطلاق قال لا تطلق وسئل الامام احمد القلانسی عمن وکز امرأتہ وقال اینک یک طلاق ثم وکزہا ثانیاً وقال اینک

[ع] جس کی طرف حاشیہ ص۳۹۶ میں اشارہ کیا گیا ہے ۱۲ منہ

دو طلاق وکزہا الثالث قال تطلق ثلاثاً ۔ شیخ الاسلام یقول سمی الضرب طلاقاً فبطل والامام احمد یقول سمی الطلاق ضرباً اھ (ص ۷۶ ج ۲) ۔ اس میں یہ اختلاف تو مذکور ہے کہ ضرب کو طلاق کہا ہے یا طلاق کو ضرب ، لیکن یہ کسی نے نہیں کہا کہ اینک طلاق میں اضافت نہیں اس لئے طلاق نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اضافت کا تحقق دونوں کے نزدیک ہے حالانکہ اوپر اینک اور اینکت میں جو فرق کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اینک میں لفظی اضافت نہیں تو اب ماننا پڑے گا کہ دوسری جگہ اضافت معنویہ کی وجہ سے (جو کہ مخاطبت ہے) وقوع کا حکم کیا گیا ہے ، اب اس کے سوا کیا وجہ تطبیق ہوگی کہ جزئیہ اُولیٰ کو دیانت پر حمل کیا جائے اور ثانیہ کو قضاء پر ورنہ ایک کو خطا پر حمل کرنا ہوگا ۔

اس کے بعد خلاصہ ہی میں ہے فی الفتاویٰ وفی المحیط (فی) دار طلاق ینوی لعدم الاضافۃ وقیل یقع بغیر نیۃ وھو الاشبہ اھ (ص مذکور) اس میں بھی میرے نزدیک قول اوّل دیانت پر اور ثانی قضاء پر محمول ہے کیونکہ " دار طلاق " میں واقعی اضافت لفظیہ نہیں جس سے یہ مطلب صریح حاصل ہو کہ اپنے اوپر طلاق سمجھے لیکن اضافت معنویہ کی وجہ سے اشبہ یہ ہے کہ قضاءً بلانیت کے طلاق پڑ جائے ۔

اسی طرح خلاصہ (ص ۱۳۰ ج ۲) میں ہے رجل قال لامرأتہ ہزار طلاق اگر فلان کار کنی واراد بہ التعلیق لا یتعلق الطلاق بذلک الفعل ولو قال اگر فلان کار کنی ہزار طلاق یتعلق کذا قال صاحب المحیط ومن المتاخرین من قال یتعلق فی الوجہین لان طریق الصحۃ عند تقدیم الشرط ادراج الخطاب وھذا قائم عند تاخیر الشرط اھ قلت فقد اجمعوا ای صاحب المحیط والمتاخرون علی وجود الاضافۃ فی صورۃ تقدیم الشرط وان معنی قولہ اگر فلان کار کنی ہزار طلاق ای تو بہزار طلاق واختلفوا فی صورۃ التاخیر لان الخطاب لم یوجد الا بعد قولہ ہزار طلاق فافہم ۔

اسی طرح خلاصہ میں ہے وفی نظم الزندویسی لو قال لامرأتہ فی حالۃ الغضب دو رفتہ است وسہ رفت وقد کان طلقہا قبل ھذا تطلیقتین ولا نیۃ لہ لا یقع الثالث (ص ۷۷ ج ۲) ــــــــ اور ظاہر ہے

کہ قیود[عــہ] فقہیہ احترازی ہوتی ہیں پس ولا نیۃ لہ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نیت ہو تو دو رفتہ است و سہ رفت سے تین طلاق پڑ جائیں گی حالانکہ یہاں اضافت لفظیہ نہیں۔ اور اس مسئلہ میں نیت کی قید اس وجہ سے نہیں ہے کہ اضافت لفظیہ کے فقدان میں قضاءً نیت کی ضرورت ہے بلکہ یہ قید اس وجہ سے ہے کہ لفظ دو و سہ دو طلاق و سہ طلاق کے معنی میں صریح نہیں بلکہ کنایہ ہے اور کنایہ بھی وہ جس میں بہر حال نیت کی ضرورت ہے جیسے انت واحدۃ۔ پس اگر وضع مسئلہ لفظ دو و سہ سے نہ ہوتی بلکہ دو طلاق رفت و سہ طلاق رفت ہوتا تو نیت کی کچھ ضرورت نہ ہوتی اگر پھر بھی نیت کی ضرورت ہوتی تو دو و سہ کے ساتھ وضع مسئلہ لغو ہوگی اور ظاہر ہے کہ دو طلاق رفت و سہ طلاق رفت میں بھی اضافت لفظیہ نہیں ہے۔

پس اس اختلاف کو دیکھ کر میں یہ سمجھتا ہوں کہ "ار توزن من سہ طلاق" میں جو اضافت لفظیہ کے نہ ہونے سے حکم عدم وقوع دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دیانۃً وقوع نہ ہوگا جبکہ زوج ارادہ طلاق مخاطبہ کا انکار کرے اور قضاءً واقع ہے کیونکہ اضافت معنویہ مخاطبت موجود ہے جس کی بنا پر ایک طلاق میں حکم وقوع دیا گیا ہے۔

اور اگر یوں کہے اگر فلان کار کنی بیک طلاق نفعلت طلقت معناہ بیک طلاق ہستی خلاصہ (ص ۹۸ ج ۲) اس میں قضاءً و دیانۃً ہر طرح طلاق واقع ہے کیونکہ اضافت معنویہ کے ساتھ اضافت لفظیہ بھی موجود ہے (لاقتضاء حرف الباء متعلقا محذوفا وھو ہستی و المقتضی کالملفوظ)۔

علاوہ ازیں اشکال ثانی کے جواب میں جو وجوہ مذکور ہیں وہ بھی اسی کو مقتضی ہیں کہ جس کلام میں اضافت لفظیہ نہ ہو اور معنویہ موجود ہو وہاں قضاءً وقوع[عــہ] طلاق ہوگا گو دیانۃً

عــہ ورنہ وقد کان طلقها کی قید کا کیا نفع ہے۔

عــہ سئل العلامة عبد الحی اللکنوی رح عن رجل قال لامرأته المدخول بها بلفظ واحد طلاق ست طلاق ست طلاق ست پس از و پرسیدہ شد کہ چند طلاق دادی او بجواب گفت کہ من صرف در تائید یک طلاق باقی الفاظ را ادا کردہ ام فاجاب بوقوع الطلقات الثلث قضاءً وان القاضی لا یقبل ارادته التاکید وان دین (ص ۸۷ ج ۲ مع الخلاصة) ۱۲ منہ

***

نیت زوج معتبر ہو۔

رہا یہ کہ خانیہ وغیرہ میں لا تطلق مطلق ہے اس کا مقید کرنا صحیح نہیں کیونکہ فقہاء موقع تقیید میں اطلاق نہیں کیا کرتے۔ تو یہ اشکال اس لئے مسلم نہیں کہ جزئیات فقہیہ میں غور کرنے سے ایسی نظائر بہت ملیں گی کہ فقہاء نے مقام تقیید میں اطلاق کیا ہے۔ چنانچہ جواب سابق میں شامی سے جو برہان محیط کا جزئیہ نقل کیا گیا ہے رجل دعته جماعة الی شرب الخمر الخ اس میں طلقت مطلق ہے جس کو شامی نے قضاءً سے مقید کیا ہے لان المراد طلقت قضاءً الخ و نظائرہ کثیرة کما لا یخفی۔

اب رہا **دوسرا اشکال** کہ لو قال امرأة طالق او قال طلقت امرأة ثلاثا وقال لم اعن امرأتی یصدق اھ سے مفہوم ہوتا ہے کہ عدم اضافت لفظیہ کی صورت میں قضاءً و دیانۃً ہر طرح تصدیق ہوگی اور جواب سابق میں تصدیق کو دیانت سے مقید کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس جزئیہ میں تو اگر زوج ارادۂ طلاق زوجہ کا انکار کرے تو قضاءً و دیانۃً ہر طرح تصدیق ہوگی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب اضافت لفظیہ نہ ہو اور اضافت معنویہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بات یہ ہے کہ امرأة طالق او طلقت امرأة میں نفی ارادۂ زوجہ معروفہ کی تصدیق قضاءً اس لئے ہوتی ہے کہ در اصل حالاً اس کلام اضافت نہ لفظی[عــہ] ہے نہ معنوی ہے بلکہ صرف ایک قرینۂ خارجیہ سے یعنی عادت سے اضافت پیدا کی گئی ہے وھو قوله لان العادة ان من له امرأة انما یحلف بطلاقها لا بطلاق غیرها بخلاف صورت مسئولہ کے کہ اس میں عورت کو مخاطب کر کے ایک طلاق دو طلاق کہا ہے گو لفظ تجھ کو وغیرہ نہیں مگر وہ سامنے موجود ہے اور اسی کو سنایا گیا ہے اور خطاب کا قصد ہے اس لئے اضافت معنویہ بوجہ خطاب کے موجود ہے اب اگر ارادۂ زوجۂ مذکورہ کی نفی کرے گا تو یہ قول قضاءً قبول نہ ہوگا چنانچہ اگر بجائے امرأة طالق و طلقت امرأة

عــہ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عورت کو طلاق یا ایک عورت کو میں نے طلاق دی جس میں ارادۂ زوجہ پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اخبار عن الغیر کا بھی احتمال ہے کیونکہ مرد وکالۃً غیر منکوحہ کو بھی طلاق دے سکتا ہے ۱۲ منہ

یا امرأتہ طالق کہے تو اس کی زوجہ معروفہ پر قضاءً طلاق واقع ہو جائے گی اور اُس کے ارادہ کی نفی معتبر نہو گی گو صراحۃً یہاں بھی اضافت طلاق کی زوجہ معروفہ کی طرف نہیں کہ نہ اشارہ ہے نہ تسمیہ بلکہ اضافت اُس عورت کی طرف ہے جو کہ اس کی ہو جس میں غیر معروفہ کا بھی احتمال ہے. مگر چونکہ زوجہ معروفہ ایک ہی ہے اس لئے معنیً اضافت اسی کی طرف ہے اور اُس کی نفی لغو ہے قال فی البحر لو قال امرأته طالق ولم یسم وله امرأة معروفة طلقت استحسانًا ولو قال لی امرأة اخری وایاها عنیتُ لایقبل الا ان یقیم البینة اھ (ص ۲۵۴ ج ۳) رہا یہ کہ عبارت بزازیہ قال لها لاتخرجی من الدار الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لایقع لعدم ذکر حلفه بطلاقها. ویحتمل الحلف بطلاق غیرها فالقول له اھ سے مفہوم ہوتا ہے کہ قضاءً اُس کا قول معتبر ہے اگر وہ غیر کا ارادہ بیان کرے اور مخاطبہ کی نفی کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قضاءً یہ جب معتبر ہوگا جبکہ اس کے کوئی اور بیوی بھی مخاطبہ کے سوا ہو ورنہ نہیں قال ابن عابدین فی حاشیة البحر ان قول البزازیة هنا لایقع ای قضاءً فیه مخالفة لهذا (ای لما فی القنیة عن المحیط رجل دعته جماعة الی شرب الخمر فقال انی حلفت بالطلاق انی لااشرب وکان کاذبًا فیه ثم شرب طلقت ام ای قضاءً) ویمکن ان یوفق بینهما بان ما فی البزازیة محمول علی انشاء الحلف لا علی الاخبار وما فی القنیة علی الاخبار لقوله وکان کاذبا فیه ولکن بعد هذا یرد علی ما فی القنیة ان قوله بالطلاق یحتمل الحلف بطلاق امرأة اخری الا ان یحمل علی انه لیس له امرأة اخری غیرها فیکون اخبارًا عن طلاق مضاف الیها وما فی البزازیة محمول علی ان له غیرها والا لایصدق بدلیل ما یأتی عن الظهیریة من قوله لو قال امرأته طالق ولم یسم وله امرأة معروفة طلقت استحسانا وان قال لی امرأة اخری وایاها عنیت لایقبل قوله الا ان یقیم البینة اھ (ص ۲۵۳ ج ۳) بہرحال امرأۃ طالق وطلقت امرأۃ میں قضاءً اُس کے قول کی تصدیق کا منشا خلو کلام

عہ یہاں تو صریح اضافت موجود ہے۔

عن الاضافۃ حالاً ہے اور عبارت بزازیہ میں اگر لایقع کو قضاء پر محمول کیا جائے نہ کہ دیانت پر تو اس کا محمل یہ ہے کہ حالف کے چند بیویاں ہوں ۔ اور اگر کسی کے صرف ایک بیوی ہو اور وہ اس کو لڑائی جھگڑے میں ایک طلاق دو طلاق بدون اضافت لفظیہ کے کہے تو قضاءً نفی قصد مخاطبہ کی قبول نہو گی کیونکہ اضافت معنویہ موجود ہے وہو الخطاب اور کوئی بیوی سوائے مخاطبہ کے ہے نہیں تو پھر کیونکر نفی کو مانا جائے فان القاضی انما یتبع الظاهر والله یتولی السرائر صرحوا به فی مواضع شتی. خلاصہ میں ہے سکران هرب منه امرأته فتبعها ولم یظفر بها فقال بالفارسیة سہ طلاق ان قال عنیت امرأتی یقع ام (ص ۷۶ ص ۲) اور ظاہر ہے کہ قیود فقہیہ احترازی ہیں تو اس میں لم یظفر بها کی قید بتلاتی ہے کہ اگر وہ سہ طلاق ایسی حالت غضب میں عورت کے سامنے کہدے تو اس صورت میں قضاءً عنیت امرأتی کہنے کی ضرورت نہو گی، والله اعلم ۔ ۱۱ رج ۱۳۴۵ھ ۔

فذلکۃ الکلام

بعد جوابات اشکالات کے اب اصل مسئلہ کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس میں تو شک نہیں کہ باب طلاق میں دیانت کا مدار صحت معنی پر ہے اور قضاء کا مدار تبادر معنی ہے۔ گو اس کے دوسرے معنی لینا بھی صحیح ہوں لیکن جب وہ متبادر کے خلاف ہوں گے تو قضاءً قبول نہو نگے اور معنی متبادر ہی کو صریح کہا جاتا ہے قال فی الدر وصریحه ما لم یستعمل الا فیه اھ قال الطحطاوی وقع نظیره لصاحب النهر حیث قال هو ما استعمل فی الطلاق دون غیره وهما قاضیان بان اللفظ لو استعمل فی غیر الطلاق ولو نادرًا یقدح فی صراحته فیه مع انهم نصوا علی ان الترکی یستعمل هذا اللفظ للطحال ولا یصدق قضاءً انه اراده بل یحکم علیه بالطلاق ان یقال ان المراد بالحصر کثرة الاستعمال فعلی هذا لو قال صریحه ما کثر استعماله فیه لکان اولی اھ (ص ۴۷ ج ۱) قلت وکذا

صاحب البحر والفتح والشامیة مثلہ۔ پس اب دیکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے لڑائی کی حالت میں ایک طلاق دو طلاق کہے یا فارسی میں ار توزن منی سہ طلاق کہے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ تجکو ایک طلاق دو طلاق اور ار توزن منی بسہ طلاق ہستی اور اس کا خلاف کچھ متبادر نہیں گو لغۃً صحیح ہو سکتا ہے جیسا کہ صاحب بزازیہ نے کہا ہے کہ لا تخرجی الا باذنی فانی حلفت بالطلاق میں کسی دوسری عورت کی طلاق کا بھی احتمال ہے مگر یہ احتمال ایسا ہی ہے جیسا انت طالق میں طلاق عن الوثاق وعن القید کا احتمال اور یا طالق میں سب و شتم کا احتمال کہ قضاءً مسموع نہو گا گو دیانۃً بوجہ صحت معنی کے مسموع ہو جائے پس سوا اُس صورت کے جو شامی نے بیان کی ہے کہ بزازیہ کے قول کو اِس پر محمول کیا جائے کہ مرد کی دوسری بیوی بھی معروف ہو اور کوئی وجہ اس کلام کی صحت کی نہیں اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیوی کو خطاب کر کے ایک طلاق دو طلاق کہنا اور ار توزن منی سہ طلاق کہنا اس سے متبادر یہ ہے کہ ار توزن منی بسہ طلاق ہستی، تو اب اس میں عدم وقوع کا مطلقاً حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ بلکہ ان کو دیانت پر حمل کرنا لازم ہو لایقال الصریح انت طالق واذا لم یکن لفظ انت مذکوراً لا یبقی صریحاً فکیف یحکم بالوقوع قضاءً اذا انکر ارادۃ المخاطبۃ بہ قلت لفظ انت لا دخل لہ فی الصراحۃ ویبقی الکلام صریحاً بدونہ اذا کان معنی الخطاب متبادراً قال ابن عابدین فی حاشیۃ البحر الصریح ما فیہ مادۃ ط ل ق کطالق وطلاق وتطلیق ونحوہ فقولہ انت طالق صریح ولا مدخل لقولہ انت فی صراحتہ اھ (ص ۲۶۱ ج ۳)۔ ولعل الکلام فی البحث عن المسئلۃ قد تم وعم والحمد للہ علی ما علم وافہم۔

۱۱ ر ج ۱۳۴۵ھ

حضرت شیخ نے اس تحریر کو ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک فقہاء کی عبارات مطلقہ در باب عدم وقوع بسبب عدم اضافت کو دیانت پر محمول کرنا تقیید اطلاق ہے کیونکہ لا یقع میں نکرہ تحت نفی ہے جو عام ہے اس کو بلا دلیل خاص نہیں کر سکتے ہاں یقع نکرہ تحت الاثبات ہے جو عموم میں نص نہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کو عدم وجود قرائن پر محمول کیا جائے اور عبارات مفیدہ کو قرائن پر کما فی الجواب۔ قلت والیہ یمیل قلبی لکن فی النفس بعد شیٔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً ۱۲ ظ

27

طلاق میں عورت کے قول کا اعتبار جبکہ میاں بیوی میں اختلاف ہو

(سوال) **بیان زوجہ کا**:- زوجہ و شوہر دونوں ایک جگہ اس طرح ہے کہ زوجہ دالان کے اندر تھی اور شوہر سائبان میں تھا، اور دالان میں تین دروازے تھے جس میں سے دو دروازے بند تھے اور صرف ایک دروازہ کھلا تھا، میں نے دالان کے اندر سے سُنا کہ شوہر نے مجھ کو کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دیا"۔ مجھے اٹکل سے معلوم ہوا کہ یہ الفاظ تین دفعہ کہا تھا میں نے لفظ "نہ" نہیں سُنا تھا فقط۔

بیان شوہر کا:- میں نے اپنی چھوٹی بہن کو بھیجا کہ جاکر اپنی بھاوج کو بلالاؤ چنانچہ وہ گئی اور واپس آکر کہا کہ نماز پڑھکر آویں گی۔ میں نے کہا اچھا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد آئیں اور کہا کہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ نیند معلوم ہوتی ہے سونے دو۔ چند منٹ گفتگو ہوتی رہی میں آنکھ بند کئے پڑا رہا کہ وہ اندر مکان کے گئیں میں نے کہا کہ کہاں جاتی ہو جواب ملا کہ آتی ہوں۔ میں نے کہا اچھا۔ وہ اندر سے کہنے لگیں کہ طلاق کا لفظ کیسا کہا ہے؟ میں نے فوراً جواب دیا کہ طلاق کیسا میں نے نام بھی نہیں لیا ہے، انہوں نے کہا کہ شاید سننے میں فرق ہو گیا ہو، میں خاموش تھا، انہوں نے کہا کہ جانتے ہو طلاق کیسے دیا جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، کہا کہ اس طرح دیا جاتا ہے "میں نے تم کو طلاق دیا" میں نے کہا ہوں کہا کہو، اس وقت میں نے کہا کہ ہم نے تم کو طلاق نہ دیا، انہوں نے کہا کہ نہ کا لفظ نہیں کہا جاتا ہے، میں نے کہا کہ ہاں نہ کا لفظ میں نے بہت زور سے نہیں کہا ہے میں سائبان میں تھا اور وہ دالان میں تھیں میں نے پھر کہا کہ طلاق وغیرہ کا نام میں نے نہیں لیا ہے اس کا خیال مت کرنا تب انہوں نے کہا کہ ہاں ہمارے سننے میں فرق پڑ گیا ہو گا فقط۔

استفتاء:- زوجہ و شوہر کا بیان اُوپر لکھا گیا ہے گواہ دونوں میں کسی کے پاس نہیں ہیں عرصہ دس بارہ سال کا ہوا کہ یہ واقعہ ہوا تھا اس وقت سے دونوں علیحدہ ہے اور پردہ رہا اب زوجہ و شوہر دونوں راضی ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ اگر شرع شریف اجازت دے تو آپس میں میل کر لیں کیا حکم علماء کا ہے احکام شرع سے آگاہ فرماویں؟ اجر عظیم اللہ تعالیٰ سے پاویں گے فقط۔

الجواب: صورت مسئولہ میں اگر زوجہ کو خوب پختگی سے یہ یاد ہے کہ شوہر

نے (میں نے تم کو طلاق دیا) تین بار کہا تھا تو اب اس کو اس شوہر کے پاس رہنا جائز نہیں اور بدون حلالہ کے دوسرا نکاح بھی اس سے نہیں کر سکتی اور اگر تین بار کے سننے میں شک ہو یعنی تین دفعہ لفظ مذکور کہنے کا ایسا یقین نہیں کہ اس پر حلف کر سکے تو وہ بدونِ حلالہ کے تجدید نکاح کر کے اس شخص کے پاس رہ سکتی ہے گو بیانِ شوہر کے مطابق تجدید نکاح کی بھی ضرورت نہیں تھی مگر جب عورت کو طلاق کا لفظ بدون لفظ "نہ" کے مسموع ہوا ہے تو اس کو بدون تجدید نکاح کے اس کے پاس رہنا اُس وقت بھی جائز نہیں جبکہ تین بار میں شک ہو لأن المرأة کالقاضی فلا تؤمر الا بعلمها وسماعها ولزوم التجدید لمضی العدة والا فالطلاق وقع رجعیا لو اقل من الثلث ، واللہ اعلم۔

۸ رجمادی الاخریٰ سنہ ۴۳ھ۔

کابین نامہ میں لکھ دیا کہ دوسرا عقد کروں تو اس پر ایک دو تین طلاق ہو جائیگی۔ اس اقرار نامہ کی خلاف ورزی پر زوجہ ثانیہ پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں

(سوال) ایک شخص نے کسی کی ایک نابالغہ لڑکی سے ارادہ نکاح کا کیا اور اپنے مربی بزرگوں سے چند آدمیوں کو لڑکی کے باپ کے پاس بھیجا تاکہ نکاح کا پیغام کریں اور بات چیت ٹھیک کریں وے لوگ لڑکی کے باپ کے پاس گئے اور نکاح کی درخواست کی۔ لڑکی کے باپ نکاح دینے پر راضی ہوا لیکن یہ بات کہا کہ کابین نامہ نکاح کا قبل عقدِ نکاح کے رجسٹری کروا دینا ہوگا۔ اور کابین نامہ کے شرائط میں اپنی مرضی کے موافق لکھاؤں گا دوسری کوئی کابین نامہ پر حوالت وبرات نہیں۔ اگر یہ بات منظور ہو تو میں اپنی لڑکی اسے نکاح دے سکتا ہوں، وے لوگ اس بات پر راضی ہوگئے اور جا کر ناکح کو آگاہ کیا ناکح نے کابین نامہ لکھوانے کے واسطے کاغذ مُہر کر کے لڑکی کے باپ کے پاس بھیجدیا اور کاتب کی اُجرت بھی ایک روپیہ بھیجدیا۔ پس لڑکی کے باپ نے کابین نامہ لکھوایا اور ناکح کے پاس بھیجا اور ایک شخص نے کابین نامہ مرقومہ ناکح کو پڑھکر سنایا۔ پس ناکح نے کابین نامہ سُنکر اور شرائط ومضامین سے آگاہ ہو کر کابین نامہ پر اپنی دستخط کر کے رجسٹرار کے پاس لے گیا۔ اور اپنا تھام[1]

[1] نشان انگوٹھا۔

چسپا کئے پھر دستخط کر کے اپنی طرف سے فیس دے کے کابین نامہ کو رجسٹری کروا دیا۔ بعد اس کے اس لڑکی سے عقد نکاح ہو گیا۔ واضح ہے کہ کابین نامہ مذکورہ میں یہ شرط لکھی گئی تھی کہ (آپ[1] کی اور آپ کے ولی وارث کی بلا اجازت اور آپ کے مہرانے کا کل روپیہ نقد ادا کر کے پشت کابین نامہ ہذا پر وصول لکھوا دینے کے بغیر اگر کوئی غیر عورت سے نکاح کروں تو وہ عورت اسی وقت ایک دو تین طلاق ہو جائے گی) اب اس شخص نے اس بیوی کے اوپر ایک دوسری عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ بود و باش کرنے لگا۔ نہ بی بی سے اجازت لی اور نہ بی بی کے ولی وارث سے پوچھا۔ اور نہ زر نقد مہرانہ ادا کر کے پشت کابین نامہ پر وصول لکھوا دیا۔ پس اس صورت میں اس کی دوسری عورت مطلقہ بہ ۳ طلاق ہوگئی یا نہیں۔ اور اس عورت کے ساتھ خلوت، صحبت کرنا زنا میں محسوب ہوگا یا نہیں اور وہ شخص اس وقت یہ عذر پیش کرتا ہے کہ یہ کابین نامہ میں نے رجسٹری کروایا سو صحیح ہے اور دستخط و تھام بھی میرا ہی ہے لیکن میں نے قبل عقد نکاح کے بین نامہ دیا۔ اور میں نے زبانی اقرار نہیں کیا۔ اور نہ کسی کو اپنے اقرار پر گواہ رکھا۔ اور نہ کسی کو لکھنے کے واسطے حکم دیا۔ پس اس صورت میں اس کا یہ سب عذر سُنا جائے گا یا نہیں۔ اور کابین نامہ قبل عقد نکاح کے ہونا شرط مذکورہ کو مضر ہے یا نہیں۔ اور رجسٹری کردہ کابین نامہ مثل اقرار[2] باللسان کردہ خط کے ہے یا نہیں۔ اور رجسٹری سے اقرار خط کا ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اور رجسٹری کردہ خط کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صورت مذکورہ میں دوسری عورت پر نکاح کرتے ہی تین طلاق واقع ہوگئیں اور اس سے وطی وخلوت سب داخل زنا ہے الا انہا لو اتت منہ باولاد بھذا الوطی لاتکون اولاد الزنا ومسلوبة النسب بل تعد ولد الحلال لکونہ وطیا بشبہة۔ اور شخص مذکور کے جملہ اعذار لغو ہیں جب ناکح نے کابین نامہ خود خرید کر بھیجا اور لڑکی کے باپ کو اختیار دیا کہ جو چاہو لکھوالو،

[1] اپنی زوجہ کو خطاب کرتا ہے۔ [2] ای اقرار بالا۔

اور خود اجرت کتابت دی اور اس کو سن لیا اور شرائط و مضامین سے آگاہ ہو کر اس پر دستخط کر دئے اور اس کو خود رجسٹری کرایا اور اب بھی اقرار ہے کہ یہ دستخط وغیرہ سب میرے ہیں تو یہ بمنزلہ قول باللسان کے ہے قال فی الشامیة ولو استکتب من آخر کتابا بطلاقها وقرأه علی الزوج وختمه وعنونه وبعث به الیها فاتاها وقع (الطلاق) ان اقر الزوج انه کتابه اھ (ص ۷۰۴ ج ۲) واللہ اعلم۔

۲۲ رجب ۱۳۴۳ھ۔

تتمہ جواب: اقول وباللہ التوفیق۔ صورت مسئولہ میں چونکہ کابین نامہ قبل نکاح لکھا گیا ہے اس لئے اس میں چند صورتیں ہیں ایک یہ کہ یوں لکھا ہو کہ اگر میں تجھ سے نکاح کر لوں پھر تیری یا تیرے ولی کی اجازت کے بغیر اور مہر وغیرہ ادا کئے بغیر کسی عورت سے نکاح کر دوں تو اس کو طلاق، اس صورت میں تو جب عورت مخطوبہ سے نکاح کر کے کسی عورت سے اس کی یا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کریگا تو منکوحہ ثانیہ پر طلاق پڑ جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یوں لکھا جائے کہ جب تک تو میرے نکاح میں رہے پھر میں تیری یا تیرے ولی کی اجازت کے بغیر اور بدون مہر کل ادا کئے کسی سے نکاح کر دوں الخ اس صورت میں منکوحہ ثانیہ پر طلاق واقع نہیں ہوگا قال فی العالمگیریة قال لاجنبیة مادمت فی نکاحی فکل امرأة اتزوجها فهی طالق ثم تزوجها فتزوج علیها امرأة لایقع ولو قال ان تزوجتك فما دمت فی نکاحی فکل امرأة اتزوجها علیها والمسألة بحالها یقع کذا فی الوجیز للکردری (ص ۱۰۱ ج ۲) قال سیدی حکیم الامة: والفرق بینهما ان فی الاول علق طلاق الثانیة علی بقاء نکاح الاولی والبقاء لایتصور بدون الحدوث فلا یصح تعلیق شیئ علی بقاء النکاح اذا کان الخطاب مع الاجنبیة فیلغوا الکلام ولا یقع به علی الثانیة شیئ۔ وفی المسئلة الثانیة علق الطلاق علی انشاء النکاح بالمخاطبة ویصح انشاء النکاح بکل اجنبیة فیصح التعلیق واذا تزوج علیها اخری طلقت اھ پس صورت مسئولہ کا جو جواب دیا گیا ہے وہ اس بناء پر ہے کہ اس کابین نامہ کی عبارت کاملہ سے تعلیق طلاق منکوحہ ثانیہ

علی انشاء النکاح بالاولی ہو اور اگر تعلیق انشاء النکاح بالاولی پر نہیں ہے بلکہ اس کے نکاح کے بقاء پر طلاق ثانیہ کو معلق کیا ہے تو وقوع طلاق نہ ہوگا چونکہ عبارت کابین نامہ مختصر تھی اور وہ کسی ایک مراد میں نص نہ تھی اس لئے تردد ہو گیا آپ ان لوگوں کے محاورات وطرز کتابت سے واقف ہیں جس صورت میں داخل سمجھیں اس کا حکم لگا دیں۔

۳۰ رجب ۱۳۴۳ھ۔

مجھ کو تمہاری لڑکی کی ضرورت نہیں الخ کے الفاظ سے طلاق نہیں ہوتی

(سوال) (۱) زید نے اپنی لڑکی کی شادی عمرو سے کر دی (۲) عرصہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا عمرو نے لے جانے سے انکار کر دیا (۳) اگر اس سے طلاق کے واسطے کہا گیا تو کچھ جواب نہیں دیا (۴) کچھ عرصہ کے بعد اس نے ایک خط لکھا جو کہ میرے پاس موجود ہے اور اس میں لکھتا ہے کہ "یا تو ۸ یوم کے اندر میری بیوی کو روانہ کرو ورنہ میری تمہاری رشتہ داری نہیں ہے اور نہ مجھ کو تمہاری لڑکی کی ضرورت" مکرر دو فقرے یہ لکھتا ہے کہ مجھ کو ضرورت نہیں چاہئے تم کچھ کرو میں بڑا نیک ہوں اور شادی کر لوں گا"۔

(۵) بندہ بہت غریب آدمی ہے خود نان و نفقہ کو محتاج ہے تو کیا میں دوسرا نکاح لڑکی کا کر سکتا ہوں؟

(۶) مکرر فقرہ جو اس نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ "میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تمہاری لڑکی کی مجھ کو کچھ ضرورت نہیں ہے"۔

الجواب: عمرو نے جو لکھا ہے کہ مجھ کو تمہاری لڑکی کی ضرورت نہیں ہے اس لفظ سے طلاق نہیں ہوئی کما فی فتاوی قاضی خاں (ص ۲۱۷ جلد ۲) ولو قال لاحاجة لی فیك ونوی الطلاق لایقع اھ وھکذا فی العالمگیریة ص ۴۹ ج ۲

عبدالکریم عفی عنہ۔ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

حکم طلاق بلفظ اگر گہے نزد تو کلام دروغ گویم تا بعد نکاح زوجہ ام سہ طلاق خواہد شد

(سوال) اگر کوئی شخص پرچہ پر لکھے یا اور کسی شخص کو خطاب کر کے کہے کہ من از امروز تا زندگی نزد تو کلامے دروغ نخواہم گفت۔ اگر گہے نزد تو کلام دروغ گویم تا بعد نکاحم۔ زوجہ ام سہ طلاق بائن خواہد شد بعد دو ماہ چنداں نکاح کنم۔ ہر زوجہ ام را اکنون طلاق بائنہ دادم بعد دو ماہ اگر وقتے نزد تو دروغ گویم۔ سچ مچ یہی عبارت کہا اور لکھا اور کاتب وثائق

یہ کلام قبل نکاح و بعد نکاح بارہا ساتھ مخاطب مذکور کے جھوٹ بات کہا تو کیا زوجہ پر قائل و کاتب کی طلاق پڑگئی ؟ اور اگر مطلقہ ہو جاوے تو جتنے نکاح کرے گا تو سب عورت مطلقہ ہو جاوے گی یا نہ اور اگر سب عورت مطلقہ ہو جاوے تو کیا وہ شخص تمام عمر بے زن رہے گا یا واسطے قائم رہنے نکاح کے کوئی صورت ہو سکتا ہے اور اگر ہو سکے تو وہ صورت کیا از روئے مہربانی جواب سے مشکور و ممنون فرمادیں ۔

الجواب ؛ صورت مسئولہ میں قائل کے کلام میں دو جملے ہیں ایک "اگر گہے نزد تو کلام دروغ گویم تا بعد نکاحم زوجہ ام سہ طلاق بائن خواہد شد بعد دو ماہ" یہ تو تعلیق ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر قائل نے مخاطب سے کلام دروغ قبل از نکاح کر لیا اور پیچھے نکاح کیا اور نکاح کے بعد دروغ نہیں کہا تو منکوحہ پر طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر نکاح پہلے کیا اور کلام دروغ بعد میں کیا تو منکوحہ اولیٰ پر طلاق ثلث واقع ہو جاوے گی بعد دو ماہ کے ، اور اس کے بعد تعلیق ختم ہو جاوے گی ۔ دوسری بیوی پر دروغ سے طلاق واقع نہ ہوگی قال فی الشامیۃ قال کل امرأۃ اتزوجھا فھی طالق ان کلمت فلانا فکلم ثم تزوج لا یقع الطلاق علیھا وان کلم ثم تزوج ثم کلم طلقت المتزوجۃ بعد کلام الاول خانیہ (ص ۸۱۳ ج ۲) وفی الدر کلمات الشرط ان، واذ، واذا ما، وکل، وکلما، ومتی، ومتی ما ۔ وفیھا تنحل الیمین اذا وجد الشرط مرۃ الا فی کلما "قلت ولفظ "گہے" فی الفارسیۃ بمعنی "متی" واللہ اعلم.

اور جملہ ثانیہ میں تعلیق نہیں ہے بلکہ اکنوں طلاق دادم انشاء حال پر دال ہے اس سے کسی منکوحہ بعد الکلام پر طلاق کا وقوع نہ ہوگا۔ واللہ اعلم ۔ ظفر احمد

اگر تو اپنے باپ سے ملے گی یا اپنے باپ کے گھر جائیگی تو تجھ پر طلاق ، اور عورت باپ کے مرنے کے بعد باپ کے گھر گئی تو طلاق نہیں ہوگی	

(**سوال**) کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیانِ شرع چراغ راہ دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی عورت سے کہا کہ اگر تو اپنے باپ سے ملے گی یا اپنے باپ کے گھر جاوے گی تو تجھ پر طلاق ہے آپ مع کتب معتبرہ و عبارت عربی ارسال فرماویں کہ آیا اس کا نکاح فاسد ہو گیا یا کہ نہیں جبکہ وہ اپنے باپ کے گھر بعد اپنے باپ کے انتقال کے گئی ، بینوا توجروا ۔

الجواب ؛ بظاہر شوہر کے ان الفاظ سے "کہ اگر تو اپنے باپ کے گھر جاوے گی الخ

وہی مراد ہے جو پہلے جملہ سے مراد ہے یعنی باپ سے گھر جا کر ملنا اس لئے بعد انتقال والد کے اگر یہ عورت اس کے گھر گئی تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اس جملہ سے مستقلاً باپ کے گھر سے روکنا مراد ہے جب بھی طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ گھر کو باپ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور موت سے یہ اضافت منقطع ہو گئی قال فی الشامیۃ لو مات مالک الدار (فیما اذا حلف لا یدخل دار زید) فدخل لا یحنث لانتقالھا للورثۃ ولو کان علیہ دین مستغرق قال محمد بن مسلمۃ یحنث وقال ابو اللیث لا وعلیہ الفتوی لانھا وان لم یملکھا الورثۃ وبقیت علی حکم ملک المیت ولکن لم تکن مملوکۃ لہ من کل وجہ اھ (ص ۱۲۸ ج ۳) واللہ اعلم

ربیع الاول ۴۲ھ ۔

اگر تو چاند جیسی حسینہ نہیں تو تجھ پر تین طلاق کہنے سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوگی	

(**سوال**) ایک شخص نے اپنی زوجہ کو کہا کہ اگر تو چاند جیسی حسینہ نہیں تو تجھ پر تین طلاق ہیں اب ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ اس پر طلاق نہیں واقع ہوئی کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ہم نے جنس انسان کو اچھی صورت میں پیدا کیا ہے ، تو اگر عورت جیسی بھی قبیحۃ المنظر ہو وہ چاند سے خوبصورت ہے ۔ اور ایک مولوی صاحب نے فرمایا ہے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے جعل الشمس ضیاء والقمر نوراً تو گویا قمر نورانی چیز ہے اور عورت چاند جیسی منورہ نہیں اس واسطے طلاق واقع ہو گئی ۔ تحریر فرماؤ کہ کس کی دلیل قوی ہے ؟

الجواب ؛ الضوء والنور ما یفرق البصر والحسن والجمال ما یمیل بالقلب ویجلبہ الیہ عرفا صورت مذکورہ میں ہمارے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ گو چاند کا عورت سے انور ہونا یقینی ہے مگر احسن ہونا یقینی نہیں کیونکہ حسن کا مدار صرف نور پر نہیں بلکہ اور بہت سی اداؤں کو بھی اس میں دخل ہے قال الشاعر

ففیک من الشمس المنیرۃ ضوءھا ٭ ولیس لھا منک التبسم والثغر

وقال آخر

خوبی ہمیں کرشمۂ ناز و خرام نیست ٭ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اس لئے چاند کا اس عورت سے احسن ہونا مشکوک ہو گیا و لا یقع الطلاق بالشک

قلتُ ثم ظفرت بجزئية صريحة فى الباب ذكره العلامة المحدث ابوبكر ابن العربى فى احكام القرآن له فى تفسير سورة التين وقد اخبرنا المبارك بن عبد الجبار الازدى اخبرنا القاضى ابو القاسم على بن ابى على القاضى المحسن عن ابيه يومًا كان عيسى بن موسى الهاشمى يحب زوجه حبًا شديدًا فقال لها يومًا انت طالق ثلاثا ان لم تكونى احسن من القمر فنهضت واحتجبت عنه وقالت طلقتنى وبات بليلة عظيمة ولما اصبح غدا الى دار المنصور فاخبره الخبر وقال يا امير المؤمنين ان تم على طلاقها تصلفت نفسى غما وكان الموت احب الى من الحياة واظهر للمنصور جزعًا عظيمًا فاستحضر الفقهاء واستفتاهم فقال جميع من حضر قد طلقت الا رجلا واحدًا من اصحاب ابى حنيفة فانه كان ساكتًا فقال له المنصور مالك لاتتكلم فقال له الرجل "بسم الله الرحمن الرحيم والتين والزيتون وطور سينين وهذا البلد الامين لقد خلقنا الانسان فى احسن تقويم" يا امير المؤمنين الانسان احسن الاشياء ولا شئ احسن منه فقال المنصور لعيسى بن موسى الامر كما قال فاقبل على زوجتك فارسل ابو جعفر المنصور الى زوجته ان اطيعى زوجك ولا تعصيه فما طلقك فهذا يدل على ان الانسان احسن خلق الله باطنًا وهو احسن خلق الله ظاهرًا جمال هيئته وبديع تركيب الرأس بما فيه و الصدر بما جمعه والبطن بما حواه والفرج وما طواه واليدان وما بطشتا والرجلان وما احتملتا ولذلك قالت الفلاسفة انه العالم الاصغر اذ كل ما فى المخلوقات اجمع فيه هذا على الجملة وكيف على التفصيل بتناسب المحاسن فهو احسن من الشمس والقمر بالمعنيين جميعًا (ص ۳۱۳ ج ۲)۔ ۲ رمضان المبارک ۴۳ھ۔

بطور وظیفہ صیغۂ طلاق کہنے سے قضاءً طلاق ہو جاتی ہے

ایک مولوی صاحب نے ایک جاہل کو تعلیم دی کہ تو کہا کر کہ یا امرأتی انت طالق ثلاثا تو خدا تجھ کو بہت سامان دے گا اب وہ گھر بیٹھکر یہ وظیفہ اپنی عورت کو سناتا رہا اور عورت بھی

خوب توجہ سے سنتی رہی آیا طلاق اس عورت پر واقع ہوگئی یا نہ جواب دلیل سے تحریر فرماویں؟

الجواب: اس جاہل کی بیوی پر دیانۃً اس وظیفہ سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور قضاءً واقع ہوگئی پس مرد کو تو اس عورت سے استمتاع جائز ہے لیکن عورت کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مرد نے میرے پاس جو وظیفہ پڑھا تھا اس کے معنی طلاق کے ہیں تو اس کو اس مرد کے پاس رہنا جائز نہیں وہ اپنے کو مطلقہ ہی سمجھے اور اگر اُسے یہ معلوم نہیں ہوا تو اس کو بتلانا ضروری نہیں قال فى الشامية قالت لزوجها اقرأ علىّ اعتدى انت طالق ثلاثا ففعل طلقت ثلاثا فى القضاء لا فيما بينه و بين الله اذا لم ينو الزوج ولم يعلم بمعناه اھ (ص ۹۹۸ ج ۲) ۳۰ ربیع الاول ۴۳ھ

حکم طلاقِ ہازل

(سوال) زید کو دو زوجہ ہے ثانیہ کو طلاق دینے کے واسطے دو ایک بار لوگوں کو بلایا ولیکن طلاق نہیں دی بعد چند روز ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ میں نے سُنا کہ تم عورت ثانیہ کو چھوڑ دی زید نے بولا ہاں چھوڑ دی بعد اس کے پوچھا کتنے طلاق دی وہ بولا تین[۳] طلاق اس وقت دو مرد اور دو عورت نے اس اقرار کو سنا۔ اس وقت انہوں سے دوسرے شخص نے پوچھا کہ یکبارگی صاف کردی؟ زید نے بولا ہاں یکبارگی صاف۔ گواہوں سے ایک آدمی نے کہا کہ تمہاری عورت مطلقہ ثلاثہ ہوگئی، زید نے بولا نہیں ایسا ہی طلاق سے ہرگز طلاق نہ ہوگی۔ زید جاہل ہے مسئلہ طلاق نہیں جانتا ولیکن وہ بولتا ہے کہ میں حقیقت میں طلاق نہیں دی سائلوں کا جواب کہا۔ اور زید دعوی کذب اور ہزل کا کرتا ہے لیکن اس میں گواہ نہیں یعنی اقرار کذب کا اور ہزل کا گواہ نہیں۔ جیسا کہ کتب فقہ میں الا اذا اشهد قبل ذلك لکھا ہے مگر اس قدر جو اوپر گذرا یعنی دو[۲] ایک دفعہ لوگوں کو طلاق دینے کے واسطے بلائیں طلاق نہیں دی ولیکن انہوں کو خبر کذب کا گواہ نہیں بنائیں، اب وہ لوگ خبر کذب اور ہزل کا گواہ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ ایک مولوی صاحب نے اس حادثہ میں حکم تین طلاق قضاءً کیا ہے نہ دیانۃً اور دلیل ان کا یہ ہے شامی کتاب الطلاق لو اقر بالطلاق كاذبًا الی قولہ وقع قضاءً چونکہ قبل حکم ایسا گواہ نہیں بنایا کہ تم لوگ گواہ رہیو کہ میں اقرار خبر کذب اور ہزل کا کروں گا فی الواقع طلاق نہیں دوں گا۔ اگر کوئی ایک عورت قضاءً تین طلاق ہو جاوے تو اس عورت کیسے بدون تفریق کے اپنے شوہر کے ساتھ میاں بیوی جیسا برتاؤ کرنا جائز ہے؟ اس حادثہ میں دوسرے

مولوی صاحب دیانۃً اور قضاءً عدم وقوع طلاق کا گیا اور بدون تفریق کے زید کے ساتھ برتاؤ کا حکم دیا چونکہ عنداللہ طلاق نہیں اور دلیل ان کا یہ ہے در مختار مع رد المحتار قولہ او هازلاً کی تفسیر میں علامہ شامی نے دلیل خانیہ اور تلویح سے استدلال کیا اور زید جو لوگوں کو طلاق دینے کے واسطے بلایا لیکن انہوں کے سامنے طلاق ندی اس کو منزلہ میں شہادت خبر کاذب اور ہزل کا گردانتا ہے اگرچہ زید ویسا نہیں کہتا۔ مولینا تھانوی صاحب نے ایک فتویٰ وقوع قضاءً وعدم وقوع دیانۃً تتمہ جلد ثانی کتاب الطلاق ص۱۰۱ میں لکھا ہے وہاں بھی خانیہ اور تلویح کی عبارت سے دلیل پیش کی اس کی کیا توجیہ ہے؟ زید نے دوسری مجلس میں بھی مذکورہ گواہوں کے سوائے اور دو آدمی کے پاس اقرار بالا کیا پوچھا گیا کہ عورت کو چھوڑ دی؟ زید نے بولا ہاں چھوڑ دی کتنے طلاق دی؟ بولا تین طلاق اور بالکل صاف کر دیا۔ فقط۔

الجواب: فقہاء نے تصریح کی ہے المرأۃ کالقاضی فلا یحل لها ان تمکنه اذا سمعت منه ذلك او علمت به لانها لا تعلم الا الظاهر اھ فتاوی حامدیۃ (ص۳۷، ج۱) ومثله فی الشامیة وغیرها ایضاً پس بعض علماء نے جو یہ کہا ہے کہ اقرار کاذباً سے قضاءً طلاق ہوتی ہے نہ کہ دیانۃً یہ تو صحیح ہے لیکن اس میں اتنی قید کی اور ضرورت ہے کہ اگر عورت نے زوج کے منہ سے الفاظ طلاق خود سن لئے یا کسی عادل نے اس کو خبر دی ہو تو عورت کو تمکین زوج من نفسها جائز نہیں بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنے مطلقہ ثلاث مغلظہ ہی سمجھے اور دو ایک دفعہ لوگوں کو طلاق دینے کے لئے بلانا اشہاد نہیں ہے بلکہ اشہاد یہ ہے کہ ان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ میں کاذباً یا ہازلاً ایسا کہوں گا۔ اور یہ بھی اُس وقت ہے جبکہ زید اس اقرار میں اقرار کاذباً کا دعویٰ کرتا ہو اور اگر ہزل کا مدعی ہے پھر تو قضاءً ودیانۃً وقوع طلقات ثلاث ہو چکا اس صورت میں تو چاہے عورت کو علم نہ بھی ہو جب بھی یہ شخص اس بیوی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا قال فی الدر او هازلاً قال الشامی ای فیقع قضاءً ودیانۃً کما یذکرہ الشارح وبه صرح فی الخلاصة وکذا فی البزازیة اھ (ص۶۹۴ ج۲) واللہ اعلم۔

نوٹ: ہم نے امداد الفتاوی تتمہ جلد ثانی (ص ۱۰۱) کا مطالعہ کیا اس میں بھی یہی حکم ہے جو جواب ہذا میں مذکور ہے، فلیراجع بتدبر، فقط۔ ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

طلاق کی ایک صورت کا حکم

(سوال) احمد نے اپنی عورت کو ایک کاغذ کے اوپر اس طرح طلاق لکھی کہ میں ڈابھیل کا رہنے والا احمد اسماعیل گارڈی میں اپنی عورت مسماۃ مریم کو جو کہ میرے ساتھ رہتی نہیں ہے آج کے روز اپنی خوشی اور ہوشیاری وعقل سے میں اس کو فارغ خطی دیتا ہوں میں نے آج کے روز سے اس کو اپنے نکاح سے فارغ کر دیا ہے میں نے اپنی راضی وخوشی سے طلاق دی ہے اس میں کسی کا کچھ چلے گا نہیں میں نے طلاق دیتے وقت پانچ آدمی کے روبرو فارغ خطی دی ہے یہ صحیح ہے دستخط احمد اسماعیل بقلم خود، شاہد اسماعیل ابراہیم بقلم خود، شاہد صالح محمد بقلم خود، شاہد صالح ابراہیم بقلم خود، شاہدہ ابراہیم کی عورت، شاہدہ خدیجہ پٹیل کی عورت۔ ان پانچ شاہدوں کا یہ اقرار ہے کہ بلا جبر احمد نے ایک کاغذ کے اوپر طلاق اس طرح سے لکھی اور زبانی بھی ہمارے روبرو میں مریم کو تین مرتبہ طلاق دی، اس واقعہ کے بعد تین چار اشخاص احمد کے پاس گئے اور اس سے اس کے متعلق پوچھا تو احمد نے اس بات کا اقرار کیا کہ میں مریم کو طلاق دے چکا ہوں یہ صحیح بات ہے اور کئی آدمی کو وہ کہتا رہا کہ میں طلاق دے چکا ہوں ابھی تک وہ اس طرح سے کہتا رہتا ہے یہ طلاق سب لوگوں میں مشہور ہو چکی اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ احمد کا بھائی محمود اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور احمد کو دیوانہ ثابت کیا اور مریم کے ماموں کے پاس وکیل کی معرفت نوٹس بھیجا کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے اس نے طلاق نہیں دی ہے اور اگر دی ہے تو وہ دیوانہ ہے میں اس کا والی ہوں اس کا طلاق دینا صحیح نہیں، مریم کے ماموں نے یہ جواب دیا کہ طلاق ہو چکی ہے اور احمد دیوانہ نہیں ہے وہ تجارت کرتا ہے مثلاً بمبئی جاتا آتا ہے مال خریدتا ہے بیچتا ہے اس کے روپئے وصول کرتا ہے روپئے امانت رکھتا ہے وہاں سے لیتا دیتا ہے ڈاکخانہ میں اس کے نام سے اس کا بڑا بھائی روپئے رجسٹری خط وغیرہ بھیجتا ہے وہ وصول کرتا ہے اور حساب کتاب سب اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے تنہا نوساری سورت وغیرہ جاتا ہے وہاں سے بھی مال لاتا ہے اور خرید وفروخت کرتا ہے اس لئے یہ دیوانہ نہیں ہے صورت مسئولہ میں طلب امر یہ ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں اور مریم اس کے نکاح سے نکل گئی یا نہیں بینوا توجروا۔

الجواب: اگر احمد واقع میں دیوانہ نہیں ہے تو ڈاکٹر کے ثابت کرنے سے کچھ نہیں

ہوتا اور دیوانہ وہ ہے جو بے سمجھی کی الٹی سیدھی باتیں بکتا ہو اور مارتا اور گالیاں بکتا ہو اور اگر گالیاں نہ بکتا ہو نہ مارتا ہو مگر بے سمجھی کی اُلٹی سیدھی بہکی ہوئی باتیں کرتا ہو تو وہ بھی ایک قسم کا جنون ہے پس اگر احمد عقل کی باتیں کرتا ہو جیسا کہ سوال میں خرید و فروخت وغیرہ درج ہو تو وہ مجنون نہیں اور طلاق واقع ہوگئی و نیز اگر اس کو بعد طلاق دینے کے جو مجنون ثابت کیا گیا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ طلاق دینے کے وقت بھی وہ مجنون تھا پس جب اس امر کے شاہد موجود ہیں کہ عقل و ہوشیاری سے طلاق دی گئی ہے تو بعد میں اگر واقع میں مجنون بھی ہو جاتا تو جو طلاق واقع ہو چکی ہو وہ کیسے باطل ہو سکتی ہے پس مریم اس کے نکاح سے نکل گئی اور بدون حلالہ کے اب اس کا نکاح احمد سے نہیں ہو سکتا قال الشامی تحت قول الدر (والمعتوہ) من العتہ وھو اختلال فی العقل ھذا ذکرہ فی البحر تعریفا للجنون وقال یدخل فیہ المعتوہ واحسن الاقوال فی الفرق بینھما ان المعتوہ ھو قلیل الفہم المختلط الکلام الفاسد التدبیر لکن لا یضرب ولا یشتم بخلاف المجنون اھ

احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ۔ ۲۰ رشوال سنہ ۴۳ھ۔

الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۲۰ رشوال سنہ ۴۳ھ۔

طلاق اور رجعت کی ایک صورت کا حکم

(سوال) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید نے ایک عورت مسماۃ ہندہ سے نکاح کیا اور قبل جانے مسماۃ مذکورہ کے اپنے سسرال کے مسمی مذکور الصدر نے اسے ایک طلاق رجعیہ دے دی، اب بوجہ ہونے ناشزنی باہم زوج اور زوجہ مذکورہ کے، مسماۃ مذکورہ قسم اٹھاتی ہے کہ مسمی مذکور نے ابتداء نکاح سے لیکر اب تک میرے ساتھ ہرگز دخول اور خلوت نہیں کی ہے اور مسمی مذکور کہتا ہے کہ میں نے اپنی عورت مذکورہ سے دخول وغیرہ کیا ہے اور اپنے اس دعوی پر گواہ پیش کرتا ہے گواہوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں رمضان ولد حاجی، قطب الدین ولد میر، نور حسن ولد حیات بخش، اللہ دتا ولد اللہ لوک، ان میں سے رمضان اور قطب الدین کا یہ بیان ہے کہ ہم نے زید اور ہندہ مذکورہ کو ایک مکان میں اکٹھا دیکھا ہے جو کہ ان کے پاس تیسرا شخص نہ تھا بلکہ اتنی بات تھی کہ غلہ گندم مسمی مذکور مکان کے سقف پر چڑھا رہا تھا اور باقیوں کا بیان ہے کہ مسمی مذکور کو اپنے سسرال کے یہاں شب و روز آتے جاتے دیکھا ہے۔ کیا یہ طلاق رجعی ہو سکتی ہے یا کہ نہیں اگر طلاق رجعیہ ہے تو نکاح ان کا برحال ہے یا کہ نہیں کیونکہ مسمی مذکور عدت ہی میں رجوع کر چکا ہے اگر یہ طلاق رجعیہ نہیں تو تجدید نکاح کی ضرورت ہے یا کہ نہیں اگر عورت نکاح نہ کرے تو دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: طلاق قبل الدخول (خواہ بعد خلوۃ صحیحہ ہو) بائنہ واقع ہوتی ہے اور جب زوجین میں درباره دخول اختلاف ہو تو خلوت ثابت ہونے پر خاوند کا قول معتبر ہوتا ہے اور اگر خلوۃ کا ثبوت نہ ہو تو عورت کا قول معتبر ہوتا ہے۔ اور واقعہ مذکورہ میں شب و روز سسرال میں آنے جانے کی شہادت شہادت علی الخلوۃ نہیں ہے باقی رہی شہادت قطب الدین اور رمضان کی سو اس میں یہ دیکھنا چاہئے کہ جس مکان میں زید اور اس کی بیوی تھے اس کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا اگر کھلا ہوا تب تو خلوت ثابت نہیں ہوتی اور اگر دروازہ بند تھا تو خلوت ثابت ہو جاوے گی بشرطیکہ اس روز رمضان کا روزہ نہ ہو اور دونوں میں سے کوئی ایسا بیمار نہ ہو کہ صحبت نہ ہو سکے اور عورت حائضہ نہ ہو فی الدر المختار (ولو خلا بہا ثم انکرہ) ای الوطء (ثم طلقہا لا) یملک الرجعۃ لان الشرع لم یکذبہ ولو اقربہ وانکرتہ فلہ الرجعۃ ولو لم یخل بہا فلا رجعۃ لہ لان الظاہر شاہد لہا والواجبۃ وقال الشامی تحت (قولہ لان الشرع لم یکذبہ) لانہ لا یملک الرجعۃ الا فی عدۃ الدخول لا فی عدۃ الخلوۃ الخ ص ۸۸۱ ج ۲ وفی العالمگیریۃ (ص ۲۴۴ ج ۲) وفی البیوتات الثلثۃ او الاربعۃ واحد بعد واحد اذا خلا بامرأتہ فی البیت القصوی ان کانت الابواب مفتوحۃ من اراد ان یدخل علیہما یدخل من غیر استیذان لا یصح الخلوۃ وکذا لو خلا بہا فی بیت من دار ولبیت باب مفتوح فی الدار اذا اراد ان یدخل علیہما غیرہما من المحارم والاجانب یدخل لا یصح الخلوۃ کذا فی فتاوی قاضی خاں وفیہ ایضا والخلوۃ الصحیحۃ ان یجتمعا فی مکان لیس ہناک مانع یمنعہ من الوطئ حسا او شرعا او طبعا کذا فی فتاوی قاضی خاں۔ پس اگر خلوت ثابت ہو جاوے تو زید کی رجعت صحیح ہوگئی جب کہ رجعت عدت میں تھی اور جب رجعت ہو چکی تو دوبارہ نکاح کی

ضرورت نہیں اور اگر خلوت ثابت نہ ہو تو طلاق بائن واقع ہوگئی عورت جس سے چاہے نکاح کرے خواہ زید سے یا اور کسی سے۔ واللہ اعلم - احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ۔

۵ رذی القعدہ ۴۳ھ۔

اور ثبوت رجعت محض شوہر کے قول اور گواہوں کے بیان سے بدون حاکم یا حکم مسلم کے سامنے بیان کئے نہ ہوگا اور اگر گواہ حاکم یا حکم مسلم کے سامنے گواہی دیں کہ ہم نے دونوں میاں بی بی کو باقاعدہ خلوت میں یکجا دیکھا ہے اور وہ گواہی قبول کرلے تب ثبوت رجعت ہوگا۔ فقط۔ الجواب صحیح - ظفر احمد عفا عنہ، ۵ ذیقعدہ ۴۳ھ۔

طلاق کے ساتھ لفظ انشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے کا حکم

(سوال) صورت مرقومۃ الذیل کا حکم تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمادیں۔

کوئی شخص اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ کچھ گفتگو کر رہا تھا اتفاقاً کسی بات کی وجہ کہ وہ اس عورت پر ناشاد ہو کر اپنے باپ سے انصاف چاہا اس وقت شخص مذکور کی ایک بہن بول اٹھی کہ تم جس بات سے اپنے بھائی کی بیوی پر خفا ہو رہے تمہاری بیوی بھی تو اس طرح کی باتیں تمہیں کہتی ہے دریغ نہیں کرتی ہے اس نے کہا میں تو نہیں جانتا اگر وہ واقع میں ایسا کہتی ہے تو تم ہی اُسے دیکھ بھال کرلائی ہو پھر بہن نے کہا کہ تم بھی تو دیکھ کرلائے ہو اس وقت اس نے کہا کہ اگر تم کہتی ہو کہ میں دیکھ بھال کر لایا ہوں تو ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق انشاء اللہ۔

پھر اُس نے اِس واقعہ کو کسی منشی جی سے سناتے وقت کہا کہ میں نے ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا ماشاء اللہ، باردیگر اُسے پوچھنے سے کہتا ہے میں نے ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا انشاء اللہ منشی جی سے ماشاء اللہ کہنے پر جرح قدح کہتا ہے کہ میں نے اس دفعہ ماشاء اللہ غلطی سے کہا ہے ورنہ پہلے ہی میں نے انشاء اللہ کہا ہے۔

باپ کی شہادت: باپ کہتا ہے کہ میں نے یہ سنا "میں نے اس بیوی کو ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا" باپ گھر کے اندر تھا اور مطلقہ آنگن میں۔

بہن کی شہادت: وہ کہتی ہے کہ میں نے یہ سنا "میں نے ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا ماشاء اللہ" پھر اسے پوچھنے سے کہتی ہے کہ میں نے یہ سنا "میں نے ایک ۱ دو تین طلاق دیا انشاء اللہ"۔

اپنی بیوی کی شہادت: وہ کہتی ہے کہ میں نے سنا "ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا ماشاء اللہ"۔

اپنے بھائی کی بیوی کی شہادت: وہ کہتی ہے کہ میں نے سنا "میں نے ایک ۱ دو ۲ تین ۳ طلاق دیا"، فقط۔

الجواب: چونکہ انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کہنے کا ایک ہی حکم ہے اس لئے ہر حال میں طلاق واقع نہیں ہوئی چاہے اس نے انشاء اللہ کہا ہو چاہے ماشاء اللہ فی الدر المختار ومثل ان الا وان لم واذا وما ولم یشا وفی الشامی تحت (قولہ وما) ای ماشاء اللہ تعالیٰ فلا یقع الخ (ص ۸۴۱ ج ۲) وفی العالمگیریۃ (ص ۱۱۸ ج ۲) لو قال انت طالق ماشاء اللہ کان وکذا لو قال انت طالق الا ماشاء اللہ لا یقع شئ کذا فی فتاوی قاضیخان۔ کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، ۹ ربیع الثانی ۴۳ھ

الجواب صحیح ظفر احمد، ۹ ربیع الثانی ۴۳ھ۔

مجھ کو ضرورت نہیں، یا طلاق ہی سی ہے، سے طلاق کا حکم

(سوال) التماس ہے کہ ایک شخص اپنے بیوی بچے کو چھوڑ کر ایک غیر مذہب کی عورت لیکر فرار ہوگیا تھا اس کی عورت نے کئی سال تک اس کا انتظار کیا مگر وہ واپس آیا نہ کوئی خبر بھیجی مجبور یہ اپنے ایک برادری کے شخص کے یہاں ایک دوسرے گاؤں میں آکر رہنے لگی بعد کو اس کا خاوند معہ فرار شدہ عورت کے اپنے مکان پر آگیا اس نے اپنی بیوی بچے کی پروا نہ کی اب اس عورت نے اپنے خاوند کے پاس دو شخص ایک اپنی برادری کا دوسرا مسلم جاٹ بھیجے اور ان دونوں سے اس عورت نے کہہ دیا کہ میری طرف سے میرے خاوند کو کہہ دینا کہ مجھ کو آکر لے جاؤ اگر وہ کسی وجہ میرا لیجانا ناپسند نہ کرے کیونکہ اس کے پاس عورت موجود ہے تو میری طرف سے حکم شرع لے لینا یعنی طلاق کا سوال کر دینا اور جواب لینا لہذا یہ ہر دو شخص اس کے پاس گئے اور اس شخص سے عورت کی طرف سے اول سوال لیجانے کا کیا اس پر وہ جواب دیتا ہے مجھ کو ضرورت نہیں، تب بعد کو سوال دوسرا یعنی طلاق کا کیا گیا تو جواب دیتا ہے کہ طلاق ہی سی ہے مکرر کہا گیا تو پھر کہتا ہے مدت سے طلاق ہی سی ہے۔ اب عرض ہے کہ یہ لفظ عورت پر طلاق پڑنے والے ہوئے یا نہیں برائے کرم مفصل حکم سے جلد مطلع فرمائیں؟ عین عنایت ہوگی زیادہ حد ادب، فقط۔

الجواب: صورت مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی ونظیرہ فی العالمگیریۃ ص ۲۷۲ ج ۲ ولو قال لہا بعد ما طلبت منہ الطلاق گفتہ گیر لا یقع وان نوی کذا فی الخلاصہ واللہ اعلم - کتبہ عبد الکریم عفی عنہ۔ الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ - ۹ ربیع الثانی ۴۳ھ

مسئلہ طلاق

(سوال) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین نیچے لکھے ہوئے مسئلہ میں کہ زید کی دو بی بیاں ہیں ان دونوں نے آپس میں جھگڑا کیا زید کے نسبتی بھائی (یعنی بی بی کلثوم کے بھائی نے) اگر زید سے پوچھا کہ ترے گھر میں ہمیشہ اسی طرح کیوں جھگڑا ہوتا ہے پس زید بولا کہ تری بہن کو (کلثوم کو) لیجاؤ کہ میں نے اس کو رخصت دی ہوں کہ تین مہینہ ہوئے بعد اس کی نسبتی بھائی نے ثالث کو جمع کیا پس ثالث نے زید سے پوچھا کہ تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو؟ زید نے جواب دیا جو بولا سو بولا پس ابھی میں نے بی بی مذکورہ (یعنی کلثوم کو طلاق بائن دی پس بعد اس کی زید وہاں سے اٹھ کر تھوڑا دور جاکر غضبناک ہو کر مارنے لگا اور کہا بی بی مذکورہ کو کہ تم گھر سے باہر ہو اور زیورات رکھ کر چلے جاؤ اس کے بعد بی بی مذکورہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی ۔ غرض یہ ہے کہ جناب بی بی مذکورہ پر تین طلاق واقع ہوئی یا نہیں اور اس شوہر نے بی بی مذکورہ کو رکھ سکتا ہے یا نہیں اگر رکھ سکتا ہے تو کس طرح؟ بینوا توجروا ۔

الجواب ؛ صورت مسئولہ میں کلثوم پر دو طلاق بلا نیت واقع ہوگئیں ایک تو میں نے اس کو رخصت دی ہوں کہنے سے کیونکہ حالت غضب میں اس لفظ سے بدون نیت طلاق پڑجاتی ہے فی تنویر الابصار ونحو اعتدی الی سرحتك فارقتك لا یحتمل السب والرد ففی حالة الغضب تتوقف الاقسام علی نیته وفی الغضب الاولان وقال الشامی تحت (قوله الاولان) ای ما یصلح رداً وجواباً وما یصلح سبا وجواباً ولا یتوقف ما یتعین للجواب (۲ج۷۶۴) قلت وفی اللغة الهندیه رخصت دی مثل سرحتك اور دوسری طلاق صریح دی ہے اور تیسری طلاق گھر باہر ہو الخ سے واقع ہونے کے لئے نیت کی ضرورت ہے بدون نیت حالت غضب و مذاکرات طلاق میں بھی اس لفظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی کما فی تنویر الابصار ایضاً نحو اخرجی واذهبی وقومی یحتمل رداً وقال الشامی ای ویصلح جواباً ص ۷۶۱ج ۲ ومر توقف هذا القسم علی النیة فی حالة الغضب وفیه ایضاً (ص ۷۶۵ج ۲) وفی مذاکرة الطلاق یتوقف الاول وفی الشامی ای ما یصلح للرد والجواب پس اگر زید نیت طلاق سے انکار کرتا ہے اور وہ حاکم اسلام یا عورت کے سامنے قسم کھا جاوے کہ میں نے اس لفظ سے طلاق کی نیت نہیں کی تو تیسری طلاق واقع نہیں ہوئی اور زید و کلثوم کا نکاح ہوسکتا ہے اور اگر زید نے لفظ مذکور سے طلاق کی نیت کی تھی تو تین طلاق واقع ہوگئیں اور زید و کلثوم کا نکاح جائز نہیں فی الدر

القول له فی عدم النیة ویکفی تحلیفها له فی منزله فان ابی رفعته للحاکم فان نکل فرق بینهما مجتبی (شامی ص ۷۶۴ج ۲) احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۵ ربیع الاول

۲۸

الجواب صحیح ، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۶ ربیع الاول ۴۳ھ

طلاق اور مطلقہ وغیرہ الفاظ سے بیوی کو مخاطب کرنے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں

(سوال) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو بعض اوقات خانگی کشیدگی اور جھگڑوں میں بطور تنبیہ اور اظہار نفرت و بیزاری کے طلاقن مطلقہ ، طلاق پانے کے قابل ۔ وغیرہم کلمات کہدیئے اگرچہ زید نے ایسے کلمات ناراضگی میں منہ سے نکالے لیکن ہندہ کو کبھی اس قسم کا خیال بھی نہیں گذرا۔ وہ محض معمولی خانگی جھگڑوں پر محمول کرتی رہی اور نہ یہ کلمے کسی تیسرے شخص کی موجودگی اور مواجہ میں کہے گئے غرض بجز زید کے کسی کے وہم و گمان میں بھی طلاق کا مذکور نہیں ۔ اب زید ان کلمات کے منہ سے نکال دینے کی وجہ سے چند روز سے اپنی زوجہ ہندہ کو مشکوک نظر سے دیکھتا ہے اور متردد ہے کہ کہیں ہندہ پر طلاق تو نہیں پڑگئی ، ہندہ کی گود میں زید کا شیر خوار بچہ بھی ہے اور فریقین کردنی ناکردنی پر توبہ استغفار کر کے رجوع کرنے پر مائل ہیں نیز زید کی خانہ آبادی بھی ہندہ کے دم سے متصور ہے اب مستفسر ہے کہ شرعاً ایسی لغویات کی کیا اصل ہے اور اب رجوع و انابت کے لئے کیا حکم ہے ؟

الجواب ؛ قال فی الدر ولو قال لها کونی طالقا ...... او یا مطلقة وقع (ای من غیر نیة لانه صریح ۱۲ شامی وفیه ایضاً عن التاترخانیة عن المحیط قال انت طالق ثم قال یا مطلقة لا تقع اخری اھ ص ۷۱۳ج ۲)

صورت مسئولہ میں یہ لفظ تو موجب طلاق نہیں کہ " طلاق پانے کے قابل " البتہ طلاقن اور مطلقہ کہکر پکارنے سے زوجہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہو چکی ہے اگر اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور عدت پوری نہیں ہوئی تو زبان سے بیوی کو اتنا کہدیا جائے کہ میں نے رجعت کرلی اور عدت پوری ہو چکی ہے تو نکاح دوبارہ کرسکتا ہے بشرطیکہ عورت بھی تجدید نکاح پر راضی ہو ورنہ وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے اور آئندہ ایسی لغویات سے احتراز کرنا لازم ہے قلت ولا یقع الثانیة ولا الثالثة بقوله یا مطلقة لانها اتصفت بها بالاول فیکون حکایة له ۔ واللہ اعلم ۔

۲۴ ربیع الاول ۴۶ھ ۔

ساس کے مطالبۂ طلاق پر شوہر کے یہ کہنے سے کہ جادی، جادی۔ طلاق رجعی و مغلظہ واقع ہونے میں تردد کا بیان

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین اس صورت میں کہ زید اور اس کی ساس میں کچھ جھگڑا ہوا اور زید کی ساس نے زید سے کہا کہ تو میری لڑکی کو طلاق دیدے، زید چونکہ غصہ کی حالت میں تھا اس نے فوراً طلاق دیدی اس کے بعد جب زید سے اس کی بیوی کو جدا کیا گیا تو زید یہ کہتا ہے کہ چونکہ میں نے صرف دو مرتبہ ان الفاظ میں طلاق دی ہے کہ جادی جادی اس لئے صرف دو طلاقیں واقع ہوئیں اور مجھے رجعت کا حق ہے لیکن طلاق دیتے وقت جو لوگ موجود تھے ان کے بیانات مختلف ہیں ایک شخص کہتا ہے کہ زید نے یہ بھی نہیں کہا کہ جادی۔ جادی۔ ایک بیان کرتا ہے کہ میں نے یہ نہیں سنا کہ زید نے یہ کہا ہو کہ جادی، جادی بلکہ زید کی ساس طلب کرتی تھی اور زید یہ جواب دیتا تھا کہ دیدوں گا۔ اور ایک شخص جو کہ معتبر بھی سمجھا جاتا ہے یہ بیان کرتا ہے کہ میرے سامنے زید نے دو مرتبہ طلاق دی اور میں نے زید کو اس فعل سے روکا اور میں وہاں سے فوراً چلا گیا۔ اور دو آدمی یہ بیان کرتے ہیں کہ زید نے تین مرتبہ سے زیادہ طلاق دی اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ یہ کہتے ہیں کہ زید نے تین مرتبہ سے زیادہ دی ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مجمع میں چل کر جہاں اور لوگوں سے تحقیق کی جاوے یہی بیان کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم کسی کے جھگڑے میں شریک نہیں ہوتے۔

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے کہ زید کی بیوی پر طلاق ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کیسی طلاق ہوئی آیا زید کو رجعت کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں بینوا توجروا۔

تنقیح: صورت مسئولہ میں سائل کو یہ بھی بتلانا چاہئے کہ زید کی بیوی کیا کہتی ہے وہ قول زید کی تصدیق کرتی ہے یا اُن لوگوں کے قول کی جو تین طلاق یا اس سے زائد کے شاہد ہیں اور یہ شاہد شریعت کے پابند اور عادل ہیں یا نہیں اس کے بعد حکم بتلایا جائے گا۔ فقط۔

ظفر احمد عفا عنہ ۳۰ ربیع الثانی سنہ ۴۹ھ

جواب تنقیح: (۱) زید کی بیوی اُن لوگوں کے قول کی تصدیق کرتی ہے جو تین طلاق یا اس سے زائد کے شاہد ہیں۔

(۲) یہ شاہد نماز پابندی سے نہیں پڑھتے اور چونکہ نائی ہیں حجامت بھی ہر قسم کی بناتے ہیں

لوگوں کی ڈاڑھیاں مونڈتے ہیں غرض پابند شریعت نہیں ہیں۔

الجواب: صورت مسئولہ میں اگر زید کی بیوی اس مجلس میں موجود تھی جبکہ زید نے جادی عہ جادی کہا تھا اور زوجہ زید کہتی ہے کہ اُس نے تین بار یا اس سے زائد یہ لفظ کہا ہے تو اس عورت کو زید کے پاس رہنا جائز نہیں وہ اس سے علیحدہ ہو جاوے اس پر بوجہ اس کے اقرار طلقات ثلث کے زید کے پاس رہنا جائز نہیں اور زید اگر تین طلاق کا منکر ہے تو اس کو اس عورت کا اپنے پاس رکھنا جائز ہے گو عورت کو اس کے پاس رہنا جائز نہیں اب اس اختلاف کا ارتفاع مفتی کے فتوے سے نہیں ہو سکتا مفتی اس صورت میں مرد و عورت کو الگ الگ فتویٰ دے گا اس کے ارتفاع کی صورت یہ ہے کہ زوجین کسی حاکم مسلم یا حکم عالم کے پاس مرافعہ کریں وہ تحقیق بقاعدۂ شرعیہ کرکے اس واقعہ کا جو فیصلہ کردے اس پر زوجین کو عمل جائز ہوگا اور اگر زوجۂ زید خود اس مجلس نزاع و طلاق میں موجود نہ تھی بلکہ صرف شہود کے بیان سے اس کو علم ہوا ہے تو سوال دوبارہ کیا جاوے۔ واللہ اعلم۔

۱۱ر جمادی الاولی سنہ ۴۶ھ۔

اس تحریر کے بعد احقر کی رائے بدل گئی اور یہ سمجھ میں آیا کہ اگر صورت مسئولہ میں زید نے طلاق کا لفظ زبان سے نہیں کہا بلکہ صرف جادی جادی مکرر کہا اور عورت کہتی ہے کہ زید نے لفظ جادی تین بار یا زائد کہا ہے اور وہ بھی طلاق کا لفظ سننا بیان نہیں کرتی تو صرف لفظ جادی کے تین بار یا زائد کہنے سے تین طلاق بدون نیت زید کے واقع نہیں ہو سکتیں اور زید کی نیت تین طلاق کی نہ تھی جیسا کہ سوال سے معلوم ہوا اس لئے اس کی زوجہ پر تین طلاق واقع نہیں ہوئیں اور اگر عورت تین مرتبہ اس لفظ کے سننے کی مدعی ہے کہ جا طلاق دی تو اس صورت میں اس اختلاف کو حاکم یا حکم مرتفع کرے گا ووجہ ذلک انا اوقعنا الطلاق بلفظ جادی لکونہ فی معنی نعم وقد رأیت فی الخلاصۃ سئل محمد عن رجل قیل لہ أطلقت امرأتک ثلاثا فقال نعم قال القیاس ان یقع الثلاث ولکن استحسن واجعلہا واحدۃ اھ (ص ۸۵ ج ۲) وفی الخلاصۃ ایضا وفی ایمان مجموع النوازل سئل نجم الدین عن امرأۃ قالت لزوجہا مرا طلاق کن مرا طلاق کن فقال

عہ قلت وھو نظیر قولہ نعم او بلی فی جواب من سئل أطلقت امرأتک وقد صرح فی الدر والشامیۃ بوقوع الطلاق بھما بلا نیۃ (ص ۶۰۲ ج ۲) فجعلہ کالصریح لکون السوال فیہ معاداً واللہ اعلم ۱۲ منہ

الزوج کردم کردم قال تطلق ثلاث وکذا اجاب السید الامام اشرف بن
محمد بن شجاع قال الشیخ الامام عمر بن ابی بکرؒ تطلق واحدۃ اھ (ص ۸۲/۲)
قلت ووجه الاول حمل التکرار فی قوله کردم فی جواب التکرار فی قولها مرا طلاق کن
وھو الظاھرعہ فکان کل فرد منه انشاءً وحمله الشیخ عمر علی التاکید لکونه محتملا
ایضاً والتاکید فی لفظ الطلاق انما لا یجعل واحدۃ قضاءً للاجماع ولا اجماع
فی تکرار مثل قوله کردم بدون لفظ الطلاق فیتوقف کونها ثلاثاً علی نیة القائل
ولا یقع فوق الواحدۃ بدون النیة ھذا ما ظھر لی قلت وھذا الاختلاف
انما ھو فیما اذا کررت المرأۃ قولها مرا طلاق کن ثلاثا واما اذا لم تکررہ وقالت
مرۃً مرا طلاق کن وکرر الزوج قوله کردم فی جوابها فالظاھر انه لا یقع الثلاث
بدون النیة عندھم جمیعاً لعدم ما یدل علی کونه انشاء برأسه وفی الصورۃ
المسئولة لم یثبت تکرار قول المرأۃ ولم ینو الزوج بتکرار قوله جادی الثلاث
فلا یقع الا واحدۃ او ثنتان حسب ما نوی واللہ اعلم - ۱۴ جمادی الاولیٰ ۳۶ھ

مکرر آنکہ ان دونوں جوابوں کو احقر نے حضرت حکیم الامۃ دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا فرمایا کہ جواب اول تو قواعد عامہ کے موافق ہے اور جواب ثانی میں جو جزئیات نقل کی گئی ہیں اُن کا مبنی صحیح سمجھ میں نہیں آیا اور جو مبنی ظاہر کیا گیا ہے وہ کچھ جی کو نہیں لگا (اور احقر کاتب بھی اس مبنی کی صحت میں متردد ہے) لیکن چونکہ یہ جزئیات جواب اول کے ظاہراً منافی ہیں اس لئے اس جواب سابق میں بھی تردد ہے اور ثانی میں بھی تردد ہے بوجہ دلیل جزئیات مفہوم نہ ہونے کے ، دوسرا سبب تردد یہ بھی ہے کہ ہر زبان کے محاورات جدا ہوتے ہیں اُن میں توافق ضرور نہیں اس لئے دونوں جوابوں کو قلم زد کر دیا گیا ہے کسی اور محقق عالم سے استفتار کر لیا جائے اور یہ سب روایات اس کے سامنے پیش کر دی جائیں واللہ اعلم۔

۱۵ جمادی الاولیٰ ۳۶ھ۔

ان الفاظ سے طلاق کا حکم کہ ہمارے چلے جانے ہی کو تین طلاق سمجھا جائے گا؛

(سوال) جناب مولانا صاحب گذارش خدمت اقدس ہے کہ کسی نے اپنی لڑکی کو گھر میں خانہ داماد رکھ کر شادی کی تھی

عہ وہو الذی صحح فی الہندیة ص ۲۷۴ ج ۲ - ۱۲ ظفر

لیکن بعد عقد نکاح کے اس داماد کو مربیان محلہ داران نے یہ شرط سنائی کہ اگر تم اس بی بی یا بیوی کے گھر والوں سے کسی سے جھگڑا فساد کرکے تین ماہ دس دن اور کہیں چلے جاؤ گے تو اس بیوی کا اپنی زوجیت میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے ہو یعنی جب تین مہینہ دس دن گذر جائیں گے تو وہ بیوی اپنی خوشی سے دوسرا خاوند قبول کر سکتی ہے اس میں تمہارا کوئی عذر نہ ہوگا تمہارے چلے جانے ہی کو تین طلاق سمجھا جائے گا اس نے کہا ہاں میں نے قبول کیا اب وہ خانہ داماد بعد عرصہ چار سال کے اپنی ساس سے جھگڑا کرکے دوسری جگہ میں چلا گیا سال بھر تک اسی حالت جدائی میں رہا اب جو مربیان محلہ داران بیوی سے اور اس کی ماں سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتی ہیں کہ اگر شریعت اجازت دے تو پھر میں اپنے داماد کو گھر میں بلالوں گی یا انہیں کے ساتھ اپنی لڑکی دے دوں گی لیکن اس کے قبل دو تین مہینہ کے انہیں مربیان نے انہوں سے دریافت کیا اس وقت دونوں ماں بیٹی نے ناراضی ظاہر کی اور ماں نے کہا میں اپنی بیٹی کو ہرگز نہیں دوں گی ۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ داماد پر کسی صورت وہ راضی ہوگئی ہیں آیا اس رضامندی سے ان کا نکاح باقی رہا یا جاتا رہا؟ موافق کتاب اللہ وسنت رسول اس کے جواب عنایت کیجئے۔

الجواب ؛ اگر صورت واقعہ یہی ہے جو سوال میں درج ہے اور مربیان محلہ داران کے الفاظ یہی تھے جو مذکور ہوئے تو شوہر کے اس کہنے سے کہ ہاں میں نے قبول کیا یہ کلام تعلیق طلاق یا تعلیق تفویض کو موجب نہیں اور شوہر کے چلے جانے سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لان قول القائل اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے لیس من الفاظ الطلاق وکذا قوله تو وہ بیوی اپنی خوشی سے دوسرا خاوند قبول کر سکتی ہے ۔ واما قوله تمہارے چلے جانے ہی کو تین طلاق سمجھا جاوے گا فقد جعل فیه غیر الطلاق طلاقاً وھو لغو وفیه ایضاً من لفظ المضارع المفید للاستقبال المحتمل للوعد فلا یکون قبوله طلاقاً ولا تعلیقاً سئل شیخ الاسلام عمن ضرب امرأته وقال دار طلاق قال لا تطلق، شیخ الاسلام یقول سمی الضرب طلاقاً فیبطل اھ عالمگیریه ج ۲ ص ۷۳ ، قلت وفی الصورۃ المسئولة جعل الغیابة طلاقاً صراحةً ولم یتکلم احد بما یفید تعلیق الطلاق اصلاً ، واللہ اعلم ۔ ظفر احمد ۔

۱۷ جمادی الاخریٰ ۳۶ھ ۔

فرار عن الطلاق کی نیت سے بیوی کا نام بدل کر طلاق دے دی تو طلاق واقع نہیں ہوگی

سوال) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اندریں مسئلہ کہ زوجہ منکوحہ جناب علی منشی مسماۃ ایم النساء بی بی بنت فرمان ملا بمرض درد شکم احیاناً چار پانچ روز مبتلا رہتی ہے اور اس کی بجز ایک لڑکی کے اور کوئی اولاد بھی نہیں۔

ازیں جہت دوسرا نکاح کرنے کے ارادہ سے ایک دولہن اپنے مکان میں لایا بعد ازاں بقصد عقد بست مجلس میں بیٹھ گیا تو اقرباء و اولیاء مخطوبہ میں معین الدین سردار دفعۃً از دست خود ایک کاغذ جناب علی کے سامنے رکھ دیا اور بہ تحدید شدت مکرر سکرر یہ کہتے رہے کہ تم اپنی اگلی بی بی کو طلاق نامہ لکھ دو تو ہم دوسری دولہن سے تمہارا عقد کر دیں گے۔ تب جناب علی چند منٹ سکوت ہو کر شش و پنج میں رہا آخر لا مر سوچ بچارے کچھ کام نہ چلا پھر اپنی پہلی ایم النساء کے نام کو قصداً بدل کر امر جان بی بی بنت فرمان ملا کو میں نے تین طلاق دیا اس مضمون کو لکھ دیا، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا اس تحریر تسمیہ تبدیل و عدم نیت سے طلاق واقع ہو گئی یا نہیں؟ بینوا بحوالہ دلیل توجروا عند اللہ الجزیل۔

الجواب: اگر جناب علی کی نیت طلاق کی نہ تھی اور اس نے اپنی بی بی کا نام اسی ارادہ سے بدلا ہے کہ بی بی پر طلاق واقع نہ ہو تو اس کی زوجہ ایم النساء پر طلاق واقع نہیں ہوئی قال فی العالمگیریۃ ولو قال امرأتہ عمرۃ بنت صبیح طالق وامرأتہ عمرۃ بنت حفص ولا نیۃ لہ لا تطلق امرأتہ وکذا اذا سمی بغیر اسمہا ولا نیۃ لہ فی طلاق امرأتہ فان نوی طلاق امرأتہ فی ہذہ الوجوہ طلقت امرأتہ کذا فی الذخیرۃ اھ ملخصا (ج ۲ ص ۵۸) اور اگر صورت سوال میں اکراہ بمعنی اکراہ شرعی متحقق ہو تو یہ ایک دوسری وجہ عدم وقوع طلاق کی ہو جائے گی کیونکہ کتابت طلاق بالاکراہ موجب طلاق نہیں صرح بہ فی الدر والشامیۃ فی فصل الطلاق بالکتابۃ، واللہ اعلم۔

۷ رمضان ۱۳۴۶ھ

حکم طلاق بلفظ طلاق ہی سمجھو

سوال) مخدوم گرامی اعلیٰ حضرت قبلہ و کعبہ ام عالیجناب مولانا صاحب مدظلہ العالی!

السلام علیکم معاملہ نکاح لڑکی مسماۃ جمیلہ خاتون کے متعلق حسب الارشاد جملہ صاحبان کے بیانات تحریری علیحدہ علیحدہ لکھوا کر حضور انور میں پیش کرنا چاہتا ہوں، فقط والسلام۔

نوٹ:- یہ چھ عدد تحریرات تھیں۔ ۱ میں زوج کا کوئی لفظ موجب طلاق نہیں صرف ایک لفظ مذکور ہے کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں علیحدگی کر دوں (جو مضارع کا صیغہ ہی) تحریر دوم میں یہ لفظ بھی نہیں بلکہ صرف اس قدر ہے کہ زوج نے اول یہ کہا کہ فلاں فلاں صاحب میرے ساتھ مظفر نگر چلیں میں وہاں اس معاملہ کا تصفیہ کر دوں گا پھر اس سے کہا گیا کہ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے جب تم تصفیہ کے لئے تیار ہو تو ابھی کر دو اس کے جواب میں زوج نے کہا کہ میں اپنے والدین سے مشورہ کے بعد بتلاؤں گا۔

بقیہ تحریرات میں جو الفاظ تھے ان کو جواب اول میں نقل کیا گیا ہے اور انہی سے بحث کی گئی ہے ۱۲ ظفر

الجواب الاول: ان تحریرات میں تحریر سوم و چہارم و ششم میں یہ لفظ مذکور ہے کہ محمود نے کہا "اب بھی جواب دینے کو طیار ہوں میری طرف سے جواب ہی سمجھیں" اس کے بعد کسی میں یہ ہے کہ "ذرا میں چرتھاول ہو آؤں وہاں سے آکر تصفیہ کر دوں گا"۔ کسی میں یہ ہے کہ مجھ کو دعویٰ مہر کا کھٹکا ہے اس لئے مظفر نگر چل کر تم معافی نامہ مہر لکھ دو پھر میں طلاق نامہ لکھ دوں گا۔

بہرحال لفظ جواب سمجھیں طلاق کا صریح لفظ نہیں بلکہ کنایہ ہے اور کنایہ بھی ایسا جو مذاکرہ طلاق میں بھی محتاج نیت ہے بوجہ لفظ سمجھیں بڑھانے کے جو ترجمہ گیر و انکار کا ہے جس میں فقہاء نے نیت کی ضرورت کی تصریح کی ہے۔

عالمگیری میں ہے امرأۃ قالت لزوجہا مرا طلاق دہ فقال الزوج دادہ گیر او کردہ گیر ان نوی یقع ویکون رجعیا وان لم ینو لا یقع ولو قال دادہ انگار او کردہ انگار لا یقع وان نوی (ج ۲ ص ۷۲) قلت وہذا یدل علی الفرق بین گیر و انکار فی عرفہم ولیس ذلک فی بلادنا بل ترجمۃ کل واحد منہما عندنا واحدۃ۔ وہذا کما تری قد صرحوا فیہ بالوقوع بالنیۃ مع کون التکلم بہ بعد مذاکرۃ الطلاق۔

اور تحریر پنجم میں یہ لفظ ہے کہ محمود نے یوں کہا کہ "میں تو رات بھی طلاق کی بابت کہتا تھا میں تو رات بھی طیار تھا اور اس وقت بھی طیار ہوں جیسا زبان سے کہدیا ویسے دے دی، اب تو کاغذ وغیرہ لکھنا باقی ہے وہ بھی لکھ دوں گا"

یہ بھی طلاق دینے میں صریح نہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جیسا زبان سے کہدیا کہ میں طیار ہوں ویسا ہی یہ کہنا ہو کہ طلاق دے دی اور اس سے بھی طلاق کا وقوع نہیں

ہوسکتا۔ بہر حال صورت مسئولہ میں جب تک شوہر یہ نہ کہے کہ میں نے یہ الفاظ (جن سے اس وقت جواب میں بحث کی گئی ہے) طلاق کی نیت سے کہے تھے اُس وقت تک طلاق نہیں واقع ہوئی، فقط۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۳ / ربیع الاول ۴۷ھ

الجواب الثانی

من بعض علماء دیوبند

اللّٰھم انت الموفق للصواب

مجھ سے کہا گیا ہے کہ بعض اکابر نے امر کیا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق تو اپنا خیال ظاہر کر۔ اس لئے میں اظہار خیال پر مجبور ہوں اور چونکہ میرا منصب فتویٰ نویسی نہیں ہے اور مفتی کیلئے جس وسعت نظر کی ضرورت ہے میں اس کے بعید تر مقام پر بھی نہیں رکھا جا سکتا ہوں، اس لئے اگر اس میں غلطی ہو تو مستبعد نہیں اور اگر صحیح ہو تو اس کو آمر مدظلہ کی کرامت خیال فرمایا جاوے۔ اس گذارش کا منشا فقط یہ ہے کہ میری یہ تحریر چند پریشان خیالوں کا مجموعہ ہے اگر اکابر امت اس کی تصدیق کریں تو قابل عمل ہے ورنہ ردی کاغذ سے زیادہ اس کی وقعت نہیں۔ میں ان تمام کاغذات منسلکہ کو دیکھنے کے بعد سمجھتا ہوں کہ صورت زیر بحث میں طلاق بائنہ واقع ہوگئی ہے کیونکہ حسب بیان مستفتی زوجہ غیر مدخول بہا ہے۔

اس خیال کی بنیاد امور ذیل ہیں:

۱ اگر اس تدقیق میں وقت صرف نہ کیا جاوے کہ "داوہ گیر" اور "جواب ہی سمجھیں" میں ترجمۃً فرق ہے تاہم جب یہ مان لیا گیا کہ اس قسم کے الفاظ کنایات طلاق میں سے ہیں تو پھر طلاق نہونا دشوار ہے کیونکہ وہ صریح سے صریح الفاظ اظہار نیت کے لئے بول رہا ہے کہتا ہے کہ پہلے بھی طیار تھا اب بھی طیار ہوں پھر اگر ان الفاظ سے نیت طلاق کا پتہ نہیں چلتا ہے تو اور کس طرح چلے گا۔ ہمارے پاس قائل کے الفاظ ہی ایسی چیز ہیں جن سے ہم اس کے ارادہ اور نیت کا پتہ چلا سکتے ہیں اور اگر ایک شخص کے الفاظ ہی اس کی نیت کو نہیں بتلا سکتے ہیں تو اگر کوئی شخص بصراحت بھی کہے کہ میری نیت یہ تھی قابل اعتبار نہ ہونا چاہئے۔ اس سے بھی قطع نظر نہ ہونا چاہئے کہ قتل عمد میں صرف آلہ جارحہ کے استعمال کو نیت قتل کے اظہار کا قطعی ذریعہ مان لیا گیا ہے۔ اگر قاتل بالآلات الجارحہ قسمیں کھا کر نیت قتل کا انکار کرے تو معتبر نہیں ہوتا تو جب قصاص ایسی مہتم بالشان چیز میں ایک قوی قرینے کو اس قدر درجہ

دے دیا گیا کہ نیت کا انکار معتبر نہیں تو اگر کسی شخص کے الفاظ اس کی نیت کو ظاہر کریں تو نیت پر جزم کرنا امر مستبعد نہیں۔ پس اگر باوجود مذاکرۂ طلاق کے ان الفاظ میں نیت طلاق شرط بھی ہو تب بھی نیت طلاق موجود ہے ملاحظہ ہو کاغذ ۳ ۴ ۵ ۶۔

۲۹

۲ تحریر ۵ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ زوج نے کہا کہ "جیسا زبان سے کہدیا ویسے دیدی اب تو کاغذ وغیرہ لکھنا باقی ہے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ زوج کے نزدیک تعلقاتِ زوجیت کے انقطاع کے تمام مراحل طے ہوگئے صرف کاغذ پر لکھنا باقی ہے اور ظاہر ہے کہ طلاق لسان سے ہے نہ کتابت سے پس طلاق واقع ہوگئی۔

۳ میرا خیال ہے کہ زوج کے یہ الفاظ کنایہ کی اس قسم میں داخل ہیں جن کو "صالح للجواب عن سوال المرأۃ طلاقہا فقط" میں داخل کیا جا سکتا ہے ان میں رد وغیرہ کا احتمال میری فہم سے بالا ہے اور اس قسم کے الفاظ کا حکم فتاوی التنویر میں اس طرح ہے ففی حال الرضا لا یقع الطلاق بشیء منہا والقول لہ مع یمینہ وفی حال لمذاکرۃ الطلاق یقع بالصالح للجواب والرد بالنیۃ ویقع الطلاق بالصالح للجواب فقط والصالح للجواب والشتم بدون النیۃ وفی حال الغضب یقع بالصالح للجواب فقط بلانیۃ ویقع بالصالح للجواب والرد والصالح للجواب والشتم بالنیۃ۔ اسی کے حاشیہ پر ملتقی الابحر سے نقل کیا ہے فلو انکر النیۃ صدق مطلقا حالۃ الرضاء ولا یصدق قضاءً عند مذاکرۃ الطلاق فیما یصلح للجواب دون الرد والشتم۔

پس میرے خیال میں مذاکرۂ طلاق کی صورت میں یہ الفاظ محتاج نیت بھی نہیں ہیں۔

خلاصۂ گذارش یہ ہے کہ یا تو یہ الفاظ محتاج نیت ہی نہیں ہیں اور اگر ہیں تو زوج ہی کے الفاظ اس کی نیت طلاق کو بتا رہے ہیں اور حسب بیان مستفتی زوجہ غیر مدخول بہا ہے لہذا زوجہ مطلقہ بائنہ ہے بلا انقضائے عدت اس کا نکاح دوسرے شخص سے کیا جا سکتا ہے واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ محمد اعزاز علی غفرلہ ۷ / ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ۔

اقول و باللہ التوفیق

احقر کی رائے میں بھی اس صورت میں طلاق بائنہ واقع ہوگئی جس کی تفصیل تحریر بالا میں مذکور ہے۔ فالجواب صحیح فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ عزیز الرحمن عفی عنہ دیوبندی۔ ☐ نشان مہر

احقر بھی حضرت مفتی صاحب کی تحریر سے اتفاق رکھتا ہے۔

الجواب صحیح، احقر محمد حمید حسن عفی عنہ دیوبندی۔

الجواب صواب، نبیہ حسن عفا اللہ عنہ۔ الجواب صحیح مسعود احمد عفا اللہ عنہ دار العلوم دیوبند، ربیع ۲ ۴۷ھ

الجواب صحیح، احقر الزمان گل محمد خان خادم دار العلوم دیوبند۔

الکلام علی ثانی الجواب

(من جامع امداد الاحکام)

واللہ الملھم للصواب

اقول وباللہ التوفیق وھو خیر معین ورفیق۔

① فاضل مجیب نے علا میں جس تدقیق میں وقت صرف نہیں کیا درحقیقت وہی قابل غور ہے اور اس میں ان کو تامل وغور کرنا اور وقت صرف کرنا لازم تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ مجتہد نہیں بلکہ مقلد ہیں پس ہم کو فقہاء کے کلام میں غور کرکے کوئی نظیر واقعہ مسئولہ کی نکالنی چاہئے تاکہ جواب محض قیاس مقلد پر مبنی نہ ہو بلکہ کلام فقہاء پر مبنی ہو۔ سو ہم نے جو اس واقعہ میں غور کیا تو متکلم کے لفظ "آپ میری طرف سے جواب ہی سمجھیں" کی چند نظائر کلام فقہاء میں ہم کو ملی ہیں ایک "دادہ گیر و کردہ گیر" جس کو جواب اول میں نقل کیا گیا ہے عالمگیری (ج۲ ص ۷۵) میں اس جزئیہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ولفظہ فی النسفیۃ سئل عن امرأۃ قالت لزوجھا با تو نمی باشم قال نا باشیدہ گیر فقالت این چہ سخن بود آن کن کہ خدائے تعالیٰ و رسول خدا فرمود۔ نیکو بگو طلاق تا بروم فقال طلاق کردہ گیر برو۔ ھل یقع الطلاق ان نوی الایقاع؟ یقع واحدۃ اھ وفی الخلاصۃ ولو قالت مرا یلہ کن فقال یلہ کردہ گیر ان نوی یقع اھ (ج۲ ص ۹۷)، اور ظاہر ہے کہ طلاق کردہ گیر اور یلہ کردہ گیر الفاظ کنایات طلاق میں سے ہیں ورنہ بعد نیت کے بھی اُن سے وقوع نہ ہوتا مگر بایں ہمہ بعد طلب طلاق و مذاکرۂ طلاق کے بھی وقوع طلاق کو

عہ قلت وقد صرح فی العالمگیریۃ ان قولہ یلہ کردم ترا تفسیر قولہ طلقتک عرفا حتی یکون رجعیا ویقع بدون النیۃ اھ ج۲ ص ۷۲۔ وانما صار کنایۃ لزیادۃ قولہ گیر فافہم ۱۲ منہ

مقید بالنیۃ کیا گیا ہے۔ اور یہاں یہ بات قابل تنبیہ ہے کہ فقہاء نے جن الفاظ میں باوجود مذاکرۂ طلاق کے بھی وقوع طلاق کے لئے نیت کو شرط قرار دیا ہے وہاں مطلب یہ ہے کہ متکلم بوقت تکلم کے ان الفاظ سے ایقاع طلاق کی نیت کرے محض قرائن نیت کافی نہ ہوں گے ورنہ مذاکرۂ طلاق کے بعد جو کہ نیت کا قوی قرینہ ہے کما صرحوا بہ قاطبۃً نیت کا شرط کرنا محض فضول و لغو ہوگا۔ اس سے فاضل مجیب کے اس قول کا جواب معلوم ہوگیا کہ:

"جب یہ مان لیا گیا کہ الفاظ کنایات طلاق سے ہیں تو پھر طلاق نہ ہونا دشوار ہے
کیونکہ جو صریح سے صریح الفاظ اظہار نیت کے لئے بول رہا ہے کہتا ہے کہ پہلے
بھی طیار تھا اب بھی طیار ہوں الخ۔"

کیونکہ اول تو اس میں صرف آمادگی کا اظہار ہے اور آمادگی برطلاق عزم طلاق کو مستلزم نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ آمادگی کسی مصلحت یا شرط کے ساتھ مشروط ہو کہ بدون اس کے تحقق کی آمادگی ہی متحقق نہ ہوگی تا العزم چہ رسد اور واقعہ مسئول عنہا میں زوج نے جس قدر بھی آمادگی طلاق پر ظاہر کی ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اول دین مہر کی طرف سے اس کا کافی اطمینان ہو جائے بدون اس شرط کے تحقق کے نہ اس کی طرف سے آمادگی کا تحقق ہے نہ عزم کا اور اس شرط کے ذکر پر تمام شہود متفق ہیں پس اول تو آمادگی برطلاق عزم طلاق کو مستلزم نہیں اور اگر ہو بھی تو ان قرائن کی حیثیت مذاکرۂ طلاق سے زیادہ نہیں مگر فقہاء نظائر مذکورہ میں باوجود مذاکرہ کے جو ان کے نزدیک قرینہ قویہ نیت طلاق کا ہے پھر بھی نیت زوج کو ضروری بتلاتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ کے تکلم کے وقت ایقاع طلاق کی نیت شرط ہے جو بدون اقرار زوج کے معلوم نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد میں فاضل مجیب کو اس پر بھی متوجہ کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مقام پر قتل کی نظیر بیان کرنے میں سخت مسامحت کی ہے کیونکہ قتل افعال حسیہ میں سے ہے، عقود و فسوخ کی جنس سے نہیں ہے عقود و فسوخ کا تحقق محض الفاظ سے ہوتا ہے اس لئے وہاں صریح و کنایات اور نیت سے بحث لازم ہے اور افعال حسیہ کا وجود الفاظ سے نہیں ہوتا بلکہ فعل حسی سے ہوتا ہے وہاں نیت سے کچھ بحث نہیں۔ پس جب فعل حسی یعنی قتل بالجارحہ کا تحقق ثابت ہوگیا اب نیت قتل کا انکار نفی قتل میں لغو ہے۔ اور اگر طلاق و نکاح کا تحقق بھی ایجاب و قبول یعنی الفاظ سے نہ ہوا کرتا بلکہ کسی عمل سے ہوتا تو بعد ثبوت

عمل یہاں بھی نیت کی بحث کو لغو کہا جاتا اور قتل و زنا میں بھی اگر ایسی صورت ہو جہاں ثبوت زنا و قتل کا مدار بینہ پر نہ ہو بلکہ صرف اقرار ملزم پر ہو اور اس صورت میں ملزم یوں کہے کہ آپ مجھ کو ہی قاتل سمجھ لیں" یا یوں کہے کہ "مجھی کو زانی سمجھ لیں" تو ہم یقین کرتے ہیں کہ ایسے مجمل و محتمل اقرار سے فاضل مجیب بھی اُس کو محل قصاص و محل رجم نہ قرار دیں گے۔

فاضل مجیب کو طلاق کی نظیر میں نکاح و بیع وغیرہ کا ذکر مناسب تھا جو مثل طلاق کے الفاظ سے ثابت ہوتے ہیں۔ اب وہ غور کریں کہ اگر کوئی شخص نکاح کی مجلس میں ایجاب کے بعد یہ نہ کہے کہ میں نے قبول و منظور کیا بلکہ یوں کہے کہ آپ میری طرف سے قبول ہی سمجھیں تو کیا اس کو بدون نیت کے صریح قبول مانا جائے گا گو وہ اس سے پہلے قبول نکاح پر کیسی ہی آمادگی اور طیاری ظاہر کر چکا ہو؟ یقیناً یہاں آپ بھی یہی کہیں گے کہ یہ الفاظ قبول میں صریح نہیں بلکہ نیت پر مدار رکھا جائے گا اگر اس نے اس لفظ سے انشاء قبول کی نیت کی ہے تو قبول ہے ورنہ محض وعدہ ہے قال فی الخلاصة لو قال لامرأة اجنبية خویشتن بزنی بمن دہ فقالت دادہ گیر ان نوت وهناك شهود صح قال واما فی البیع والاجارة وكل ما يتعلق بالمال بان قيل لرجل بع هذه الدار منی فقال فروختہ گیر و قبل فلان فلا يصح اھ (ج ۲ ص ۹۷)۔

دوسری نظیر واقعہ مسئولہ کی فقہاء کے کلام میں دادہ انگار و کردہ انگار ہے جس میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ باوجود نیت کے بھی وقوع طلاق نہ ہوگا۔ قاضی خان نے اس کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے امرأة قالت لزوجها مرا طلاق دہ فقال الزوج دادہ انگار او قال کردہ انگار لا يقع الطلاق وان نوى كانه قال لها بالعربية احسبی انك طالق وان قال ذلك لا يقع وان نوى اھ (ج ۲ ص ۲۱۰) اسی قاضیخان میں (ج ۲ ص ۲۱۴) پر ہے ولو قيل لرجل اطلقت امرأتك؟ فقال عدها مطلقة او احسبها مطلقة لا تطلق امرأته اھ اور اگر تامل صادق سے کام لیا جائے تو لفظ جواب ہی سمجھیں کا ترجمہ طلاق دادہ گیر سے زیادہ قریب طلاق دادہ انگار و احسبی انك طالق وعدها مطلقة ہے اور ان میں فقہاء باوجود نیت کے بھی وقوع طلاق کے قائل نہیں اور دادہ گیر کا ترجمہ صحیح یہ ہے کہ "طلاق ہی مان لو"، پس صورت مسئولہ میں اگر متکلم نے یوں کہا ہوتا کہ "آپ میری طرف سے جواب ہی مان لیں" تو بیشک لفظ طلاق دادہ گیر

کی صریح نظیر تھی جس سے بشرط نیت ایقاع بوقت تکلم وقوع طلاق کا ہو جاتا اور جواب ہی سمجھیں میں حکم وقوع طلاق دشوار ہے اور بدون نیت بوقت تکلم کے تو دشوار تر ہے فاضل مجیب دقت صرف کر کے اس میں دوبارہ غور کریں۔

(۲) فاضل مجیب نے اس نمبر میں سخت مسامحت سے کام لیا ہے کہ زوج کے قول کو نقل کر کے یہ نہیں بتلایا کہ ایقاع طلاق کا حکم کس لفظ کی وجہ سے ہے زوج کے الفاظ یہ ہیں "میں نے تو رات بھی طلاق کی بابت کہا تھا میں تو رات بھی طیار تھا اور اس وقت بھی طیار ہوں جیسا زبان سے کہدیا ویسے دے دی اب تو کاغذ وغیرہ لکھنا باقی ہے وہ بھی لکھ دیگا" فاضل مجیب کو چاہئے تھا کہ اس کلام میں وہ لفظ معین کرتے جس سے ایقاع طلاق ثابت کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ زوج کے نزدیک تعلقات زوجیت کے انقطاع کے تمام مراحل طے ہو گئے صرف کاغذ پر لکھنا باقی ہے الخ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مجیب کے نزدیک لفظ "اب تو کاغذ وغیرہ پر لکھنا باقی ہے" سے وقوع طلاق کا ہوا ہے حالانکہ یہ لفظ الفاظ ایقاع میں سے ہرگز نہیں اگر کسی شخص نے ایک مرتبہ بھی انشاء طلاق و ایقاع کا لفظ زبان سے نہ نکالا ہو اور وہ لاکھ مرتبہ یہ کہتا پھرے کہ "اب تو کاغذ وغیرہ لکھنا باقی ہے" تو ہرگز کوئی مفتی اس لفظ سے ایقاع طلاق کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر لفظ "جیسا زبان سے کہدیا ویسا دیدی" کو موجب وقوع سمجھا گیا ہے تو فاضل مجیب کو لازم تھا کہ سیاق و سباق کے ساتھ ملا کر اس مہمل جملہ کا مطلب بھی واضح کرتے تاکہ دوسروں کو غور کا موقعہ ملتا کہ فاضل مجیب نے اس کے کیا معنی سمجھے اور اس کو کس قاعدہ سے موجب ایقاع طلاق قرار دیا ظاہر ہے کہ اس جملہ میں لفظ جیسا ویسا تشبیہ کا حرف ہے جس سے قائل نے ایک شے کے دینے کو زبان سے کہی ہوئی بات کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور زبان سے جو بات اس سے پہلے کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "میں رات بھی طیار تھا اور اس وقت بھی طیار ہوں" جس کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ آمادگی بر طلاق کو اعطاء طلاق کے ساتھ تشبیہ دے رہا ہے یعنی تم میری اس ظاہر کردہ آمادگی کو مثل طلاق دینے ہی کے سمجھو اب ہم منتظر ہیں کہ فاضل مجیب فقہ کی کس جزئی سے اس کا ثبوت دیں گے کہ تشبیہ آمادگی بر طلاق باعطاء طلاق یا اس کا عکس موجب وقوع طلاق ہے میرا خیال ہے کہ وہ اس کو ہرگز ثابت نہیں کر سکتے پھر حیرت ہے کہ متکلم کے کلام کا تو کوئی جزو موجب وقوع نہیں اور فاضل مجیب اس کا خلاصہ اپنی

عبارت میں نکال کر حکم وقوع کر رہے ہیں ۔

اس کے بعد فاضل مجیب نے دوسری مسامحت یہ کی کہ اس امر میں غور نہیں کیا کہ جس لفظ سے وہ نمبر دوم میں بحث کر رہے ہیں اس کا ناقل و شاہد صرف ایک شخص ہے اور ایک شخص کا قول باوجود عدالت کے بھی باب طلاق میں حجت نہیں پھر جس لفظ کے ناقل دو تین بھی ہیں ان میں بھی عدالت شرط ہے فاضل مجیب کو حکم وقوع لگانے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری تھا کہ عدد شہادت کامل ہے یا نہیں اور شہود عادل ہیں یا نہیں، اور کوئی وجہ مخاصمت بالزوج یا اتحاد مع الزوجہ تو موجود نہیں اور اس کی ضرورت مجیب اول کو نہ تھی کیونکہ اس نے عدم وقوع کا فتویٰ دیا ہے ولاحاجۃ فی عدم الوقوع الی ھذہ الشرائط هذا وقد صرح الفقها بلزوم الافتاء بالقضاء لا بالديانة كما في اوائل رد المحتار واواخر الحامدية ۔

(۳) اس نمبر میں فاضل مجیب نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے خیال میں زوج کے یہ الفاظ کنایہ کی اس قسم میں داخل ہیں جن کو صالح للجواب عن سوال المرأة طلاقها فقط میں داخل کیا جا سکتا ہے الخ

اس کے متعلق عرض ہے کہ ہمارا اور آپ کا محض خیال فتویٰ میں کافی نہیں بلکہ زوج کی طرف جو الفاظ شہود نے منسوب کئے ہیں ان کو فقہاء کے کلام میں غور کر کے کسی جزئی پر منطبق کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ لفظ فلاں لفظ کی نظیر ہے جو محض صالح للجواب ہے، اس لئے یہ بھی محض صالح للجواب ہے اس کے بعد حکم وقوع صحیح ہوگا والا فلا اور محض قاعدہ کلیہ بیان کر دینا کافی نہیں اس سے تو ہر طالب علم واقف ہے۔

آپ کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ ان میں رد و شتم کا احتمال فہم سے بالا ہے لیکن ان الفاظ میں احتمال وعدو تسلیہ ضرور ہے ہمارے محاورہ میں وعدہ کے وقت کہا کرتے ہیں کہ اس کام کو ہوا ہی سمجھو، تم میرے پیغام کو نکاح ہی سمجھو ، میری بات کو قبول ہی سمجھو ۔ اسی قبیل سے یہ قول ہے کہ آپ جواب ہی سمجھیں ۔ یعنی جواب ہوا ہی چاہتا ہے ۔ اور جب یہ کلام محتمل وعدو تسلیہ ہے تو پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ یہ صالح للجواب عن سوال الطلاق فقط ہی میں داخل ہے ۔ فاضل مجیب غور فرمائیں کہ عورت کے سوال طلاق کے بعد شوہر کا یہ کہنا طلاق دادہ گیر یا یلہ کردہ گیر اس میں کیا احتمال رد و شتم کا ہے ؟ ہرگز نہیں، بلکہ

ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ جواب سوال طلاق کے سوا کسی شئ کو رد و شتم میں سے محتمل نہیں مگر چونکہ اس میں وہی احتمال وعدہ کا اور امید دلانے کا ہے اس لئے فقہاء نے اس میں باوجود مذاکرۂ طلاق کے نیت ایقاع کو شرط کیا ہے اور طلاق انگار و احسبی انك طالقة وعدھا مطلقة واحسبها مطلقة میں باوجود نیت کے بھی عدم وقوع کی تصریح فرمائی ہے کیونکہ یہ لفظ معنیٔ وعدہ میں صریح ہے جس کی نظیر[عہ] یہ ہے کہ کوئی سوال طلاق کے بعد یوں کہے طلاق کنم طلاق کنم تو اس سے بوجہ معنیٔ وعد کے وقوع نہ ہوگا قال فی الھندیۃ قالت لزوجها من باتو نمی باشم فقال الزوج مباش فقالت طلاق بدست تو است مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق میکنم وکرر ثلاثا طلقت ثلاثا بخلاف قوله کنم لانه استقبال فلم يكن تحقيقا بالشك وفي المحيط لو قال بالعربية اطلق لايكون طلاقا اى مع النية كما صرحوا به ۱۲ منه الا اذا غلب استعماله للحال ا ھ (ج ۲ ص ۲۷) ۔

یہ تو جملہ اولیٰ کے متعلق گزارش تھی اب جملہ ثانیہ کے بابت جو تحریر ۵ میں ہے عرض ہے کہ لفظ جیسا زبان سے کہدیا ویسے دیدی اب تو کاغذ وغیرہ لکھنا باقی ہے الخ یہ الفاظ طلاق میں سے ہے ہی نہیں کیونکہ اس میں محض تشبیہ اعطاء طلاق بالقول السابق ہے اور اس سے وقوع طلاق کا کوئی احتمال نہیں پھر اس قول میں کہ جیسا زبان سے کہدیا ویسے دے دی اضافت طلاق الی المرأة بالکل نہیں ہے نہ لفظاً کما ھو ظاھر نہ معنیً کیونکہ عورت کو خطاب نہیں نہ بوقت اس کلام کے وہ سامنے تھی اور طلاق کا جو ذکر اس سے پہلے ہو رہا تھا وہ بھی ابہام کے ساتھ بدون اضافت کے تھا قال فی الخانیۃ امرأۃ قالت طلقنی ثلاثا فقال الزوج اینک ہزار طلاق لا تطلق امرأته لانه کلام محتمل (ج ۲ ص ۲۱۵) ای لعدم الاضافۃ بخلاف قوله اینکت ہزار طلاق حیث تطلق ثلاثا کما فی الخلاصۃ واللہ تعالیٰ اعلم اور عدم اضافت کا احتمال لفظ اول میں بھی ہے یعنی قول زوج آپ جواب ہی سمجھیں میں کیونکہ بجز ایک شاہد کے

عہ اور یہ بھی پوری نظیر نہیں کیونکہ مضارع میں بعد نیت کے وقوع ہو جاتا ہے اور الفاظ مذکورہ میں بعد نیت کے بھی وقوع نہیں ہوتا لیکن اس کو محض اس بات کے بتلانے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ معنی وعد کا احتمال وقوع طلاق کی نفی کر دیتا ہے ۱۲ منہ

کسی نے اضافت کی تصریح نہیں کی پس فاضل مجیب کو حکم وقوع طلاق کرتے ہوئے سب پہلوؤں پر غور کرنا لازم تھا اور باب طلاق میں اضافت کا مسئلہ ایسا مشکل ہے جس کو بہت ہی کم لوگ حل کر سکتے ہیں لاختلاف اقوال الفقہاء فیہا و تشابہ النظائر وتشاکلہا ھذا ما عندی ولم آلُ جھدًا فی تحقیق المسئلة وتنقیحہا وشرحہا وتلقیحہا وفوق کل ذی علم علیم فاللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ ظفر احمد ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۴۷ھ۔

تحقیق مسئلہ ہدم بزبان عربی

الاستفتاء: رجل طلق امرأته مرتین واثناء عدتها ما راجعها وما امسکها وما طلقها ثالثة حتی انقضت عدتها وبانت منه وهی منفردة منه فی بیتها وبعد برهة من الزمان سنح له ان ینکحها نکاحًا جدیدًا فنکحها لکن بعد مدة حدث حادث ما فطلقها طلقة واحدة. فی هذه الصورة یقول عامة الفقهاء الاعلام انها فی هذه الطلقة الواحدة حرمت علیه حرمة غلیظة حتی لا تحل له حتی تنکح زوجًا غیره وهذا لا یفقهه حق التفقه وما ذکروا فی الکتب لا ینتقح البتة بل ینصح خلافه فیاله من داء عقام ولعمری من این اخذوا هذا الحکم الشدید الضیق کثیر الحرج غایتها أمن القرآن الحکیم ام من السنة السنیة الصحیحة ومن القرآن الشریف لا تصل الی ایدیهم الا آیة اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ الآیة وکلما یغور النظر فی الآیة یجدها آبیة من ان یمکن منها اخذه کیف والآیة تحکم بان الرجل اذا نکح امرأة یملك[عه] طلقات ثلثة فان طلق مرتین فله اختیار امرین اما یراجعها ویمسکها او یسرحها

عه لم یتعرض القرآن بذلك صریحا وانما ثبت ذلك بسنة، فان کانت السنة حجة فی ذلك فلتکن حجة فی غیره من الاحکام ۱۲ منه

ای یطلقها مرة ثالثة حیث فسر النبی صلعم کذا فی جواب سوال الصحابی فاین الثالثة؟ قال او یسرحها فالصورة المحکومة علیها فی القرآن ان الزوج اذا طلق امرأته مرتین فله ان یراجعها او یطلقها ثالثًا فی اثناء عدتها اذ الرجعة انما تتصور فی العدة والطلقة الثالثة تنفذ[عه] اذا وقعت فی العدة فان طلقها کذا فلا تحل له حتی الآیة فقوله تعالیٰ فان طلقها اعادة للتسریح المذکور ویترتب علیها الحکم الآتی وانت خبیر انما الآیة تقتضی ان الطلقة الثالثة اخرجتها عن صلوحها لمحلیة النکاح الجدید بالمطلق حتی تنکح زوجًا غیره والصورة المستشکلة وراء تلك الصورة لا یوافقها بل یباینها اذ فی هذا ما امسکها وما سرحها بل ترکها علی حالها حتی بانت وعادت الی حالتها الاولیٰ حیث لا تحل له حتی ینکحها نکاحًا صحیحًا جدیدًا اذ النکاح بانقضاء العدة قد انعدم بالمرة وانصرم بالکلیة ولم یبق اثره البتة الیس حین بانت منه بانقضاء عدتها صارت اجنبیة منه ولم تصلح محلًا بالتصرف ولا یحل له وطیها ولا مسها بشهوة ولا ینفذ تطلیقها ثالثًا اذ التطلیق انما تتصور فی النکاح اما قبل حدوثه او بعد زواله فلا اذ لم یصادف محلًا وهل تجب علیه بعد انبتات عدتها نفقتها او کسوتها وغیر ذلك ولا اظن احدًا هجس به نفسه فتفوه به الیٰ ورح ان مات هو لا تعتد هی عدة الوفاة ولا ترثه وهو لا یرثها ان ماتت هی حین بانت منه بانقضاء العدة فبعده ان نکحها کان نکاحًا جدیدًا[عه] ولا بد

عه لا نسلم توقف نفاذها علی العدة؛ بل تنفذ بعد العدة أیضا إذا زوجها ثانیا، وقوله تعالیٰ: "أو تسریح بإحسان" یعم التسریح فی العدة وبعدها، فمن أین للسائل أن یقیده بزمان العدة؟ ۱۲ منه۔

عه لقائل أن یقول: إذا طلق الرجل امرأته ثلاثا فکیف حرمها اللہ تعالیٰ علیه حتی تنکح زوجا غیره؟ فهل إذا انکحت غیره یکون نکاحه بها نکاحا جدیدا؟ ولا یکون کذلك إذا انکحها بغیر ذلك، مع أنها صارت أجنبیة عنه، لا یرثها ولا ترثه، فإن کان التزوج بزوج آخر یغیر المرأة عن حالها، ولا تتغیر بدون ذلك، ای: الحل، فکذا یجوز أن لا یتغیر حال امرأة بقضاء عدتها بعد طلقتین کل التغییر وإن کان قد تغیر تغییرا ما، فافهم ۱۲ منه۔

اذا الایجاب والقبول جدید ان والتراضی جدید والمهر جدید وکذا التشهود ولایمکن ان یکون هذا النکاح هو الاول والا یلزم اعادۃ المعدوم وتحصیل الحاصل وقوانین الشرع لاتساعدہ عہ شیئا وهی حینئذٍ تکون تصلح لنکاح کل احد وخطبته واذا النکاح الاول کان باقیا کانت لم تصلح فاذن قد ثبت ان النکاح الاول وتوابعه بمعزل من ان یعد او ینضاف الی هذا وصار کان لم یکن شیئاً مذکورا وانقضاء عدۃ الطلقة الثانیة لایخرجها عن صلاحها لمحلیة النکاح الجدید بالمطلق نعم ازال مالکیة للطلقة الثالثة بالمرۃ وبعبارۃ اخری وطی الزوج الثانی فی الصورۃ المحکومة علیها فی القرآن الشریف لایملکه للطلقات الثلاثه جدیدًا بالذات بل بالعرض انما یأهله لان ینکحها جدیدًا فهذا النکاح الجدید یصیّرہ مالکا للطلقات الثلاثة بالذات او هو یملك بنفسه للطلقات الثلاثة بعد النکاح و حیث لایتوقف نکاحا جدیدًا ایضا لایتوقف مالکیته للطلقات الثلاثة البتة والاثر المروی یحدث عن رجل من قومه عن رجل من اصحابه صلعم فیه ضعف ومجهول بیّن کیف یوخذ منه الحکم الشدید الضیق کثیر الحرج ینبغی لرجل فقیه ان یسلك مسلك الیسر والرفق دون العسر و الرتق مهما امکن یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ماجعل علیکم فی الدین من حرج سیما اذا قامت علیه الحجة فهی المحجة کیف

عہ وان ادعی احد ان توقف جواز النکاح بعد الطلقات الثلاث علی النکاح بزوج آخر من الحرج فهل یقول السائل بجوازہ بدونه ؟ ۱۲ منه .

یجترأ احد وکیف یسوغ لفقیه ان یحرم فرجًا عہ علی من اباحه الله تعالی لیعین من النکاح ویحل علی رجل حرمها علیه ولیس معه حجة قویة نقلیة ولاسنة صریحة صحیحة ونحن نذعن ان الصحابة کانوا اعمق علمًا و اروق ذهنًا واحق حکمًا وادق فقها ورئیا فنتحیر کیف سلکوا هذا المسلك الوعرۃ بل نظن وقع الغلط فی النقل عنهم عہ نعم یتضح هذا فی ما اذا امسکها وراجعها واعادها الیه فی اثناء عدتها حیث تعود الیه بما بقی وقول ابن عباس عہ رضی الله عنه نکاح جدید وطلاق جدید لعمری هو اشبه واحق واحری بالقبول ولا یتوقف هذا علی نکاح زوج الثانی او اصابته اذ لا اثر له ولا تعلق بوجه ما البتة لیس الا وذکر الزوج الثانی انما هو بالاتفاق اذ الحادث لعله قد اتفق کذا واما بالحکم فلا مساس له البتة کما لا یخفی وتحس اثرا او تشم رائحة من قول حبر الائمة ابن عباس رضی الله تعالی عنه نکاح جدید وطلاق جدید ان تجدد النکاح انما تکون اذا اصابها زوج آخر کلا ولم یثبت ولم یتحقق فیها قضاء رسول الله صلی الله علیه وسلم بذلك کیف ولو کان فما بال حبر الائمة امام الائمة نحریر النجمة اذ قد خفی علیه مثل هذا القضاء مع سعة الفضاء والعجب علی العجب من الفقهاء الاعلام کیف یسطحوا لعہ النظر

عہ وکیف یجوز لعالم ان یحلل فرجا حرمه الله ورسوله لاحد ۱۲.

عہ واختلط الصور بعضها ببعض وهو برئ عہ منه وکیف ماهو والله اعلم ۱۲

من السائل .

عہ علی الناقل تصحیح النقل فان ابن عباس لم یقل بذلك الا اذا ماتزوجها بعد تحلل النکاح بزوج غیرہ ۱۲ .

لعہ یا عجبا ممن لایحسن العربیة ولا کتابة کیف یطعن علی الفقهاء الاعلام ویجعل نظرهو سطحیا ونظرہ غائرا وهل هذا الا الضلال ۱۲ ظفر .

ههنا غاية السطيحة ولم يعقوها قليلاً فزعموا بما هو مخالف العقل و النقل هذا ولعل الله يحدث بعد ذلك امراً ۔

الجواب : اقول وبالله التوفيق ۔ كلما ذكره السائل اغلوطة محضة لا يلتفت اليها مؤمن فى قلبه حب الله ورسوله وعزة الايمان وليت شعرى هل هو مجتهد ام مقلد فان كان مجتهداً فليجعل نفسه عرضة لامتحان لكى يكرم او يهان وايضاً فلا يجوز لمجتهد احداث قول قد اجمع السابقون من المجتهدين على بطلانه وان كان مقلداً فليس له الا التسليم لما قاله الفقهاء المجتهدون قبله ومن اين له ان يعترض على النقل الصحيح والاثر تقع الامان عن الشريعة المطهرة على مبلغها الف الف تحية ۔ هذا وقد اجمع المجتهدون من الفقهاء والمحدثون من العلماء والراسخون من الفضلاء على ان المرأ اذا طلق امرأته ثلاثا مجتمعة او متفرقة سواء كان بعد ما تزوجها ثانيا بشرط عدم تخلل نكاحها بزوج اخر دونه فهى طالق عليه ثلاثا لا تحل له حتى تنكح زوجا غيره واما ابن عباس فانما قال نكاح جديد وطلاق جديد اذا تزوجها الاول بعد تخلل نكاحها بزوج اخر فقال يهدم الواحدة والثنتين و الثلاث وبمثله قال ابن عمر كما فى كتاب الآثار لمحمد بن حسن (رض) ولم يقل ذلك اذا تزوجها من غير تخلل النكاح بغيره ومن ادعى فعليه البيان والى الله المشتكى مما احدثه هذا السائل فى الشرع فلم يسبقه احد اليه والله تعالى اعلم ۔

وايضاً فان قوله تعالى او تسريح باحسان ليس بصريح فى الطلقة الثالثة وانما يوخذ منها ذلك ببيان الصحابة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وليس فى القرآن ان الرجل يملك على زوجته ثلاث تطليقات وانما فيه الطلاق مرتان فلما كان بيان الرسول بنقل اصحابه حجة فى تفسير التسريح بالاحسان بالطلاق الثالث فليكن كذلك قولهم ان التسريح يعم ما اذا طلقها ثالثا فى النكاح الاول او فى الثانى او فى الثالث

مالم يتخلل النكاح بزوج اخر غيره فافهم ۔

۸ رجمادی الاولیٰ سنہ ۴۸ھ

حکم لزوم کفارہ وعدم وقوع طلاق جبکہ شوہر یہ حلف اٹھائے کہ خدا کی قسم تیرے ہاتھ کا کھانا کھاؤں تو اپنی ماں سے زنا کروں

سوال) کسی نے حالت غصہ میں اپنی زوجہ کو کہا کہ تیرے ہاتھ سے کبھی نہیں کھائیں گے خدا کی قسم اگر کھائیں تو میں میرے ماں کے ساتھ زنا کردوں گا کئی دن بعد اس نے اس کے ہاتھ سے کھانا شروع کردیا اس پر طلاق واقع ہوگا یا نہیں اگر واقع ہو تو کے طلاق اور کیا کرنا ہوگا اور اگر نہ ہو تو حلف صادق آئے گا یا نہیں اور اگر صادق ہو تو کفارہ لازم ہوگا یا نہیں اگر ہو تو کیسا بالتفسیر لکھنا، فقط؟

الجواب : صورت مسئولہ میں یعنی جبکہ بیوی سے یوں کہا خدا کی قسم اگر تیرے ہاتھ کا کھانا کھاؤں تو اپنی ماں کے ساتھ زنا کروں اور پھر اس کے ہاتھ کا کھانا کھالیا تو اس سے طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ قسم کا کفارہ دینا لازم ہوگا ۔ واللہ اعلم ۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ، ۹ رشوال ۴۵ھ ۔

الجواب صحیح ، ظفر احمد عفا عنہ ۔ ۱۰ رشوال ۴۵ھ ۔

وقوع طلاق کے لئے الفاظ طلاق پر تلفظ شرط ہے

سوال) معروض یہ ہے کہ ایک شخص نے بلا تلفظ یعنی دونوں ہونٹ بند ہونے کی حالت میں اپنی زوجہ کو طلاق دی اور کچھ حرکت دونوں ہونٹ میں اور زبان میں بھی اندر ہی اندر ہوئی یعنی ہلنا پایا گیا غرض دونوں ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہے اور زبان میں اندر ہی اندر حرکت ہوئی اور دونوں ہونٹ میں بھی حرکت ہوئی بند ہونے کے حالت میں جس قدر حرکت ہوسکے اور بے تلفظ اپنی زوجہ کو طلاق دی یہ طلاق واقع ہوئی یا نہ ہوئی امید ہے کہ جواب سے ممنون فرماویں؟

الحاصل یہ طلاق دینا تلفظ کے ساتھ نہ ہوا اور دل ہی دل میں بھی نہیں بلکہ بین بین جیسا کہ تفصیلاً عرض کیا گیا زبان میں اور دونوں ہونٹوں میں بند ہونے کی حالت میں جس قدر حرکت ہوسکے پائی گئی مگر تلفظ قطعاً نہیں جب تلفظ نہیں تو دل ہی دل میں شمار کیا جاوے یا نہیں ؟

الجواب : صورۃ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ وقوع طلاق کے لئے تلفظ شرط ہے اور منہ بند کرکے جو زبان کو حرکت دی گئی ہے وہ تلفظ نہیں ہے لان المشائخ

اختلفوا فی حد النطق والتلفظ علی ثلثة اقوال فبعضهم قالوا هو خروج صوت
یصل الی اذنه (ای ولو حکما کما کان هناك مانع من صمم او جلبة اصوات او
نحو ذلك قاله الشامی) وبعضهم قالوا هو خروج الصوت من الفم وان لم
یصل الی اذنه لکن بشرط کونه مسموعًا فی الجملة حتی لو ادنی صماخه الی فیه
یسمع والقول الثالث انه یکفی تصحیح الحروف کما هو المذکور فی البحر و
رد المحتار وفتح القدیر وغیرها من کتب الفقه ولا یخفی ان الصورة
المسئولة لا یصدق علیه حد التلفظ علی احد من الاقوال الثلثة اما علی
الاول والثانی فظاهر لا یحتاج الی البیان واما علی الثالث فنقول ان
المراد بکفایة تصحیح الحروف ان مجرد خروج الصوت (ای الهواء
المتموج) من الفم یکفی وان لم یکن مسموعا قط ولیس مرادهم ان مجرد
تحریك اللسان ووضعه علی المخارج یکفی بدون الصوت لان الصوت
ماخوذ فی حد الحرف کما قال صاحب کشاف الاصطلاحات عرفه القراء
بانه صوت معتمد علی مقطع محقق او مقدر وعرفه ابن سینا بانه کیفیة للصوت
بها یمتاز الصوت عن صوت آخر (ص ۳۱۹) والصوت کیفیة تحدث فی الهواء
من تموجه بسبب قرع او قلع مع المقاومة کما فی حاشیة المیبذی عن
العلمی . فثبت ان تصحیح الحروف لا یاتی بدون التموج فی الهواء و
لا یخفی ان التموج لا یحدث بغیر انفتاح الشفتین، والله اعلم .

فائدہ :- القول الاول اصح وارجح لاعتماد اکثر علمائنا علیه کما نقله
الشامی عن فتاوی الخیریة واختاره صاحب التنویر فی القراءة وقال بعده
یجری ذلك فی کل ما یتعلق بنطق کتسمیة علی ذبیحة ووجوب سجدة تلاوة
وعتاق وطلاق وقال صاحب الدر متفرعًا علیه فلو طلق او استثنی ولم یسمع
نفسه لم یصح فی الاصح ولکن القول الثالث ایضًا مصحح کما فی الشامی عن
الخیریة ایضًا فینبغی الاخذ بالاحوط ای یعمل بالاول فی القراءة والتسمیة و
الاستثناء وبالثالث فی السجدة والعتاق والطلاق وهذا آخر ما اردنا ایراده فی
هذا المقام بتوفیق الملك العزیز العلام ، کتبه الاحقر عبد الکریم عفی عنه ۸ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

حکم طلاق مدہوش وغیرہ

(سوال) چہ میفرمایند علمائے شریعت غرا وفضلائے ملت بیضا اندرینکہ شخصے مسمی بطفیل علی چہار پنج سال میگذارد کہ وے بمرضے شدید تا مدت مدید مبتلا گشتہ بود کہ اندرون دہان او دملی ہائل وجراحتی عظیم پیدا شد تکالیف شاقہ وآلام و اوجاع متنوعہ ازان کشیدہ بود دو سہ بار طبیب نشتر زدہ آنرا شگافتہ انواع مواد فاسدہ از ریم واز وآب وخون فاسد ازان برآوردہ بود بالجملہ قریب بمرگ رسیدہ بود وبر بستر موت خفتہ اما بسبب بقائے مدت حیات بحکم این مقولہ صادقہ بیت ؎

اگر در حیاتت بماندہ است دیر ؎ نہ مارت گزاید نہ شمشیر و شیر

آہستہ آہستہ ازین مرض ہائل سبکدوش گردید اما اثرش تا ہنوز باقی ست کہ اگر خلاف مرضی چیزے از کسی از زن وفرزند ومادر وبرادرش سرزد شود چنان در طیش آید کہ چشمش خیرہ ودماغش متغیر وعقلش مختل گردد واقوال وافعال بیرون از حد اعتدال وخارج از جادہ استقامت ازو سرزد شود ہمچون مدہوشان ومجنونان اما بیخبر محض نشود وادراک وعلم و ارادہ بالکلیہ زوال پذیر نگردد باری وے درچنیں حالت اختلال عقل زن خود را طلاق داد آیا شرعًا زنش مطلقہ ثلاث شدہ است یا نہ وکسیکہ حالش دو سہ بار چنین شدہ اگر دعوی تطلیق درانچنان حالت نماید شرعًا قولش معتبر شود یا نہ ؟ بینوا توجروا

جواب آمدہ از بنگال بغرض تصدیق

درصورت سوال آن شرعًا مطلقہ نشدہ است فی رد المحتار فالمعتبر اقوال المعتوه مع انه لا یلزم فیه ان یصل الی حالة لا یعلم فیها ما یقول ولا یریده وایضًا فیه والذی یظهر لی ان کلا من المدهوش والغضبان لا یلزم فیه ان یکون بحیث لا یعلم ما یقول بل یکتفی فیه بغلبة الهذیان واختلاط الجد بالهزل کما هو المفتی به فی السکران . وایضًا فیه فان بعض المجانین یعرف ما یقول ویریده ویذکر ما یشهد الجاهل به بانه عاقل ثم یظهر منه فی مجلسه ما ینافیه فاذا کان المجنون حقیقة قد یعرف ما یقول ویقصده فغیره بالاولی فالذی ینبغی التعویل علیه فی المدهوش ونحوه اناطة الحکم بغلبة الخلل فی اقواله وافعاله الخارجة عن عادته وکذا یقال فیمن اختل

عقلہ لکبر او لمرض او لمصیبۃ فاجأتہ فما دام فی حال غلبۃ الخلل فی الاقوال و الافعال لا تعتبر اقوالہ وان کان یعلمھا ویریدھا لان ھذہ المعرفۃ والارادۃ غیر معتبر لعدم حصولھا عن ادراک صحیح کما لا تعتبر من الصبی العاقل انتھی۔ ازیں عبارات بخوبی مدرک گردید کہ زن طفیل علی مطلقہ ثلاث نشدہ است اگرچہ وی در انحالت اختلال عقل بعلم و ارادہ وقصد ایقاع طلاق دادہ باشد بسبب عدم صحت ادراک او دعوی تطلیق او در آنچناں حالت شرعاً معتبر ومقبول گردد فی رد المحتار واذا کان یعتادہ بان عرف منہ الدھش مرۃ یصدق بلابرھان، فی الھدایۃ: فصار کما اذا قال طلقت او اعتقت وانا مجنون والجنون منہ کان معھوداً فی حاشیۃ الھدایۃ قولہ کما اذا قال الخ فالقول قولہ حتی لا یقع الطلاق والعتاق لاضافتہ الی حالۃ منافیۃ للایقاع ۱۲ع انتھی فقط واللہ اعلم بالصواب۔

المجیب احقر فیض اللہ عفی عنہ مدرس ومفتی مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام

اصاب فیما اجاب	فقد اصاب المجیب	المجیب مصیب
خلیل الرحمن عفی عنہ	یعقوب عفا اللہ عنہ	عبدالوہاب عفی عنہ

جواب از خانقاہ

یہ تو صحیح ہے کہ مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی ولیکن اولاً اسکی تحقیق ضروری ہے کہ وہ مدہوش ہے یا نہیں۔ یعنی جو حالت سوال میں لکھی ہے اگر اسکو کم از کم دو ثقہ اور شناخت رکھنے والے آدمیوں نے معائنہ کرکے تجویز کیا ہو کہ یہ شخص مدہوش ملحق بالمجنون ہے تب مدہوش ہونا ثابت ہوگا اور اگر یہ معائنہ اسوقت ہوا ہو جسوقت کہ اس نے طلاق دی ہے تب تو یہ دو گواہ کسی حاکم یا محکم کے سامنے گواہی دیدیں اسپر عدم وقوع کا حکم ہوجائے گا اور اگر طلاق کے واقعہ سے قبل معائنہ ہوا ہو تو معائنہ پر گواہی لینے کے بعد خاوند سے قسم بھی لی جاوے کہ اسوقت اس کا ہوش ٹھکانے نہ تھا تب عدم وقوع کا حکم دیا جائے بدون یمین اور بینہ کے عدم وقوع کا فتویٰ دینا درست نہیں فتویٰ میں ضروری قیود کا ذکر کرنا لازم ہے ورنہ جاہل لوگ فتویٰ دیکھتے ہی اپنا مطلب نکال لیتے ہیں قیود وشرائط کیطرف اصلا التفات نہیں کرتے۔ فقط والسلام۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۴ محرم الحرام ۵۲ھ